ماہنامہ

کرن

اپریل 2012

اس شمارے کے ساتھ
کرن کتاب

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

مستقل سلسلے

زر سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ) ----- 800 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ----- 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ----- 6000 روپے

اپریل 2012
جلد 35 شمارہ 1
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ
کرن
37- اردو بازار کراچی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔
ناشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: khawateendigest@hotmail.com , info@khawateendigest.com

اداریہ

اپریل کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
پوری دنیا میں جہاں مختلف قسم کی تبدیلیاں ہر لحظہ ہو رہی ہیں۔ ان ہی میں ایک تبدیلی موسم کی بھی ہے۔ ہمارے ملک میں موسم گرما کا آغاز ہو گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی شہری اداروں کے ای ایس سی، واٹر اینڈ سیوریج بورڈ والوں کی نا اہلی کی وجہ سے عوام بجلی اور پانی جیسی نعمتوں سے قطعی طور پر محروم ہیں۔ بدامنی، دہشت گردی کی وجہ سے ملکی اور غیر ملکی سرمایہ کاری تقریباً رک چکی ہے۔ توانائی کے بحران نے معیشت کا پہیہ جام کر رکھا ہے۔ روزگار کے مواقع معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ توانائی کے وسائل میں اضافہ ہوا نہ متبادل ذرائع تلاش کیے گئے۔ لاکھوں عوام ذہنی کرب کی زندگی گزار رہے ہیں۔ جمہوری حکومت کو ان حالات میں اصلاح احوال کے لیے حقیقت پسندانہ فیصلے کرنے چاہئیں کہ ملک و قوم کا مفاد اسی میں ہے۔
اللہ تعالیٰ ہمارے مقتدران کو نیک اعمال کرنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

اس شمارے میں،

- اداکارہ "ندا رضا اصفہانی" کی شاہین رشید سے ملاقات،
- اداکار "سلیم معراج" دو کے پہاڑے کے ساتھ،
- "آواز کی دنیا سے" آرجے "اسماء توحید" کی باتیں،
- "دست کوزہ گر" فوزیہ یاسمین کا سلسلے وار ناول،
- "دردِ دل" نبیلہ عزیز کا سلسلے وار ناول،
- "ماور سے پیا" نایاب جیلانی کے مکمل ناول کی آخری قسط،
- "مقیدِ خاک" مہ پارہ ساحر کے طویل مکمل ناول کی آخری قسط،
- "کہ کچھ رات کٹے" سلویٰ علی بیٹ کا دلچسپ مکمل ناول،
- "بارِ محبت" شہزادی عباس کا ناولٹ،
- غزالہ جلیل راؤ، عائشہ نصیر، صبیحہ اقبال، فرحین اظفر اور عالیہ حرا کے افسانے،
- اور مستقل سلسلے،

مفت،

کرن کتاب "چہرے کچھ بولتے ہیں" ہر شمارے کے ساتھ مفت حاصل کریں۔

حمد باری تعالیٰ

وَحدَہٗ
صبحِ ازل کیا
شامِ ابد کیا
قیدِ مکاں کیا
وقت کی حد کیا
تُو ان سب سے بالاتر ہے
تُو ہی مخفی تُو ہی خبر ہے
سب چہرے تیرے ہی چہرے
سارے نام ترے ہی نام
تُو خود ہی اپنا شاہکار
تُو خود ہی اپنا انعام

سرشار صدیقی

نعت رسول مقبول ﷺ

نورِ ازل ہیں نور کا پیکر حضورؐ ہیں
تخلیقِ کائنات کا محور حضورؐ ہیں

معراج وہ ملی جو فرشتے نہ پا سکے
بعد از خدا ہر ایک سے برتر حضورؐ ہیں

بندوں کی رہنمائی تو ہر اک نبیؑ نے کی
ہاں سارے رہنماؤں سے بڑھ کر حضورؐ ہیں

دائم جہادِ حق کا نشان ظفر ہے وہ
باندھے ہوئے جو پیٹ سے پتھر حضورؐ ہیں

سیرت ہے پاک اُسوۂ حسنہ ہے بے مثال
انسانیت کا ماہِ منور حضورؐ ہیں

قرآن کا نزول ہوا جن کے قلب پر
سرتاجِ انبیاء وہ پیمبر حضورؐ ہیں

سیما گناہ گار و خطا کار ہوں مگر
تسکین یہ ہے کہ شافعِ محشر حضورؐ ہیں

سیما سراج

ردا رضا اصفہانی سے ملاقات

شاہین رشید

آج کل شوبز میں کافی نئی لڑکیاں آگئی ہیں۔ نوجوان لڑکیوں میں اضافہ ایک خوش آئند بات ہے۔ آج کل آپ ایک نیا چہرہ ردا رضا اصفہانی کا دیکھ رہے ہوں گے
اس ماہ ہم نے ردا رضا سے کچھ باتیں کی ہیں جو نذر قارئین ہیں۔

★ "ردا کیسی ہیں... بہت مصروف رہتی ہیں؟"

✳ "جی بالکل ٹھیک ہوں ... اور الحمد للہ بہت مصروف رہتی ہوں۔ آپ اندازہ بھی نہیں کر سکتیں۔"

★ "کتنا عرصہ ہوگیا ہے آپ کو اس فیلڈ میں؟"

✳ "یہی کوئی آٹھ دس ماہ... اور اس عرصے میں ماشاء اللہ میں آٹھ دس پروجیکٹس پہ کام کر چکی ہوں۔ میں آپ کو اس کی تھوڑی تفصیل بتاتی ہوں۔ سب سے پہلے میں نے ایک گانے کی ویڈیو "پوچھ میرا کیا نام ہے" اس کو زین العابدین صاحب نے کیا تھا۔ اس کے بعد "اے اینڈ بی" والوں نے مجھے دو ڈرامہ سیریلز میں بک کیا "روگ" اور "پل صراط" اور یہ دونوں ہی سیریلز بہت ہٹ گئے۔ اس کے بعد پرائیویٹ پروڈکشن کی طرف سے "محمود آباد کی" آفر آئی اس میں ابتدا میں میرا کردار بہت ہی مختصر سا تھا مگر پھر میری پرفارمنس کو دیکھ کر اس میں اضافہ کر دیا گیا۔ پھر اسی پروڈکشن ہاؤس کا "مدہوش" کیا اس کے بعد "ام کلثوم" میں آمنہ شیخ کی چھوٹی بہن کا رول کیا پھر مجھے ماسٹر مائنڈ کے احمد کامران نے اپنے سیریل "شہریار شہزادی" کے لیے آفر کیا یہ سیریل نہیں بلکہ سوپ ہے اور اس میں میرا کردار بہت ہی اچھا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور سوپ "مڈل کلاس" کر رہی ہوں۔

کچھ اور بھی سیریل سائن کیے ہیں جن کے بارے میں ابھی فائنل بات نہیں ہوئی۔ مگر ہو جائے گی۔"

★ "گڈ، بہت کام ہو رہا ہے کچھ اپنی فیملی بیک گراؤنڈ کے بارے میں بتائیں؟"

✳ "ہم لوگ اصفہانی ایرانی ہیں لیکن اردو اسپیکنگ ہیں۔ کراچی میں ہی رہتے ہیں۔ میرے والد ریڈیو سے بچپن سے وابستہ ہیں اور بنیادی طور پر رائٹر ہیں۔ شاعر بھی ہیں اور پروفیشنل آرٹسٹ ہیں ان کا نام طالب رضا اصفہانی ہے ــــــــ میری والدہ کا نام محمودہ اصفہانی ہے اور کاظم پاشا کے سیریل "تھوڑا سا آسمان" سے اپنی اداکاری کا آغاز کیا... اور اس کے بعد کافی کام کیا۔ ڈرامہ سیریل "پل صراط" میں اور "محمود آباد کی ملکائیں" میں میرے والد کا رول میرے والد ہی کر رہے ہیں۔ میرے دو بھائی ہیں ایک مجھ سے بڑے ہیں "علی رضا اصفہانی" بی کام کے طالب علم ہیں اور ایک مجھ سے چھوٹا ہے غالب رضا اصفہانی جو اب فرسٹ ایئر میں ہے۔ میں ایک ہی بہن ہوں اور میرا نام مریم رضا اصفہانی ہے۔"

★ "مریم رضا اصفہانی نام ہے تو ردا رکھنے کا مطلب؟"

✳ "یہ نام میں نے شوبز کی وجہ سے نہیں رکھا... میری ڈیٹ آف برتھ کے حوالے سے مجھے کچھ پرابلمز ہو رہی تھیں تو پھر ڈیڑھ سال پہلے میرا نام "ردا" رکھا گیا ویسے ضروری دستاویزات میں مریم رضا اصفہانی ہی ہے اور میں کراچی میں 26 ستمبر 1992ء میں پیدا ہوئی اور بی کام تھرڈ ایئر کی طالبہ ہوں اور اسٹار لبرا ہے۔"

★ "شوبز میں والدین کی مرضی سے آئی ہیں؟"

✳ "جی بالکل مجھے کوئی شوق نہیں تھا۔ لیکن گھر والوں نے کہا تو میں نے آڈیشن دے دیا اور فوراً" بی اے اینڈ بی پروڈکشن ہاؤس نے مجھے دو سیریلز میں بک کر لیا۔"

★ "اتنی مصروفیات میں گھر والوں کے لیے وقت نکالنا تو مشکل ہی ہوتا ہوگا؟"

✳ "نہیں بالکل نہیں... جب میں شوٹ سے فارغ ہوتی ہوں تو پھر سارا وقت میرے گھر والوں کے لیے ہوتا ہے۔ نہ میں دوستوں کے ہاں جاتی ہوں اور نہ ہی کسی اور تقریب میں، پہلے تو پھر بھی گھومنے پھرنے چلی جاتی تھی۔ مگر اب ایسا نہیں ہے۔ اب تو ہم سب مل کر ایک ساتھ بیٹھ کر ڈرامے وغیرہ دیکھتے ہیں اور میرے ڈراموں کو تو اتنی اہمیت دی جاتی ہے کہ وہ جتنی مرتبہ ریپیٹ ہوں سب اسے دیکھتے ہیں۔ میرے والدین، میرے بھائی اور رشتے دار سب مجھے بہت اہمیت دیتے ہیں اور میرے ایک ایک سین پہ میری حوصلہ افزائی کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ مجھ میں بہت خود اعتمادی آ گئی ہے۔"

★ "اپنی زندگی سے مطمئن ہیں؟"

✳ "میں اپنی زندگی کے بارے میں ایک ہی بات

کہوں گی کہ بچپن سے لے کر آج تک میں اپنے گھر والوں کی بہت زیادہ لاڈلی رہی ہوں اور میں نے جس چیز کی خواہش کی ہے اس کو گھر والوں نے اور میرے اللہ نے پوری کی ہے۔ میری زندگی میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ اللہ کا شکر ہے۔"

★ "کافی کردار آپ کر چکی ہیں اور ان شاء اللہ اور بھی کریں گی پھر بھی کسی خاص کردار کی خواہش ہے؟"

✻ "نفسیاتی لڑکی کا کردار کرنا چاہتی ہوں۔ باقی کردار تو ان شاء اللہ ملتے ہی رہیں گے۔ کیونکہ ابھی مجھے بہت کام کرنا ہے۔"

★ "اپنے بارے میں سوچتی ہیں کہ فیوچر میں کیا پلاننگ ہیں کیا کرنا ہے؟"

✻ "یہ میں نے کبھی نہیں سوچا' کبھی پلاننگ نہیں کی کیونکہ میرا موڈ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے مگر اللہ سے اچھی امید ہے۔ جیسے شوبز کے بارے میں کبھی نہیں سوچا اور جب اس فیلڈ میں آئی تو اللہ نے کامیابی دے دی۔ تو یہ اللہ کا بڑا شکر ہے کہ جو کام کیا اس میں کامیابی ملی۔"

★ "آپ جب تک اس فیلڈ میں نہیں آئی تھیں۔ یہ فیلڈ کیسی لگتی تھی؟"

✻ "شوبز سے میرے والدین تو کافی عرصے سے وابستہ تھے اور جب تک میں خود نہیں آئی تھی تو میں یہ کہتی تھی کہ یہ تو وقت کا زیاں ہے۔۔۔ لیکن جب میں نے خود کام کرنا شروع کیا تو میری سوچ بالکل بدل گئی مجھے کام کرنے میں بہت مزا آتا ہے اور جس دن میرے پاس کام نہ ہو میں بہت بوریت محسوس کرتی ہوں۔"

★ "لیکن شوبز میں دل لگ گیا ہے۔ اچھی لگنے لگی ہے یہ دنیا؟"

✻ "بہت اچھی لگنے لگی ہے اور شوبز میں ہر بندہ بہت لونگ ہے اور جس کے ساتھ آپ اچھے طریقے سے ملیں گے وہ بھی آپ سے اچھے طریقے سے ہی ملے گا۔ میرا اب تک کا تجربہ بہت اچھا ہے اور سب میرے ساتھ خواہ وہ سینئر فنکار ہوں' کیمرے کے پیچھے کام کرنے والے ہوں یا ڈائریکٹرز' پروڈیوسرز سب بہت اچھے ہیں۔"

★ "تقریبات میں جاتی ہیں شوبز کی؟"

✻ "سچی بات بتاؤں مجھے شوبز کی تقریبات میں جانا بالکل بھی پسند نہیں ہے اور میں کسی نگیٹو وے میں نہیں کہہ رہی بلکہ مجھے لگتا ہے کہ میں ٹائم ضائع کر رہی ہوں مجھے اپنی فیملی کے ساتھ ٹائم گزارنا زیادہ اچھا لگتا ہے۔"

★ "شوبز کی دنیا اچھی لگی۔ کوئی برائی نظر نہیں آئی؟"

✻ "ابھی تک تو میں نے شوبز کی دنیا میں کوئی برائی نہیں دیکھی۔ ابھی تک تو مجھے سب کچھ پوزیٹو ہی نظر آرہا ہے۔ وہی پرانی بات کہ آپ اچھے ہو تو سب اچھے ہیں اور مجھے تو شوبز کے لوگ غیر معمولی طور پر خیال کرنے والے اور محبت کرنے والے لگتے ہیں۔ جس ٹیم کے ساتھ کام کرو لگتا ہے فیملی کے ساتھ کام کر رہے ہیں پڑھا لکھا اور بہت اچھا ماحول ہے۔"

★ "چھٹی کا دن کیسے گزارتی ہیں؟"

✻ "سو کر بہت دیر تک سوتی ہوں۔ پھر امی سے ناشتا مانگتی ہوں' پھر ان کے ساتھ کہیں باہر جاتی ہوں۔۔۔ اور میری یہ بہت بری عادت ہے کہ میں ناشتا خود نہیں بناتی بلکہ ہمیشہ امی سے بنواتی ہوں اور اگر وہ ناشتا نہ بنا کر دیں تو میں بھوکی رہ لوں گی مگر خود نہیں بناؤں گی۔ امی کہتی ہیں کہ جب پرائے گھر جاؤ گی تب پتا چلے گا۔"

★ "امی کے ساتھ بازار جاتی ہیں اور گھومتی پھرتی ہیں لوگ پہچان کر کیا کہتے ہیں شہرت پا کر مزا آرہا ہے؟"

✻ "شہرت پا کر بہت مزا آرہا ہے۔ اور میں تو اپنی اس شہرت پر اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں اور بہت خوشی ہوتی ہے اور جب لوگ ملتے ہیں تو مجھے میرے کردار کے حوالے سے پہچان کر بات کرتے ہیں۔۔۔ اور میں جہاں جہاں جاتی ہوں لوگ مجھے پہچان کر بات کر رہے ہوتے ہیں تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔۔۔ اور میں بہت دل کے ساتھ ان کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔"

★ "زندگی تو بہت حسین لگ رہی ہے۔ کبھی بری بھی لگی؟"

✻ "جی ماشاء اللہ زندگی بہت اچھی لگ رہی ہے۔ مگر جب میں اپنے آپ سے کچھ باتوں کا تجزیہ کرتی ہوں یا غلط باتیں سوچ لیتی ہوں اور کسی بات سے میرا دل برا ہوتا ہے تو پھر مجھے زندگی بری لگنے لگتی ہے۔۔۔ تب پھر میں رونے لگتی ہوں اور رو دھو کر سکون مل جاتا ہے تو۔ پھر ٹھیک ہو جاتی ہوں۔ زیادہ دیر تک ٹینشن میں نہیں رہ سکتی۔"

★ "غصے کی تیز ہیں اور کیا کرتی ہیں غصے میں؟"

✻ "میں تھوڑی سی غصے کی تیز ہوں۔۔۔ اور مجھے یہ احساس شدت سے ہوتا ہے کہ میں ابھی مکمل طور پر ایک اچھی انسان ہوں۔ میں ماشاء اللہ سے اٹھارہ انیس سال کی ہو گئی ہوں اور بڑی گہری نظر رکھتی ہوں اپنی خامیوں پہ اور میرا یہ اصول ہے کہ پہلے اپنی خامیاں دیکھیں دوسروں کی بعد میں تلاش کریں تو مجھ میں یہ خاص بات ہے کہ میں جلد ہائپر ہو جاتی ہوں اور پھر یہ بھی نہیں دیکھتی کہ میرے سامنے کون ہے اور جس کا بعد میں مجھے افسوس ہوتا ہے۔ اپنی اس خامی کو دور کرنا چاہتی ہوں اور غلطی کا اعتراف بھی کر لیتی ہوں۔"

★ "موڈ کب خراب ہوتا ہے؟"

✻ "موڈ کم ہی خراب ہوتا ہے۔ کیونکہ گھر والے ہوں یا کوئی اور سب میرے موڈ کو سمجھتے ہیں۔ موڈ اس وقت خراب ہوتا ہے جب کوئی ایک بات کو بار بار بولے۔ بھئی میں کہتی ہوں کہ ایک بات کو بار بار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

★ "فضول خرچ ہیں اور کہاں خرچ زیادہ کرتی ہیں؟"

✻ "نہیں۔۔۔ فضول خرچ نہیں کہہ سکتیں۔ کیونکہ میں بہت سوچ سمجھ کر خرچ کرتی ہوں۔ کیونکہ مجھے اندازہ ہے کہ کمانا آسان نہیں ہے اور کہاں خرچ کرتی ہوں تو سب سے پہلے اللہ کی راہ میں خرچ کرتی ہوں۔۔۔ اپنے چھوٹے بھائی پہ جو کہ مجھے بہت پیارا ہے اور میرا خیال بھی بہت رکھتا ہے اور اپنے امی ابو پہ تو بہت ہی زیادہ خرچ کرنے کو دل چاہتا ہے۔ ان کی محبتوں کا کوئی بدل ہی نہیں ہے۔"

★ "اچھی عادت بتائیں اور گھر آکر تھکن کا اظہار کرتی ہیں؟"

✻ "میرے خیال میں میری اچھی عادت یہ ہے کہ میں رحم دل ہوں اور اللہ تعالیٰ نے مجھے جو اتنی کامیابی دی ہے اس کی وجہ بھی میری رحم دلی ہے۔ گھر آکر تھکن کا اظہار بالکل نہیں کرتی۔ لوگ کہتے ہیں ہم صبح اٹھ کر اپنے آپ کو ترو تازہ محسوس کرتے ہیں جبکہ میں رات کو جب گھر آتی ہوں تو اپنے آپ کو ترو تازہ محسوس کرتی ہوں۔ جب میں گھر آتی ہوں تو میری بیٹری چارج ہو جاتی ہے میں بہت ہلکا پھلکا اور اپنے آپ کو فریش محسوس کرتی ہوں اور جب بستر پر لیٹتی ہوں تو فوراً" بہت مزے کی نیند آجاتی ہے۔"

★ "لوگ آپ کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟"

✻ "سچی بات بتاؤں میرے رشتے دار میرے دوست اور جن کے ساتھ میں زیادہ اٹھ بیٹھ جاؤں۔ وہ میری باتیں سن کر کہتے ہیں کہ تم اپنی باتوں سے بڑی لگتی ہو جبکہ تمہاری عمر کم ہے یعنی تم میچور باتیں کرتی ہو' تمہارا بات کرنے کا انداز بہت اچھا ہے تو مجھے بہت حیرت ہوتی ہے کہ میں تو کبھی سوچ سمجھ کر بولتی ہی

نہیں ہوں۔ جو میرے دل میں ہوتا ہے وہی میری زبان پر ہوتا ہے۔"

★ "جب ٹی وی آن کرتی ہیں تو کون سا چینل لگاتی ہیں؟"

٭ "میں اے آر وائی ڈیجیٹل لگاتی ہوں۔ کیونکہ اس چینل سے میرے سب سے زیادہ ڈرامے ٹیلی کاسٹ ہوتے ہیں۔ بس اس لیے مجھے یہ چینل اچھا لگتا ہے۔"

★ "گھرداری سے کتنا لگاؤ ہے؟"

٭ "ارے جناب مجھے گھرداری سے بالکل لگاؤ نہیں ہے میں گھر کی صفائی ستھرائی میں حصہ لیتی ہوں نہ کچھ پکاتی ہوں۔ ہاں چائے بنا لیتی ہوں کیونکہ میرے ابا چائے بہت شوق سے پیتے ہیں انہی کی وجہ سے چائے بنانی سیکھی ہے۔ کبھی کبھار برتن دھو لیتی ہوں۔"

★ "ماڈلنگ اور کمرشل کیے؟"

٭ "ہاں کمرشل کیے ہیں اور کمرشل کرکے اچھا بھی لگا۔ لیکن ریمپ پہ ماڈلنگ نہیں کی اور ——— نہ ہی کوئی خواہش ہے بس اداکارہ بننا چاہتی تھی سو بن گئی ہوں۔"

★ "اور کبھی فیوچر میں فلم کرنے کا ارادہ ہے؟"

٭ "اگر "بول" اور "خدا کے لیے" جیسی اچھی فلموں کی پیشکش ہوئی تو ضرور ضرور کام کروں گی۔"

★ "فلمیں شوق سے دیکھتی ہیں؟"

٭ "جی دیکھتی ہوں۔ خاص طور پر جس فلم میں شاہ رخ خان اور کرینہ کپور ہوں وہ دیکھتی ہوں ورنہ تو میرے نزدیک فلم دیکھنا بھی وقت کو ضائع کرنا ہے۔"

★ "شوبز میں سفارش چلتی ہے؟"

٭ "نہیں — ہرگز نہیں — سفارش صرف ایک بار چلتی ہے اس کے بعد آپ کا ٹیلنٹ چلتا ہے۔ نہ بہت زیادہ بیوٹی کام آتی ہے اور نہ سفارش، صرف ٹیلنٹ کام آتا ہے۔"

★ "ابھی آپ اس فیلڈ میں سینئر نہیں ہوئیں۔ جب ماشاء اللہ بہت فیمس ہو جائیں گی تو پھر جب آفر آئے گی تو کیا دیکھیں گی اسکرپٹ رائٹر یا ڈائریکٹر؟"

٭ "سب سے پہلے اسکرپٹ اور ابھی بھی ایسے ہی کرتی ہوں۔ پہلے اسکرپٹ دیکھتی ہوں اور ڈائریکٹر کو بھی دیکھوں گی۔ کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ یہی دو چیزیں کسی بھی ڈرامے کی کامیابی کے لیے بہت ضروری ہوتی ہیں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے روا سے اجازت چاہی

✡ ✡

دو کا پہاڑہ

سلیم معراج

شاہین رشید

1 "کوئی دو نام جن کے لیے آپ سوچتے ہیں کہ کاش یہ میرے ہوتے؟"

☆ "میں تو یہ سوچتا ہوں کہ سلیم کی جگہ کوئی اور نام نہ ہوتا اور معراج تو میرا پسندیدہ ترین نام ہے اور میرا پورا نام محمد سلیم معراج ہے۔"

2 "آپ کے لکی نمبر؟"

☆ "لکی نمبر پہ میرا کوئی یقین ہی نہیں ہے بالکل زیرو یقین ہے۔"

3 "دو تاریخی ادوار جس میں آپ جانا چاہتے ہیں؟"

☆ "میں جانا تو نہیں چاہتا تھا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دور جس میں ساری دنیا کا نقشہ ہی بدل گیا۔ میں تو گناہ گار آدمی ہوں جانا تو چاہتا ہوں پر کیسے جاؤں گا۔"

4 "دو افراد جن کے SMS کے جواب آپ فوراً دیتے ہیں؟"

☆ "ایک تو میری بیگم اور دوسری بھی میری بیگم یہ خیال رہے کہ ایک ہی بیگم ہے مگر دو پہ بھاری ہے۔"

5 "کوئی دو بری عادتیں جن سے نجات چاہتے ہیں؟"

☆ "اپنی صحت پہ توجہ کم دیتا ہوں۔ اللہ نے جو صحت دی ہے اسی پہ گزارا ہے اور اللہ کا شکر بھی ادا کرتا ہوں کہ اچھی صحت دی ہے اور اگر توجہ دوں تو سونے پہ سہاگہ ہو جائے اور دوسری بری عادت سگریٹ کی

ہے۔اس سے نجات چاہتا ہوں۔"

6 "دو جھوٹ جو آپ اکثر بولتے ہیں؟"

☆ "ایک زمانے میں کافی جھوٹ بولا کرتا تھا۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ میں نے جب بھی جھوٹ بولا وہ سامنے آجاتا ہے اور جب جھوٹ کا پول کھل جائے تو پھر وہ شرمندگی کا باعث ہوتا ہے اور جھوٹ ہمارے پروفیشنل ہی ہوتے ہیں۔ کوشش تو کرتا ہوں کہ نہ بولوں لیکن جھوٹ بولے بغیر ہماری سوسائٹی میں گزارا بھی نہیں ہے۔"

7 "اپنے بارے میں کن دو باتوں کو سن کر آپ کو غصہ آجاتا ہے؟"

☆ "یہ کہ جو بات آپ نے کی ہی نہیں ہے بلکہ آپ سے وابستہ ہو جائے اور دوسری یہ کہ میں ان جگہوں سے بچ کر رہتا ہوں جہاں کسی قسم کی ڈسکشن ہو رہی ہو اور کسی لڑکی کے ساتھ میرا نام آئے تو مجھے غصہ آتا ہے۔"

8 "حالات حاضرہ کے دو اینکر جو آپ کے خیال میں پرچی سے آئے ہیں؟"

☆ "ایسا کوئی نہیں ہیں جتنے بھی اینکرز ہیں انہوں نے بہت محنت کے بعد یہ مقام پایا ہے اس لیے کوئی نہیں ہے۔"

9 "مارننگ شو کے دو اینکر جو آپ کو بہت پسند ہیں؟"

☆ "جب مرینہ خان مارننگ شو کرتی تھیں تو بہت اچھا لگتا تھا اور دوسری سویرا ندیم ہیں۔ اب تو انہوں نے بھی چھوڑ دیا ہے۔"

10 "دو دوست جن پر آپ بھروسہ کر سکتے ہیں؟"

☆ "بہت سارے دوست ہیں جن پہ بھروسہ کر سکتا ہوں۔ ان میں ایک تو شاہد شفاعت ہیں یہ ڈائریکٹر ہیں۔ احسن احتشام تحمیل ان سب پر اندھا اعتماد کرتا ہوں۔"

11 "دو مشہور شخصیات جن کے ساتھ آپ دنیا گھومنا چاہتے ہیں؟"

☆ "بھئی میں تو صرف اور صرف اپنی بیگم اور بچوں کے ساتھ دنیا گھومنا چاہتا ہوں۔"

12 "دنیا کی دو ایسی شخصیات جن کی قسمت پر رشک آتا ہے؟"

☆ "جتنے بھی کامیاب لوگ اپنی اپنی فیلڈ کے ہیں ان سب پر رشک آتا ہے۔ خواہ وہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان ہوں یا مہاتیر محمد وغیرہ وغیرہ۔"

13 "دو تہوار جو آپ اہتمام سے مناتے ہیں؟"

☆ "عید اور رمضان المبارک۔"

14 "دن کے چار پہر میں سے کون سے دو پہر اچھے لگتے ہیں؟"

☆ "صبح کا وقت بہت اچھا لگتا ہے۔ آٹھ بجے اٹھتا ہوں اور رات بارہ بجے کے بعد کا وقت۔"

15 "پہلی ملاقات میں کون سے دو جملے لازمی بولتے ہیں؟"

☆ "السلام علیکم کیا حال چال ہیں آپ کے۔"

16 "دو کھانے جن کو کھا کر کبھی بور نہیں ہوتے؟"

☆ "نہاری' آلو قیمہ' پالک گوشت۔"

17 "دو افراد جن سے معافی مانگنے میں شرم محسوس نہیں کرتے؟"

☆ "میں کسی سے بھی معافی مانگنے میں شرم محسوس نہیں کرتا۔ اگر میری غلطی ہو تو۔"

18 "دو پسندیدہ کھلاڑی جن کی وجہ سے آپ کرکٹ دیکھتے ہیں؟"

☆ "عمران خان کی وجہ سے دیکھتا تھا اور اب شاہد خان آفریدی کی وجہ سے۔"

19 "دو خواہشات جو ابھی تک پوری نہیں ہوئیں؟"

☆ "اللہ کا شکر ہے کہ ضرورت سے زیادہ ملا ہے اور خواہشات تو ویسے بھی ختم نہیں ہوتیں۔"

20 "دو چیزیں جنہیں لیے بغیر آپ گھر سے نہیں نکلتے؟"

☆ "موبائل اور والٹ۔"

21 "دو الفاظ جو آپ بہت استعمال کرتے ہیں؟"

☆ "نہیں یار' بس یہی استعمال کرتا ہوں۔"

22 "سات دنوں میں سے کون سے دو دن اچھے لگتے ہیں؟"

☆ "جمعہ اور ہفتہ ویسے اتوار بھی بہت پسند ہے۔"

23 "بارہ مہینوں میں کون سے دو مہینے اچھے لگتے ہیں؟"

☆ "دسمبر اور جنوری۔"

24 "اپنے گھر میں دو پسندیدہ جگہیں؟"

☆ "دو جگہیں نہیں بلکہ پورا گھر ہی اچھا لگتا ہے۔"

25 "گھر کے دو کام جو آپ کو پسند نہیں؟"

☆ "سودا سلف لانا پڑتا ہے یہ ذمہ داری بھی ہے اور مجبوری بھی ہے اور فیملی شاپنگ پسند نہیں۔"

26 "دو ایسی شخصیات جن پر کسی قسم کا شک نہیں کر سکتے؟"

☆ "شاہد شفاعت اور ثانیہ سعید۔"

27 "دو سیاست دان جو ملک کے لیے بوجھ ہیں؟"

☆ "بہت سارے ہیں۔ کس کس کا نام لوں۔"

28 "کن دو ممالک کی ترقی سے متاثر ہیں؟"

☆ "امریکہ اور یورپ کو چھوڑ دیں تو آپ دیکھیں کہ ملائیشیا نے بہت ترقی کی ہے اور چائنا نے بھی ترقی کی ہے۔ انڈیا اور بنگلہ دیش نے بھی کافی ترقی کر لی ہے۔"

29 "کون سے دو رنگ کے لباس پسند ہیں؟"

☆ "کالا اور کوئی نہیں۔"

30 "اپنے ملک کے دو پسندیدہ شہر؟"

☆ "کراچی اور لاہور۔"

31 "اگر ایک دن کے لیے ساری دنیا سو جائے سوائے آپ کے تو کیا دو چیزیں لینا چاہیں گے؟"

☆ "کچھ نہیں۔۔۔ میں بھی سونا چاہوں گا۔ مجھے کچھ بھی لینے کا لالچ نہیں ہے۔"

32 "لڑکیوں کے لیے کوئی دو نصیحتیں؟"

☆ "کسی بھی فیلڈ میں جانے کے لیے پڑھا لکھا اور

ذہین ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ بے وقوف سے بے وقوف لڑکے بھی لڑکیوں کو آسانی سے بے وقوف بنا لیتے ہیں۔ اگر لڑکیاں پڑھی لکھی اور ذہین نہ ہوں تو۔"

33 "سال کے چار موسموں میں کون سے دو پسند ہیں؟"

☆ "بہار اور سردی۔"

34 "لڑکیوں کی دو ناپسندیدہ عادتیں؟"

☆ "مجھے تو لڑکیوں کی کوئی عادت بری نہیں لگتی۔ لڑکیوں کا تہذیب و تمیز کے ساتھ بیٹھنا اور بات کرنا لڑکوں کو اچھا ہی لگتا ہے۔"

35 "صبح اٹھتے ہی کون سے دو کام پہلے کرتے ہیں؟"

☆ "برش کرتا ہوں اور بیٹی کو لے کر اسکول جاتا ہوں۔"

36 "دو خواتین جنہوں نے آپ کی زندگی بنانے میں اہم رول ادا کیا ہو؟"

☆ "ثانیہ سعید نے مجھے بہت سپورٹ کیا اس فیلڈ میں باقی گھر میں امی اور بہن نے حوصلہ افزائی کی۔"

37 "آپ کے نزدیک دنیا کی دو خوب صورت ترین خواتین؟"

☆ "مجھے تو ہر لڑکی ہی اچھی لگتی ہے اور ایسا نہیں ہے کہ اس کے نین نقش اچھے ہیں یا اس کا رنگ اچھا ہے یا آنکھیں اچھی ہیں۔ بس وہ اگر بیٹھی ہوئی اچھی لگ رہی ہے تو بس لگ رہی ہے۔ خواتین خدا کی حسین تخلیق ہیں۔"

38 "دو پسندیدہ پروفیشن؟"

☆ "اداکاری بطور پروفیشن اور بس اس فیلڈ میں کچھ مزید کرنا چاہتا ہوں۔"

39 "دنیا کے دو بہترین سیاست دان آپ کی نظر میں؟"

☆ "مہاتیر اور نیلسن منڈیلا۔"

40 "والدین کی دو نصیحتیں جو آپ نے گرہ سے باندھ لی ہوں؟"

☆ "نصیحت تو ہر والدین کرتے ہیں لیکن میرے والدین نے ہماری تربیت بہت عمدہ کی ہے۔ کوئی کسر نہیں چھوڑی انہوں نے۔"

41 "دو چیزیں جن پر آپ بہت خرچ کرتے ہیں؟"

☆ "شاپنگ پر ہی خرچ ہوتا ہے جو عموماً گھر کی ہی ہوتی ہے۔"

42 "اپنے دو ڈرامے جو فراموش نہیں کر سکتے؟"

☆ "کاش میں تیری بیٹی نہ ہوتی" اور "خدا کی بستی" نیا والا ان دونوں سے مجھے بریک تھرو ملا ہے اور میرے لیے مزید ترقی کے راستے کھلے ہیں۔"

43 "دو قیمتی چیزیں جو آپ خریدنا چاہتے ہیں؟"

☆ "میں گھر خریدنا چاہتا ہوں بس یہی بہت قیمتی ہو گا۔"

44 "اپنے کیے گئے دو فیصلے جو غلط ثابت ہوئے ہوں؟"

☆ "چھوٹے چھوٹے غلط فیصلے تو بہت کیے ہیں۔ ایسا کوئی بڑا فیصلہ نہیں کیا کہ جو غلط ثابت ہوا ہو۔"

45 "پانچ وقت کی نمازوں میں کون سے دو وقت کی نمازیں لازمی پڑھتے ہیں؟"

☆ "ایک وقت تھا کہ جب پانچوں وقت کی نمازیں پڑھتا تھا۔ مگر اب جمعہ کی پڑھتا ہوں اور دیگر پڑھنے کی بھی کوشش کرتا ہوں۔ البتہ نہ پڑھنے کی خلش دل میں رہتی ہے۔"

46 "بیرون ملک شاپنگ میں کیا دو چیزیں لازمی خریدتے ہیں؟"

☆ "میں بڑا گھریلو سا بندہ ہوں اپنے بیوی بچوں کے لیے ہی شاپنگ کرتا ہوں اور جو پسند آتا ہے لے لیتا ہوں۔"

47 "دو لوگ جن کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"

☆ "کوئی نہیں ہے۔"

48 "کن دو لوگوں کی تعریف میں بخل سے کام نہیں لیے؟"

☆ "جو بھی تعریف کے قابل ہوتا ہے اس کی تعریف ضرور کرتا ہوں۔"

49 "دو پسندیدہ مشروب؟"

☆ "پیپسی، مرنڈا اس قسم کے مشروب اچھے لگتے ہیں۔ شوق سے پیتا ہوں۔"

50 "دھنک کے سات رنگوں میں کون سے دو رنگ پسند ہیں؟"

☆ "دھنک کے ساتوں رنگ بہت خوب صورت ہوتے ہیں۔"

51 "آج کے دور کے دو پسندیدہ گلوکار؟"

☆ "راحت فتح علی اور شفقت امانت علی۔"

52 "شادی کی دو رسمیں جو انجوائے کرتے ہیں؟"

☆ "مہندی کی رسم اور نکاح کی رسم نکاح میں عجیب فیلنگز ہوتی ہیں۔ خوشی بھی ہوتی ہے اور اداسی بھی یعنی ٹرین ایک ٹریک پہ چل رہی ہوتی ہے اور ایک دم سے ٹریک بدل جاتا ہے۔"

53 "دو باتیں جو آپ کا موڈ خراب کرتی ہیں؟"

☆ "میں وقت کا پابند آدمی ہوں اور وقت پر شوٹ پہ جاتا ہوں۔ اگر مجھے پتا ہو کہ لوگ دیر سے آتے ہیں تو بس یہی باتیں میرا موڈ آف کر دیتی ہیں۔"

54 "افسردگی میں کن دو لوگوں کے ساتھ آنسو بہانا اچھا لگتا ہے؟"

☆ "پہلے بہت رونا دھونا تھا میں چھوٹی چھوٹی باتوں پہ جذباتی ہو جاتا تھا جب سے پریکٹیکل لائف میں آیا ہوں تھوڑا ٹھیک ہو گیا ہوں۔ تو آنسو خود ہی بہانا اچھا لگتا ہے کسی کے ساتھ نہیں۔"

55 "اپنے لباس میں کن دو باتوں کا خیال رکھتے ہیں؟"

☆ "کسی بھی چیز کا خیال نہیں رکھتا۔ تھوڑا لاپروا ہوں، جینز اور ٹی شرٹ میں رہنا زیادہ اچھا لگتا ہے۔"

56 "کن دو افراد کے ساتھ بارش انجوائے کرتے ہیں؟"

☆ "ہلکی ہلکی ہوا اور ڈرائیو پہ ہوں۔ ساتھ بیگم ہو یا دوست ہوں اچھی خاتون دوست ہو تب بھی اچھا لگے گا۔"

57 "کن دو کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"

☆ "ڈر تو نہیں لگتا بس کراہیت آتی ہے۔"

58 "دو ریسٹورنٹ جہاں کھانا کھانا پسند کرتے ہیں؟"

☆ "میں تو ریسٹورنٹ میں کم ہی کھانا کھاتا ہوں۔ کبھی دوستوں کے ساتھ چلا جاتا ہوں۔ جہاں دوست لے جائیں۔"

59 "اپنے ملک کے دو شاپنگ مال جہاں سے شاپنگ کرنا پسند کرتے ہیں؟"

☆ "زینب مارکیٹ، کھڈا مارکیٹ اور زمزمہ سے بھی کرتا ہوں جہاں کوئی چیز اچھی لگتی ہے خرید لیتا ہوں۔"

60 "دو چینل جو آپ شوق سے دیکھتے ہیں؟"

☆ "ڈرامہ چینل اور نیوز چینل۔"

61 "کھانے کی ٹیبل پہ کون سی دو چیزیں نہ ہوں تو کھانے کا مزا نہیں آتا؟"

☆ "کچھ بھی چل جاتا ہے۔ نہ ہو کچھ تب بھی صبر و شکر کر لیتا ہوں ایسا نہیں ہے کہ فلاں چیز نہیں ہے تو کھانا ہی نہیں کھانا۔ ایسا ہو تو زندگی بہت تنگ ہو جاتی ہے۔"

62 "دو چیزیں جو آپ کے والٹ میں لازمی ہوتی ہیں؟"

☆ "اللہ کا نام رکھا ہوا ہے اور تھوڑے سے پیسے کہ اگر راستے میں کوئی ڈاکو روک لے تو اس کو دینے کے کام آئیں۔ یہ جان کا صدقہ ہوتے ہیں۔"

63 "کن دو شخصیات کو اغوا کرنا چاہیں گے اور تعاون میں کیا وصول کریں گے؟"

☆ "نہیں مجھے کسی کو اغوا نہیں کرنا میں اپنی لائف میں خوش ہوں۔ مجھے کسی چیز کا کوئی لالچ نہیں ہے۔"

☆ ☆

اسماء توحید

شاہین رشید

صنفِ نازک جب مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہے تو نا صرف ان کے والدین کو اپنی بیٹی پر فخر ہوتا ہے بلکہ وہ خود پر بھی فخر محسوس کرتی ہیں کہ ہم کسی سے کم نہیں ہیں ۔۔۔ اسماء توحید اپنے والدین کی وہ قابلِ فخر بیٹی ہیں جنہوں نے نا صرف اعلا تعلیم حاصل کی بلکہ میڈیا سے متعلق ہر فیلڈ میں بہت نمایاں خدمات انجام دیں اور اب عنقریب آپ انہیں اسکرین پہ بھی دیکھیں گے۔ آواز کی دنیا میں ہم اسما توحید سے آپ کی ملاقات کروا رہے ہیں۔

★ ''کیسی ہیں اسماء ۔۔۔ کچھ اپنے بارے میں بتائیں۔''

✻ ''اللہ کا شکر ہے اور تعارف میرا یہ ہے کہ میرا پورا نام اسماء توحید ہے میرے والد ریٹائرڈ نیوی آفیسر ہیں۔ والدہ ہاؤس وائف ہیں۔ ہم تین بہنیں ایک بھائی ہیں جن کا اپنا بزنس ہے۔ پھر بہن ہیں اور پھر میں ہوں ہم اردو اسپیکنگ ہیں۔ والدہ کا تعلق شملہ سے ہے اور والد صاحب کا تعلق یوپی سے ہے 26 اگست کو میں کراچی میں پیدا ہوئی' میرا استارہ ورگو ہے ۔۔۔ اور ورگو کی تمام خصوصیات مجھ میں موجود ہیں۔''

★ ''گویا ستاروں سے دلچسپی ہے آپ کو؟''

✻ ''جی بالکل دلچسپی ہے ۔۔۔ مگر اتنی نہیں کہ روزانہ اخبار میں اپنے ستارے کو پڑھ کر اپنا دن گزاروں۔ مجھے پڑھنے کا بہت شوق ہے اور میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ انسان کی شخصیت پہ اس کے کیا اثرات ہوتے ہیں اور میں نے یہ مشاہدہ کیا ہے کہ واقعی انسان کی شخصیت پہ اس کے اثرات ہوتے ہیں کہ جس کا جو ستارہ ہوتا ہے اس سے اس کی شخصیت میچ کر رہی ہوتی ہے۔''

★ ''مگر سب اچھائیوں کو تو قبول کر لیتے ہیں مگر برائیوں کے لیے کہا جاتا ہے کہ یہ تو غلط لکھا ہے؟''

✻ ''میں اپنے بارے میں تو وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ برائیوں کو بھی میں قبول کرتی ہوں۔ ہم لوگوں پہ تنقید بہت زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ ہم لوگ بہت زیادہ صفائی پسند ہوتے ہیں۔ بہت چھوٹی چھوٹی چیزوں کو بھی محسوس کرتے ہیں۔ اور لوگوں کو بھی ویسا ہی دیکھنا چاہتے ہیں جیسے وہ خود ہوتے ہیں اور یہ بات غلط ہے۔ کچھ زیادہ ہی حساس بھی ہوتے ہیں۔''

★ ''اگست والوں کو غصہ بھی بہت آتا ہے۔ جن سے روٹھ جاتے ہیں ان سے دوستی بھی مشکل سے کرتے ہیں؟''

✻ ''بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ غصہ بہت آتا ہے۔ جذباتی بھی بہت ہوتے ہیں اور دل میں ہر بات کو رکھتے ہیں اور ویسے منافقت نہیں ہوتی ہم میں ۔۔۔ اور جب تک بات کلیئر نہ ہو جائے ہمارا دل صاف نہیں ہوتا ۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ برائیوں کو ختم کروں مگر غصہ قابو میں نہیں آتا۔ ویسے میرا غصہ اتر بھی جلدی جاتا ہے اور کینہ پرور ہم نہیں ہوتے۔''

★ ''تعلیمی میدان میں کیا کیا کیا آپ نے؟''

✻ ''منیجمنٹ میں ماسٹرز کیا۔ سائیکولوجی میں ماسٹرز کیا ہے اور انٹرنیشنل ریلیشن میں ماسٹرز کیا ہے۔''

★ ''اتنے سارے ماسٹرز کرنے کی کیا ضرورت تھی۔''

✻ ''مجھے پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ اور میری اپنی لائبریری ہے' میرے گھر میں کتابیں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ اخبارات کا مطالعہ روزانہ ضرور کرتی ہوں اور خواتین کی نفسیات کے بارے میں کتابوں کا مطالعہ بہت شوق سے کرتی ہوں اور باہر کے جو رائٹرز ہیں ان کی کتابوں کا خاص طور پر مطالعہ کرتی ہوں ۔۔۔ اور وہ کتابیں جن میں انسان کی شخصیت کو ڈسکس کیا ہوا ہوتا ہے وہ پڑھتی ہوں۔''

★ ''لکھنے کا بھی شوق ہے؟''

✻ ''جی ہاں ۔۔۔ بہت زیادہ افسانے لکھنے کا بہت شوق رہا اور لکھے بھی اور جب میں میٹرک میں تھی تو میں نے ریڈیو پاکستان سے نیوز پڑھیں بلکہ باقاعدہ پڑھنا شروع کر دی تھیں' ڈیبیٹر بھی رہی' بچوں کے رسالوں میں بہت لکھا' ریڈیو پاکستان کے لیے ڈرامے لکھے۔ بزم طلبہ کے پروگرام کیے ۔۔۔ ریڈیو پاکستان میں اناؤنسمنٹ کی' ڈرامے کیے۔ ریڈیو پاکستان میں کافی عرصہ رہی' پھر ایف ایم 107 کی منیجمنٹ نے مجھے بلایا اور تقریباً" آٹھ سال میں نے ایف ایم 107 پہ بحیثیت آر جے کے کام کیا۔ اس کے بحیثیت پروڈیوسر' ہوسٹ' نیوز کاسٹر' نیوز پروڈیوسر' رپورٹر اور اسکرپٹ رائٹر کے کام کیا۔ اردو ریڈیو پہ تقریباً" میں نے 24 گھنٹے کام کیا اور جتنے بھی اہم پروگرام ہوتے تھے وہ کیے ایک پروگرام ''مکمل گھر'' کے عنوان سے ہوتا تھا وہ میں نے تقریباً" چار سال کیا ۔۔۔ میگزین شو کیا زبیدہ طارق کے ساتھ اس پروگرام کی میں ہوسٹ تھی' انٹرویوز کے پروگرام بہت کیے۔ ٹیلی ویژن کے کمرشلز کی وائس اوور ہوں۔ جتنی بھی ایئرلائن ہیں ان کی ''آفیشل وائس'' میں ہوں اور ''پی ٹی سی ایل'' میں جو ریکارڈنگز ہوتی ہیں ان میں میری آواز ہے۔ مختلف کمرشلز کے لیے ''لپسنگ'' کرتی ہوں اور یہ جتنے بھی بڑے ''برانڈز'' ہوتے ہیں ان کی وائس اوور ہوں۔ کچھ چینلز کے لیے ٹیلی فلمز لکھی ہیں ٹی وی شوز کے اسکرپٹ لکھے ہیں اور آج کل ایک نجی ٹی وی چینل کے لیے اسکرپٹ سیکشن میں کام کر رہی ہوں۔''

★ "ماشاء اللہ آپ نے اتنا کچھ کیا کوئی شعبہ آپ سے نہیں بچا..... مجھے لگ رہا ہے کہ میں نے آپ کا انٹرویو کرنے میں بہت دیر کردی ہے؟"

✻ قہقہہ..... "یہی میں بھی سوچتی تھی اور آپ کے کیے ہوئے انٹرویوز میں نے بہت پڑھے ہیں..... اور میں تو خواتین' کرن' شعاع تو بہت شوق سے پڑھتی ہوں اور پڑھنے' لکھنے کا سلسلہ تو جاری رہتا ہی ہے اور مجھے یہ بات بہت اچھی لگتی ہے اور میں خواتین کو بہت پرموٹ کرتی ہوں جو اپنی تمام تر مصروفیات اور پرابلمز کے باوجود اتنے اچھے عہدوں پر کام کررہی ہیں۔"

★ "جو کام آپ نے کیے..... یہ وہ کام ہیں جن کے لیے میں کہوں گی کہ قدرتی صلاحیتیں تھیں..... لکھنے کی صلاحیت تھی' آواز اچھی تھی بولنے کی صلاحیت تھی۔ لیکن جو تین ماسٹرز آپ نے کیے وہ پریکٹیکل لائف میں کام آئے؟"

✻ "بہت زیادہ کام آئے..... اور ہر کوئی مجھ سے اس حوالے سے بات کرتا ہے۔ اگر میں ایجوکیشن لیڈر شپ کا موازنہ کروں تو جب تک ہمارے ہاں تعلیم کا فقدان ہے ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ ہمارے پاکستان میں اور دیگر ممالک کے لوگ تعلیم کے کس رتبے پہ ہیں اور ہم کہاں ہیں۔ ہمارے ہاں تعلیم کا کیا ریشو ہے۔ اس کے بارے میں میں نے ایجوکیشنز کے پروگرام میں شرکت کرکے فیکٹ بتائے۔ سائیکلوجی میں ایم اے کرکے یہ فائدہ ہوا کہ میں نے جب گرامر اسکولز میں پڑھایا اور یونیورسٹیز میں لیکچرز بھی دیے۔ تو مجھے بچوں کی اور بڑوں کی فیس ریڈنگ سے اندازہ ہوا کہ یہ بندہ کیسا ہے اور کہیں بھی کام کرنے جاتی ہوں تو مجھے اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ بندہ کس کرب سے گزر رہا ہے اور انسانوں کے کتنے روپ ہوتے ہیں اور آئی آر میں ایم اے کرنے سے یہ فائدہ ہوا کہ ہماری موجودہ سیاسی سچوئیشن کیا ہے۔ کیا سناریو ہے اور بین الاقوامی طور پر اس کو کس طرح دیکھا جاتا ہے۔"

★ "یہ بتائیں کہ کس طرح ریڈیو پہ گئیں؟ کس طرح آپ کے تعلقات بنے کہ آپ کو مواقع ملتے گئے آگے بڑھنے کے؟"

✻ "میں یہ بات ضرور کہنا چاہوں گی کہ تقریباً" سو لوگوں میں سے صرف پانچ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو بہت اچھے ہوتے ہیں۔ باقی لوگوں کے لیے میں بڑے افسوس کے ساتھ کہنا چاہوں گی کہ ہمارے یہاں جتنے بھی سینئرز ہیں ان میں سے زیادہ تر ایسے ہوتے ہیں جو کوشش کرتے ہیں کہ ان کی سیٹ بچی رہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم سے بہتر کوئی ینگ ٹیلنٹ آجائے اور ہم فارغ کردیے جائیں..... تو پھر وہ نئے ٹیلنٹ کو اتنا بھگاتے ہیں' اتنی تکلیف پہنچاتے ہیں کہ وہ بندہ یا بندی جس کو تین سال قبل وہ مقام مل جانا چاہیے تھا اس کو حاصل کرنے کے لیے اسے سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اس ساری جدوجہد میں آپ کو پوزیٹو رہنا ہے..... تو میرے آگے بڑھنے کی کہانی کچھ یوں ہے کہ اسکول کے زمانے سے ہی مجھے غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا شوق تھا۔ اسٹیج پہ جانا' تقریریں کرنا۔ قومی نغمے گانا..... وغیرہ۔ ایک دن ریڈیو پاکستان کے اسٹیشن ڈائریکٹر آئے انہوں نے مجھے اسٹیج پہ پرفارم کرتے دیکھا تو مجھے کہا کہ آپ ریڈیو آئیں اور بچوں کے پروگرام میں حصہ لیں۔ یوں ریڈیو میں میں بڑی آسانی سے آگئی۔ پھر کچھ وقفہ آیا اور جب کالج میں آئی تو بزم طلبہ کے پروگراموں میں حصہ لینے کا دل چاہا اور جب میں ریڈیو گئی تو وہاں مجھے اندر ہی نہیں جانے دیا جارہا تھا۔ میں نے تو وہاں پہ ایک طوفان مچادیا اور چیخنے چلانے لگی کہ ہمارا حق ہے اور میں اسٹوڈنٹ ہوں اور پہلے بھی کام کرچکی ہوں..... تو کہا گیا کہ اپنی درخواست جمع کرادیں ہم آڈیشن کے لیے بلالیں گے۔ میں نے کہا کہ ایسے کوئی آڈیشن کے لیے نہیں بلاتا کیونکہ تین چار مہینے پہلے میں درخواست دے چکی ہوں۔

میرا شو رشر اہا سن کر قمر علی عباسی جو کہ اسٹیشن ڈائریکٹر تھے [illegible] میں نے ساری [illegible] سنائی تو کہنے لگے کہ چلیں [illegible] دیں۔ [illegible] انہوں نے نا صرف مجھے شاباش دی بلکہ مجھے اپائنٹ بھی کرلیا۔ اس کے بعد پھر میں نے ریڈیو کے لیے بہت کام کیا۔ اسکول اور کالج سے فارغ ہونے کے بعد ہمارا دوسرا گھر ریڈیو پاکستان ہی ہوتا تھا تو بڑے بڑے فنکار' ڈائریکٹر' لکھاری وغیرہ ہوا کرتے تھے اور میں بڑی خاموشی کے ساتھ ان سب کو سنتی تھی اور مشاہدہ کرتی تھی۔ مرحوم قربان جیلانی صاحب نے مجھے اپنی بیٹی بنایا ہوا تھا۔ میں نے کچھ ہی عرصے کے بعد کوئز کا پروگرام کیا۔ ریڈیو کے ہی ——— سینئر لوگوں سے آواز کے اتار چڑھاؤ کو سیکھا ساتھ ساتھ یہ بھی احساس اجاگر ہوا کہ تعلیم بہت ضروری ہے سو تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔

ریڈیو میں بھی جس شعبے میں جانے کو دل چاہتا وہاں جاکر آڈیشن دے دیتی چونکہ لکھنے کا بہت شوق تھا تو اسکرپٹ لکھ کر پروگرام کرنے شروع کردیے..... پھر کچھ میگزین میں افسانے اور ناولٹ لکھے۔ ہیلتھ میگزین میں بحیثیت کنسلٹنٹ کے مشورے دینا شروع کیے۔ فری لانس دیگر میگزین میں فیشن پہ اور مختلف موضوعات پر لکھنا اور مشورے دینے کا کام شروع کردیا۔ 2001ء میں جب "دانا" آپریشن ہو رہے تھے تو آئی ایس پی آر نے مجھے بحیثیت ایگزیکٹو پروڈیوسر آئی ایس پی آر بنایا تھا اپنے پروگرام "ورلڈ کپ سولجر" کے لیے اور ہماری جو فوجی فیملیز تھیں جن کے جوان شہید ہوئے تھے ان کے لیے پروگرام کیے اور میں خود ہی رائٹر بھی تھی اور ہوسٹ بھی تھی اس میں فوجیوں کے خاندانی مسائل ہوتے ہیں ان پر اور جو فوجی جوان سرحدوں پہ ہوتے ہیں ان کے مسائل پہ پروگرام کرتی تھی اور چونکہ میرے والد نیوی آفیسر ہیں۔ میرے بہنوئی آرمی میں ہیں تو میرا فوجی ماحول تھا اور مجھے اس فیلڈ کے لوگوں سے محبت بھی بہت ہے میں نے بہت دل سے یہ پروگرام کیا اور اسے بہت زیادہ پسند بھی کیا گیا۔"

★ "ٹی وی کی طرف بھی تو آئیں آپ؟"

✻ "بالکل آئی جب ——— کچھ چینل لاؤنچ ہوئے تو میں لاؤنچنگ ٹیم میں شامل تھی اور کھانے کی جتنی بھی ترکیبیں ہوتی تھیں وہ میری آواز میں ہوتی تھیں۔ پی ٹی وی ورلڈ اور نجی ٹی وی کی ڈاکومنٹریز کی ہیں۔"

★ "سب کام آپ نے کیمرے کے پیچھے رہ کرکیے۔ کیمرے کے آگے آنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے کیا؟"

✻ "ان شاء اللہ بہت ممکن ہے کہ بہت جلد آپ مجھے اسکرین پہ بھی دیکھیں گی اور مجھے کافی لوگوں نے

اسکرین پہ آنے کے لیے کہا ہے۔ تو دیکھیں کیا ہوتا ہے۔"

★ "آپ کے گھر والوں کا آپ کے ساتھ کتنا تعاون رہا۔ عموماً" خاندان والوں اور دیگر لوگوں کو لڑکی کی یہ آزادی پسند نہیں ہوتی؟"

✻ "میں آج جس مقام پر ہوں صرف اور صرف اپنے والدین کی وجہ سے ہوں ہمارے خاندان میں کوئی بھی اس فیلڈ میں نہیں ہے۔ کوئی انجینئر ہے' کوئی ڈاکٹر ہے اور کچھ مختلف عہدوں پر ہیں۔ لیکن مجھے اس فیلڈ میں آنے کا شوق تھا اور میرے والدین نے ہر لمحے' ہر موقع پر میری رہنمائی کی۔ میرے والد میرے ساتھ آتے جاتے تھے اور جب میں چھوٹی تھی تو میری امی میرے ساتھ گھنٹوں میری ریکارڈنگ کے دوران باہر بیٹھی رہتی تھیں ..... اور آج بھی مجھے دروازے تک چھوڑنے آتی ہیں ڈھیروں دعائیں دیتی ہیں اور مجھ سے پوچھتی ہیں کہ آج میری بیٹی نے کون سا نیا کام کیا ہے ——— میرے والدین نے مجھ پر بھروسہ کیا خاندان والوں اور دیگر لوگ لڑکی کی اس آزادی کو پسند نہیں کرتے اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے آزادی کا کچھ زیادہ ہی فائدہ اٹھایا کہ میں پرنٹ اور الیکٹرونکس دونوں میڈیا میں ہوں۔ جب میں چھوٹی تھی تو امی نے کہا کہ تمہاری کوئی ایسی شکایت نہیں آنی چاہیے کہ ہمیں شرمندگی اٹھانی پڑے اور میرے ساتھ تو شروع سے میرے خاندان والے اور میرے پڑوسیوں کے لہجے میں یہی طنز چھپا ہوا ہوتا ہے کہ بیٹی کو بڑی آزادی دی ہوئی ہے۔ اور بیٹی جو بھی کرنا چاہ رہی ہے آپ کرنے دے رہی ہیں۔"

★ "کون کون سے ایف ایم سے کام کیا آپ نے اور اب ایف ایم 107 کو کیوں چھوڑا آپ نے؟"

✻ "ایف ایم 107 کو اس لیے خیرباد کہہ دیا ہے کہ اب میری ٹیلی ویژن کی مصروفیات بہت بڑھ گئی ہیں۔ ریڈیو پاکستان سے شروعات کی پھر ایف ایم 101 اور پھر 107 سے کیا۔"

★ "شادی کیوں نہیں کی آپ نے؟"

✻ "کیوں نہیں کی؟ تو یہ اللہ کے اختیار میں ہے جب ہونی ہو گی ہو جائے گی اور میرا اسٹار جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ ورگو ہے اور ہم لوگ پرفیکشن کو پسند کرتے ہیں اور مجھے ناشائستہ گفتگو پسند نہیں ہے اور مجھے ہمیشہ یہ تلاش رہتی ہے کہ انسان بہت زیادہ خوب صورت نہ ہو لیکن وہ ڈیسنٹ ضرور ہو محبت کرنے والا اور خیال رکھنے والا ہو اور مجھے پتا ہو کہ یہ شخص ہر طرح سے نباہ کر سکتا ہے تو پھر انسان ہر قربانی دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔"

★ "اچھا..... اور اگر شادی کے بعد آپ کے میاں نے آپ کو گھر بٹھا دیا تو؟"

✻ قہقہہ "کافی لوگ مجھ سے یہ بات پوچھتے ہیں۔ تو میں یہ کہتی ہوں مینٹل انڈر اسٹینڈنگ سب کچھ ہوتی ہے۔ لڑائی جھگڑے سے آپ کچھ حاصل نہیں کر سکتے لیکن انڈر اسٹینڈنگ سے اپنی بات منوائی جا سکتی ہے۔"

★ "ان سارے کاموں میں گھر داری کا وقت مل جاتا ہے؟"

✻ "ہاں جی ... بالکل کیونکہ میری امی اس معاملے میں انتہائی سخت ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ لڑکیاں پڑھی لکھی ہوں اور پھر وہ تخریہ بتائیں کہ ہمیں چائے اور انڈا بنانا نہیں آتا تو یہ بہت بری بات ہوتی ہے ..... تو میں نے سب کچھ سیکھا ہوا ہے اور جس دن چھٹی ہوتی ہے تو کھانا بنانا میری ذمہ داری ہوتی ہے اور میٹھا بنانا مجھے بہت پسند ہے' کھانے بھی تقریباً" تمام ہی بنانے آتے ہیں کیونکہ امی کا ڈنڈا سر پر سوار ہوتا ہے۔"

★ "آپ نے ماشاء اللہ اتنا کام کیا ہے آپ تو کسی محفل میں بولتی ہوں گی تو لوگ پہچان لیتے ہوں گے کہ یہ اسماء توحید ہیں؟"

✻ "جی بالکل پہچان جاتے ہیں اور میں خود بھی اس

بات سے بہت حیران ہوتی ہوں کیونکہ میں کہیں بھی جاؤں خواہ امی کے ساتھ اسپتال جاؤں یا شاپنگ سینٹر میں جب بات کرتی ہوں تو لوگ فوراً" پہچان کر کہتے ہیں کہ آپ اسماء توحید ہیں۔ زیادہ تر ڈرائیونگ کے وقت لوگ ریڈیو سنتے ہیں لہٰذا ان کے کانوں میں ہماری آواز سمائی ہوتی ہے اور ایف ایم 107 میں مختلف فیلڈ کے لوگوں کو بلاتی تھی تو سب سے میری پی آر بھی بہت اچھی ہو گئی ہے۔"

★ "ایوارڈز بھی ملے آپ کو؟"

✻ "2010ء میں شوبز ہنگامہ کی طرف سے بہترین "آر جے" کا ایوارڈ مل چکا ہے اور ہر طرف سے جب تعریفی کلمات سننے کو ملتے ہیں تو وہ میرے لیے کسی ایوارڈ سے کم نہیں ہے۔"

★ "آپ کے سننے والوں میں کس عمر کے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے؟"

✻ "ہر عمر کے لوگ میرا پروگرام بہت شوق سے سنتے ہیں اور آپ یقین کریں کہ چھوٹی عمر کے بچے بھی مجھے کال کرتے ہیں۔ بزرگ بھی نوجوان بھی اور جب میں پروگرام "صبح کا ہم سفر" کیا کرتی تھی تو اسکول کے بچے مجھے کالز کرتے تھے کہ ہماری وین میں ریڈیو لگا ہوتا ہے اور اسکول جاتے ہوئے ہم آپ کا پروگرام سنتے ہیں ..... ٹین ایجر بڑے پیار سے فون کرتے ہیں ویلنٹائن ڈے کے پروگراموں کو بہت پسند کیا گیا اور مجھے لوگوں نے "رومانٹک وائس" کا خطاب بھی دیا ہوا ہے اور چونکہ میں خود بھی بہت رومانٹک ہوں تو اس قسم کے شوز کرنے میں مجھے بہت مزا آتا ہے۔ محبت کا عنصر میری زندگی میں ہمیشہ سے رہا ہے اور یہ محبت خواہ اللہ سے ہو ماں باپ سے ہو یا وطن سے ہو' مجھے اپنے پاکستان سے بہت محبت ہے "آئی لو یو پاکستان" اور یہ جملہ میں ہمیشہ اپنے پروگرام میں ضرور کہتی ہوں۔ مجھے انکل ٹائپ کے لوگ بھی بہت کالز کرتے ہیں۔ میں "سدا بہار" کے نام سے اتوار کے دن پروگرام کرتی تھی اور اس میں میں 50ء' 60ء' 80ء کے گانے چلاتی تھی اور میرے سینئر سننے والے مجھے بہت دعائیں دیتے تھے۔"

اور اس جواب کے ساتھ ہی ہم نے اسماء توحید سے اجازت لی۔

☼ ☼

رابعہ رزاق

ادارہ

○ "تاریخ پیدائش / ستارہ؟"
☆ "اٹھارہ مارچ / حوت Pisces۔"
○ "خدا سے تعلق؟"
☆ "سب سے قریبی اپنائیت بھرا / جب دل کرتا ہے پکار لیتی ہوں۔"
○ "فرصت کا وقت گزارنے کا پسندیدہ طریقہ؟"
☆ "اول تو فرصت ملتی نہیں / ملے تو سارا وقت بچوں کے نام۔"
○ "کون سی چیز خوش گوار تاثر قائم کرتی ہے؟"
☆ "موسم کی تبدیلی / اچھے وقت کی یاد / صاف ستھرا گھر۔"
○ "وہ چیز جو موڈ خراب کر دے؟"
☆ "بے ترتیبی۔۔۔ بے ہنگم ٹریفک۔"
○ "مشکل ترین لمحہ؟"
☆ "ہر وہ لمحہ جب زندگی کا زیاں ہوتے دیکھا۔"
○ "بہترین تعریف جو وصول کی؟"
☆ "ایک لمبی فہرست ہے تعریفوں کی۔۔۔ لیکن آج کل مجھے اپنے بیٹے کے الفاظ نئی زندگی دے دیتے ہیں۔ "میری مما بہت اچھی ہیں۔ میری مما کا ڈرامہ بہت اچھا ہے۔"
○ "وقت ضائع کرنے کا بہترین طریقہ؟"
☆ "سونا اور ٹی وی دیکھنا (میں اکثر یہ دونوں کام کر کے پچھتاتی ہوں)"
○ "زندگی کا خوفناک واقعہ؟"
☆ "کشمیر میں پانچ اکتوبر کا زلزلہ اور اس کے بعد کی بے سروسامانی اب بھی میرے اندر خوف کی لہر دوڑا دیتی ہے۔"

○ "بہترین تحفہ میری نظر میں؟"
☆ "وہ قیمتی وقت 'جو اس مصروف دور میں اگر کسی کو میرے لیے میسر ہو جائے تو میں اسے قیمتی تحفہ ہی سمجھوں گی۔"
○ "ایسی تاریخی شخصیت جس سے ملنا چاہوں؟"
☆ "میں تاریخ کی شیدائی ہوں۔۔۔ میرا دل کرتا ہے۔۔۔ وقت جب خلفاء راشدین کے دور میں لے جائے' وقت مجھے خالد بن ولید اور محمد بن قاسم جیسے تاریخ کا دھارا بدلنے والے لوگوں سے ملوا دے۔"
○ "پسندیدہ ساتھی؟"
☆ "میرا قلم۔"
○ پسندیدہ ہستی؟
☆ "وہ جسے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا پسندیدہ چنا۔۔۔ حضرت علیؓ۔"
○ "پسندیدہ پروفیشن؟"
☆ "میرا اپنا پروفیشن جرنلزم۔"
○ "بہترین کاوش؟"
☆ "ابھی تو سفر کا آغاز ہے۔"
○ "پسندیدہ ملکیت؟"
☆ "میری اپنی اولاد۔"
○ "زندگی کی خواہش؟"
☆ "اب ایک ہی خواہش 'میرے بچے خوشحال اور پرامن پاکستان میں پرمسرت زندگی گزاریں۔"
○ "پریشان کن لمحہ؟"
☆ "جب کسی ماں کو اولاد کے لیے تڑپتے دیکھتی ہوں۔"
○ "جب موڈ آف ہو تو کیا کرتی ہوں؟"

☆ "ٹی وی لگا کر بیٹھ جاتی ہوں۔"
○ "کوئی ایسا فرد جس کے سامنے کھڑی نہ رہ سکوں؟"
☆ "ایسا کوئی نہیں۔"
○ "فیشن کب مسئلہ بنتا ہے؟"
☆ "فیشن کے نام پر ہونے والی فحاشی مسئلہ بنتی ہے۔"
○ "انسان کا دل کب ٹوٹتا ہے؟"
☆ "کسی بہت اپنے کی بے اعتنائی اور نظر انداز کرنا دل توڑتا ہے۔"
○ "کیا چیز جذباتی کر دیتی ہے؟"
☆ "کسی بھی بیٹی کی رخصتی کا لمحہ۔"
○ "زندگی کا یادگار دن؟"
☆ "ہر وہ دن یادگار ہے جب زندگی کی کتاب کے خالی صفحے پر کسی خواہش کی تکمیل نے تحریر کا روپ دھارا۔"
○ "موسیقی میرے نزدیک؟"
☆ "تھکاوٹ کا احساس ختم کر دیتی ہے۔"
○ "پسندیدہ گانا؟"
☆ "بے شمار اور پسند بدلتی بھی رہتی ہے۔"
○ "پسندیدہ فقرہ؟"
☆ "پیار دوستی ہے۔"
○ "پسندیدہ کردار؟"
☆ "گزارش فلم میں رینتھک روشن کا کردار۔"
○ "سب سے زیادہ عزیز اور قیمتی اثاثہ؟"
☆ "میرا کنبہ 'میرے بچے۔"
○ "اچھا اور خوب صورت موسم؟"

☆ "یاد کا موسم۔"
○ "پہلی کاوش شائع ہونے پر تاثرات؟"
☆ "کامیابی اور اپنے ہونے کی شناخت مسرور کر گئی تھی۔"
○ "زندگی بہت مہربان ہے۔ ابھی اس نے مجھے دن اور رات کا شمار رکھنے کی آزمائش میں نہیں ڈالا۔ ہر دن خوب صورت اور ہر رات پرسکون ہے۔"
○ "حسد محسوس کرتی ہیں؟"
☆ "میں بالکل بھی حسد نہیں کرتی۔"
○ "خوشبو پسند ہے تو کیوں؟"
☆ "خوشبو تازگی کا احساس جگاتی ہے۔ شخصیت کی پہچان ہوتی ہے۔"
○ "آخری کتاب جو پڑھی؟"
☆ "آج کل زاہدہ حنا کی "راہ میں اجل ہے" پڑھ رہی ہوں۔"
○ "پسندیدہ جگہ؟"
☆ "اپنے بچوں کے ساتھ ان کی پسندیدہ جگہ یا پھر اپنے گھر کشمیر۔"
○ "میری قوت ارادی؟"
☆ "میری قوت ارادی کمزور نہیں پڑتی۔"
○ "گھر کا پسندیدہ کمرا؟"
☆ "وہ کمرا جہاں دھوپ اور روشنی کا بھرپور امتزاج نظر آئے۔"
○ "پسندیدہ مصنف؟"
☆ "مصنفین کی فہرست میں نام آگے پیچھے ہوتے رہتے ہیں مستنصر حسین تارڑ، امرتا پریتم کا نام پہلے آتا ہے۔"
○ "پسندیدہ شاعر؟"
☆ "فیض احمد فیض، احمد فراز، امجد اسلام امجد، ناصر کاظمی۔"
○ "ویران سنسان جزیرے پر سب سے پہلا کام کیا کریں گی؟"
☆ "کسی ذی روح کو تلاش کروں گی۔"
○ "کھانے کی پسندیدہ جگہ؟"
☆ "دوستوں کے ساتھ کسی ڈھابے اور چارپائی ہوٹل پر بھی جانے کا موقع مل جائے تو وہی پسندیدہ جگہ ہے۔"
○ "اگر میں مصنفہ نہ ہوتی؟"
☆ "کیا میں واقعی مصنفہ ہوں (دلی ابھی دور ہے)۔"
○ "ایک لفظ جو مجھے واضح کرے؟"
☆ "پرسکون۔"
○ "جنس مخالف کے بارے میں رائے؟"
☆ "احساس برتری سے مالا مال (مجبور مخلوق)۔"
○ "محبت کے بارے میں خیال؟"
☆ "محبت اپنے ہر روپ میں انسان کی سب سے بڑی ڈھارس اور حوصلہ ہے۔"
○ "پسندیدہ رشتہ؟"
☆ "ماں کا اولاد سے۔"
○ "اگر محبت کی تو کیا نتائج نکلیں گے؟"
☆ "میرے لیے محبت ریت کی صورت۔"
○ "چہرے کچھ بتاتے ہیں؟"
☆ "چہرے کبھی کچھ نہیں بتاتے۔ جو لوگ یہ دعوا کرتے ہیں وہ خود بھی فریب میں ہی رہتے ہیں۔"
○ "شاعری کے بارے میں خیال؟"
☆ "احساسات کی ترتیب اور لفظوں کے نظم و ضبط کا نام شاعری ہے۔"
○ "بہترین کامیابی؟"
☆ "مجھے کامیابی اسی وقت بہترین لگی جس نے میرے ماں اور باپ کو خوشی دی۔"
○ "وہم کا ازالہ کس طرح کرتی ہیں؟"
☆ "میں بالکل بھی وہمی نہیں ہوں۔"
○ "سائنس کی بہترین ایجاد؟"
"سائنس کی بہترین ایجاد برق، بجلی، روشنی۔"

☆ ☆

بول کہ لب آزاد ہیں

ریحانہ امجد بخاری

ارم آفتاب..... کراچی

خوبصورتی انسان کو اندر تک ترو تازہ کر دیتی ہے..... یہ بات صرف سنی تھی مگر جب اس خوبصورتی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو یوں محسوس ہوا گویا روح تک سرشار ہو گئی ہے۔ حسین منظر نگاہوں کو خیرہ کرنے کے لیے چلے آ رہے ہیں..... شاید ہی کبھی ایسا منظر نظروں کے آگے سے گزرا ہو..... آنکھیں تو پتلی کی پتلی رہ گئیں۔ [illegible] پہلے بھی ایسا [illegible] نہیں تھا۔

آسمان پر ہلکی ہلکی دھند سی چھائی تھی گو کہ فضاء حبس آلود تھی جو بارش کا پیغام دے رہی تھی پھر بھی موسم بھلا ہی لگ رہا تھا۔ دور تک چمکتی شفاف سڑک کسی ناگن کی طرح بل کھاتی جا رہی تھی سڑک کے دونوں اطراف بڑے بڑے گھنے درخت اس موسم میں مزید نکھر گئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سرمستی کے عالم میں اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ اور ہم! ایک آرام دہ بس کی، آرام دہ سیٹ پر انتہائی آرام سے براجمان اس منظر سے آنکھوں کو خیرہ کرنے میں مصروف تھے۔

قانون کی ایسی پاسداری کی یہ مثال شاید ہی تاریخ میں کبھی ملی ہو۔

گاڑیاں ایک ہی رو میں بڑے ہی اطمینان سے گزر رہی تھیں۔ نہ ہارن کا شور، نہ لوگوں کی جھجک، نہ کنڈیکٹر کی بدتمیزیاں، نہ دھکم پیل اور نہ ہی دھواں اگلتی گاڑیاں.....

"واہ صاحب..... کیا نظارہ ہے۔" دل جھوم سا گیا، آنکھیں خوشی سے چھلک ہی تو پڑی تھیں۔ دفعتاً" زور کا جھٹکا لگا۔

"کیا ہوا..... کیا بس نے بریک ماری، نہیں نہیں بس تو خراماں خراماں محوِ سفر ہے۔" دوبارہ جھٹکا محسوس ہوا۔ ابھی ہم سوچ ہی رہے تھے اور سمجھنے کی کوشش ہی کر رہے تھے کہ جھٹکے تسلسل سے لگنے لگے، یوں محسوس ہوا کسی نے جھنجوڑ کر رکھ دیا ہو۔

"ہیں..... یہ کیا؟" ہماری آنکھ کھل گئی۔ ہم تو اپنے بستر میں تھے۔

"تو کیا یہ سپنا تھا۔" افسوس ہوا، ایسا خواب کیا کبھی شرمندہ تعبیر ہو سکے گا۔ ابھی بستر پر پڑے کف افسوس ہی مل رہے تھے کہ اماں کی گرج دار آواز نے زیادہ افسردہ نہ ہونے دیا اور فوراً" اچھل کر باتھ روم میں گھس گئے۔ جلدی جلدی تیار ہونے چل دیے۔ (کہاں کے لیے)

تو جناب بدولت طفل مکتب ہیں آج کل کراچی یونیورسٹی کو رونق بخشی ہوئی ہے۔ ناشتے کے نام پر گرم گرم چائے حلق میں انڈیلی اور بھاگم بھاگ بس اسٹاپ کا رخ کیا۔

ٹریفک کا وہ ہی پرانا نظام دیکھ کر حلق تک کڑوا ہو گیا اور خواب پوری جزئیات کے ساتھ ذہن میں اجاگر ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر یہ وقت منہ بسورنے کا نہیں تھا۔ فوراً" خواب کو پیچھے دھکیلا اور سر پر کفن باندھ کر بس میں چڑھنے کی سعی کرنے لگے۔

بھئی آپ تمام لوگوں نے یقیناً" بس کا سفر تو ضرور کیا ہو گا۔ تو بخوبی اندازہ ہو گا کہ بس میں سوار ہونا کتنے جان جوکھم کا کام ہے۔ تو جناب! پہلے تو اپنی مطلوبہ بس کے انتظار میں کھڑے کھڑے پیر سن ہو گئے۔ گھر سے جو نک سک سے تیار ہو کر نکلے تھے، امپریشن ہی پڑے

گا۔(بھئی لڑکیوں پر) ——— ختم ہو چکا تھا۔

اچانک ذہن میں ایک خیال کودا' میرا مطلب کوندا۔۔۔ لفٹ۔ کیوں نہ کسی سے لفٹ لے لی جائے۔ پر ہزار کوشش کے باوجود کوئی گاڑی رک کر نہ دی۔ کیا کریں صاحب! آج کل کسی کو کسی پر بھروسہ جو نہیں۔ بھلا بتاؤ اتنے ہینڈسم بندے (ہینڈسم سرا سراپنے لیے استعمال کیا ہے) کو چور اچکا سمجھ لیا ہے۔ بے حسی سی بے حسی ہے۔ دل میں ہزار صلواتیں گاڑی والوں کو سنائیں اور دوبارہ بس کی راہ میں پلکیں بچھا دیں۔ اللہ۔۔۔ اللہ کر کے مطلوبہ بس آئی۔ مگر یہ کیا یہ بس کم بکرا منڈی کا منظر زیادہ پیش کر رہی تھی' جس میں مسافروں کو جانوروں کی طرح ٹھونسا گیا تھا۔ مگر ہم اس بس کو مس کرنے کے متحمل ہرگز نہیں ہو سکتے تھے۔ لہٰذا بے خطر ہو کر انسانوں کی اس منڈی میں کود پڑے۔ بے ساختہ ذہن میں اقبال کا مصرعہ گونجا۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق

آخری پائیدان پر ہمیں بھی پیر دھرنے کو جگہ مل ہی گئی۔ ورنہ یہاں تو واقعتا" تل دھرنے کو بھی جگہ نہ تھی۔ خیر ہم نے بنالی۔ (صلاحیتیں ہی خداداد ہیں) خیر اللہ اللہ کر کے بس محو سفر ہوئی' ابھی ہم سنبھلے ہی تھے زوردار جھٹکا لگا اور ہم سنبھلتے سنبھلتے پھر سے ڈگمگا گئے۔ (خدارا ڈگمگانے سے کوئی اور مطلب ہرگز اخذ نہ کیجیے گا)

اسپیڈ بریکر تھا شاید' مگر اس جھٹکے میں ہمارا سر ہینڈل سے ضرور ٹکرا گیا۔ (لمبے قد کا ایک اور نقصان۔۔۔ باقی نقصانات کے بارے میں پھر کبھی مفصل بتائیں گے) جس سے لوگوں کو لٹکایا گیا تھا۔ (ہمیں تو یوں ہی محسوس ہوتا ہے) خیر سنبھل کر ذرا ادھر ادھر نگاہ کی تو سامنے لکھے شعر نما چیز پر نظر ٹھہر گئی۔

جس سے پیار کیا وہ اٹلی چلی گئی
جس کو دل دیا وہ دلی چلی گئی

دل نے کہا چلو خودکشی کرلیں
سوئچ میں ہاتھ ڈالا بجلی چلی گئی

"لاحول ولا قوۃ۔۔۔" (اب اس شعر پر سبحان اللہ تو کہنے سے رہے' گویا کہ اس شعر میں واپڈا کی نااہلی کو پوری فصاحت و بلاغت کے ساتھ بیان کیا ہے۔) پھر بھی ہماری ادبی حس بری طرح مجروح ہوئی اور تن من سلگ کر رہ گیا۔

"کرایہ۔" ابھی اسی غم میں بلبلا رہے تھے کہ کنڈیکٹر کی پاٹ دار آواز سماعتوں سے ٹکرائی۔ ڈنڈے کا سہارا لیتے ہوئے گویا ہانگ کرتے ہوئے کرایہ نکالنے کی تگ و دو ہی کر رہے تھے۔ ایک جھٹکے سے بس رکی اور ہم خود کو سنبھالتے سنبھالتے سامنے کھڑے بڑے میاں کے اوپر پورے کے پورے گر گئے۔

"ارے میاں سنبھل کے۔" اس افتاد پر ہم سمیت وہ صاحب بھی بوکھلا گئے۔

"چل۔۔۔ جلدی اترو' استاد ڈبل اے' استاد۔" ابھی مسافر اترنے بھی نہیں پایا تھا کہ بس چل پڑی اور مسافر صلواتیں سناتا اپنی راہ ہوا۔ کچھ لوگوں کے اترنے سے تھوڑی جگہ میسر آئی اور سانس جانے کہاں اٹکی ہوئی تھی' بحال ہوتی محسوس ہوئی۔

"اف اللہ میرا پیر۔" ایک نسوانی سی چیخ سماعتوں سے ٹکرائی' تمام حسیں بیدار ہو گئیں۔

"آرام سے دیکھ نہیں سکتیں۔" ہم نے فورا" دیدے لیڈیز کمپارٹمنٹ کی طرف کیے' جانے کس دوشیزہ کی آواز تھی اور کون ماہ جبیں کس پری وش کے پیر پر چڑھی۔ کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ کسی چہرے کا دیدار جو نہ ہو سکا۔ اسٹاپ سے ایک نوجوان ہمارے برابر آکر بیٹھا۔ شاید کہ کوئی غیر ملکی اسٹوڈنٹ تھا۔ (اس ڈیزائن کے بہت سارے یونیورسٹی کو رونق بخشنے دیار غیر سے ہمارے ملک آتے رہتے ہیں)

"سر کرایہ۔" حیرت کا پہاڑ ٹوٹا۔ کس کی آواز ہے یہ۔

"کہاں جانا ہے سر؟" آنکھیں اب تک پھیل کر مزید بڑی ہو گئی ہوں گی۔ (یقین کامل تھا)

"جامعہ کراچی۔" اس غیر ملکی نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں جواب دیا۔

"بقایا پیسے سر۔" کنڈیکٹر کو کیا ہوا' اتنی تہذیب' ہونٹ خود بخود مسکرا اٹھے۔

واقعی یہ ہماری تہذیب ہی تو ہے' ہماری اسلامی تعلیمات کہ مہمانوں کے ساتھ عزت سے پیش آؤ۔۔۔ بھلے ہم کتنی ہی پریشانیوں میں گھرے لوگ ہیں' افراتفری' بدامنی' لوٹ مار اتار کی زندگی کا حصہ بن کر رہ گئی ہیں۔ لوگ نفسیاتی مریض بنتے جا رہے ہیں۔ کوئی کسی سے سیدھے منہ بات تک کرنا پسند نہیں کرتا۔ مگر ان سب کے باوجود ہم میں اتنی تہذیب اب بھی باقی ہے کہ یہ مہمان جب یہاں سے اپنے ملک جائے گا تو کم از کم اس مہمان نوازی کو ضرور یاد رکھے گا۔ بہت ارادہ نہیں' ایک ادنیٰ سی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔ [illegible] تمام تر [illegible] جو سر پر [illegible] کم ہو گئیں اور میں اس تبدیلی پر مسکرا دیا۔ گویا امید ابھی باقی ہے' ان چراغوں میں اب بھی روشنی ہے' جو اندھیروں کا تدارک کرنا جانتے ہیں' میں باہر دیکھنے لگا' مسکراہٹ ہونٹوں پر پھیلتی چلی گئی' گویا اب بھی امید کی جا سکتی ہے کہ روشن کریں ہمارا مقدر بنیں گی اور نیا سال مثبت تبدیلیوں کا سال ہو گا۔ سال نو مبارک۔۔۔ امید کے چراغوں کے ساتھ۔

تسنیم چوہدری۔۔۔ آکسفورڈ یو کے

سب سے پہلے تو میں ریحانہ جی! آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ آپ نے ایک بہت اچھا سلسلہ شروع کیا ہے۔ جس میں آزادی کے ساتھ ہر مسئلے کو بیان کیا جا سکتا ہے۔ سب ہی اس سلسلے کے ذریعے اپنی اپنی رائے سے آگاہ کرتے ہیں۔

دیکھا جائے تو ہم سب کے لیے سب سے اہم اور ضروری پاکستان اور اس کے حالات ہیں آخر یہ سب کیا ہے؟ کون ذمہ دار ہے ان حالات کا؟ کیوں چیونٹی سے بدتر ہو کر معصوم لوگ مارے جا رہے ہیں؟ کیوں مہنگائی اتنی بڑھ گئی ہے؟ اور کون آئے گا ان حالات اور مسئلوں کو ٹھیک کرنے' کون ان سب کے خلاف پہلی آواز اٹھائے گا؟ کیا ان سب حالات کے ذمہ دار ہمارے چور لیڈر ہیں یا پھر ہماری سوئی ہوئی عوام۔ آخر کب یہ عوام بیدار ہو گی' کون اس سوئی ہوئی عوام کو جھنجھوڑے گا' ہر بندہ اپنے گھر تک ہو کر رہ گیا ہے' کسی کو کوئی خبر ہی نہیں کہ پاکستان تباہی کے کس دہانے پر کھڑا ہے۔ ہم تو باہر کے ملکوں کی تہذیب۔۔۔ (جو راہ روی کا شکار ہے) اپنانے میں پہل کرتے ہیں۔ اور اس پر فخر بھی کرتے ہیں مگر ہمیشہ منفی چیزوں کی طرف ہی ہمارا رجحان کیوں ہوتا ہے؟

مگر ان کے رولز' ان کی ایمانداری' ان کا سسٹم اور سچائی یہ سب تو ہمارے مذہب ہمارے اسلام میں ہے جو یورپی ممالک نے اپنائی ہوئی ہیں' کم از کم اپنے پڑوسی ملک کو ہی دیکھ لیں۔ جس کے بے حیا چینل سب سے زیادہ پاکستان کے گھروں میں چلتے ہیں' ہم ہر بے حیائی' فحاشی کو اپنا چکے ہیں' اس ملک کے لیڈر اپنی عوام کے ساتھ کتنے مخلص ہیں تو پھر ہمارے لیڈر کیوں غریبوں کا خون چوس رہے ہیں؟ کیوں بے گناہ ماؤں' بہنوں کے بیٹے' بھائی ان سے جدا کیے جا رہے ہیں اب وقت آگیا ہے ملک کے لیے کچھ کرنے کا اب تو اپنے گھروں سے نکلو اب تو ظلم کے خلاف آواز اٹھاؤ' بہت ہو گیا' بہت کھا لیا ان چور اور جھوٹے لیڈروں نے پاکستان کو۔ بہت بہادر اور سمجھ دار ہیں پاکستانی عوام' ان سیاسی لیڈروں نے عوام کو بے بس اور کمزور سمجھ لیا ہے۔ اپنے حق کے لیے اپنے پاکستان کے لیے آواز بلند کرو' رب العزت سدا پاکستان کو قائم و دائم رکھے آمین۔

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کردیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زر'' کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے بادا اتیاز مل جاتا ہے' جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۱۹

اُنیسویں قسط

"کیا۔۔۔؟ ہم واپس جارہے ہیں؟" علیزے نے آذر کے منہ سے واپسی کا سن کر کافی بے یقین اور ترسے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ وہ تو جب سے آئی تھی تب سے ہی واپس جانا چاہ رہی تھی' لیکن ان سب کی خاطر خاموش تھی کہ اس کی وجہ سے وہ سب خواہ مخواہ بدمزا ہوں گے' لیکن اس وقت اچانک واپسی کی خبر سن کر جیسے اس کے دل کی مراد بر آئی تھی۔

"ہوں۔۔۔ ہم واپس جارہے ہیں۔" آذر نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا۔

"لیکن بھائی! اتنی جلدی۔۔۔؟" واپسی کی اطلاع پہ سب سے پہلے اعتراض اور خفگی انوشہ کو ہوئی تھی' وہ سب اس وقت ڈرائنگ روم میں اپنی اپنی نشست سنبھالے بیٹھے تھے اور ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے سے اندر کھڑا آذر سب کی نظروں کا مرکز تھا اور سب کی نظریں سوالیہ تھیں۔

"آنی کی کال آئی تھی' ڈیڈ نے خود واپسی کا آرڈر دیا ہے کہ صبح تم سب کو حویلی میں موجود ہونا چاہیے اب یہ جلدی ہے یا دیر۔ یہ میں نہیں جانتا۔" آذر نے سب کو باری باری وضاحتیں اور جواب دینے کی بجائے صاف صاف بتا دیا کہ یہ آرڈر اوپر سے آیا ہے' اس لیے اس میں اعتراضات کی اور خفگی کی کوئی گنجائش نہیں ہے' اور پھر واقعی ایسا ہی ہوا تھا' وہاں موجود سب ہی افراد چپ ہو کے رہ گئے تھے' ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ان لوگوں میں کافی گپ شپ اور ہنسی مذاق ہو رہا تھا' مگر واپسی کا سن کر علیزے کے سوا سب بجھ سے گئے تھے۔

"کیا بات ہے؟ یہاں اتنی خاموشی کیوں ہے؟" عائشہ آفندی عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد وہیں ڈرائنگ روم میں چلی آئیں' لیکن ان سب کو خاموش دیکھ کر انہیں حیرت ہوئی تھی۔

"ہم لوگ صبح واپس جارہے ہیں' ڈیڈ نے واپسی کا کہا ہے۔" آذر نے ان کی سمت پلٹتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا۔۔۔؟ خیریت تو ہے نا؟" عائشہ آفندی کو تشویش ہوئی۔

"کیا اپنے گھر جانے کے لیے خیریت ہونا ضروری ہوتا ہے؟" آذر نے بے تاثر سے انداز میں پوچھا تھا عائشہ آفندی ٹھٹک سے رک گئیں۔

"نہیں بیٹا! یہ بات نہیں ہے میں تو پیچھے والوں کی خیریت معلوم کرنا چاہ رہی تھی' آج اچانک واپسی کا حکم دے دیا ہے تو کہیں کوئی مسئلہ تو نہیں ہے نا۔" انہوں نے وضاحت دی تھی۔ "نہیں کوئی مسئلہ نہیں آپ لوگ بس واپسی کی تیاری کریں' صبح صبح یہاں سے نکلنا ہوگا' اس لیے اپنے اپنے سامان کی پیکنگ ابھی سے کرلیں' تاکہ صبح ہم لوگ لیٹ نہ ہوں۔" وہ کھڑے کھڑے ان سب کو ہدایات دے کر واپس پلٹ گیا اور وہ سب بجھے بجھے سے انداز میں اٹھ کر اپنے اپنے کمرے کی سمت چل دیے سب نے کافی پھیلاوا سمیٹنا تھا۔

☼ ☼ ☼
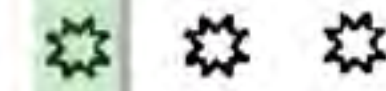
"ہیلو! گڈ مارننگ۔۔۔" وہ دروازے کے ہینڈل پہ ذرا سا دباؤ ڈالتی ہوئی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

"ہائے! سیم ٹو یو میڈی۔" جبزی اپنے روم میں بیٹھا ناشتا کر رہا تھا' جب مدحیہ اچانک اندر چلی آئی اور وہ اسے دیکھ کر فوراً" کھڑا ہو گیا۔

"اٹس او کے! بیٹھو ناشتا کرو تم۔۔۔" مدحیہ اسے اشارہ کرتی ہوئی خود کھڑکی کی سمت بڑھ گئی اور کھڑکی کے تمام پردے اک جھٹکے سے ہٹا دیے تھے چمکتے سنہرے دن کی روشنی لپک کے اندر داخل ہوئی اور پورا کمرہ کھل اٹھا۔

"کیسی لگی یہاں کی صبح۔۔۔؟" مدحیہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

"نائس' ویری نائس' اٹریکٹیو اینڈ فریش مارننگ' ایز لائیک یو۔" جبزی نے بھی جواباً" کھلے دل سے اظہار کیا۔ مدحیہ ایک دم کھلکھلا اٹھی۔

"غلط کہہ رہے ہو تم' میں تو مارننگ سے بھی زیادہ فریش اور اٹریکٹیو ہوں۔" مدحیہ کا موڈ آج کچھ فریش تھا' اسی لیے وہ اپنی فریش نیس کا اظہار بھی کافی فریش انداز میں کر رہی تھی۔

"ہوں' ایم ایگری ود یو۔" جبزی نے اس کی شوخی سے اتفاق کیا۔

"جو سچ ہے' جو حقیقت ہے' اس سے ایگری تو ہونا ہی پڑے گا نا؟" مدحیہ نے لاپروائی سے کندھے اچکائے تھے۔

"ہوں! یہ بھی ٹھیک ہے۔" جبزی ناشتا کرتے ہوئے مسکرایا' اور مدحیہ بھی ہنستی ہوئی پلٹ کر بیڈ پہ آ بیٹھی۔

"ارے! یہ کیا ہے؟" اس کی نظر بیڈ پہ بکھرے پھیلاوے کی سمت اب گئی تھی۔

"تمہارے لیے گفٹس ہیں۔" اس نے بھی لاپروائی سے جواب دیا۔

"میرے لیے گفٹس؟ کیا مطلب؟" اسے حیرت ہوئی تھی۔

"لیس! برائن' شیٹے' کرسٹینا اور باقی فرینڈز نے بھیجے ہیں۔" جبزی۔ ناشتا ختم کر کے نیپکن سے ہاتھ پونچھتا ہوا بولا۔

"ارے واؤ! تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔" مدحیہ کو حقیقتاً" بہت زیادہ خوشی ہوئی تھی کہ اس کے فرینڈز نے اسے گفٹس بھجوائے ہیں' وہ بھی اتنے شوق اور اتنی محبت سے۔

"تم پہلے مجھے ملی کب ہو؟" وہ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"کل ملی تو تھی؟" مدحیہ برائن کا بھیجا ہوا گفٹ الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔

"تو کیا آتے ہی بتا دیتا؟"

"ہاں! بتا دیتے' اس میں کیا حرج تھا بھلا؟" وہ گفٹ ریپر کھول چکی تھی' اس نے مدحیہ کے لیے بہت قیمتی پرفیوم بھیجا تھا' مدحیہ اس پرفیوم کی مہک سے مسحور ہو گئی تھی۔

"حرج تھا یار' کیونکہ کل میں ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔" جبزی اپنی پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے عین اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"کیا مطلب؟ کس لیے ذہنی طور پہ تیار نہیں ہو۔" مدحیہ نے چونک کر جبزی کی سمت دیکھا وہ ڈائریکٹ اسے ہی دیکھ رہا تھا اور اس کی لو دیتی آنکھیں بول رہی تھیں وہ سب سنا رہی تھیں' جو مدحیہ سننا نہیں چاہتی تھی۔ "اس گفٹ کے لیے' جس کے لیے تم بھی ذہنی طور پر تیار نہیں ہو۔" جبزی نے اپنی جیب سے چھوٹی سی سرخ رنگ کی مخملی سی ڈبیا نکال کر مدحیہ کے سامنے کی تھی اور مدحیہ اس سرخ رنگ کی ڈبیا کو دیکھ کر گنگ ہو گئی' بے شک وہ ڈبیا بند تھی' لیکن اس میں موجود گفٹ مدحیہ کے ذہن اور سوچ سے چھپا ہوا نہیں تھا' کیونکہ وہ گفٹ پوشیدہ ہو کر بھی پوشیدہ نہیں تھا۔

"جبزی! یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ کیا کہہ رہے ہو تم؟" مدحیہ کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا' وہ کیا بولے اور کیا نہ بولے؟

"میں جو کچھ کہہ رہا ہوں تم اچھی طرح سمجھ رہی ہو' لیکن دیکھو میڈی میری تم سے ایک ریکوئسٹ ہے کہ تم پلیز اس وقت اس گفٹ کو مت ٹھکرانا۔۔۔ ابھی میرے پاس بہت ٹائم ہے' تم مجھے سوچو' مجھے پرکھو' پھر جو فیصلہ کرو تو مجھے بتا دینا' ابھی یہ گفٹ تم اپنے پاس رکھو' اگر تم نے کبھی یہ گفٹ پہن لیا تو میں سمجھوں گا تم نے مجھے قبول کر لیا' اور اگر مجھے واپس کر دیا تو میں سمجھوں گا تم نے مجھے ٹھکرا دیا ہے' میں نہ تم سے سوال کروں گا' نہ جواب' ہمیشہ کے لیے سامنے سے ہٹ جاؤں گا' بس یہ میرا تم سے وعدہ ہے اور عہد بھی۔" جبزی نے جو کچھ کہا تھا اس پہ کسی اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی تھی۔ مدحیہ نے لب بھینچتے ہوئے اک نظر جبزی کو اور اک نظر اس کے ہاتھ کی سمت دیکھا اور پھر گہری سانس کھینچتے ہوئے وہ گفٹ تھام لیا اور جبزی کے چہرے پہ امید کے کئی رنگ آ ٹھہرے

تھے اور ہونٹوں کو مسکراہٹ چھو گئی تھی۔

"تھینک یو میڈی۔" وہ آہستگی سے بولا اور مدیحہ بیڈ سے کھڑی ہو گئی' اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"چلیں؟" جبزی نے خود ہی استفسار کیا۔

"ہوں! چلیں۔" وہ سرخ ڈبیا مٹھی میں دباتی ہوئی اٹھ کر باہر نکل آئی اور اپنی الجھن اور بے دھیانی میں باقی کے گفٹس بھی اٹھانا بھول گئی تھی' اس لیے وہ سارے گفٹس جبزی خود اٹھا کر اس کے پیچھے باہر نکل آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

مریم کی بات پہ پورے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

عابدہ خاتون نے یک دم فاروق نیازی کی سمت دیکھا اور وہ بھی بستر پہ لیٹے ان ہی کی سمت دیکھ رہے تھے' مریم اپنی بات کر چکی تھی' اس لیے اب ان کے بولنے کی منتظر تھی' عابدہ خاتون خود اس وقت حیرت اور بے یقینی کے شکنجے میں تھیں کہ مریم نے اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر لیا؟ وہ یہ قدم کیوں اٹھانا چاہتی ہے؟ آخر بیٹھے بیٹھے کیا ہوا ہے اسے؟ کیا سوچ سمائی ہے اس کے ذہن میں؟

"ابا جی! میں نے آپ دونوں سے اجازت مانگی ہے' آپ کو خاموش ہونے کا نہیں کہا۔" مریم نے پھر سے بات چھیڑ دی۔

"لیکن بیٹا! تم یہ جاب کیوں کرنا چاہتی ہو؟" فاروق نیازی کے اشارے پہ عابدہ خاتون نے استفسار کیا۔

اور ان کے استفسار پہ مریم نے سر اٹھا کر ان کے چہرے کی سمت دیکھا۔

"امی! آپ جانتی ہیں کہ میں یہ جاب کیوں کرنا چاہتی ہوں؟ بے شک خود میری کوئی خواہشیں' کوئی بہت زیادہ ضرورتیں نہیں ہیں' لیکن ایمن' ایمان' زونیہ اور زوبیہ کی تو ضرورتیں ہیں نا؟ کیونکہ وہ ابھی پڑھ رہی ہیں' نہیں اور کچھ نہ سہی' لیکن اسکول اور کالج کے لیے تو پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے' فیسز کے علاوہ بھی ہزاروں خرچے ہوتے ہیں اور یہ خرچے عدیل بھائی کیسے پورے کر رہے ہیں' یہ آپ لوگ بھی اچھی طرح جانتے ہیں' گھر کے اخراجات' اور ابا جی کی بیماری کا علاج بھی ٹھیک طریقے سے ہو جائے تو ہمارے لیے اللہ کا بڑا احسان ہوگا' لیکن ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنا بھی ٹھیک نہیں ہے' گھر میں اور کوئی ایسا فرد نہیں ہے جو عدیل بھائی کا ہاتھ بٹا سکے' کوئی بھائی نہیں ہے' جو برابر چل کے مدد کر سکے' ایسے میں اگر میں کچھ کر سکتی ہوں تو مجھے کرنا چاہیے' آپ مجھے روکیے مت' بلکہ خوشی خوشی اجازت دیجیے' میں وعدہ کرتی ہوں کہ عدیل بھائی کا بھائیوں کی طرح ساتھ دوں گی' آپ پلیز! میرے بارے میں نہیں' عدیل بھائی کے بارے میں سوچیں' وہ کتنے پریشان رہتے ہیں' کتنا بوجھ ہے ان پہ' پلیز ابا جی! آپ گھر کے حالات بخوبی جانتے ہیں' مجھے اجازت دینے سے بہت بہتری آجائے گی۔" مریم نے ان کا بے جان سا ہاتھ تھام لیا اور انہیں متفق کرنے کی پوری کوشش کی تھی' ان کی بے تاثر آنکھیں اس وقت آنسوؤں کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھیں۔

ان کی بیماری نے ان کے بچوں کو پریشانیوں اور تفکرات میں ڈال دیا تھا' وقت سے پہلے بڑا بنا دیا تھا' لڑکیاں جس عمر میں اپنی خواہشیں اور خواب پورے کرنے کا سوچتی ہیں' ان کی بیٹیاں گھر کے حالات اور ضرورتیں پوری کرنے کا سوچ رہی تھیں۔۔۔ ان کے آنسو بہہ کر ان کی کنپٹیوں میں جذب ہو گئے اور انہوں نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے مریم کو اجازت دے دی' کیونکہ مریم نے جو کچھ کہا تھا وہ سب صحیح تھا' سب کچھ ان کے سامنے ہی تو تھا۔

"لیکن عدیل نہیں مانے گا۔" عابدہ خاتون کو عدیل کی طرف سے ڈر تھا۔

"ان کو میں منا لوں گی۔" مریم اپنے آنسو پونچھتی ہوئی سیدھی ہوئی اور ابا جی کا ہاتھ دباتے ہوئے ان کے ہاتھ پہ

بوسہ دیا۔

"تھینک یو ابا۔" وہ ان کا شکریہ ادا کرتی وہاں سے اٹھ گئی' اس نے امی اور ابا جی کو تو منا لیا تھا' لیکن ابھی عدیل کا مسئلہ باقی تھا اور اگلی صبح ایسا ہی ہوا تھا عدیل کو مریم کے جاب کرنے کا سن کر جیسے کرنٹ چھو گیا تھا۔

"مریم جاب کرے گی؟ لیکن کیوں؟" عدیل نے ناشتا درمیان میں ہی چھوڑ دیا۔

"بیٹا! اچھی آفر ہے' اچھی سیلری ہے' اور مریم بھی تو پورا دن گھر میں فارغ اور ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھی رہتی ہے' اس لیے میں نے اور تمہارے ابا جی نے سوچا ہے کہ وہ جاب کر لے' کم از کم تمہاری ہی کچھ ہیلپ ہو جائے گی۔" عابدہ خاتون نے عدیل کو بہت طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی تھی' لیکن عدیل کا مزاج برہم ہو چکا تھا۔

"اب میں اپنی ہیلپ بہنوں سے کرواؤں گا۔"

"دیکھو بیٹا! بہن کوئی طعنہ نہیں ہے' جس پہ مرد کو غصہ آجائے' بہن پہ اعتماد کرو' اس پہ بھروسہ رکھو تو بھائیوں سے کم ثابت نہیں ہوتی' کئی ایسی مثالیں ہیں جن میں بہنوں نے بھائیوں کے ساتھ دیے ہیں' تمہیں کیوں اعتراض ہے۔" مریم کے کہنے پہ عابدہ خاتون پورا پورا اس کا ساتھ دے رہی تھیں۔

"امی! آپ کس زمانے کی اور کن مثالوں کی بات کر رہی ہیں؟ آپ آج کل کے معاشرے کو اور آج کل کے چال چلن کو نہیں جانتیں' یہاں مرد' عورت کو نگلنے کے لیے تیار کھڑا ہے' کوئی بہت ہی قسمت والی یا عزت والی عورت ہوگی' جو مرد کے شکنجے سے بچ نکلتی ہوگی' ورنہ عورت کو بکتے ہوئے کم ہی دیکھا ہے۔" عدیل سخت انکاری تھا۔

"کیا آپ کو اپنی بہن پہ اعتماد نہیں ہے؟" مریم کچن کی دہلیز پہ آکھڑی ہوئی اور اس کے سوال پہ عدیل چونک گیا۔

"بتائیے نا بھائی! کیا آپ کو اپنی بہن پر اعتماد نہیں ہے؟" وہ کافی دوٹوک اور سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

"مریم! میں یہ بات نہیں کر رہا' میرا یہ مطلب نہیں ہے۔"

"بھائی! میں آپ سے آپ کی بات کا مطلب نہیں پوچھ رہی' میں یہ پوچھ رہی ہوں کہ آپ کو مجھ پہ اعتماد ہے یا نہیں؟" وہ ضدی بچے کی طرح ایک ہی سوال پہ اڑ چکی تھی۔

"مریم! یہ کیسی بات کر رہی ہو تم؟" عدیل اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔

"آپ! بس میرے سوال کا جواب دیں' آپ کو مجھ پہ اعتماد ہے یا نہیں؟ اگر اعتماد ہے تو مجھے جاب کرنے دیں' اور اگر اعتماد نہیں ہے تو مجھے منع کر دیں' میں کبھی جاب کرنے کا ذکر بھی نہیں کروں گی' بلکہ کبھی گھر سے باہر قدم بھی نہیں نکالوں گی۔" مریم نے عدیل کے سامنے بہت کڑا سوال رکھ دیا تھا' وہ نہ ہاں میں جواب دے سکتا تھا اور نہ ہی نا میں' وہ تذبذب کا شکار ہو چکا تھا۔

"سوچ کیا رہے ہیں؟ جواب دیں مجھے؟" مریم نے کبھی اس طرح ضد میں آکر بات نہیں کی تھی' لیکن آج اس کے تیور بھی بدلے ہوئے تھے۔

"دیکھو مریم! مجھے تم پہ اعتماد ہے' خود سے بھی زیادہ اعتماد ہے' لیکن یہ معاشرہ اعتماد کے قابل نہیں ہے' میں تم پہ تو اعتماد کر سکتا ہوں لیکن اس معاشرے پہ نہیں کر سکتا۔" اس نے مریم کو کندھوں سے تھام لیا۔

"آپ کو مجھ پہ اعتماد ہے نا؟ تو پھر آپ بے فکر ہو جائیں' آپ کی عزت کو میں نے سنبھال کے رکھنا ہے' اس معاشرے نے نہیں۔" مریم نے اسے پورا یقین دلایا تھا اور یہ اس کا یقین اور لہجے کی مضبوطی تھی کہ عدیل اسے منع نہیں کر سکا اور مریم کی آنکھوں میں آنسو آگئے' وہ بے ساختہ اس کے کندھے سے لگ گئی اور عدیل نے اس کا سر تھپکتے ہوئے اسے بھائیوں سا بھرپور مان بخشا تھا' عابدہ خاتون کی آنکھیں بھی نم ہو چکی تھیں۔

"اب بس کرو' ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے' کام پر بھی جانا ہے تم نے۔" انہوں نے دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھتے

ہوئے انہیں آواز دی اور عدیل پلٹ کر دوبارہ ناشتا کرنے کے لیے آبیٹھا' پھر جیسے ہی عدیل گھر سے رخصت ہوا' مریم بھی فاطمہ کی بتائی ہوئی اکیڈمی جانے کے لیے تیار ہونے لگی' وہ آج پہلی بار جارہی تھی' اس لیے کافی اچھی طرح تیار ہوئی تھی' حالانکہ اس کی تیاری میں بھی سادگی کی جھلک تھی' لیکن پھر بھی بہت اچھی لگ رہی تھی' وہ امی اور ابا جی سے مل کر گھر سے نکل آئی' یہ اس کا گھر سے نکلنے والا پہلا قدم تھا' لیکن اس کے ارادے بہت مضبوط تھے' حوصلہ بلند اور نیت نیک تھی' اس لیے کامل یقین تھا کہ اللہ اس کا ساتھ بھی دے گا اور اس کی عزت کی حفاظت بھی کرے گا' کیونکہ سب کی عزتوں کا محافظ اور رکھوالا تو وہی تھا۔۔۔ اوپر والا۔۔۔!

☆ ☆ ☆

علیزے مری سے عجیب سے احساسات لے کر جارہی تھی۔

آذر کے ذہن پہ بھی دانیال کا کیا گیا انکشاف حاوی تھا۔

عائشہ آفندی کے دل پہ زہرہ سے نہ ملنے کا رنج طاری تھا۔

اور کومل آذر کی توجہ نہ ملنے پہ اندر ہی اندر گیلی لکڑی کی طرح سلگ رہی تھی' اس کا بس چلتا تو علیزے کو منظر سے ہٹادیتی۔۔۔ وہ علیزے جو ہر طرح سے بے ضرر تھی' جو کسی کے لیے برا نہیں سوچتی تھی' جو کسی کے ساتھ کچھ برا ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

جس کے لیے آذر سمیت سب کزنز برابر تھے' جو نہ حسد کرتی تھی' نہ دل میں میل رکھتی تھی' بس اپنی ذات کے دائرے میں رہتی تھی' وقار آفندی یا باقی حویلی والے اسے اتنا لاڈ پیار دیتے تھے تو اس میں اس کا کیا قصور تھا بھلا؟ وہ خود تو نہیں کہتی تھی کہ سب اسے پر دلو کول دیں' لیکن پھر بھی کومل اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتی تھی' وہ علیزے کو اپنا رقیب سمجھتی تھی' اسی لیے اب وہ اپنی اس جلن اور رقابت کو اپنے لفظوں تک لے آئی تھی' اپنے لہجے اور انداز سے اظہار کرنے لگی تھی اور اس کے اسی اظہار کا بوجھ علیزے اپنے دل پہ لیے بجھی بجھی سی واپسی کے سفر کے لیے روانہ ہوئی تھی۔

بلکہ اس سفر میں کئی لوگ بجھے بجھے سے اور مایوس سے تھے' لیکن جودت ہنوز ہشاش بشاش اور خوش تھا اور اس کا نشانہ آج بھی منصور حسین تھا۔

"کیا بات ہے منصور حسین! تم بھی چپ چپ سے ہو؟" اس نے گردن موڑتے ہوئے منصور حسین کی سمت دیکھا۔

"میرا کام ہی ایسا ہے کہ مجھے چپ رہنا پڑتا ہے۔" منصور حسین نے گہری سانس کھینچی تھی۔

"کیوں یار! باتوں کے دوران ڈرائیونگ نہیں ہوسکتی؟"

"ہوسکتی ہے' لیکن یہ کام مالکوں کا ہے' وہ باتیں بھی کرتے ہیں اور ڈرائیونگ بھی' لیکن ہم ملازم لوگوں کا کام ہوتا ہے چپ رہنا اور چپ رہ کر کام کرنا۔۔۔ ہمارے بولنے پہ اعتراض ہوتا ہے۔" منصور حسین کے جواب ہمیشہ کھرے ہی ہوتے تھے۔

"یار منصور حسین! تم ہمیشہ اتنی جلی کٹی سی باتیں کیوں کرتے ہو؟ یوں لگتا ہے جیسے تم سے یا محبت چھن گئی ہے یا عزت؟" جودت کی بات پہ پوری گاڑی گھوم کے رہ گئی تھی' گاڑی کے ٹائر چرچرا اٹھے تھے۔ منصور حسین کے ہاتھ کسی فولاد کی طرح اسٹیئرنگ پہ جم گئے تھے۔

"بے شک میں ملازم ہی سہی جودت صاحب! لیکن اپنی عزت اور محبت پہ بات کرنے کی اجازت میں کسی کو بھی نہیں دے سکتا' چاہے وہ آپ ہوں' چاہے کوئی اور۔۔۔" منصور حسین کا لہجہ بہت سخت اور پتھریلا ہو رہا تھا۔ جودت

نے حیرت سے منصور حسین کی سمت دیکھا۔ اس کے تیور ٹھکا دینے کی حد تک بگڑے ہوئے تھے۔

"آپ میری ذات پہ بات کریں' میری ذاتی باتوں اور معاملات پہ بات نہ کریں' کیونکہ میں یہ بات پسند نہیں کرتا۔" منصور حسین نے جودت کو ایک حد میں رہنے کا اشارہ دیا تھا اور یہ اشارہ بہت واضح تھا' جس پہ منصور حسین کو کوئی شرمندگی بھی نہیں تھی' اس لیے وہ سر جھٹک کر گاڑی دوبارہ سے اسٹارٹ کرچکا تھا' جودت نہ جانے کیوں کچھ بھی کہے بغیر چپ ہوگیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تھا' کیونکہ اس نے واقعی ایک غلط بات کہی تھی اور منصور حسین ایک غیرت مند آدمی تھا' جس سے یہ بات برداشت نہیں ہوئی تھی' جب ہی جودت بھی منصور حسین کی خفگی سہہ گیا۔

"ایم سوری یار۔" جودت نے آہستگی سے سوری کیا اور منصور حسین کی نظر بے ساختہ بیک ویو مرر کی سمت اٹھ گئی۔

"علیزے بی بی کہتی ہیں کہ غلطی کرکے معافی مانگنے والے لوگ مجھے قطعی اچھے نہیں لگتے۔" منصور حسین نے علیزے کی بات دہرائی۔

"کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتے ہو تم؟" جودت کو سمجھ نہیں آئی تھی' لیکن علیزے سمجھ چکی تھی کہ وہ اسے اس کا غصہ اور اس کی بات یاد دلا رہا ہے۔

"میرا مطلب ہے کہ میں بھی علیزے بی بی کی بات سے متفق ہوں' مجھے بھی غلطی کرکے معافی مانگنے والے لوگ اچھے نہیں لگتے' اور معافی دینے کو دل بھی نہیں چاہتا۔" منصور حسین نے اپنے غصے پہ قابو پالیا تھا' اس لیے قدرے نارمل انداز میں بات کررہا تھا' ورنہ ایک پل میں اس کا پارہ کہاں سے کہاں جا پہنچا تھا' وہ برداشت نہیں کرتا تھا' کسی کی بات سہہ نہیں پاتا تھا' اسی لیے اکثر لوگ اس سے نالاں ہی رہتے تھے' رجو' عارف اور مبارک خان کی طرح۔۔۔!

"اچھا؟ علیزے نے یہ بات کہی ہے؟ لیکن علیزے اتنی سخت تو نہیں ہے؟ کیوں علیزے یہ کیا سن رہا ہوں میں؟" جودت نے گردن موڑ کر علیزے کو دیکھا۔

"جی! ٹھیک سن رہے ہیں آپ۔۔۔" وہ ذرا سنبھل کے بیٹھ گئی۔

"ارے واقعی؟ تم اتنی سخت تو نہیں ہو؟" جودت حیرت کا اظہار کررہا تھا۔

"میں اتنی نرم بھی نہیں ہوں جودت بھائی! آپ میری نرمی پہ مت جائیں' بات اصول کی آجائے گی تو اصول کی کروں گی' میں یہ سوچتی ہوں جن لوگوں نے بعد میں معافی مانگنی ہوتی ہے وہ پہلے غلطی ہی کیوں کرتے ہیں؟" علیزے نے سنجیدگی سے کہا۔

"غلطی کرنے سے پہلے سوچتا کون ہے یار؟"

"لیکن سوچنا چاہیے نا' میں کہتی ہوں کہ غلطی کرنے سے پہلے سو بار سوچو' اور اچھا کام کرنے سے پہلے ایک بار بھی مت سوچو' بس میرا تو یہی پوائنٹ آف ویو ہے۔" اس نے کندھے اچکائے اور جودت حیران ہوا تھا کہ علیزے بھی ایسی باتیں کرلیتی ہے۔

"خیر! فی الحال اس بات کو چھوڑو اور اپنے ڈرائیور سے کہو کہ میرا سوری قبول کرلے۔" جودت نے سفارش کے لیے کہا۔

"نو! میں یہ نہیں کہہ سکتی' یہ اس کی اپنی مرضی پہ ڈپینڈ کرتا ہے۔" علیزے نے نفی میں سر ہلایا اور منصور حسین کو علیزے کی یہ بات اور انداز بہت اچھے لگے تھے' اس نے دل ہی دل میں علیزے کو سراہا تھا۔

"کیوں منصور حسین! پھر کیا ارادہ ہے تمہارا؟" جودت' علیزے کی طرف سے رخ موڑ کر سیدھا ہوا تھا۔

"اگر اس روز میری غلطی پہ علیزے بی بی نے مجھے معاف کر دیا ہوتا تو شاید اس وقت میں بھی آپ کو معاف کر دیتا۔" منصور حسین نے موڑ کاٹتے ہوئے کہا۔

"تو تم علیزے کا بدلہ مجھ سے لو گے؟" جودت کو اچنبھا ہوا۔

"نہیں صاحب! بدلہ نہیں لے رہا' بلکہ ان کے اصول پہ چل رہا ہوں' آخر ڈرائیور ہوں ان کا۔" منصور حسین نے کافی اطمینان سے جواب دیا۔

"سوچ لو منصور حسین! غلطی کر رہے ہو' معافی نہ دے کر۔" جودت نے اسے دھمکایا۔

"دیکھیے صاحب! اگر آپ صاحب ہونے کے ناتے کہہ رہے ہیں تو پھر آپ کو معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے' آپ مالک ہیں اور میں ملازم اور اگر آپ انسانیت کے ناتے کہہ رہے ہیں تو پھر معافی میری مرضی سے ہی ملے گی۔" منصور حسین بھلا کب کسی سے دبنے والا تھا' جودت اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"میں معافی تمہاری مرضی سے چاہتا ہوں۔" وہ بھی آخر جودت تھا زچ کر دینے والا۔

"ٹھیک ہے' سوچوں گا۔" منصور حسین نے سکون سے کہتے ہوئے گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی' وہ لوگ مری اور اسلام آباد کی حدود سے نکل آئے تھے' اب ان کا رخ لاہور کی سمت تھا۔

☼ ☼ ☼

پورے گھر میں خاموشی اور سناٹا چھایا ہوا تھا اور وہ دونوں اس خاموشی کے دوران گھر کی چیزیں سمیٹتی پھر رہی تھیں' نگارش نے پیکنگ کا کام ابھی سے شروع کر دیا تھا' کیونکہ عبداللہ نے ٹکٹس کنفرم کروا لیے تھے۔ اور آج زری بھی اپنے ایگزامز سے فارغ ہو گئی تھی' اس لیے اب ان کی واپسی کنفرم ہو چکی تھی۔

"کیا بات ہے' اتنی خاموش کیوں ہو؟" نگارش ریک میں سجی کتابیں ایک کارٹن میں بند کر کے رکھتے ہوئے زری کی سمت متوجہ ہوئی۔

"ڈر لگ رہا ہے۔" زری رائٹنگ ٹیبل سے ساری چیزیں سمیٹتے ہوئے بہت بے دل اور سست لگ رہی تھی۔

"کس چیز سے؟" نگارش ٹیبل اور کرسیوں پہ وائٹ کور چڑھا رہی تھی۔

"پاکستان سے۔" زری کی آواز دھیمی تھی۔

"کیوں۔۔۔؟"

"مجھے لگتا ہے پاکستان مجھے نگل جائے گا' میں پاکستان کی سرزمین پہ نہیں بلکہ کسی دلدل میں قدم رکھنے والی ہوں' جس میں' میں دھنس جاؤں گی' بے بس ہو جاؤں گی اور۔۔۔ اور یہی بے بسی سوچ کر میرا دل ڈوب رہا ہے' نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔" زری کی حالت خاصی عجیب سی ہو رہی تھی' اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"کیا تمہیں عبداللہ پر بھروسہ نہیں ہے؟" نگارش نے خفگی سے پوچھا۔

"بھروسہ ہے بھابھی' ان پہ تو پورا بھروسہ ہے' لیکن جو وہاں میری تاک لگائے بیٹھے ہیں' ان پہ بھروسہ نہیں ہے۔" زری روہانسی ہو گئی۔

"وہاں دل آور بھی تو ہے؟ کیا اس پہ بھی بھروسہ نہیں ہے؟" نگارش نے جان بوجھ کر دل آور کا ذکر کیا تھا۔

"وہاں ملک حق نواز بھی تو ہے بھابھی؟ کیا دل آور شاہ' ملک حق نواز سے چھین لے گا مجھے؟ کیا مجھے اس سے بچا لے گا؟ کیا میرے بھروسے پہ پورا اترے گا وہ؟ ہزاروں لوگوں کے لیے لڑتا ہے' کیا ملک حق نواز سے لڑے گا میرے لیے؟ اگر وہ میرے لیے لڑنے کو تیار ہے تو میں آج ہی پاکستان جانے کے لیے تیار ہوں۔۔۔ مگر بھابھی مجھے پورا یقین ہے وہ ایسا کچھ نہیں کرے گا' وہ سب کے لیے لڑ سکتا ہے' مگر میرے لیے نہیں۔" زری کے آنسو اس

کے رخساروں پہ بہہ رہے تھے اور نگارش چپ کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔
"دل آور اتنا برا یا بزدل نہیں ہے ' جتنا تم سمجھ رہی ہو' یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ تمہیں یا عبداللہ کو کسی محاذ پہ اکیلا چھوڑ دے ' مجھے پوری امید ہے کہ وہ ہم لوگوں کا ساتھ دے گا ' ملک حق نواز اس کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے ' بس چند دن کی بات ہے ' ہم خود دیکھ لینا ' کیونکہ دل آور تمہارا ساتھ دے یا نہ دے ' لیکن عبداللہ کا ساتھ ضرور دے گا ' عبداللہ کی بات ہوئی تھی دل آور سے وہ کہہ رہا تھا کہ وہ ' ہمیں ریسیو کرنے کے لیے خود آئے گا ' عبداللہ کو کسی بھی کام کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" نگارش نے زری کو حوصلہ اور یقین دلایا تھا اور زری کا دل جیسے ٹھہر سا گیا۔ نگارش بھابھی کی تسلی پہ ذرا سی ڈھارس ہوئی تھی اسے۔
"بھابھی! یہ آپ۔۔۔"
"بس ' بس! یہ ساری باتیں یہیں رہنے دو ' اور کام کرو میرے ساتھ ' میری ہیلپ کروانے کی بجائے الٹا مجھے ٹینشن دے دے کر مار رہی ہو۔" نگارش نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا اور زری اپنے آپ کو سنبھالتی بمشکل کام کی طرف متوجہ ہوئی تھی ' ورنہ خدشے اور وسوسے اب بھی اس کے دل و دماغ میں ہلکورے لے رہے تھے ' مگر وہ کنٹرول کر گئی۔

✡ ✡ ✡

"کیا میں اپنی ذاتی گاڑی لے سکتا ہوں؟" جہذی کو بیٹھے بیٹھے گاڑی کا خیال آیا تھا ' آخر وہ کب تک مدحیہ کی گاڑی پہ ڈیپینڈ کر سکتا تھا؟
"پتا نہیں۔" مدحیہ نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔
"ارے! کیوں پتا نہیں ہے؟ تمہارے بھائی صاحب شوروم بنا رہے ہیں اور تمہیں پتا ہی نہیں ہے؟" جہذی نے حیرت سے کہا۔
"میرے بھائی صاحب شوروم بنا رہے ہیں تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ میں گاڑیوں کی انفارمیشن ساتھ لیے پھر رہی ہوں ' شوروم ان کا ہے ' کام ان کا ہے ' مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں گاڑیوں کی معلومات رکھتی پھروں؟" مدحیہ نے کافی خفگی سے جواب دیا۔
"تو پھر میں کس سے معلومات لوں؟"
"معلومات کی کیا ضرورت ہے؟ تمہیں چاہیے کہ تم گاڑی رینٹ پہ لے لو۔" مدحیہ نے اسے ایک مفید مشورے سے نوازا۔
"گاڑی رینٹ پہ۔۔۔؟"
"ہاں! ظاہر ہے تم نے زیادہ عرصہ تو یہاں نہیں رہنا ' ایسے میں اگر تم نیو زیرو میٹر گاڑی لیتے ہو تو اس میں سراسر تمہارا نقصان ہے ' پندرہ ' بیس لاکھ کی گاڑی اگر تم جانے سے پہلے سیل بھی کرو گے تو وہ سیکنڈ ہینڈ کہلائے گی اور سیکنڈ ہینڈ گاڑی کوئی بھی پندرہ ' بیس لاکھ میں تم سے نہیں خریدے گا ' تمہیں پانچ ' چھ لاکھ کا نقصان ضرور ہوگا ' اس لیے اتنے بڑے نقصان سے بہتر ہے کہ تم کوئی اچھی سی گاڑی رینٹ پہ لے لو ' ڈرائیو تم خود کر لو گے۔" مدحیہ کا انداز اب بھی لاپروا سا تھا ' جبکہ جہذی نہ جانے کیوں ہنس رہا تھا۔
"کیا بات ہے ' کیوں ہنس رہے ہو؟ ایسا کیا کہہ دیا ہے میں نے؟" مدحیہ نے دائیں طرف ٹرن لیتے ہوئے کہا۔
"اس لیے ہنس رہا ہوں کہ تمہیں تو گاڑیوں کی معلومات ہی نہیں ہے ' پھر بھی اتنا کچھ بتا دیا؟" جہذی نے اسے چھیڑنے کے سے انداز میں کہا تھا اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی مدحیہ کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

"تھینک گاڈ! تمہارے چہرے پہ مسکراہٹ تو آئی۔" جہذی نے شکر ادا کیا۔
"چلو اوکے! اب یہ تو بتاؤ کہ جانا کہاں ہے؟" مدحیہ نے گاڑی کی اسپیڈ کم رکھتے ہوئے پوچھا۔
"گاڑی کا پتا کرتے ہیں ' کہاں سے ملے گی؟" جہذی آج کے دن میں گاڑی کا مسئلہ حل کرنا چاہتا تھا۔
"ڈھونڈتے ہیں ' جہاں سے بھی مل گئی۔" مدحیہ نے کندھے اچکائے تھے اور پھر یوں ہی اپنی موج و مستی میں سڑک پہ ملنے والی گاڑیاں دیکھنے چل دیے تھے۔

✡ ✡ ✡

یوں ہی کوئی مل گیا تھا
یوں ہی کوئی مل گیا تھا
سر راہ چلتے چلتے
سر راہ چلتے چلتے

چھوٹا خاصی سریلی آواز میں یوں لہک لہک کر گنگنا رہا تھا جیسے فلم میں گانا بھی اسی پہ پکچرائز کیا گیا ہو۔
"او چھوٹے واہ! کیا کمال کا گاتے ہو یار! لیکن کیا بات ہے یار آج تمہارے گانے کا اثر نہیں ہو رہا؟" سلو نے بھی کام کرتے ہوئے درمیان میں لقمہ دینا ضروری سمجھا۔ وہ در حقیقت عدیل کو چھیڑ رہے تھے ' جبکہ عدیل چپ چاپ خاموشی سے اپنے کام میں مصروف تھا ' آج ورکشاپ میں کام زیادہ تھا ' اس لیے عدیل خود ساتھ مل کر کام کر رہا تھا۔ دو ' تین گاڑیوں کا کام بیک وقت ہو رہا تھا۔ گاڑیوں کے انجن کھلے پڑے تھے اور ڈیزل سے ان کے کپڑے ابتر ہو رہے تھے۔
"اثر ہو رہا ہے یار بالکل ہو رہا ہے ' بس ظاہر آہستہ آہستہ ہوگا۔" چھوٹے نے مطمئن سے انداز میں کہا۔
"ارے یار! اثر کیا ہونا ہے بھلا؟ تم گانے ہی اداس گا رہے ہو۔" جیدی نے منہ بنا کے کہا۔
"ہیں؟ یہ وجہ ہے؟" چھوٹے نے بھنویں اچکائیں۔
"تو اور کیا؟ کوئی دل کو چھونے والا گاؤ گے تو اثر ہوگا نا؟"
"ہاں یار! یہ تو تم ٹھیک کر رہے ہو ' میں بھی نرا لنگوڑا ہی ہوں۔" چھوٹے نے اپنے سر پہ ہاتھ مارتے ہوئے خود کو سرزنش کی۔
"چلو کوئی بات نہیں ' اب اپنا ٹریک بدل لیتا ہوں۔" اس نے کسی نئے گانے کے لیے اپنے آپ کو تیار کیا۔
"شاباش۔۔۔" جیدی اور سلو نے ہمت بندھائی۔

موسم ہے عاشقانہ ــــ موسم ہے عاشقانہ
اے دل کہیں سے ان کو ایسے میں ڈھونڈ لانا

چھوٹے نے ایک نیا سر لگایا اور بے ساختہ عدیل کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ امڈ آئی ' وہ اس کی اس مسکراہٹ کے لیے ہی تو اتنے جتن کر رہے تھے۔
"ہر۔۔۔" انہوں نے عدیل کو مسکراتے دیکھ کر نعرہ لگایا۔
"بہت کمینے لوگ ہو تم۔۔۔" عدیل نے رنج سے گاڑی کے ٹائر کا پیچ کستے ہوئے سر جھٹکا۔ البتہ چہرے کی مسکراہٹ ہنوز تھی۔
"ہم لفنگے بھی ہیں استاد۔" سلو معنی خیزی سے کہہ کر ہنسا تھا۔
"جانتا ہوں ' بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔" وہ کام کرنے کے ساتھ ساتھ باتیں بھی کر رہے تھے

"استاد! اب آپ جیسا شریف بھی تو نہیں ہوا جاسکتا کہ بندہ کسی کو یاد بھی کرے اور بتائے بھی نہ؟" چھوٹے نے اسے چھیڑا۔
"ارے! میں کس کو یاد کرنے لگا بھلا؟" عدیل نے تعجب سے کہا۔
"یہ تو آپ کو ہی پتا ہوگا استاد' اگر نہیں پتا تو اپنے دل سے پوچھ لو۔" چھوٹا معنی خیزی سے بات کر رہا تھا' عدیل ہنس دیا۔
"میں نے پہلے بھی تمہیں کہا تھا کہ خوش فہمیاں پالنا اچھی بات نہیں ہے' اس سے بہتر ہے کہ بندہ اپنا کام کرلے۔" عدیل نے چھوٹے کو گاڑی کے نیچے گھسنے کا اشارہ کیا' کیونکہ اس گاڑی کا کچھ کام نیچے لیٹ کر کرنے والا تھا' گاڑی کو انہوں نے پہلے ہی جیک پہ لگا رکھا تھا۔
"سوری استاد! میرا موڈ آج بہت اچھا ہے' آج نیچے جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے' یہ کام سلو یا جیدی سے کہو۔" چھوٹے نے پہلی بار کسی کام سے انکار کیا تھا اور عدیل بھی نہ جانے کس موڈ میں تھا کہ کسی سے بھی کہنے کی بجائے خود نیچے لیٹ کر گاڑی کے نیچے گھس گیا۔
"ارے... رے استاد! یہ کیا کر رہے ہو؟ آپ نکلو باہر' میں خود کر لیتا ہوں۔" چھوٹے نے عدیل کو کام کرتے دیکھ کر منع کیا۔ مگر عدیل اب ادھورا کام کیسے چھوڑ سکتا تھا۔
"کوئی بات نہیں' کام تو کرنا ہی ہے' چاہے جس طرح بھی کرنا پڑے۔" عدیل کی آواز گاڑی کے نیچے سے آرہی تھی۔
"ہیلو... ! کیا ہمیں کوئی گاڑی رینٹ پہ مل سکتی ہے؟" سنجیدہ سی نسوانی آواز پہ وہ چاروں ہی چونک گئے تھے' چھوٹے نے یکدم گردن موڑ کے دیکھا تھا اور مدحیہ کو دیکھ کر بری طرح ٹھٹکا تھا۔
"آپ...؟" وہ اسے پہچان چکا تھا' لیکن مدحیہ اسے نہیں پہچانی تھی۔
"میں آپ سے کچھ پوچھ رہی ہوں مسٹر؟" مدحیہ نے حیران حیران سی نظروں سے دیکھتے چھوٹے کو دوبارہ متوجہ کیا اور اب کی بار اس آواز پر عدیل بھی چونک گیا' اس نے گاڑی کے نیچے سے ہی جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی تھی' ذرا سے فاصلے پہ اسے دودھیا پاؤں بلیک کلر کے باریک ڈوریوں والے سینڈلز میں مقید نظر آئے تھے اور ان کے ساتھ جوگرز والے پاؤں بھی نظر آرہے تھے' یعنی اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟ عدیل سب کچھ وہیں چھوڑ چھاڑ کے گاڑی کے نیچے سے نکل آیا۔
"السلام علیکم میڈم!" عدیل اپنے کپڑوں سے دھول مٹی جھاڑتا ہوا سامنے آکھڑا ہوا' اب کی بار مدحیہ نے چونک کر دیکھا تھا اور عدیل کو اس ماحول اور اس حلیے میں دیکھ کر اس کی آنکھیں بے یقینی سے پھیل گئی تھیں۔
"تم یہاں؟" وہ اپنے تاثرات پہ کنٹرول نہیں کرپائی تھی اور بے ساختہ بول اٹھی' اس کے سوال پہ عدیل کے لبوں کو اک خفیف سی مسکراہٹ چھوگئی تھی۔
"جی ہاں! میں یہاں' میرے جیسے بے کار لوگوں کا یہی ٹھکانا ہے۔" عدیل نے لاپروائی سے کہا' لیکن مدحیہ تو جیسے کسی شاک میں آگئی تھی' وہ ہکا بکا سی عدیل کا حلیہ دیکھ رہی تھی۔
"لیکن تم! یہ کام کیسے...؟" مدحیہ یوں بات کر رہی تھی جیسے پہلو میں کھڑا جبزی نہیں سامنے کھڑا عدیل اس کا دوست ہو اور اسے اس کے کام پہ افسوس ہو رہا ہو۔
"کیوں میڈم؟ اس کام میں کیا برائی ہے بھلا؟" عدیل نے استہزائیہ سے انداز میں کہتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔
"برائی نہیں ہے' لیکن..." مدحیہ کہتے کہتے چپ ہوگئی۔

"سلو! میڈم اور صاحب کے لیے کرسیاں لے کر آؤ۔" عدیل نے سلو کو اشارہ کیا تھا۔
"جی استاد! ابھی لایا۔" سلو نے جواباً بڑی پھرتی کا مظاہرہ کیا۔
"بیٹھیے۔" عدیل نے مدحیہ اور جبزی کو بیٹھنے کی آفر کی' حالانکہ عدیل کو خود مدحیہ کے ساتھ جبزی کو دیکھ کر نہ جانے کیوں' بہت عجیب سا فیل ہوا تھا' لیکن وہ اس چیز کا اظہار نہیں کر سکتا تھا' کیونکہ اس کے پاس نہ ایسا کوئی حق تھا' نہ تعلق۔
"نو تھینکس! بیٹھنے کا وقت نہیں ہے۔" مدحیہ نے انکار کردیا۔
"تو آپ آئی کیوں ہیں؟" عدیل ڈائریکٹ اس کے چہرے کی سمت دیکھ رہا تھا۔
"پتا نہیں کیوں آئی تھی۔" مدحیہ نے نفی میں سر ہلایا۔
"کس چیز کی ٹینشن لے رہی ہیں آپ؟" عدیل نے بغور اس کے تاثرات نوٹ کیے تھے۔
"کہا نا کچھ نہیں' چلو جبزی' واپس چلو۔" مدحیہ کہتے ہوئے یکدم پلٹ گئی۔ جبزی بھی اس کے ساتھ واپس پلٹ گیا تھا۔
"میڈم! آپ کو رینٹ پہ گاڑی مل سکتی ہے' آپ ٹھہریے تو سہی۔" عدیل نے پیچھے سے آواز دی' لیکن مدحیہ بغیر کچھ سنے اور بغیر کچھ کہے وہاں سے نکل گئی تو وہ سب دیکھتے رہ گئے۔
مدحیہ کوشش کے باوجود اپنی کیفیات پہ کنٹرول نہیں کرپائی تھی' اس لیے اسے وہاں ٹھہرنا مناسب نہیں لگا تھا اور وہ وہاں سے آگئی تھی' لیکن اس کا ذہن الجھا ہوا تھا' اسی الجھن نے اسے وہاں ٹھہرنے نہیں دیا' جبزی کو بھی مدحیہ کے ری ایکٹ پہ حیرت ہوئی تھی اور حیرت تو عدیل وغیرہ کو بھی ہو رہی تھی کہ وہ آئی بھی اور چلی بھی گئی۔

متراں دی چھتری توں اڈھ گئی
امبراں نے لاندی اے اڈاریاں

پھل کوئی ولایت والا لے گیا
پڑا میں رہ گیا کیاریاں

چھوٹے نے ایک اور موقع کی مناسبت سے گانا ڈھونڈ لیا تھا' اب کی بار عدیل نے اسے گھور کے دیکھا تھا اور چھوٹا اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے رخ موڑ گیا۔
"ویسے استاد! اللہ جھوٹ نہ بلوائے آج صاف لگ رہا تھا کہ میڈم کے دل میں اتر گئے ہو' اس ڈیزل اور دھول مٹی سمیت' آج تو میڈم کے منہ سے کوئی شرارہ بھی نہیں پھوٹا۔" چھوٹے نے دوبارہ عدیل کی سمت رخ موڑتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔
"لیکن یار! میڈم کے پہلو میں وہ مسٹر کون تھا؟" سلو کا دھیان جبزی کی طرف تھا۔
"اپنے استاد کا رقیب اور کون؟" چھوٹے نے جھٹ سے بیان دیا۔
"بکو مت' جو منہ میں آتا ہے بول جاتے ہو۔" عدیل نے اسے جھڑک دیا۔
"بول نہیں جاتا استاد' کھٹک تو تم بھی گئے ہو۔" چھوٹا بھی اپنے نام کا ایک ہی تھا' عدیل زچ ہوگیا۔
"ہاں' ہاں! کھٹک گیا ہوں' پھر؟" اس نے چڑ کے پوچھا۔
"پھر لڈیاں پاواں۔" چھوٹے نے قہقہہ لگاتے ہوئے بھنگڑا ڈالا اور اس کے ساتھ جیدی اور سلو بھی شامل ہوگئے تھے اور عدیل بھی اتنے غصے کے باوجود اپنا قہقہہ نہیں روک پایا۔

☼ ☼ ☼

عصر اور مغرب کا درمیانی وقت تھا جب ان لوگوں کی گاڑیاں فراٹے بھرتی ہوئی بڑی حویلی میں داخل ہوئی تھیں اور ان کو دیکھتے ہی حویلی میں جیسے یکدم ہلچل سی مچ گئی' سب سے پہلے عون اور عدید بھاگتے ہوئے باہر آئے تھے اور علیزے کو گاڑی سے اترتے دیکھ کر بے ساختہ اس سے لپٹ گئے۔

"آئی مس یو علیزے آپی! آئی مس یو سو مچ۔" وہ دونوں بڑی معصومیت سے باری باری اپنی بے تابی کا اظہار کر رہے تھے۔

"آئی مس یو جانو۔" علیزے نے ان کی پیشانی پہ پیار کیا اتنے میں وقار آفندی' آسیہ آفندی' ثروت بیگم' شمو بیگم اور اسرار آفندی بھی باہر نکل آئے اور سب ہی بچوں سے بہت محبت اور بہت خوشی سے ملے' لیکن جب وہ سب لوگ اندر آئے تو ان کی حیرت اور خوشی سے آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

"ارے علیزے کے برتھ ڈے کی تیاری ہو رہی ہے نا...؟" دانیال نے گھر میں ہونے والی تیاری دیکھ کر فوراً ہی جان لیا تھا سامنے ٹیبل پہ انویٹیشن کارڈز بھی بکھرے ہوئے تھے جو لوگوں میں تقسیم کرنے تھے۔

"ہوں بالکل...! چودہ نومبر کا دن تم لوگ بھول سکتے ہو' مگر میں نہیں' چودہ نومبر کا دن میری زندگی کا خوبصورت ترین دن تھا۔" وقار آفندی علیزے کو اپنے بازو کے حصار میں لیے کھڑے تھے۔

"چودہ نومبر کا دن تو ہم بھی نہیں بھول سکتے' اللہ نے ہمیں اتنی پیاری اتنی کیوٹ سی کزن سے نوازا تھا۔" دانیال نے شرارت سے کہتے ہوئے علیزے کے سر پہ ہلکی سی چپت لگائی' دانیال' انوشہ اور زین بھی حقیقتاً" علیزے سے بہت زیادہ پیار کرتے تھے' آخر ان لوگوں کا تو علیزے سے دوہرا رشتہ تھا۔

"کزن کزن' علیزے' علیزے' ہونہہ! بھاڑ میں گئی علیزے' کان پک گئے ہیں اس کا نام سن سن کے۔" کومل بمشکل خود پہ ضبط کرتی ہوئی منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے پلٹ کر سیڑھیاں چڑھ گئی۔ حرمت اور آذر دونوں بہن بھائی نے بیک وقت کومل کی سمت دیکھا تھا' وہ بہت تیزی سے سیڑھیاں طے کر گئی تھی۔ آذر گہری سانس کھینچ کے رہ گیا' البتہ باقی سب بڑے زور و شور سے اپنے ٹرپ کی روداد سنانے میں مصروف تھے۔

بڑی حویلی میں پھر سے رونقیں جاگ اٹھی تھیں لیکن ان رونقوں اور ہنگاموں کے باوجود وقار آفندی کا سارا دھیان عائشہ آفندی کی طرف تھا۔ عائشہ آفندی ہنسنے اور مسکرانے کے باوجود کافی اداس اور بجھی بجھی سی لگ رہی تھیں اور یہ بات آسیہ آفندی نے بھی نوٹ کرلی تھی اسی لیے وہ عائشہ آفندی کے پاس آبیٹھی تھیں۔

"کیا بات ہے عائشہ؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا...؟ اتنی تھکی تھکی سی کیوں لگ رہی ہو...؟" آسیہ آفندی کو پریشانی ہو رہی تھی۔

"میں تو سالوں سے تھکی ہوئی ہوں بھابھی! بس کسی کو محسوس نہیں ہوتا۔" عائشہ آفندی کا لہجہ اور آواز کافی کمزور سے تھے۔

"کیوں کیا ہوا ہے...؟"

"کچھ پتا نہیں کیا ہوا ہے...؟" عائشہ آفندی بے بس اور ناامید سی ہو رہی تھیں۔

"عائشہ! کیوں اتنی مایوس اور ناامید ہو رہی ہو... ہوا کیا ہے؟ کچھ بتاؤ تو...؟" وہ ان سے بصد اصرار پوچھ رہی تھیں۔

"امی نے مری میں زہرہ آنٹی کو دیکھا تھا' اس لیے اداس ہیں۔" زین نے لاپروائی سے کہتے ہوئے آسیہ آفندی کی مشکل آسان کی تھی لیکن آسیہ آفندی بھی زہرہ کا نام سن کر ٹھٹک گئی تھیں۔

"کیا؟ زہرہ کو دیکھا تھا؟ لیکن کب؟ کہاں؟" آسیہ آفندی نے ایک ہی سانس میں کئی سوال پوچھ ڈالے تھے۔

"مری میں دیکھا تھا' آٹھ' دس دن ہو گئے ہیں' دل پہ یہی بوجھ لیے پھر رہی ہوں۔" عائشہ آفندی کے لہجے سے

جھلک رہی تھی' یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بہت زیادہ نڈھال ہو چکی ہوں۔

"تو پھر تم اس سے ملی تھیں؟" آسیہ آفندی کا اگلا سوال اٹھا۔

"مل لیتی تو شاید دل پہ یہ بوجھ نہ رہتا۔"

"کیا مطلب ہے عائشہ؟ سب صاف صاف بتاؤ نا؟" وہ الجھ گئیں۔ اور پھر عائشہ آفندی نے زہرہ کو دیکھنے کی ساری روداد سنا ڈالی' جسے سن کر آسیہ آفندی چند ثانیے کے لیے خاموش ہو گئی تھیں۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ زہرہ یہیں کہیں ہے پاکستان میں؟"

"ہاں! وہ یہیں ہے۔" اب عائشہ آفندی کے لہجے میں یقین شامل ہو چکا تھا۔

"ہوں! تم فکر نہ کرو' میں وقار سے بات کروں گی' ہم اسے دوبارہ ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔" آسیہ آفندی نے انہیں تسلی دی اور پھر سچ رات کو جب وہ سونے کے لیے بیڈ روم میں آئیں تو انہوں نے سب سے پہلا ذکر زہرہ کا ہی چھیڑا تھا۔

"کیا آپ کو پتا ہے عائشہ نے زہرہ کو دیکھا ہے؟" وہ بیڈ پہ بیٹھے ہوئے کمبل درست کر رہی تھیں' وقار آفندی بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھے کوئی ضروری فائل چیک کر رہے تھے' جب ان کی بات پہ ٹھہر گئے۔

"ہاں! پتا ہے' سب پتا ہے' لیکن پلیز میں آج کل کے دنوں میں اپنے گھر میں کوئی ایسا ذکر نہیں سننا چاہتا جس کی وجہ سے گھر میں ٹینشن اور بدمزگی پیدا ہو' اس لیے عائشہ سے بھی کہہ دو کہ فی الحال اس بات کو یہیں رہنے دے۔" وقار آفندی نے ان کو سختی سے منع کر دیا تھا اور آسیہ آفندی چپ رہ گئی تھیں' وہ اب اور کیا کہہ سکتی تھیں بھلا؟ اسی لیے خاموشی سے سونے کے لیے لیٹ گئی تھیں۔ البتہ وقار آفندی کا ذہن پھر سے بھٹک چکا تھا' وہ فائل سائیڈ پہ رکھتے ہوئے بستر سے اٹھ گئے' سگریٹ اور دھوئیں کا سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

علیزے کے برتھ ڈے کی ارینج منٹ حویلی میں ہی ہو رہی تھی اور اس ساری ارینج منٹ کی ذمہ داری مبارک خان پہ تھی' مبارک خان نے دن رات ایک کر رکھا تھا' ہر کام اپنی نگرانی میں کروا رہا تھا اور منصور حسین اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا' اس وقت بھی وہ اسے کھوجتا ہوا حویلی کی چھت پہ آگیا تھا' کیونکہ حویلی کے چاروں اطراف ریلنگ پہ لائٹنگ کا کام ہو رہا تھا' حویلی کو دلہنوں کی طرح سجایا جا رہا تھا۔

"السلام علیکم۔" منصور حسین نے کافی آہستگی سے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام! آؤ آؤ منصور حسین بیٹھو یہاں۔" مبارک خان نے کرسیوں کی سمت اشارہ کیا۔

"نہیں یار! میں بیٹھنے نہیں آیا' میں کسی کام سے آیا ہوں۔" منصور حسین کافی سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔

"کس کام سے؟" مبارک خان بھی پوری طرح سے متوجہ ہوا تھا' کیونکہ منصور حسین اس وقت سنجیدہ اور بے لچک نظر آ رہا تھا۔

"مجھے دو دن کی چھٹی چاہیے' میں جب سے کام پہ آیا ہوں ایک دن بھی چھٹی نہیں لی' لیکن اب مجھے ضرورت ہے' میں نے گھر جانا ہے۔" منصور حسین کافی تھکا ہوا تھا' شاید گھر جا کر آرام کرنا چاہتا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو منصور حسین؟ تم جانتے بھی ہو کہ آج کل گھر میں کتنا کام ہے' کتنی مصروفیت ہے اور تم چھٹی لینا چاہ رہے ہو؟" مبارک خان نے کافی خفگی سے اسے دیکھا۔

"مبارک خان! یہ کام تو کبھی ختم نہیں ہوں گے' تو کیا کبھی گھر نہیں جاؤں گا؟" منصور حسین کو اس سے بھی زیادہ خفگی ہوئی تھی۔

"آپ میں کیا کہہ سکتا ہوں بھلا؟ مجبوری کے مارے سب کچھ کرنا ہی پڑتا ہے' مجھے دیکھو چھ مہینے ہو گئے ہیں' میں گھر نہیں گیا' میرے بھی ماں' باپ ہیں' بہنیں ہیں' بھائی ہے' بیوی ہے' کیا میرا دل نہیں چاہتا گھر جانے کے لیے؟" مبارک خان کا لہجہ بھی قدرے اداس ہو گیا' جس پہ منصور حسین کو نہ چاہتے ہوئے بھی خاموش ہونا پڑا۔

"دیکھو منصور حسین! یہ فنکشن ختم ہو لینے دو' پھر تم آرام سے چھٹی لے لینا اور گھر جا کر ریسٹ کر لینا۔" مبارک خان نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"ہوں! ٹھیک ہے' لیکن صرف اس فنکشن تک۔" منصور حسین کو ماننا ہی پڑا تھا' ورنہ وہ چھٹی لینے کا پکا ارادہ کر کے آیا تھا۔

"ٹھیک ہے' ایسا ہی ہو گا۔" مبارک خان نے اسے تسلی دی اور منصور حسین سر ہلا کر پلٹ گیا۔

"اور سنو منصور حسین۔" اس نے پیچھے سے اسے پکارا۔

"ہوں! کہو؟" وہ ٹھہر گیا۔

"بڑے صاحب نے کہا ہے' علیزے بی بی کی گاڑی سروس کروا لاؤ' گیراج میں کھڑی ہے' کافی گندی لگ رہی ہے۔" مبارک خان نے پیغام دیا تھا۔

"ٹھیک ہے' کروا لاتا ہوں۔" وہ کہہ کر چلا گیا اور ابھی وہ نیچے آیا ہی تھا کہ علیزے نے پکار لیا۔

"جی بی بی! کہیے؟" وہ سر جھکائے کھڑا تھا۔

"میں نے بوتیک جانا ہے۔" وہ بھی کافی دھیمی آواز میں بولی تھی' جب سے مری میں اس کے ساتھ وہ واقعہ پیش آیا تھا وہ منصور حسین سے آنکھ ملا کر بات ہی نہیں کرتی تھی۔

"معذرت چاہتا ہوں بی بی جی! فی الحال میں گاڑی سروس کروانے کے لیے جا رہا ہوں۔"

"تو پھر میں کیسے جاؤں گی؟"

"آپ انتظار کر لیں' بعد میں چلی جایئے گا' تب تک گاڑی لے کر آ جاؤں گا۔" منصور حسین بھی آہستگی سے جواب دے رہا تھا۔

"کس نے جانا ہے؟" آذر اور دانیال بھی ڈرائنگ روم سے نکل آئے تھے۔

"میں نے بوتیک جانا ہے' لیکن ڈرائیور گاڑی سروس کروانے کے لیے جا رہا ہے' اس لیے سوچ رہی ہوں کہ اب کس کے ساتھ جاؤں؟" علیزے پریشانی سے کہہ رہی تھی۔

"آذر کے ساتھ چلی جاؤ' یہ بھی مارکیٹ کی طرف ہی جا رہا ہے۔" دانیال نے فوراً" مشورہ دیا۔

"نہیں! میں نے کسی کام سے کہیں اور بھی جانا ہے' میں اپنے ساتھ نہیں لے کر جا سکتا' تم اپنے ساتھ لے جاؤ۔" آذر نے بھی فوراً" ہی انکار کر دیا' وہ علیزے کے قریب ہو کر اسے خوامخواہ دوسروں کی نفرت اور حقارت کا نشانہ نہیں بنوانا چاہتا تھا' اسی لیے پچھلے کئی دنوں سے اس سے کترا رہا تھا۔

"لیکن میں۔۔۔" دانیال نے کچھ کہنا چاہا۔

"تم فارغ ہو دانیال' تم لے جاؤ' میں فی الحال بزی ہوں۔" آذر نے دانیال کو درمیان میں ہی ٹوک دیا' دانیال چپ ہو گیا' اب وہ انکار کیسے کرتا؟ سو مجبوراً" جانے کے لیے مان گیا' تب کہیں منصور حسین بھی آزاد ہوا اور گاڑی لے کر حویلی سے نکل آیا' وہ بھی آذر اور علیزے کے متعلق ہی سوچ رہا تھا' منصور حسین کی نظر بڑی گہری نظر تھی' پہلی نظر اور پہلی ملاقات میں ہی پہچان جاتا تھا کہ کون کیسا ہے؟ کس مزاج کا ہے؟ کیا کہتا ہے؟ اور کیا چاہتا ہے؟ اور یہی حال آذر سے مل کر بھی ہوا تھا' وہ آذر کی چاہت' اس کا مزاج' اس کی طبیعت سب جان گیا تھا اور یہ بھی جان چکا تھا کہ آذر پچھلے چند روز سے کچھ چپ چپ اور ڈسٹرب سا ہے اور اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ وہ علیزے

بی بی کی وجہ سے ڈسٹرب ہے' کیونکہ آذر جتنا علیزے سے کلوز نظر آتا تھا آج کل اتنا ہی دور نظر آ رہا تھا' جس کے پیچھے یقیناً" کوئی بڑی وجہ ہی تھی۔

منصور حسین نے اپنی سوچوں کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے گاڑی سیدھی چاند ورکشاپ کے اندر لا کھڑی کی اور خود گاڑی سے اتر آیا تھا۔

"السلام علیکم۔" اس نے سامنے کھڑے عدیل سے ہاتھ ملایا۔

"وعلیکم السلام! آیئے بیٹھیے منصور صاحب۔" عدیل نے کرسی کی سمت اشارہ کیا اور منصور حسین آگے بڑھ کے کرسی کی طرف آ گیا۔

"شکریہ۔" وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے جیب سے سگریٹ اور لائٹر نکال کر کرسی پہ بیٹھ گیا' اسے حویلی میں ہوتے ہوئے سگریٹ پینے کا موقع ذرا کم ہی ملتا تھا' اس لیے وہ جب بھی حویلی سے نکلتا اپنا شوق' اپنی عادت پوری کر لیتا تھا۔

"کہیے! کیا حکم ہے ہمارے لیے؟" عدیل گاہک کو بڑے پیار اور بڑے احترام سے ہینڈل کرتا تھا۔

"گاڑی سروس کروانی ہے۔" اس نے سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے کہا۔

"اتنی جلدی؟ ابھی چند روز پہلے ہی تو آپ نے سروس کروائی تھی؟" عدیل کے بولنے سے پہلے ہی چھوٹا بول پڑا۔

"دو ہفتے پہلے کی بات ہے' اور دو ہفتے میں تو انسان کو سروس کی ضرورت پیش آ جاتی ہے' تم گاڑی کی بات کر رہے ہو؟" اس نے استہزائیہ انداز میں کہہ کر سگریٹ کا کش لیتے ہوئے دھواں فضا میں اڑا دیا۔

"ارے باؤ منصور! یہاں لوگ دو' دو سال گاڑی سروس نہیں کرواتے' آپ دو ہفتے کی بات کر رہے ہو؟" چھوٹا کون سا کم تھا۔

"یہ گاڑی کس کی ہے' تمہیں پتا نہیں ہے شاید؟" منصور حسین کے لہجے میں تمسخر تھا۔

"کس کی ہے جناب؟" چھوٹے نے بھی تجسس سے پوچھا تھا۔

"آفندی انڈسٹریز کے مالک وقار آفندی کی بیٹی کی گاڑی ہے۔" منصور حسین نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے جواب دیا اور چھوٹے نے ہونٹ سکیڑ لیے تھے۔

"او اچھا! پھر تو ان کا حق بنتا ہے کہ جب چاہیں گاڑی سروس کروائیں۔"

"بالکل! میں بھی تو یہی کہہ رہا تھا۔" منصور حسین نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ آپ ان کی بیٹی کے ڈرائیور ہیں؟" چھوٹے کا ذہن اب کہیں اور جا پہنچا تھا۔

"ظاہر ہے' اسی لیے تو اس وقت تمہارے سامنے ہوں۔" منصور حسین پاؤں سیدھے کر کے بیٹھ گیا۔

"پھر تو بڑے خوش قسمت ہو باؤ منصور۔" چھوٹے نے رشک کا اظہار کیا۔

"ارے بھئی میں ڈرائیور ہوں ڈرائیور' خوش قسمت کیسے ہو گیا بھلا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"باؤ منصور! اتنے بھولے نہ بنو' لوگ یہاں وقار آفندی سے ملنے کے لیے ترستے ہیں' مہینوں پہلے ٹائم لیتے ہیں اور آپ ان کے گھر میں رہتے ہو' ان کی بیٹی کے ڈرائیور ہو' یہ خوش قسمتی کی بات نہیں تو اور کیا ہے؟" چھوٹا خفگی سے کہہ رہا تھا' جس پہ منصور حسین نے لاپروائی سے سر جھٹکا۔

"میں ایسی خوش قسمتی کو دل پہ نہیں لیتا شہریار صاحب! اور نہ ہی چھوٹی موٹی خوش قسمتی پہ خوش ہوتا ہوں۔" منصور حسین کا اپنا انداز بڑا شاہانہ تھا' جسے دیکھ کر عدیل بے ساختہ مسکرا دیا اور اس کی بات سے متاثر بھی ہوا تھا۔ "بالکل ٹھیک کہا منصور صاحب آپ نے' میں بھی کچھ ایسے ہی خیالات رکھتا ہوں' کسی امیر کبیر آدمی اور خوب

صورت لڑکی کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور دعا سلام کو اپنی خوش قسمتی تصور کرنا انسان کی سب سے بڑی بے وقوفی اور کم عقلی کی علامت ہے اور یہ علامت ہمارے چھوٹے میں بے بہا پائی جاتی ہے۔" عدیل ذرا فارغ تھا' اس لیے کرسی کھینچ کر خود بھی منصور حسین کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ منصور حسین پہلے بھی ایک دفعہ ان کے پاس آچکا تھا۔ اس لیے ان میں تھوڑی بہت بے تکلفی بھی ہو چکی تھی۔

"اس کا کوئی قصور نہیں ہے' بادِ عدیل' یہ عمر ہی ایسی ہے' خوش فہمیوں میں ڈالنے والی۔" منصور حسین نے مذاق اڑایا اور اسی ہنسی مذاق میں وہ گاڑی سروس کرنے میں لگ گئے' البتہ عدیل کافی دیر منصور حسین سے باتوں میں مصروف رہا تھا۔

✡ ✡ ✡
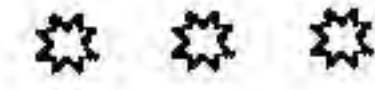
جودت کافی دیر سے ڈرائنگ روم میں بیٹھا مسز بدر کا انتظار کر رہا تھا' وہ شاید اوپر اپنے بیڈ روم میں تیار ہو رہی تھیں' عاصم' سائم اور فاطمہ گھر پہ نہیں تھے' شاید اسی لیے ان کی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی اور جودت انتظار کرتے ہوئے بور ہونے لگا۔

"ارے جودت تم یہاں؟" سائم اچانک ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور جودت کو صوفے پہ بیٹھا دیکھ کر بے ساختہ حیرت اور خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"جی ہاں! میں ہی ہوں' میری آتما نہیں ہے۔" جودت نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔

"ہاں! تمہاری آتما تو مری اور اسلام آباد بھٹکنے کے لیے گئی ہوئی تھی' واپسی کب ہوئی۔" سائم مسکراتے ہوئے بیٹھ گیا۔

"دو دن پہلے۔"

"اچھا! تو تم نے بتایا کیوں نہیں؟"

"سوچا پہلے تھکن اتار لوں' پھر بتا دوں گا۔" جودت نے کندھے اچکائے۔

"کیسی تھکن؟" سائم کا سوال معنی خیز سا تھا۔

"ارے نہیں! ایسی ویسی تھکن نہیں تھی' ساری فیملی کے ہوتے ہوئے ایسا سوچنا بھی گناہ ہے۔" جودت نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"اچھا! اتنا احترام کرتے ہو فیملی کا۔"

"آف کورس یار! جب بہنیں اور بھائی ساتھ ہوں تو احترام کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"چلو شکر ہے' کسی کا تو احترام کرتے ہو نا۔" سائم نے شکر ادا کیا تھا اور جودت قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

"بیلو مائی سن! کیا ہو رہا ہے؟" مسز بدر تک سک سے تیار ساڑھی کا پلو سنبھالتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔

"ہائے آنٹی! کیسی ہیں آپ؟" جودت فوراً کھڑا ہو گیا۔

"بالکل ٹھیک ہوں' تم سناؤ' آج کیسے آنا ہوا؟ مجھے پتا چلا ہے کہ تم کافی دیر سے انتظار کر رہے ہو؟" وہ جودت کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی بیٹھ گئیں۔

"جی! وہ آنی نے آپ کے لیے یہ کارڈ بھیجا ہے۔" جودت نے کارڈ ان کی سمت بڑھا دیا۔

"وہ تو علیزے کی برتھ ڈے ہے؟" مسز بدر کارڈ دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں۔

"جی! اور آنی نے آپ کو اسپیشلی انوائیٹ کیا ہے' اسی لیے یہ کارڈ مجھے دے کر بھیجا ہے۔"

"ہاں۔ ہاں! کیوں نہیں بھئی' میں ضرور آؤں گی۔" انہوں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ہامی بھری اور

جودت ان کا شکریہ ادا کرتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"ارے اتنی جلدی کہاں جا رہے ہو؟ بیٹھو نا؟" سائم اور مسز بدر نے بیک وقت اسے روکا تھا۔

"ایم سوری! فی الحال بیٹھنے کا ٹائم نہیں ہے' میں نے ابھی کہیں اور بھی جانا ہے کارڈ دینے کے لیے۔" اس نے معذرت چاہی تھی۔

"کہاں جانا ہے؟ میں بھی چلتا ہوں۔" سائم بھی کھڑا ہو گیا۔

"مسز رزاق کی طرف۔" جودت نے سائم کی آنٹی کا نام لیا۔

"ارے وہ تو اس وقت اکیڈمی میں ہوں گی؟" سائم نے اطلاع دی۔

"تو کوئی بات نہیں' میں اکیڈمی چلا جاتا ہوں' ان فیکٹ یہ کام مجھے آنی نے سونپا ہے' اس لیے اسے پورا کرنا ضروری ہے اور میں ذرا بھی کوتاہی نہیں کر سکتا۔" جودت نے اصل وجہ بتائی۔

"او کے! چلو پھر میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔" سائم جانے کے لیے تیار تھا۔

"لیٹس گو۔" جودت کہتے ہوئے پلٹا اور مسز بدر کو اللہ حافظ کہہ کر سائم کے ساتھ باہر نکل آیا۔

"اور سناؤ کوئی نئی تازہ؟ تمہارے دن کیسے گزرے؟" جودت بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"سو بورنگ یار! کوئی مزا نہیں آ رہا' موسم بے رنگ سا گزر رہا ہے۔" سائم نے منہ بنایا۔

"اچھا۔ یہ سب تم کہہ رہے ہو؟" جودت نے مذاق اڑاتے ہوئے تعجب کا اظہار کیا۔

"ہاں یار! طبیعت فریش نہیں ہے۔" سائم نے اعتراف کیا۔

"تو پھر کریں فریش؟" جودت نے چھیڑا۔

"تم تو کر لو گے' لیکن میں کیا کروں گا؟" سائم منہ بنا کے بولا تھا۔

"یار! جیسے میں اپنی طبیعت فریش کرنا چاہتا ہوں ویسے ہو نہیں رہی نا؟" جودت کے جواب پہ سائم اس کا مفہوم سمجھ گیا تھا' اسی لیے چپ بھی ہو گیا اور اتنے میں جودت نے بائیک اکیڈمی کی پارک میں لا کھڑی کی تھی۔

جودت اور سائم کو چوکیدار پہلے سے جانتا تھا' اس لیے فوراً گیٹ کھول دیا۔ وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے اور قدم پرنسپل کے آفس روم کی طرف بڑھا دیے تھے۔

"ویسے یار! رنگا رنگ خوشبوئیں اور رنگا رنگ نظارے دیکھنے ہوں تو بندہ گرلز کالج یا اکیڈمی کا رخ کرے۔" جودت کے لہجے اور آنکھوں میں شرارت تھی' وہ کلاس روم سے نکل کر سیڑھیاں اترتی لڑکیوں کو دیکھ رہا تھا۔

"جودت! انسان بنو' آنٹی کو پتا چلا تو ناراض ہوں گی۔" سائم نے اسے ٹھوکا دیا تھا اور مجبوراً جودت نے سر جھکا لیا۔

لیکن جب وہ مسز رزاق کو کارڈ دے کر واپس آ رہے تھے کہ کلاس رومز کے سامنے سے گزرتے ہوئے جودت کے قدم اچانک ٹھٹک گئے' وہ ایک سرسری نظر میں ہی پہچان گیا تھا کہ وہ کون ہے؟

"جودت۔!" سائم نے اسے اپنے ساتھ نہ پا کر فوراً پیچھے پلٹ کر دیکھا تھا۔

"میں شاید اپنا سیل بھول آیا ہوں' تم چلو میں لے آؤں۔" جودت اپنی جیبیں ٹٹولتا ہوا بہانا بنا کر پلٹ گیا اور سائم اس کی چالاکی سے بے خبر گیٹ عبور کر گیا۔

اس کی کلاس آف ہو چکی تھی اس لیے وہ اپنی چیزیں سمیٹتی ہوئی پلٹ رہی تھی جب کسی کو کلاس روم کے دروازے کی چوکھٹ کے بیچوں بیچ کھڑے دیکھ کر ٹھٹک گئی لیکن جیسے ہی اس کے چہرے پہ نظر گئی اس کا رنگ فق ہو گیا۔

"ہائے! کیسی ہیں آپ۔؟" جودت اسے اپنی گہری نظروں کی زد میں رکھتے ہوئے قدم بڑھاتا ہوا قریب آ گیا۔

غزالہ جلیل راؤ

"آپ کون ہیں؟ میں آپ کو نہیں جانتی۔" مریم نے اپنی چادر درست کرتے ہوئے ناگواری سے کہا۔

"آپ کا گھائل ہوں' بس جاننے کے لیے یہی کافی ہے۔" جودت جتنے قدم بڑھا کے قریب آیا تھا' مریم اتنے ہی قدم اٹھا کر پیچھے ہوئی تھی۔

"شٹ اپ! تمیز سے بات کریں' آپ کون ہیں؟ کیا ہیں؟ مجھے یہ جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔" مریم کافی پراعتماد لڑکی تھی' وہ جودت سے متاثر ہونے والی نہیں تھی۔

"لیکن مجھے تو بتانے کی ضرورت ہے نا مریم فاروق نیازی؟" جودت نے اس کا پورا نام لیا' جس پہ مریم نے چونک کر دیکھا اور جودت اس کے ری ایکٹ پہ بے ساختہ مسکرا دیا۔

"کہتے ہیں کہ شکر خورے کو شکر مل ہی جاتی ہے' آج اس پہ بھی یقین آگیا ہے' راستے میں آپ کی ہی طلب کر رہا تھا اور یہاں آپ مل گئیں' اللہ کا شکر ادا کرنے کے علاوہ اور کیا کر سکتا ہوں بھلا۔" جودت اس کے چہرے پہ نظریں جمائے اسے بغور دیکھ رہا تھا اور مریم نے کچھ کہنا ہی چاہا تھا کہ جودت نے اسے روک دیا۔

"فی الحال کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے' میں ذرا جلدی میں ہوں' آپ سے پھر ملوں گا' اللہ حافظ۔۔۔" وہ اسے چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بے باک نظروں سے دیکھتا پلٹ کر چلا گیا اور مریم وہیں کی وہیں کھڑی دیکھتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼
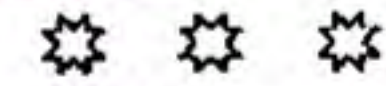
"شہناز بی بی! آپ سے کوئی ملنے کے لیے آیا ہے۔" انسپکٹر شہناز ڈیوٹی پہ جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی' جب ملازمہ کی اطلاع پہ اس کے ہاتھ رک گئے۔

"کون ملنے کے لیے آیا ہے؟" اس کا سوال کھوجتا ہوا تھا۔

"پتا نہیں کون ہے' آپ سے ملنے پہ بضد ہے۔" ملازمہ نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

"ٹھیک ہے' بٹھاؤ اس کو میں آ رہی ہوں۔" اس نے اجازت دیتے ہوئے اپنے آپ پہ ایک طائرانہ سی نگاہ ڈالی اور شوز پہننے کے بعد اپنی گاڑی کی چابی اور موبائل لے کر خود بھی نیچے آگئی' لیکن ڈرائنگ روم میں چار' پانچ گارڈز کے ساتھ اس آدمی کو دیکھ کر انسپکٹر شہناز بری طرح ٹھٹک گئی تھی' اس کی پیشانی پہ بل پڑ گئے تھے۔

"السلام علیکم۔" اسے دیکھ کر وہ آدمی کھڑا ہو گیا۔

"وعلیکم السلام! بیٹھیے۔" مجبوراً" اسے فارملیٹی نبھانی ہی پڑی۔

"شکریہ میڈم' بہت شکریہ۔" وہ آدمی بیٹھ گیا۔

"کہیے؟ کون ہیں آپ اور کس سلسلے میں آئے ہیں؟" اس کا لب و لہجہ پروفیشنل ہو چکا تھا۔

"ملک حق نواز نام ہے میرا' مومنہ بی بی کے کیس کے سلسلے میں آیا ہوں۔ دل آور شاہ اور مومنہ بی بی سے ملنا چاہتا ہوں' ملاقات کروادیں۔" اس نے اپنا تعارف کروایا تھا۔۔۔ نپے تلے انداز میں۔

"ملک حق نواز؟" انسپکٹر شہناز دنگ رہ گئی تھی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼
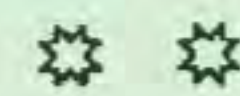
چشمِ تصور سے اس نے دیکھا' وہ لمبے لمبے دامنوں والی میکسی نما قمیص پہنے' لمبے لمبے برآمدوں اور راہ داریوں میں لگے شیشے کے فریموں اور آئینوں کو صاف کررہی ہوگی اور جب کوئی شیشہ چمک آشنا ہوگا تو کتنی ہی دیر اس کو مختلف زاویوں سے دیکھتی ہوگی۔ جب شیشے پہ کوئی داغ نظر نہیں آئے گا تو کتنی سندر سی مسکان اس کے پورے چہرے کا احاطہ کرے گی۔

دھیمے دھیمے انداز میں مسکراتی ہوئی وہ کم گو لڑکی اب پودوں میں پانی دے رہی ہوگی۔ کیاریوں میں کھلی ادھ کھلی کلیوں کو دیکھ کر اس کے نیم وا لبوں پر مسکرانے والی ساری کلیاں پھول بن کر کھل اٹھیں گی۔ وہ کتنی سندر لگتی ہوگی۔ کبھی یہاں' کبھی وہاں' دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی سارے کام سرانجام دیتی وہ کتنی اچھوتی اور خوب صورت لگتی تھی۔ اس کا رویہ حاکمانہ سا تھا۔ حالانکہ وہ تو کبھی اونچی آواز میں بات تک نہ کرتی تھی' پورے گھر کا کام کرتی؟ لیکن سامنے آجاتی تو یوں لگتا تھا ہاتھ لگادیا تو میلی ہوجائے گی۔

مزاج اتنا شاہانہ تھا کہ اس سے ملنے کو سب آتے تھے' وہ تو کبھی کہیں جاتی بھی نظر نہ آئی تھی۔ وہ ہر وقت مصروف رہتی۔ ہر وقت مصروف مگر اس کی پیشانی پر کبھی بل تک نہ ہوتا۔

صبح اذان کی آواز کے ساتھ بہت آہستگی سے وہ اپنا بستر چھوڑ دیتی۔ کیونکہ اس کے پاس اس کی سب سے چھوٹی بہن ثانیہ سوتی تھی۔ ساتھ کے پلنگ پہ سعدیہ' پپو اور خرم۔ البتہ بڑی دونوں بہنیں رادیہ اور فوزیہ الگ کمرے میں سوتی تھیں۔

اس کی امی گزشتہ چار برس سے معذور زندگی گزار رہی تھیں۔ ثانیہ کی پیدائش کے وقت ان کی ٹانگیں کسی لاپروائی کی وجہ سے کام کے قابل نہ رہی تھیں اور تب سے آئزہ نے ساری ذمہ داریوں کو از خود سنبھال لیا تھا۔

اس کے ابو ڈاکٹر تھے۔ لیکن بیوی کا علاج ان کے بس کا روگ بھی نہ تھا۔ فزیو تھراپی اور الیکٹرک شاک وغیرہ سے اتنا ہوا کہ وہ ٹانگوں کو ہلا جلا سکتی تھیں' لیکن چلنا پھرنا ممکن نہ تھا۔ آئزہ کو بہت دکھ تھا' لیکن اس کی ایک بہت بڑی خوبی تھی کہ وہ دکھوں کو زندگی کا حصہ سمجھتی تھی اور ان کا مقابلہ کرتی تھی۔ اس نے اس خوب صورتی سے بہن' بھائیوں کی ذمہ داری سنبھالی کہ لگتا ہی نہ تھا کہ گھر کی مالکہ معذور ہوچکی ہے۔ ہر کام اس قدر خوش اسلوبی' صفائی اور نفاست سے ہوتا کہ سب حیرت زدہ رہ جاتے۔

گھر میں نوکر چاکر بھی تھے۔ پرانی بوا بھی تھیں۔ بہنیں بھی ہر کام کے لیے مستعد رہتی تھیں' لیکن وہ خود کو ذمہ دار سمجھ کر ہر معاملہ خود سلجھانا چاہتی' اس روز جب وہ ڈیڈی کے کپڑے استری کررہی تھی۔ ڈیڈی اس کے پاس آئے اور بولے۔

"آئزی! بیٹی دانش کا فون آیا تھا وہ نوکری کے سلسلے میں یہاں آرہا ہے۔ ممکن ہے کچھ روز ٹھہرے تم بوا سے کہہ کر سامنے والا کمرہ ٹھیک کروادو۔"

حسبِ معمول اس نے ڈیڈی کا کمرہ صاف کیا اور الماری کھول کر بیڈ شیٹ اور تکیے نکال کر سامنے والے کمرے میں چلی گئی۔ پھر وہاں سے فارغ ہوکر کچن میں آئی تو امام دین معمول کے مطابق کام کررہا تھا۔

"امام دین کھانے میں دو' ایک چیزیں اور پکادو شاید دو مہمان ہوں گے۔" اس نے مختصر سی بات کی اور بڑے کمرے میں چلی گئی۔

"ثانیہ' سعدیہ' پپو' خاور چلو تم سب نہا کر کپڑے بدلو اور بالکل کوئی ہنگامہ نہیں کرنا۔ گھر میں مہمان آنے والے ہیں۔"

"کون آرہا ہے آپی؟" رادیہ نے شوخی سے کہا۔

"شاید پھوپھو۔" وہ چادریں تہ کرتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

"اور؟" رادیہ نے اسے چھیڑا۔

"دانش ہوں گے۔" اس کا لہجہ سپاٹ تھا اور بیٹھ موڑے موڑے جواب دے رہی تھی۔ وہ بھاگ کر یہ خبر فوزیہ کو سنانے چلی گئی۔

"سچ! دانش بھائی آرہے ہیں اور وہ بھی آج کی فلائٹ سے۔" فوزیہ کے لیے یہ خبر بہت خوش کن

تھی۔ سب کو معلوم تھا کہ پھوپھی اماں نے آئزہ کو بہت پہلے سے دانش بھائی کے لیے مانگ رکھا ہے۔ پھوپھی کی فیملی لاہور میں رہتی تھی اور یہ پہلا موقع تھا کہ دانش ان کے گھر آرہے تھے۔ انہوں نے بہت پہلے کبھی آئزہ کو دیکھا ہوگا۔ امی تو بیمار تھیں۔ یقیناً" آئزہ آپی ہی اب ان کی جگہ کمپنی دیں گی۔ ان سے باتیں کریں گی اور اس خیال سے ان کو کتنا اچھا لگ رہا تھا کہ شرمائی آپی کتنی پیاری لگیں گی۔ انہوں نے آج تک آپی کا یہ روپ نہ دیکھا تھا۔

کھانے سے کچھ دیر پہلے ہی وہ ڈیڈی کے ہمراہ ایرپورٹ سے آچکے تھے۔ باورچی خانے سے نکل کر وہ جیسے ہی ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی اس کے قدم وہیں ٹھٹک گئے۔ ڈیڈی کے ہمراہ صرف وہی تھا۔ پھوپھو تو نہیں آئی تھیں۔

کتنا وجیہہ' شکیل اور خوب صورت تھا۔ لائٹ بلو ٹی شرٹ اور کالی پینٹ میں اس کا اونچا لمبا سراپا مسحور کن تھا۔ اس نے پہلی نگاہ ڈالی اور اس کے بعد اس کی نگاہیں جھکی رہیں۔ البتہ چہرے کا رنگ مزید گلابی ہوچکا تھا۔

"بیٹے آپ کھانا لگواؤ۔ جب تک دانش ممانی سے مل لیتے ہیں۔" ڈیڈی نے اندر جاتے ہوئے کہا۔

"جی ڈیڈی۔" اس نے جلدی سے باورچی خانے کا رخ کیا۔ دانش اسے یک ٹک دیکھ رہا تھا۔ اس کی پشت پہ لہراتی ناگ جیسی سیاہ چوٹی کتنی خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس نے صرف ایک بار اپنی شرگیں آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔ اور وہ شرگیں آنکھیں اس کے اندر اس کی پوری ہستی کو تہ و بالا کرگئیں۔

ٹیبل پر کھانے چننے کے بعد اس نے پپو سے کہا۔

"ڈیڈی اور مہمان کو بلاؤ' کھانا ٹھنڈا ہوگیا تو بدمزا ہوجائے گا۔" اندر وہ ممانی کی حالت پہ افسردہ تھا۔ اس کے چہرے پہ تاسف اور لہجہ انتہائی دکھی تھا۔ وہ بات بات میں اپنی کوتاہی اور سستی پہ افسوس کا اظہار کررہا تھا۔

رادیہ اور فوزیہ بھی کالج سے واپس آچکیں تو کھانا شروع کیا گیا۔ وہ یونیفارم تبدیل کیے بغیر ڈائننگ ٹیبل پہ آگئیں۔ ڈیڈی نے آئزہ کو بلا بھیجا۔

"بیٹے آپ کھانا نہیں کھائیں گی۔" ڈیڈی کے شہد آگیں لہجے پر اس نے ایک دم نگاہیں اٹھا کر آئزہ کو دیکھا۔

پیلے جارجٹ کے دوپٹے اور پیلے لان کے کرتا شلوار میں اس کی سفید رنگت چمک رہی تھی۔ سیاہ گھنیری پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ اس کے دل میں کبھی جارہی تھی۔ رادیہ اور فوزیہ کے گالوں پہ شوخیاں ناچ رہی تھیں۔ ان کا دل چاہ رہا تھا۔ آپی یوں ہی ان کے سامنے بیٹھی رہیں۔ وہ کن آنکھیوں سے دانش کو دیکھ رہی تھیں جو انتہائی والہانہ پن سے اسے تک رہا تھا۔

"دانش بھائی پسند سے پسند نہیں آپ کو؟" فوزیہ نے نچلا ہونٹ شرارت سے دانتوں تلے دبا کر رادیہ کو ٹہوکا مارا۔

"فوزی کیا کررہی ہو؟ ڈونگہ ہاتھ سے چھوٹ جاتا تو۔۔۔"

"سوری۔۔۔" وہ پلیٹ پہ جھک گئی۔ آئزہ نے دونوں پہ تنبیہی نظر ڈالی تو وہ ایک دم سیدھی ہو بیٹھیں' مگر ان کو بات بے بات ہنسی آئے جارہی تھی۔

✡ ✡ ✡

اسے آئے پانچواں روز تھا اور وہ یہ دیکھ دیکھ کر حیرت زدہ تھا کہ وہ کس طرح معمول کے مطابق کام سرانجام دیتی ہے' لیکن اس کی کسی ادا سے تھکن کا اظہار تک نہیں ہوتا۔

نماز کے بعد وہ سیدھی باغ میں آتی' تھوڑی دیر چہل قدمی کرتی' پھر گلاب اور چنبیلی کے پھول توڑتی اور اماں کے کمرے میں چلی جاتی۔ ان کی تمام ضروریات جیسے اسے ازبر تھیں۔ کتنا صبر' حوصلہ اور ثابت قدمی تھی۔ ڈیڈی سے لے کر تمام بہن' بھائیوں کی ایک ایک چیز کا خیال اسے تھا۔ گھر کی تمام تر ذمہ داری اس پر تھی۔ یہاں تک کہ بوا کا بھی اسے دھیان تھا۔

"بوا، رات آپ کے دانت میں درد تھا۔ کیسی طبیعت ہے؟" اس نے ناشتا بناتے بناتے ہاتھ روک کر دروازے میں کھڑی بوا سے پوچھا۔

"اچھی ہوں بٹی۔ رات میں نے دانت میں لونگ رکھ لیا تھا تو نیند آگئی تھی، اب دانت میں تکلیف نہیں ہے۔" بوا اسے اکیلا کام کرتے دیکھ کر اپنا درد چھپا رہی تھیں۔

"آج آپ آرام کرو بوا، کچھ کام میں کرلوں گی۔"

"نہیں میری بچی! میں ٹھیک ہوں اور پھر گھر میں مہمان ہے، کام کچھ بڑھا ہوا ہے، آپ اکیلی۔۔۔"

"بوا، میں اس گھر میں مہمان کہاں سے ہوگیا۔ میں نے تو بہت سارے دن رہنا ہے۔" وہ تمام تر وجاہتوں سمیت کچن کے دروازے میں ہاتھ میں ملک باٹ لیے کھڑا تھا۔

"ارے جم جم رہو میاں، مگر آپ کچن میں کیوں چلے آئے؟"

"ذرا دودھ چاہیے۔" اس نے آئزہ پر نظریں جما کر کہا۔

"آپ چلیے میاں میں لاتی ہوں۔" بوا نے ایک دم دیگچی سے دودھ انڈیلا اور دودھ دانی میں ڈالنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

شام بہت دل فریب تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی مسحور کن ہوائیں چل رہی تھیں۔ اور اس کے لانبے لانبے کھلے بالوں کی خوشبو ان ہواؤں میں مل کر فضاؤں میں تحلیل ہو رہی تھی۔

دانش کو مہندی کی خوشبو بہت اچھی لگتی تھی اور آئزہ نے شاید بالوں میں مہندی لگا رکھی تھی۔ اس کے کھلے گیلے بالوں کی اڑتی خوشبو نے اسے بے خود کر دیا۔

ڈیڈی، پپو اور خاور کو لے کر باہر نکل گئے تھے۔ سعدیہ اور ثانیہ اپنے کتے کو نہلا رہی تھیں۔ رادیہ اور فوزیہ ٹیسٹ کی تیاری کر رہی تھیں۔ وہ لان میں ذرا فاصلے پہ کرسیاں ڈالے بچوں کو دیکھ رہے تھے۔

وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے چہرے پر پھیلا سنجیدہ سنجیدہ سا تبسم اور اس کی مدبرانہ گفتگو کا انداز اس کے اندر جھجک پیدا کر رہا تھا کہ وہ اس سے دل کی بات کہہ دے۔ چند لمحے وہ کچھ سوچتا رہا، پھر اپنی کرسی اس کے قریب کرتے ہوئے بولا۔

"آئزی! مجھے یقین ہی نہیں آتا کہ ہماری اتنی لمبی جدائی میں حالات کیا سے کیا ہو جائیں گے، اور تم کتنی بدل جاؤ گی، تم اتنی کم گو تو کبھی نہ تھیں۔"

"ہاں میں بھی سوچ رہی ہوں۔ فاصلے اتنے طویل تو نہ تھے جتنے بن گئے۔" اس نے اپنی موی انگلیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"مما تو آپ لوگوں کا ہر وقت ذکر کرتی رہتی ہیں۔"

"ظاہر ہے، پھوپھی جو ہوئیں۔" وہ مختصر سے مختصر بات کر رہی تھی۔ جبکہ دانش کا مقصد طویل گفتگو کا تھا۔

"تمہیں یاد ہوگا آئزی! بچپن میں ہم ایک دوسرے کے بغیر کوئی گیم نہیں کھیلتے تھے۔ کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ کچھ کھاتے پیتے تھے۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تم اتنی سنجیدہ، اتنی بردبار اور بزرگ ہستی بن جاؤ گی، تم تو بہت شوخ و شنگ ہوا کرتی تھیں۔" اس نے بہت معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھ کر اسے کچھ اور یاد دلانا چاہا۔

"ہاں! کبھی کبھی میں بھی سوچتی ہوں ایسا کیسے ہوگیا؟ سب کچھ بدل گیا۔ دراصل میں بڑی تھی، شاید اس لیے اپنی ذمہ داریوں کو نا صرف محسوس کیا بلکہ قبول بھی کر لیا۔" اس نے اپنے دونوں خوب صورت مرمریں ہاتھ اپنی گود میں رکھے ہوئے تھے۔ لگتا تھا وہ اس موضوع سے ہٹ جانا چاہتی تھی، اس نے نئی گفتگو کا آغاز کیا۔

"آج دن بھر گرمی زیادہ رہی۔ ابھی موسم بہتر ہے۔" خوب صورت معصوم چہرے پر الجھنیں بکھری پڑی تھیں۔

"کراچی کی شامیں بڑی دلکش ہوتی ہیں کیا خیال ہے کہیں چلنا نہیں چاہیے۔" وہ جس موضوع سے بچنا چاہتی تھی۔ دانش اسی پر بات کرنا چاہتا تھا۔

"اوہ، نہیں۔۔۔ شاید آپ بھول گئے کہ میری مما بہت بیمار ہیں۔ وہ اپنا کوئی کام خود نہیں کرسکتیں۔ میرے بہن، بھائی بہت چھوٹے ہیں اور ڈیڈی بہت تنہائی محسوس کرتے ہیں۔ اس گھر کو میری ہر وقت ضرورت ہے۔ میں ان کو ذرا دیر بھی تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔"

"تم نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے؟" دانش آخر وہ بات زبان پر لے ہی آیا جس نے اس کے اندر بڑی ہلچل مچا رکھی تھی۔

"اپنے بارے میں؟" وہ ایک دم پریشان ہوگئی۔

"مجھے کیا ہوا، میں نے اپنے بارے میں کیا سوچنا ہے اور پھر ابھی تو سوچنے کا میرے پاس وقت ہی نہیں۔"

"لیکن مما نے مجھے کہا تھا کہ تم ماموں، ممانی بلکہ آئزی سے پوچھ کر آنا۔ وہ جلد از جلد اس فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی ہیں۔"

اس نے بہت توجہ اور غور سے دانش کی بات سنی۔ لحہ بھر کو اس کے چہرے پہ دھواں دھواں سا نمودار ہوا، پھر وہی مسکراہٹ آگئی جو اس کے وجود کا حصہ بن چکی تھی، اس کے کردار کا جزو تھی اور جسے لبوں پر سجا کر وہ کچھ بھی منوا سکتی تھی، وہ بہت آہستگی سے اور بڑے دھیمے پن سے بول رہی تھی۔

"دراصل دانش! بات جب میری اپنی سمجھ سے بالاتر ہے تو میں آپ کو کس طرح سمجھاؤں، ویسے کوشش کروں گی، آپ سمجھ جائیں اور یہ اچھا بھی ہے کہ اس موضوع پر آج بات ہو جائے، میری زندگی میں اتنے نشیب و فراز آچکے ہیں کہ زندگی میرے لیے معمہ بن چکی تھی، پھر میں نے اس معمے کو خود ہی حل کر دیا۔ اب میں بہت پرسکون اور مطمئن ہوں۔ میں نے سوچ لیا کہ اپنی ساری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنے بھائی، بہنوں کو اس قابل بنا دوں کہ ان کو قدم قدم پہ سہاروں کی ضرورت نہ پڑے۔" اس نے دانش پر بڑے واضح الفاظ میں ظاہر کر دیا کہ وہ اپنے بارے میں ابھی نہیں سوچے گی۔ ابھی منزل اس سے کافی دور ہے اور اسے بہت سارے لوگوں کو ان کی منزل مقصود پہ پہنچانا تھا اور اس کی اس قربانی کے بغیر وہ سارا خاندان بکھر جاتا۔ رادیہ اور فوزیہ اتنی سمجھ دار نہ تھیں کہ فوراً آپڑنے والی آفت ناگہانی کا مقابلہ کرسکتیں۔ یوں بھی دونوں جڑواں تھیں اور آئزہ سے سات برس چھوٹی تھیں۔

آئزہ کے اندر جنگ ہو رہی تھی۔ فرض اور محبت کی جنگ، بے شک اس نے ظاہر نہیں کیا تھا، لیکن دانش کو دیکھ کر اس کے انگ انگ میں اس کی برسوں سے دبی محبت بیدار ہوگئی تھی۔ وہ قسمت کی ستم ظریفی پر افسردہ تھی۔ اسے دکھ ہو رہا تھا۔ کاش اس کے بعد جو دو بھائی پیدا ہوئے تھے، اگر نہ مر گئے ہوتے تو وہ پھر مثبت انداز میں سوچتی۔

مگر نہیں! لڑکے تو بڑے لاابالی ہوتے ہیں۔ اور پھر ان کو بھی تو تعلیم کا مسئلہ ہوتا۔ وہ کیسے سب مسائل حل کرتے۔ کیسے گھر چلاتے تب بھی یہ فیصلہ صرف آئزہ کو کرنا ہوتا اور آج بھی اس مقام پہ آئزہ ہی کھڑی تھی۔ کیسے وہ رادیہ اور فوزیہ کو کہتی۔

"دینی تعلیم کو خیرباد کہہ دو، اس گھر کے گرتے ستونوں کی جگہ کھڑی ہو جاؤ۔ اپنی شوخیاں، شرارتیں اور بچپن بھول جاؤ۔" نہیں اس سے یہ ظلم نہیں ہوسکتا۔ وہ ان کی معصومیت نہیں چھین سکتی تھی۔ ایک اپنی ذات کے لیے وہ اتنے لوگوں کو منتشر نہیں کرے گی۔ اگر اس نے ایسا کیا تو یہ اس کی خود غرضی ہوگی۔

"دانش!" وہ خلاؤں میں گھورتے ہوئے بولی۔

"اور تم نے اپنے بارے میں کیا سوچا؟"

"میں انتظار کروں گا آئزی۔۔۔ تمہارا انتظار، جب تم سارے فرض نبھا لوگی تو بہت تھک جاؤ گی، تب تمہیں بھی تو کسی سہارے کی ضرورت ہوگی، مگر شرط یہ ہے کہ تم۔۔۔"

"پیار شرطوں کا محتاج نہیں ہوتا دانش۔" اس نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تم اس رشتے پر شرط لگا کر میری توہین نہ کرنا۔ جب پیار میں شرط حائل ہو جائے تو قدم قدم پر اپنی غرض نظر آتی ہے۔ پیار شرطوں پہ طے ہونے

والا بیوپار تو نہیں ہوتا۔ اگر تم ایسا چاہو گے تو میرے جذبوں کی توہین ہوگی۔ تم فیصلہ کرلو دانش۔۔۔ تم سے وابستہ لوگوں کے بھی کچھ ارمان ہوں گے۔ کچھ تمنائیں اور خوشیاں ہوں گی۔ میں اپنے لوگوں کو جب تک منزل تک نہ لے آؤں تمہارا ساتھ نہ دے سکوں گی اور تم خود سوچو ابھی تو ببو صرف پانچ برس کا ہے۔ بہت لمبی عمر چاہیے۔ راویہ اور فوزیہ کے گھر بساؤں گی۔ سعدیہ کو زمانے کی گرم ہوا کی تپش سے محفوظ رکھوں گی۔ خاور اور ببو کو بہت سارا پڑھا کر باہر بھیجوں گی۔ تاکہ اپنی ماں کی بے جان آنکھوں میں دمکتے پانی کے قطرے جو بے بسی سے ابل پڑتے ہیں۔ موتی کا روپ نہ دھار لیں۔" اس کے چہرے پہ چٹانوں کی سی سختی ابھر آئی تھی۔

"اچھا!" وہ بہت گہری سوچوں سے چونک کر بولا۔ "تم اکیلے یہ سب کرلوگی۔"

"ہاں! راستے میں کوئی دیوار نہیں اٹھے گی اور کسی نے کوئی دیوار اٹھانا چاہی تو۔۔۔" وہ ہنس پڑا۔

"تم انہی پتھروں سے اسے زخمی کردوگی۔" وہ مسکرا دی۔ اس ملکوتی مسکراہٹ نے اس چاند چہرے کو اور بھی دل آویز بنادیا' وہ یک ٹک اسے دیکھے گیا۔

"تم مجھے کیا سمجھتی ہو؟" اس نے ایک دم بہت مشکل سوال کر ڈالا چند لمحے وہ غور سے اسے دیکھتی رہی' پھر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔

"خود کو بہت مضبوط سمجھتی ہوں۔"

"میں نے اپنے بارے میں پوچھا ہے۔" اس نے اس کے چہرے کو دل میں اتارتے ہوئے پوچھا۔

"تم بہت اچھے انسان ہو' یقیناً" میری مجبوریوں کو سمجھ لوگے۔"

"اور اگر میں تم سے کہوں۔ آؤ۔۔۔ دکھ سکھ بانٹ لیں تو۔۔۔؟" اس نے امید بھری نظروں سے دیکھا۔

"نہیں دانش! جن کو تم دکھ سمجھتے ہو وہ میرے بہن' بھائی ہیں۔ میرے ماں' باپ ہیں اور میں زندگی کے کسی موڑ پر اپنے فیصلوں میں کمی بیشی نہیں کروں گی۔ میں ان دکھوں کو سینے میں چھپالوں گی۔"

"آئزہ۔۔۔" اس نے جذبات سے پکارا۔

"میں سن رہی ہوں دانش!" اس نے جھکا ہوا سر نہیں اٹھایا' وہ اپنی کسی کمزوری کے اظہار کی قائل نہ تھی اور یہاں اسے خدشہ تھا' وہ جانتی تھی اس کا من پگھل جائے گا۔ وہ ان آنکھوں کی پیاس کا مقابلہ نہ کرپائے گی جو اس کی دید' اس کی خوشبو کی' ارمانوں اور چاہتوں کی پیاسی تھیں۔

اگر ایک بار بھی وہ دانش کی آنکھوں میں دیکھ لے گی تو پھر پیار کی ان گہرائیوں میں ڈوب جائے گی' جہاں اس کے لیے رنگوں کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ اس کی امنگوں اور چاہتوں کے رنگ اور اس سے وابستہ لوگوں کی زندگی بے رنگ ہوجائے گی۔

"میں نے سوچا تھا شبستان ان آنسوؤں سے جلتے ہوں گے جو میری محبت میں جدائی بن چکی ہیں۔ لیکن یہ میری خوش فہمی تھی۔" اس کے چہرے پر لکھی تحریر کتنی واضح تھی۔

"میرے لیے تو میری وہ محبوب ہستی ہی میری محبتوں سے منکر ہے۔ تو میں کیونکر آسودہ اور مطمئن رہوں گا۔ میں نے سوچا تھا تمہیں میری ضرورت ہوگی۔ تو جان بھی تحفے میں دے ڈالوں گا۔۔۔ لیکن تم۔۔۔"

"پلیز دانش پلیز! میرے پائے استقلال میں لرزش تو نہ لاؤ' مجھے تو بہت لمبے سفر پر جانا ہے۔ تنہا اور پاپیادہ راستے میں بڑی کٹھنائیاں ہوں گی۔ بڑے پرپیچ اور دشوار گزار مرحلے آئیں گے۔ میرے پاس زادِ راہ کے لیے یہ تقویت تو رہنے دو کہ میں چاہتوں کی بے بہا دولت کی مالک ہوں۔" مگر وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اور گود میں رکھے ہاتھوں کو چپ چاپ دیکھتی رہی۔

دھیرے دھیرے آہستہ خرامی سے رات در و بام کو اپنے سیاہ دبیز اندھیروں میں لپیٹنے لگی۔ وہ دونوں اپنی کرسیوں پہ خاموش' بے جان مجسموں کی طرح بیٹھے رہے' نہ جانے کب ببو' خاور آئے' کب ثانیہ اور راویہ انہیں اندر لے گئیں۔ شاید انہوں نے آپو کے معصوم چہرے پر خوشیوں کی دھنک لانے کے لیے ان

کو بہت سارا وقت دینے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ان کو کیا معلوم کہ یہ وقت تو ان سے ساری امیدیں' ساری تمنائیں' اور خوشیوں کی جانب جانے والے راستے چھین رہا تھا۔

"آؤ آئزہ اندر چلیں' شاید اوس زیادہ پڑ رہی ہے۔" دانش نے بہت ثابت قدمی سے اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھایا۔ وہ چونک پڑی۔

"ہاں چلو۔" اوس تو ان کے جذبوں پہ پڑ چکی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے قدم رکھتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

✡ ✡ ✡
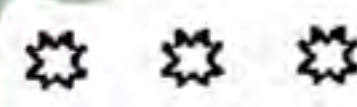
اگلی صبح حسبِ معمول وہ اپنی پرانی روش پہ قائم تھی۔ وہی باغ کی سیر' وہی پھول توڑنا' ممی' ڈیڈی کے کمروں میں جانا اور گھر بھر کی دیکھ بھال' لیکن اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ کھڑکی میں کھڑا دیکھ دیکھ کر سوچتا رہا۔

"ہاں! آئزہ اب میں محسوس کررہا ہوں کہ تیرے اندر آگ روشن ہے۔ آج شبستان تیرے آنسوؤں سے جل رہے ہوں گے۔ اے میری محبوب ہستی! آج تو تو میری محبتوں سے منکر نہیں ہوسکتی' میں اس امید پہ تمہیں اللہ حافظ کہوں گا کہ میری محبت تیری نس نس میں میرا انتظار بن جائے گی۔ میں تمہیں بہت سارا وقت دوں گا۔" اور پھر وہ واقعی چلا گیا۔ ایک نامعلوم عرصے کے لیے اس نے اس کے جانے کا سنا اور گنگ ہوگئی۔ لیکن جاتے جاتے وہ جو اپنی آنکھوں کے سحر سے اسے مسحور کر گیا تھا۔ اس نے اسے بہت ہلکا پھلکا کردیا۔

"اب کب آؤ گے دانش بھائی؟" شوخ و شنگ فوزیہ نے جھکی جھکی پلکوں والی اپنی پیاری آپو کو نظروں کی زد میں لاکر سوال کیا۔

"جب بھی تم یاد کروگی۔" اس نے خوش دلی سے کہا۔

"میں تو آپ کو چوبیس گھنٹے یاد کروں گی۔ لیکن کچھ لوگوں کو تو یاد کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ ان کے بارے میں کیا خیال ہے۔"

"ایسی بات ہے تو ہم کبھی نہیں آئیں گے۔ ہم سے تو ہماری یاد اچھی ہوئی پھر۔" دانش نے اداسی سے کہا' اس کے لہجے کی مایوسی سے سب چونک پڑے۔ آئزہ نے گھبرا کر نظریں اٹھائیں' تب فوزیہ کو ایک دم احساس ہوا کہ آپی کی آنکھیں سوجی ہوئی اور سرخ ہیں۔ وہ شاید روتی رہی ہوں۔ شاید نہیں ضرور' اس کی آنکھوں نے گواہی دی۔

"آپو! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" اس نے محبت پاش نظروں سے باری باری دونوں کو دیکھا اور ان کے چہروں پہ چھائے ملال کے موسموں نے اسے دکھی کردیا۔ لیکن وہ اپنی آپو کو جانتی تھی۔ یقیناً" دانش بھائی کی خواہشوں کو زد کردیا گیا ہوگا۔ وہ ان سب کے لیے بہت حساس تھیں۔ اپنی خوشیاں' اپنا سکون د آرام بیچ کر ان کو زمانے کے سرد گرم سے بچانے کے لیے ہر قیمت پر تیار تھیں۔ اپنی خوشیوں کو بھی داؤ پہ لگا دیا۔ دانش چلا گیا' کبھی نہ آنے کے لیے' لیکن جاتے جاتے وہ چپکے چپکے اسے کہہ رہا تھا۔

"میں جارہا ہوں آئزی! تم سے دور۔۔۔ بہت دور اگرچہ تم بہت بہادر سہی' لیکن میری محبت تمہیں کمزور کردے گی۔ میں عورت کی فطرت کو سمجھتا ہوں۔ وہ اپنی محبت سے کبھی بے دخل نہیں ہوسکتی اور میرا یقین ہے تم مجھ سے محبت کرتی ہو' تم بہت بہادر ہو آئزی' بہت بہادر۔" اس نے اس کے دونوں ہاتھ عقیدت اور محبت سے تھام کر لبوں سے لگالیے۔

"تم کائنات کی مضبوط ترین حقیقت ہو آئزی! مجھے اس سے انکار نہیں' لیکن میری محبت تمہارے ارادوں کو کمزور کردے گی اور میں تمہیں کمزور نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے تمہارا یہ روپ پسند ہے۔ تم زندگی سے لڑ رہی ہو' میں تمہارے حق میں یہ جنگ جیتنے کی دعا کروں گا۔ میں جارہا ہوں' لیکن میں پھر آؤں گا اور اس وقت آؤں گا جب زندگی تمہارے اندر تمام تر جذبوں کے ساتھ کروٹ لے کر بے دار ہوجائے گی۔ تم میرا

اور میں وقت کا انتظار کروں گا۔"

☼ ☼ ☼

وقت دھیرے دھیرے گزرنے لگا۔ وہ بے وفا وعدوں کے جال میں باندھ کر ایسی آس دے گیا کہ اذیتوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ زندگی تمام تر دکھوں سمیت اس کے فرائض میں اضافے کرتی رہی اور پھر تاریک رات جب گھر بھر محو آرام تھا اور وہ جو کئی برس سے پلنگ پر پڑا وجود صرف اور صرف اس کے لیے بے انتہا قیمتی سرمایہ تھا۔ چپ چاپ وہ پلنگ خالی کر گیا۔

محبتوں اور ممتا سے خالی وجود اس کے اندر تباہی و بربادی بن گیا۔ وہ ماں تھی۔ معذور تھی۔ لیکن سرمایہ تھی' دعا تھی' سائبان تھی' سہارا تھی' تقویت تھی۔ اس کے بعد تو کچھ بچا ہی نہ تھا۔ وہ کتنی خالی خالی اور تہی دامن رہ گئی تھی۔

راویہ اور فوزیہ کے چہروں پر چھایا پیلا پن، ان کے لبوں سے چھن جانے والی ہنسی' گالوں پر اٹلتی شوخیاں' کچھ بھی تو نہ رہا۔ جیسے سب بے اماں ہو گئے تھے۔ ثانیہ' خاور' ببو اور سعدیہ کی آنکھوں میں ویرانیاں اتر آئیں۔ ڈیڈی چند دنوں میں بہت بوڑھے لگنے لگے۔ وہ خود دکھی تھی لیکن اس نے ایک بار پھر اپنی ہمتوں کو جمع کیا اور آنکھوں میں آئی ساون بھادوں کو برف کی تہوں میں چھپانے کا ملکہ حاصل کر لیا۔ وہ اپنے دکھوں سے تنہا ہی دست و گریبان رہی اس نے سوچا۔ یہ دنیا ہے۔ اور دنیا میں رہنے والے سب کچھ بھلا کر زندہ رہتے ہیں۔ کائنات کا کوئی کام اس وقت تک چل ہی نہیں سکتا جب تک آنے والے وقت کا ساتھ نہ دیا جائے۔

یہاں تو ایک چلتا پھرتا' سو کام سنوارتا وجود' اپنی ذات میں ایک ادارہ ایک انجمن ــــ دنیا چھوڑ دے تو اس کو بھی چند دنوں کے ــــ بعد بھلا دیا جاتا ہے۔ مسز جواد تو ایک معذور اور بے کار لاش میں ڈھل چکی تھیں لیکن آئزہ کے لیے ان کو فراموش کر دینا ممکن ہی نہ تھا۔

صحیح معنوں میں اس نے ممتا کے جذبوں کو محسوس کیا' اور ماں کا روپ دھار لیا۔ وہ تو نہ جانے کب سے ماں کا روپ دھارے ہوئے تھی۔ اس نے بڑے ناز و نعم سے ان سب کی پرورش کی' اپنی بھرپور توجہ اور شفقت سے ان کو پروان چڑھایا۔ راویہ اور فوزیہ کی پڑھائی مکمل ہو گئی تو دونوں کی شادیاں کر دیں۔ وہ دونوں تو اپنی آپو کے اس روپ کے سامنے سجدہ ریز تھیں' کئی بار جب وہ سسرال سے آتیں تو منت بھرے انداز میں کہتیں۔

"آپو! ہم سب بہت خوش نصیب تھے کہ ماں کی کمی کبھی محسوس نہ ہوئی آپ نے جو کچھ کیا ایک ماں اس سے زیادہ کیا کرتی۔ لیکن آپو آپ کا بھی تو اپنی ذات پر کچھ حق ہے۔ اب تو ببو اور خاور بھی اپنی تعلیم مکمل کر چکے ہیں۔ آپ نے ان کو باہر بھیج کر پڑھانے کا شوق بھی پورا کر لیا' اب کیا ہے آپو؟"

"فوزیہ تم سمجھتی کیوں نہیں۔ ڈیڈی بہت نفاست پسند ہیں۔ ان کو شروع روز سے میرے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا پسند ہے۔ ببو اور خاور کے گھر بسانے ہیں ان کو بھی تو میری ضرورت ہے۔ ہاں سعدیہ کی وجہ سے میں بہت فکر مند ہوں نہ جانے کیوں یہ لڑکی بہت بے چین' منتشر اور بکھری بکھری سی ہے۔ زندگی کی ہر خواہش ہر تمنا پوری ہونے کے باوجود وہ خوش نہیں۔ میں اس کی ہر خوشی پوری کرنا چاہتی ہوں۔ تم اس سے پوچھو تو سہی۔" تب وہ بہت افسردہ ہو گئیں شاید انہیں سعدیہ سے بھی کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔

راویہ اور فوزیہ اپنے گھروں کو لوٹ گئیں۔ ڈیڈی کا بہت سارا وقت لائبریری میں گزرنے لگا۔ ببو اور خاور اپنی اپنی جاب اور دنیا کی رنگینیوں میں گم ہو گئے۔ آئزہ کو محسوس ہو رہا تھا کہ ان میں اب وہ پہلی والی بات نہیں رہی۔ بلکہ شاید وہ بھی اپنی مرضی کرنا پسند کریں اور سعدیہ جس نے اس کو بچوں کی طرح پالا تھا۔ وہ تو کبھی کبھی بدتمیزی پر اتر آتی تھی۔ سارا غصہ ثانیہ پر نکالتی۔

پھر ایک روز وہ خود سعدیہ کے کمرے میں گئی۔ اس کا بے ترتیب کمرہ اس کی منتشر طبیعت کا گواہ تھا۔ وہ باتھ روم میں تھی۔

اس نے سلوٹوں سے بھری بیڈ شیٹ کو کھینچ کھینچ کر درست کیا' قالین پر سینڈلوں کے بے ترتیب جوڑوں کو ریک میں رکھا اور کتابیں ٹیبل پر لگا کر دوپٹے کے کونے سے شیشہ صاف کرنے لگی۔ اسی وقت سعدیہ باتھ روم سے باہر آ گئی۔ سبز سادہ سوٹ میں وہ اسے ایک دم بہت بڑی بڑی لگی۔ اس کا خوب گورا رنگ چمک رہا تھا اور وہ بہت خود اعتمادی سے قدم اٹھاتے ہوئے اس کے قریب آن کھڑی ہوئی۔ اس نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ بدلی بدلی سی لگ رہی تھی جیسے وہ ایک دم ہی بہت بڑی ہو چکی ہو۔

"سعدیہ۔" وہ اس کا نام لے کر رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اسے کیا کہے۔

"آپ کچھ کہہ رہی تھیں آپی۔" اس نے قدرے بے زاری سے کہا۔

"سعدی تم نے اپنا کمرہ بہت گندا رکھا ہوا۔ صاف کرو بیٹے۔ لڑکیاں تو بہت نفاست پسند ــــ"

"لو آپی صاف کر لوں گی۔" اس نے آئزہ کے ہاتھ سے کتاب لے لی۔

"سعدی کیا بات ہے۔ تم اتنی الجھی الجھی سی کیوں ہو؟ کوئی بات ہے تو مجھے بتاؤ۔ آخر مجھے نہیں بتاؤ گی تو کس کو بتاؤ گی بیٹی۔"

"یہ ضروری بھی تو نہیں کہ ہر بات آپ کو بتائی جائے۔" اس نے رکھائی سے کہا۔ اور زور سے باتھ روم کا دروازہ بند کر کے باہر نکل گئی۔ وہ ہکا بکا کھڑی رہ گئی۔

اسے غصہ تو بہت آیا مگر اس نے سوچا۔

"بچی ہے' لاڈ و پیار میں پلی ہے۔ اور پھر اولاد بھی تو کبھی کبھی ماں باپ سے اس طرح کا اظہار کر ہی دیتی ہے۔ میں خاور اور ببو کو کہوں گی وہ اسے سمجھا دیں گے۔" یہ سوچ کر وہ مطمئن ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

اس روز جب بہت گرمی پڑ رہی تھی۔ وہ کالج سے لوٹی تو ثانیہ اس کے ہمراہ نہ تھی۔ آئزہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ پہلی بار ایسا نہیں ہوا تھا۔

"سعدیہ' ثانیہ کہاں ہے؟ اس کو اکیلا چھوڑ کر کیوں آ گئیں؟"

"مجھے نہیں معلوم آپی! ثانیہ اب بچی تو نہیں کہ میں روز کالج سے اس کے اسکول جاؤں اور اسے ساتھ لے کر آؤں۔ اسے کہیں خود ہی اپنی بس سے آیا کرے۔ انگلی پکڑ کر لانے کی عمر گئی۔"

"سعدیہ! تم بہت بدتمیزی ہو گئی ہو۔ تمہیں نہیں معلوم بڑوں سے کس طرح بات کی جاتی ہے۔" آئزہ نے اپنا بے پناہ غصہ دبا کر اسے تنبیہی انداز میں ڈانٹا۔

اس نے اپنا پرس اور کتابیں مزید بدتمیزی سے ٹیبل پر پٹخیں اور پلنگ پر گر کر بازو آنکھوں پر رکھ لیے۔

آئزہ نے گھبرا کر اس کی آنکھوں سے بازو ہٹانا چاہا۔

"سعدی! طبیعت تو ٹھیک ہے۔ خیریت تو ہے۔ کسی سہیلی سے لڑ پڑیں۔؟ آخر کیا ہوا؟ بتاؤ گی نہیں تو پتا کیسے چلے گا۔" اس نے اپنا بازو بے زاری سے چھڑا لیا اور بدتمیزی سے بولی۔

"مجھے کچھ نہیں ہوا۔ بس مجھے چھوڑ دیں۔ ہر وقت ہر بات نہ پوچھا کریں۔"

"سعدیہ!" آئزہ کو بہت غصہ آ گیا۔

"تم بہت نڈر' خود سر اور بدتمیز ہو چکی ہو آئندہ مجھ سے بات نہ کرنا۔"

اس روز جب اس نے سعدیہ کے بارے میں ببو اور خاور سے بات کی تو اسے یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ وہ بھی سعدیہ سے کم نہ تھے بلکہ خاور نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا۔

"آپی پلیز' سعدیہ بہت حساس ہے اور حساس لوگوں کے لیے ذرا سی بات بھی بہت ہوتی ہے۔ اسے آپ کی ہر وقت کی نگرانی سے چڑ ہونے لگی ہے۔ وہ کہتی ہے۔ آپی ہر وقت مجھے ٹوکتی ہیں۔ یہ کیوں پہنا۔ میں اب بچی تو نہیں۔ چوبیس گھنٹے نصیحتیں کرتی رہتی ہیں۔ بغیر جانچ پڑتال کیے دوستیاں نہ کرو اور لوگوں کو گھر پر نہ بلاؤ۔ زمانہ بہت خراب ہے۔ کسی کی پہچان ممکن ہی نہیں۔ اکیلی آنے کی بجائے ثانیہ کا

ساتھ ہونے کے باوجود دو چار لڑکیوں کے ساتھ آؤ۔ جیسے کسی نے مجھے ہی تو اغوا کرنا ہے۔
یہ کرو۔ وہ نہ کرو۔ وہ کرو یہ نہ کرو۔ یہ بھی بھلا کوئی زندگی ہے۔ کاش میری ماں ہوتی تو میری بات سمجھتی۔ دراصل آپی ماں کی محرومی نے اسے۔۔۔" وہ خزاں رسیدہ پیلے پتے کی طرح کانپتی ہوئی آپی کی حالت سے بے خبر سعدیہ کی حمایت میں بول رہا تھا۔
"بس کرو خاور بس کرو۔" وہ ہذیانی انداز میں چیخی۔
"کاش تمہاری ماں زندہ ہوتی تو دیکھتی کہ کتنی کوتاہیاں ہوئیں مجھ سے وہ زندہ ہوتیں۔ جو اپنی زندگی میں چھ سال تک مردہ رہیں۔" وہ سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے اپنے کمرے میں گھس گئی۔ اندر سے کمرہ بند کرلیا۔

اس رات وہ جی بھر کر روئی۔ اس نے کیا کیا نہ کیا تھا۔ اور صلے میں ملنے والی بے چارگی اور محرومی کے احساس نے اسے زندہ درگور کردیا۔ وہ کتنی حرماں نصیب تھی اس کی ساری قربانیاں رائیگاں ہوگئیں۔
رات بھر رونے سے اس کی طبیعت بے حد خراب ہوگئی۔ صبح صبح ڈیڈی نے اس کا کمرا کھلوایا تو یہ دیکھ کر ان کی حالت خراب ہوگئی کہ اس کو بہت تیز بخار تھا آنکھیں سوج سوج کر پلکیں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی تھیں۔ ڈیڈی کو دیکھ کر اس نے آنکھوں میں امڈ آنے والے آنسوؤں کو بری طرح رگڑ کر صاف کیا۔ وہ ان کو کچھ نہ بتانا چاہ رہی تھی۔
"یہ سب کیسے ہوا بیٹا جی۔" انہوں نے اسے لٹا کر چادر درست کی اور نرم نرم ہاتھوں سے اس کا سر دبانے لگے۔

"پتا نہیں جی۔ شاید فلو کا اثر ہے۔" وہ ان کو ہرگز پریشانی میں نہ دیکھ سکتی تھی۔ ان کے بے چین ہونے پر بھی وہ شرمندہ تھی۔
سعدیہ' خاور' ثانیہ اور بپو سر جھکائے شرمندہ شرمندہ سے کمرے میں کھڑے تھے سب سعدیہ کو ٹھوکے مار رہے تھے اور پھر وہ آپی کے پاس آئی جیسے جل تھل مچ گیا۔ ان کے ہاتھ تھامے وہ بری طرح رو رہی تھی۔
"مجھے معاف کردو آپی۔ پلیز مجھے معاف کردو۔" پھر اس نے اسے سینے سے لگالیا اور اس کا سر پیار سے تھپتھپانے لگی۔
"پاگل نہ ہو تو۔" خاور' بپو' ثانیہ اور سعدیہ سب کچھ بھلا کر اس کے اردگرد جمع تھے۔ اس کی ایک آواز پر چاروں بھاگ کر آتے ڈیڈی کا بہت سارا وقت اس کے پاس گزرنے لگا لیکن اس کا دل اندر سے جیسے خالی ہوچکا تھا۔ اس کو نہ معلوم سا احساس پریشان کررہا تھا۔ دل میں ہولے ہولے درد سا اٹھتا اور وہ بے چین ہوجاتی' خوف زدہ نظروں سے اپنے اردگرد دیکھتی جیسے وہ ایک روح ہو۔ وہ بہت تنہا تنہا سا محسوس کررہی تھی۔ جیسے پوری دنیا سے کٹ چکی ہو۔ چند روز بعد اس کی طبیعت ٹھیک ہوگئی لیکن اب وہ پہلی والی بات نہ تھی۔ وہ اپنے آپ کو ان کے درمیان بہت اوپرا اوپرا اور اجنبی محسوس کررہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہورہا تھا کہ وہ ان کی آزادی اور خوشیوں کی راہ میں دیوار بن چکی ہے۔
اس نے بڑے ضبط اور حوصلے سے خاور کی باتیں سنی تھیں لیکن اپنے اوپر لگائی جانے والی الزام تراشی کو وہ برداشت نہ کرسکی۔ جب بھی اسے وہ لہجہ وہ باتیں اور وہ بے وردی یاد آتی اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتا اور آنکھیں برسنے لگتیں۔ وہ اکثر یاد کرتی اور سوچتی۔
"میں نے تو کبھی یہ سب سوچا بھی نہیں تھا۔ یہ سب تو میرے تھے' میرے اپنے تھے اور پھر ایسا دوبارہ بھی ہوسکتا ہے؟ اور اب اگر ہوا تو بہت برا ہوگا۔ میں روز روز یہ اذیت برداشت نہ کرسکوں گی۔ کدھر جاؤں گی میں؟ میں نے تو اپنی طرف کھلنے والے سارے دروازے اپنے ہاتھوں بند کرلیے تھے۔ اب ان دروازوں سے باہر بہت سارا وقت گزر چکا ہے۔ اور اندر کا موسم گھٹن زدہ اور حبس آلود ہے۔"
اس نے بارہا محسوس کیا کہ ثانیہ اسے کچھ بتانا چاہتی ہے لیکن سعدیہ کی تیز نظریں اسے روک دیتی ہیں۔
خاور' بپو اور سعدیہ کی بہت بنتی تھی۔ آئزہ خوش

تھی کہ سب کی بہت دوستی ہے۔ لیکن سعدیہ کی زبان درازی پر اس نے دو تین بار جھلا کر اسے تنبیہی انداز میں کہا تھا۔

"جب تک تم میں بڑوں سے بات کرنے کی تہذیب نہ آجائے مجھے ہرگز مخاطب نہ کرنا۔" لیکن سعدیہ کی اس روز کی بدتمیزی ناقابل برداشت تھی۔ آنزہ کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اب اسے یوں محسوس ہوتا پپو، خاور اور سعدیہ تینوں دبے دبے لفظوں میں اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اس نے ان تینوں پر جتنی محنت کی تھی۔ جتنے لاڈ پیار سے پالا تھا۔ اتنی اس نے رادیہ اور فوزیہ پر محنت نہ کی تھی۔ لیکن وہ صحیح معنوں میں اس کی قدر دان تھیں ان کے لیے تو اس نے اپنی امنگوں، خوشیوں اور خواہشوں کی، اپنی زندگی کے خوب صورت ترین سالوں کی قربانی دی تھی۔ اگر اس وقت اس نے اپنی شادی کی ہوتی اس کے برابر اس کے اپنے بچے ہوتے۔ لیکن اس نے ان کے لیے ایسا نہ کیا اور آج صلے میں کتنی دردناک تنہائی ملی۔

اس نے اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اپنے سراپے کا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھیں اب بھی خوبصورت تھیں۔ لیکن تھکاوٹوں اور آہٹوں کی منتظر آنکھیں کالے کالے حلقوں میں گہری زندگی کی سچی خوشیوں سے خالی تھیں ——— لانبی اور سیاہ زلفوں میں چاندنی گھل رہی تھی۔ گالوں کے گلاب مرجھا رہے تھے۔ اور پورا سراپا خزاؤں کی آمد کی خبر دے رہا تھا۔ اس نے انگلیوں کی پوروں سے سامنے کے بال اوپر کیے۔ سفید بالوں کی باڑھ آگئی ہوئی تھی۔

"کہاں ہو تم دانش؟ تم تو کہتے تھے کہ تم اس وقت آؤ گے جب زندگی میرے اندر تمام تر لطافتوں کے ساتھ بے دار ہو جائے گی۔" دو آنسو لڑھک کر اس کی گود میں آگرے۔

"یہ لطافتیں کیسے بے دار ہوتی ہیں ... آکر تو دیکھو۔" اس رات جب ڈیڈی کھانے کی میز پر اسے گم سم دیکھ کر کچھ پوچھنا چاہ رہے تھے کہ ... سعدیہ نے آکر کہا۔

"آپی آپ کا فون ہے۔" نہ جانے کیوں اس کا دل بہت زور سے دھڑکا۔

"ہیلو۔" ملو تھ پیس اس کے ہاتھ میں کانپ رہا تھا۔

"میری آواز پہچانو آنزی۔" لہجہ وہی جانا پہچانا تھا، وہی چاہتوں سے چور چور تھا مگر اس طرف اس کی آواز گم تھی۔ آنسو بے آواز گر رہے تھے۔ وہ کتنا سچا تھا۔ آج ہی تو اس نے دلی جذبوں سے اسے پکارا تھا۔

"میں جانتا تھا آنزی! تم مجھے کبھی نہیں بھول سکتیں۔" اس نے بے حد یقین سے کہا۔

"سچ بتاؤ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔"

"ہاں دانش تم سچ کہتے ہو۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھول پائی۔" وہ رو پڑی۔

"مگر اب تم نے کیا سوچا؟ میں آؤں یا ...؟" اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"تم آجاؤ دانش مگر ...۔" وہ ہکلائی۔

"اچھا باقی باتیں ملنے پر ہوں گی۔ تم کسی کو کچھ نہ بتانا میں سب کو سرپرائز دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" اس کی آواز بھیگ رہی تھی۔

وہ واپس ٹیبل پر آئی تو سب اس فون کے بارے میں متجسس تھے جس نے اسے گم سم کر دیا تھا۔ اس نے ایک بار جھکی ہوئی پلکیں اٹھائیں۔ بہت ساری آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اور وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

"کیا ہوا؟" صرف ڈیڈی نے پوچھا۔

"خیریت؟"

"جی میری دوست کا فون تھا۔ بڑے عرصے بعد آئی ہے۔" اس نے بھیگی پلکیں اٹھائیں۔

"اوہو۔ میں بھی سمجھی پتا نہیں کیا ہو گیا۔ آپی کو رونا بہت اچھا لگتا ہے۔" ثانیہ نے شرارت سے باری باری سب پر نظر ڈال کر پوچھا۔ اور اس نے ان کی طرف دیکھنے کے باوجود یوں محسوس کیا جیسے سب نے یک زبان کہا ہو۔

"آپی کی تو عادت ہے۔ ہر بات پر جل تھل مچا دیتی

ہیں۔" رات دیر تک ذہن میں دانش کی باتوں کی بازگشت گونجتی رہی اور وہ سو نہ سکی۔ صبح اس کی نماز بھی قضا ہو گئی۔ وہ جلدی جلدی اٹھی اور بیڈ ٹی بنا کر ابی کے کمرے میں گئی۔ پھر باغ میں سے ڈھیر سارے رنگ برنگے پھول توڑے اور سارے گھر میں سجاتی رہی۔ وہ بہت خوش تھی اور خوشیاں اس کے پورے سراپے سے چھلکی پڑ رہی تھیں۔

آج اس کی زندگی میں کتنی خوب صورت ساعتوں نے آنے کا قصد کیا تھا۔ وہ کب سے ٹوٹے دل کی کرچیاں سمیٹتے سمیٹتے اپنی لہولہان انگلیوں کو دیکھ دیکھ کر اسے یاد کرتی رہی۔

تھوڑی دیر بعد اس کی نظریں گیٹ کی طرف اٹھ جاتیں لیکن ابھی تو بہت سویرا تھا۔ اس نے کتنا لمبا چوڑا انتظار کیا تھا لیکن اب پل پل بھاری تھا۔ وقت گزر کے نہ دے رہا تھا۔ بوا نے کچن کا دروازہ کھولا تو وہ بوکھلا کر کھڑی ہو گئی۔ بوا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ مسکرا دی۔ پپو برآمدے میں کھڑا اسے ایزی چیئر پر گیٹ کی طرف ایک ٹک دیکھتے ہوئے دیکھ کر بولا۔

"کن سوچوں میں گم ہو آپی؟"

"نہیں تو۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ گود میں رکھی ڈھیروں کلیاں فرش پر ڈھیر ہو گئیں۔

"اوہو۔" وہ جھک کر پھول سمیٹنے لگی۔

ثانیہ اور سعدیہ اسکول کالج کے لیے تیار ہو گئیں۔ اس کا دل چاہا ان سے کہے۔

"نہ جاؤ۔ دیکھو تو آج کون آرہا ہے۔ میری زندگی کی وہ واحد خوشی، جس کے بغیر میں کبھی بھی پوری نہ ہو سکی۔ ہمیشہ ادھوری رہی۔ تشنہ اور ناکام۔" اور پھر وہ آگیا۔ تمام تر وجاہتوں کے ساتھ ... تمام تر خوب صورتیوں کے ساتھ ...

وہ ذرا بھی نہ بدلا تھا۔ وہ بغیر کسی دوسری سمت دیکھے۔ گلابی عارضوں پر جھکی کالی پلکوں کی گھنیری جھالر کو دیکھتا رہا۔ تبھی تیز تیز گاڑی کی سمت جاتی ہوئی ثانیہ ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی اور پھر چیخ کر بولی۔

"سعدی، پپو بھائی، خاور، ڈیڈی، بوا یہاں آؤ سب کے سب۔" پپو آپی کو معنی خیز نظروں سے دیکھ کر بولا۔

"جب ہی میں کہوں۔ آپی بوکھلائی ہوئی کیوں ہیں؟" اس نے چور نظروں سے سب کو دیکھا اور باوقار قدموں سے چلتی ہوئی آگے بڑھ کر بولی۔

"اندر چل کر بیٹھیں یہاں کب تک کھڑے رہیں گے۔" موسم خوشگوار ہو چکا تھا۔ دن بھر کی گپ شپ کے بعد وہ سب لان میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے کہ اچانک انہیں محسوس ہوا زمانہ ایک بار پھر ماضی کی طرف لوٹ گیا ہے۔

دانش نے کرسی اس کے قریب کر دی اور جذب سے بولا۔

"اب تو میرے ویرانہ دل کو اپنا مسکن بنا ڈالو۔"

"ہاں دانش! زندگی کی شام ہونے کو ہے چلتے چلتے پیر چھالے چھالے ہو چکے۔ میں بھی تھک گئی ہوں۔" وہ خود سپردگی کے عالم میں بولی۔

"آؤ باقی کی تھکن بانٹ لیں۔ مل جل کر تھکاوٹوں کا باقی سفر طے کر لیں۔ آؤ میرے قدموں سے قدم ملا کر چلو راستہ جلد کٹ جائے گا اور منزل قریب آجائے گی۔" سرمئی شام کا آنچل دھیرے دھیرے ان پر سایہ فگن تھا اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے۔ وہ دھیرے دھیرے اسے کہہ رہی تھی۔

"مانا کہ میں نے انتظار کا کہا تھا لیکن یہ تو کرب تھا دانش، پھر بھی ایک عورت کے لیے یہ کتنا بڑا اعزاز ہے کہ ایک مرد نے اسے چاہا۔ پیار کیا اور اسے یاد رکھا۔"

وہ ہنس دیا۔

"مجھے اس بات پر فخر ہے آنزی! کہ میں نے کسی معمولی لڑکی کو نہیں، بڑے مضبوط کردار کی لڑکی کو چاہا۔ جس نے اپنے اصولوں کی خاطر اپنے جذبوں کی قربانی دی۔"

اس نے بالکل غیر ارادی طور پر اسے دیکھا۔ اس کے صاف شفاف اور خوب صورت چہرے پر سچ کا اجالا پھیل رہا تھا۔

☼ ☼

نایاب جیلانی

مکمل ناول

دسویں اور آخری قسط

یہ وقت کی نہ جانے کیسی گردش تھی کہ اس کی لپیٹ میں اب اس کا پورا گھر آچکا تھا۔ جاب کیا ہاتھ سے گئی کمپنی سے فوری لون کا مطالبہ آگیا۔ ابھی وہ لون ادا کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک اس کی پوری ہستی گویا ہل کر رہ گئی۔

آج صبح سے دل نہ جانے کیوں بے حد بے چین تھا۔ اس بے چینی کی ساری وجہ اپنے وارنٹ گرفتاری
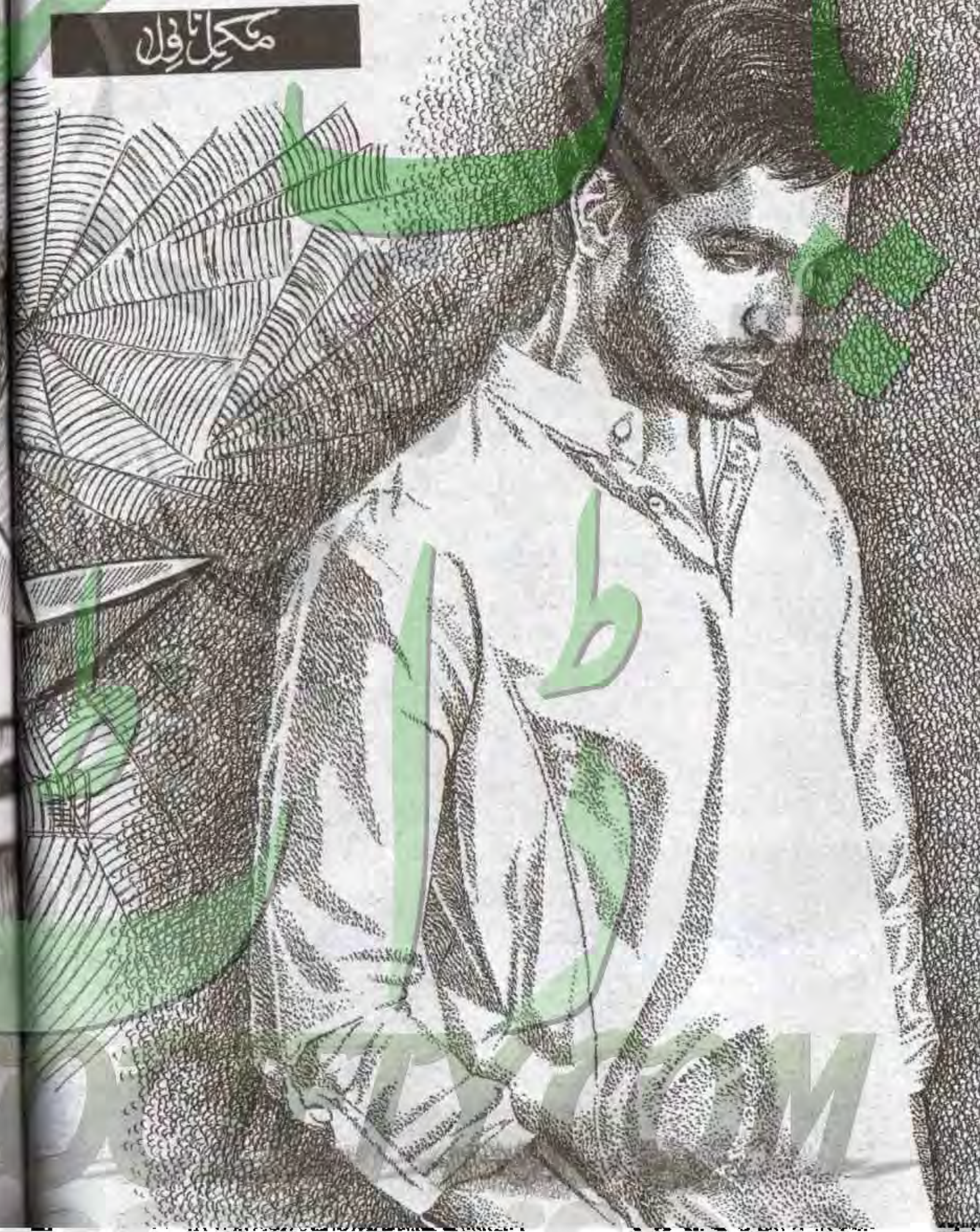
دیکھ کر ہی وہ سمجھ چکا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا یہ کیسی آزمائش ہے؟ یہ کیسا امتحان ہے؟ اسے بس اتنی خبر تھی کہ اس کے اردگرد ایک پھندا بہت دھیرے دھیرے تنگ کیا جارہا ہے۔ نہ جانے اس میں خالق کی کیا بہتری تھی۔ حریم تو دروازے پر پولیس دیکھ کر ہی ٹھنڈی برف ہو گئی تھی۔ راحت بیگم کی تو خوف سے گھگی بندھ گئی۔

"یہ سب کیا ہے ماہیر!" جانے سے پہلے وہ اس سے ملنے آیا تھا۔ وہ اسے گھر کے کچھ معاملات کے بارے میں سمجھا رہا تھا۔

"کچھ بھی نہیں ہے۔ بس آزمائش ہے اور آزمائش اللہ کے پسندیدہ بندوں پر ہی اترتی ہے۔ بس میری جان! تم گھبرانا مت۔ ثابت قدم رہنا اور شاہنواز کو فون کر کے وکیل کے بارے میں بات کرلینا۔ سچ اور جھوٹ کو تو عدالت ہی سامنے لائے گی۔ میرا دل اور ضمیر مطمئن ہے۔" وہ سچ مچ بہت مضبوط تھا۔ قطعاً" گھبرا نہیں رہا تھا۔

"یہ کس نے کیا ہے ماہیر؟ آپ جائیں گے تو ہمارا کیا ہو گا؟ میں کیسے سب کو سنبھال پاؤں گی۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

"میرے ارادوں کو تمہارے آنسو توڑ دیں گے حریم! مجھے کمزور نہ کرو۔" وہ اس کے آنسو انگلیوں کی پوروں سے چن رہا تھا۔ اس بات سے بے خبر وہ آخری مرتبہ حریم کو چھو رہا ہے۔

"اور مجھے آپ کی جدائی توڑ کر رکھ دے گی۔" وہ سسک رہی تھی۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" ماہیر جانتا تھا۔ یہ تسلیاں جھوٹی ہیں۔ جس بھی شخص نے اس کے اردگرد جال پھیلایا تھا۔ وہ اسے اتنی آسانی کے ساتھ باہر نہیں آنے دے گا۔

"کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو گا۔" حریم کی چھٹی حس اسے خوف میں مبتلا کر رہی تھی۔

"آپ نے آفس سے لون کیوں لیا؟ اگر اس گھر پر آپ خرچہ نہ کرتے تب بھی تو ہم سہولت سے رہ رہے تھے نا۔"

"تقدیر میں لکھے دکھ تدبیر نہیں مٹا سکتی حریم! یہ عارضی جدائی ہے۔ تم کچھ حوصلہ پکڑو۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ اسے بہت سے دلاسے دے کر گیا تھا۔ مگر کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوا۔ بلکہ سب کچھ تہس نہس ہو رہا تھا۔ ہوتا جارہا تھا۔

ماہیر کے چلے جانے کے آٹھ دن بعد حانی کے اغوا نے ان سب کو تھرا کر رکھ دیا تھا۔ دن دہاڑے نہ جانے کون لوگ تھے جو حانی کو گھر سے اٹھا کر لے گئے تھے۔

حریم تو ماہیر کی جدائی سے ادھ موئی ہو رہی تھی اوپر سے حانی کے اغوا نے اس کی رہی سہی ہمت کو بھی نچوڑ لیا تھا۔ آخر یہ سب ہو کیا رہا تھا؟ کون تھا؟ جو یہ سب کروا رہا تھا؟ بہت سے سوالیہ نشان تھے۔

موبی کو ان دنوں شدید دورے پڑنے لگے تھے۔ وہ سارا سارا دن عالم بے ہوشی میں رہتا تھا۔ راحت بیگم شدید بیمار ہو گئی تھیں۔ ان کا بی پی بہت زیادہ پرہیز کے باوجود بھی شوٹ کر جاتا تھا۔ ان دنوں وہ بہت پرہیز کر رہی تھیں۔ ان سے کچھ بھی کھایا پیا نہیں جاتا تھا۔ وہ سارا سارا دن ماہیر کو یاد کر کے روتی رہتیں۔ زمیلہ کے ٹیلی فون بھی انہیں خوش نہیں کرتے تھے۔

گھر کے اخراجات اور موبی کی دوائیوں کا خرچہ فیفا کی تنخواہ سے پورا ہوتا تھا اور وہ شاہنواز کے ساتھ مل کے ماہیر کی ضمانت کے لیے بھاگ دوڑ بھی کر رہی تھی۔

یہ بہت تھکا دینے والے دن تھے۔ یہ غم سے بوجھل دن تھے۔ حانی کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ اسلام آباد سے خالہ اور محسن بھی آچکے تھے اور محسن ہر طرح کی کوششیں کر کے تھک چکا تھا اور محسن کو مایوس دیکھ کر اس کے بیمار بابا دل ہار گئے تھے۔ بابا کی بیماری نے حریم کو صدمات سہارنے کے قابل ہرگز نہیں چھوڑا تھا۔ جب ایک عجیب واقعہ ہو گیا۔ یہ عجیب تھا، ہولناک تھا۔ المناک تھا۔ بھلا یہ کیا تھا؟ صبح صبح اسے ایک رجسٹری موصول ہوئی تھی۔

یہ نہ جانے رجسٹری بھیجی کس نے تھی؟ کس کی تحریر تھی یہ "مٹی مٹی۔۔۔ آنسوؤں سے نم۔ جس کے لفظ لفظ سے گویا لہو ٹپک رہا تھا۔

حریم نے تحریر کو پڑھا، ایک دفعہ، دو دفعہ پھر کئی دفعہ۔۔۔ اسے لگا، یہ دل جو اس کے سینے میں دھڑک رہا ہے۔ کسی بھی لمحے پھٹ جائے گا۔ کسی بھی لمحے اس کے جسم اور روح کا تعلق ختم ہو جائے گا۔ مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ نہ وہ مری نہ وہ زندہ رہی۔۔۔ زندگی اور موت کے ملاپ نے حریم جمال کو یکدم مار دیا تھا۔ وہ تحریر تھی یا پھر کوئی ظالم ناگ، جس نے حریم جمال کو اس طرح سے ڈس لیا تھا کہ وہ زندہ رہتے ہوئے بھی زندہ نہیں تھی۔

حانی کی واپسی حریم کی زندگی سے مشروط تھی؟ آخر یہ سب کیا تھا؟ کیوں ہو رہا تھا؟ آخر بے قصور ہوتے ہوئے بھی وقت ان پر کیوں قیامت بن کر ٹوٹ پڑا تھا؟

وہ تحریر بھلا کیا تھی۔ وہ چند لفظ بھلا حریم کے لیے کیسی اہمیت رکھتے تھے؟ وہ اس کے دل کی موت تھے اور اس کے دل کی موت واقع ہو چکی تھی۔ وہ تحریر اس نے پھاڑی تھی۔ اس تحریر کے ثبوت کو اس نے مٹانا ہی تھا۔ اسے اس طرح کھا گیا تھا۔ وہ آخری مرتبہ ان کاغذ کے ٹکڑوں کو دیکھ رہی تھی۔ بعض لفظ آپ کے جسم کے سارے رس کو نچوڑ لیتے ہیں۔ یہ لفظ بھی کچھ ایسے ہی تھے۔

"پیاری حریم! سلام خود غرضی، بڑا غرض سے لپٹا سلام ہے۔ قبول کرنا چاہو تب بھی ٹھیک نہ کرنا چاہو تب بھی ٹھیک۔

بات زیادہ طویل نہیں کروں گی۔ مختصر یہ ہے، تمہاری چھوٹی بہن میرے گھر میں پچھلے پندرہ دن سے بالکل محفوظ ہے۔ تم سے صرف اتنا کہنا تھا۔ بہت خاموشی کے ساتھ، بہت صبر اور حوصلے کے ساتھ ماہیر کی زندگی سے نکل جاؤ میری جان! تم نہیں جانتیں، میں ایک زخمی سی عورت ہوں۔ میرے وجود اور دل میں اتنے زخم ہیں کہ تم ہاتھ سے چھونا چاہو گی تو تمہارا ہاتھ بھی زخم زخم ہو جائے گا۔ تم جاؤ، کہیں بہت دور، جہاں ماہیر کی تم پر نظر نہ پڑے۔

حانی واپس آجائے گی۔ بہت عزت آبرو کے ساتھ۔ مال و جواہرات کے ساتھ۔ شرط بس اتنی سی ہے، تم ماہیر کی زندگی سے نکل جاؤ۔۔۔ ہمیشہ کے لیے، ورنہ تمہاری حانی کی بدنامی کے چرچے زبان زدعام ہوں گے۔"

والسلام

زوباریہ درانی

یہ اسی شام کی بات ہے جب حریم نے ایک معمولی سے کلینک میں ماہیر کے بیٹے کو جنم دیا تھا۔ اس اتنی بڑی خوشی نے بھی ان سب کے مردہ دلوں میں جوت نہیں جگائی تھی۔

حریم اس معصوم فرشتے کو دیکھ کر بھی خاموش تھی۔ راحت بیگم اپنے صحت مند پوتے کا دیدار کر کے بھی رنجیدہ تھیں۔ خوشی اور ہنسی گویا ہمیشہ کے لیے روٹھ گئی تھی۔ ادھر حریم پر ہمہ وقت وحشت سوار رہتی تھی۔ سوچوں نے اسے ادھ موا کر دیا تھا۔ شاہنواز کا سارا رسوخ بھی ماہیر کی ضمانت نہیں کروا سکا۔ حانی واپس نہیں آئی تھی اور زندگی گویا ایک بدبو دار جوہڑ میں ٹھہر گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

دروازہ بہت آہستگی سے کھلا تھا اور پھر بند بھی ہو گیا۔ حانی کا چڑیا جتنا دل خوف کے مارے دھک دھک کر رہا تھا۔ ابھی تک کسی نے بھی اس کے ساتھ کوئی بھی نازیبا حرکت نہیں کی تھی۔ اسے بہت آرام اور سکون مہیا کیا جا رہا تھا۔ تینوں وقت بہت ہی پر تکلف کھانا ٹرالی میں سج کے آتا تھا۔ بیڈ روم فل فرنشڈ تھا۔ اے سی اور روم فریج بھی موجود تھا۔ کمرے میں سہولت کی ہر چیز موجود تھی مگر پھر بھی حانی سارا سارا دن اپنی بہن اور بابا کو یاد کر کے تڑپتی رہتی۔

اسے جس کے کہنے پر اغوا کیا گیا تھا۔ وہ عورت ابھی سامنے نہیں آئی تھی۔ تاہم اتنا تو وہ جانتی تھی کہ وہ کوئی عورت ہی تھی۔

آج اٹھارواں دن تھا اور آج کی سہ پہر کچھ انوکھا ہونے والا تھا۔ کیا یہ تو حانی کو بھی خبر نہیں تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز نے حانی کو چونکا دیا تھا۔ کوئی تھا جو دبیز کارپٹ پر بے آواز قدموں سے چلتا ہوا اس کے قریب آگیا۔ حانی نے چادر کو مزید منہ کے اوپر کھسکا لیا۔ وہ اس وقت لیٹی ہوئی تھی۔ بہت آہستگی کے ساتھ کسی نے اس کے پیروں پر سے چادر اتار دی۔ حانی کا دل خوف کے عالم میں پھڑپھڑانے لگا۔ مگر اس نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس سے مارے خوف کے اٹھا ہی نہیں گیا۔

"حانی!" کسی نے بہت نرمی سے پکارا۔ یہ کسی عورت کی آواز تھی۔ روئی روئی سی آواز' آنسوؤں سے بوجھل آواز۔ اس عورت کے آنسو حانی کے پیروں پر گر رہے تھے۔ حانی کا دل دھک سے رہ گیا۔

"میری گڑیا! میں تم سے معافی مانگتی ہوں اس تکلیف پر جو تمہیں میری طرف سے پہنچی۔" وہ ابھی تک رو رہی تھی۔

"مگر کیا کروں میں مجبور ہوں۔ میری مجبوری کو کوئی نہیں سمجھتا۔" اس کی سسکیاں حانی کو اور بھی حیران کر رہی تھیں۔

"میں سونے کے پنجرے میں قید ایک بھکارن ہوں۔ میرے ہاتھ میں پکڑا کشکول خالی ہے۔ مجھے تم سے صرف اتنا کہنا ہے۔ مجھ بھکارن کی جھولی بھر دو۔" اب وہ دھواں دھار رو رہی تھی۔

"مم.....میں بھلا کیا کر سکتی ہوں۔"

"کچھ زیادہ نہیں صرف ایک فون کال کرنا ہے۔" وہ اسی طرح سے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وحشتوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ وہ پہلی نظر میں اسے پاگل لگی تھی۔ دیوانی' پاگل اور خبطی.....

"کیسا فون؟" حانی کپکپانے لگی۔ اسے اس بکھری بکھری عورت سے بہت خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اسی پل ایک اور عورت آگئی۔

"بس اتنا حریم سے کہنا ہے کہ یہاں تمہیں بہت تکلیف ہے۔ تمہیں رات دن تشدد سہنا پڑ رہا ہے اور تمہاری عزت بھی محفوظ نہیں اور بہت جلد تمہاری بدنامی کے چرچے ہونے والے ہیں۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو سی ڈیز پر تمہاری قابل اعتراض تصویریں اور پوری فلم چلوا دیں گے۔ تمہیں کسی عرب کے تاجر کے ہاتھ فروخت کرنے کی بھی ڈیل طے ہو چکی ہے۔ اپنی بہن سے کہہ دو' تمہاری عزت اور زندگی اب اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اگر تمہیں واپس جانا ہے تو جو میں کہہ رہی ہوں۔ وہ خاموشی سے کرتی جاؤ۔" اس ملازمہ ٹائپ عورت نے بڑے دبنگ لہجے میں کہا۔ اب وہ موبائل اس کے ہاتھ میں تھما رہی تھی۔ سامنے ایک پرچہ لکھا ہوا تھا اور حانی روتے ہوئے وہ ہی الفاظ دوہرا رہی تھی۔

"آپ حریم سے کیا چاہتی ہیں؟" وہ زوباریہ سے سہمے سہمے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔ حالانکہ زوباریہ بہت حلیم تھی۔ بڑے نرم لہجے میں بات کرتی تھی۔

"میں اس سے۔ جو چاہتی ہوں۔ وہ سب سمجھ گئی ہو گی۔ بس کچھ دیر اور انتظار کر لو' اسیری کے دن بس تھوڑے ہیں۔" وہ حانی کے سر پر بوسہ دے کر چلی گئی اور حانی واپس آنے کے دن تک بھی حیران اور ششدر رہی تھی۔ وہ اس بے حد سادہ نظر آنے والی عورت کو سمجھ نہیں پائی تھی۔

ادھر حریم گویا ننگے پیر انگاروں پر چل رہی تھی۔ اس کے سامنے ایک پل صراط تھا اور اس پل صراط کو بھلا وہ کیسے پار کرتی۔

ماہیر سے ناتا توڑنا بھلا آسان کہاں تھا۔ حانی کی واپسی کو حریم کی زندگی سے مشروط کر دیا گیا تھا اور اس نے زندگی سے ناتا توڑ دینے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا۔ ماہیر سے جدائی زندگی سے جدائی کی طرح تھی۔ مگر اسے یہ دریا عبور کرنا ہی تھا۔

حانی جمال کے لیے' عزت کی بقا کے لیے اور خود اپنے لیے وہ کیا کرتی' حانی سے محبت' ماہیر کی محبت پر غالب آگئی تھی۔ اس محبت میں دل ٹوٹنا تھا۔ زندگی اندھیروں کے سپرد ہونا تھی۔ مگر حانی کی محبت میں

نسلوں کی عزت اور بقا پوشیدہ تھی۔ محبت پر عزت فوقیت لے گئی تھی۔ ماہیر کی محبت کا پلڑا ہلکا ہو گیا تھا۔ عزت' محبت پر حاوی ہو گئی تھی۔ ماہیر سے اس نے طلاق کا مطالبہ کر دیا تھا۔ اور یہ خبر ہر ایک پر گویا بجلی بن کر گری تھی۔ راحت بیگم کے حواس معطل ہو رہے تھے اور وہ شاہنواز کو بلا کر لے آئی تھیں۔ حریم تیار ہو رہی تھی۔ آج اس نے ماہیر سے آخری ملاقات کے لیے جیل جانا تھا۔ فیصلے کی جس گھڑی سے وہ خوفزدہ تھی۔ آج وہ تلوار کی مانند اس کے سر پر ٹنگی تھی۔ بالآخر حریم جمال نے زہر سے بھرے جام کو لبوں سے لگا ہی لیا تھا۔ شاہنواز اس کے ساتھ جانے والا تھا مگر حریم کی بات سن کر وہ چکرا کر رہ گیا۔

"حریم! تم پاگل ہو گئی ہو؟"

"ہاں پاگل ہو گئی ہوں۔ غم کی بہت بھاری رات گزری ہے مجھ پر۔ میرے حواس چھن چکے ہیں۔ نہ جانے میں زندہ کیسے ہوں؟ مجھے تو مر جانا چاہیے۔" وہ ننھے اذان کو راحت بیگم کے حوالے کر کے شاہنواز کے ساتھ باہر آگئی تھی۔

"حریم! تم کیا کرنا چاہتی ہو؟"

"پلیز شاہنواز! مجھ سے کوئی سوال نہ کرو۔ میں کوئی جواب دینے کے قابل نہیں ہوں۔" جیل کے بڑے سے پھاٹک کے سامنے گاڑی رک گئی تھی۔ وہ لب بھینچے حریم کو دیکھے جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم!" ماہیر کی آنکھوں میں ستارے سج گئے تھے۔

"حریم! تم ٹھیک ہو نا۔ اذان کیسا ہے؟ کیسی شکل ہے اس کی؟ تم اذان کو بھی لے آتیں۔ میں اسے دیکھ لیتا۔ نہ جانے کب تک میرے کیس کا فیصلہ ہو گا۔ چلو' اللہ بہتر کرے گا۔"

"اذان ٹھیک ہے اور اس کی شکل میری جیسی ہے۔" حریم کے لہجے میں نہ چاہنے کے باوجود بھی آنسوؤں کی نمی گھل گئی تھی۔

"پھر تو خوب صورت ہو گا۔" وہ ہلکے پھلکے لہجے میں بولا۔ حریم نظر جھکائے کھڑی تھی۔ وہ لفظوں کو ترتیب دے رہی تھی اور لفظ تھے کہ اس کی پکڑ میں نہیں آ رہے تھے۔

"حریم! کچھ بولو نا' چپ چپ کیوں ہو؟ میں تمہاری آواز سننا چاہتا ہوں۔" بے قراری اس کی آنکھوں سے ہویدا تھی۔

"کیا بولوں؟ کیا بولنے کے لیے کچھ رہ گیا ہے؟" وہ زخمی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"حانی کا کچھ پتا چلا؟" وہ جانتا تھا اپنے باپ کی بیماری اور حانی کے غائب ہونے کے غم نے اسے گھائل کر رکھا ہے۔

"عنقریب پتا چل جائے گا۔" اس کا انداز مبہم سے تھا۔

"تم موبی اور امی کا خیال رکھتی ہو؟" وہ بڑے یقین سے پوچھ رہا تھا۔

"موبی اور امی میری ذمہ داری نہیں۔" حریم تلخی سے گویا ہوئی تھی۔ یوں کہ جیل کی جالیوں پر رکھے ماہیر کے ہاتھ لحظہ بھر کو کپکپائے۔

"امی! سے جھگڑا ہو گیا ہے؟ پلیز حریم! میری خاطر در گزر کر دیا کرو۔" وہ گویا التجا کر رہا تھا۔

"میں ہی کیوں در گزر کروں؟" حریم جواباً" چیخ اٹھی۔ ماہیر پھر سے کچھ چونک گیا تھا۔ وہ حیران تھا کہ حریم اجنبیوں کی طرح بات کیوں کر رہی ہے۔

"میں آپ کی مخبوط الحواس ماں اور پاگل بھائی کی خدمت کر کر کے عاجز آچکی ہوں۔ اب مزید قربانی میرے بس میں نہیں۔ خود کو تو قربان کر چکی ہوں اور کیا کروں آپ کے بھائی اور ماں کے لیے۔" وہ پھر سے بھینچی آواز میں چلائی۔

"حریم! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" وہ حشت زدہ سا اسے دیکھتا رہا۔

"پاگل کتے نے کاٹ لیا ہے۔" حریم دھاڑی۔

"میرا اور تمہارا ساتھ یہیں تک تھا ماہیر عالم! مجھے آزاد کر دو ان جھنجٹوں سے۔ تنگ آگئی ہوں میں تمہارے گھر میں کیڑے مکوڑوں جیسی زندگی جیتے

ہوئے۔ بہت برداشت کیا ہے میں نے تمہاری ماں کی تلخیوں کو' تمہارے اوھورے بھائی کو بہت ذلت سہی ہے۔ بہت دکھ جھیلے ہیں۔ اب اور نہیں' مجھ میں اور کچھ سہنے کی طاقت نہیں۔"

"تم' واقعی پاگل ہو گئی ہو۔ حریم! جانتی ہو۔ تم کیسے کیسے لفظ بول رہی ہو۔" صدمے کی شدت نے ماہیر کے حواس سلب کر دیتے تھے۔

"میں ہوش و حواس میں ہوں۔ مجھے طلاق چاہیے۔" وہ پھر سے دھاڑی۔

"میں تم جیسے خود غرض اور بے ایمان آدمی کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ نہ جانے کب سے حرام کما کر کھلا رہے ہو مجھے۔ نہ جانے کس کس کا حق چھینتے ہو۔ کس کس کا رزق چھینتے ہو۔ کس کس کی بددعا سمیٹ رکھی ہے تم نے۔ مجھے تمہاری بددعاؤں میں حصہ دار نہیں بننا۔"

"طلاق۔" ماہیر کو لگا تھا۔ جیل کی چھت اس کے سر پر آگری ہے۔

"تمہیں طلاق چاہیے؟"

"ہاں۔" وہ بے خوف تھی۔

"حریم! میں کسی کے قتل کے مقدمے میں اندر نہیں ہوں۔ معمولی سا غبن کا جھوٹا کیس ہے۔ یوں آنکھیں تو نہ بدلو' چند ماہ اور صبر کر لو۔ میں تم سے۔۔۔"

"مجھے اور کہانیاں مت سناؤ ماہیر عالم! میں کسی جھوٹے بہلاوے میں نہیں آنا چاہتی۔ میرا وکیل کاغذات لے کر آئے گا۔ دستخط کر دینا۔" وہ اس کی بات کاٹ کر چلائی۔

"کیا اس انتہائی فیصلے کی وجہ بتا سکتی ہو؟" ماہیر کے لہجے میں بھی زخمی شیر کی پھنکار تھی۔ وہ اس شاک کی کیفیت سے گویا نکل آیا تھا۔

"اتنی وجوہات کیا کم ہیں۔ جو کچھ اور جاننا چاہتے ہو؟" وہ ترخ کر بولی۔

"کیا کوئی اور جزیرہ نظر آگیا ہے؟" ماہیر کا لہجہ بھی زہر خند ہو گیا۔ تنہائی' ناکامی اور بدلتے حالات کی کروٹ نے بہت سی کڑواہٹ ماہیر کے اندر بھی بھر دی تھی اب۔ جو حریم نے نظر بدلی تو وہ گویا ذہنی طور پر مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔

"یہی سمجھ لو۔" آج وہ خود کو ماہیر کی نظر سے گرا لینے کا عہد کر کے ہی تو آئی تھی۔

"صرف چند دنوں میں کون کون سے خواب دیکھ چکی ہو حریم! سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا کہ خوابوں کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔" اس کے لہجے میں استہزا ابھر گیا تھا۔

"خواب دکھانے والا' پہلے حقیقت کو سامنے لایا ہے۔ حریم دوسری مرتبہ دھوکا کھانے سے رہی۔" حریم کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا اور لفظ گویا پتھر برسا رہے تھے۔

"چلو جی' تم خوش تو ہم خوش۔" وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا دیا۔

"نہ جانے کیوں دل کو یقین نہیں آتا کہ یہ الفاظ تمہارے ہیں۔ یوں لگتا ہے کسی نے کنپٹی پر پستول رکھا ہے اور تم اسکرپٹ ہاتھ میں پکڑے بول رہی ہو۔"

"میری خوشی سے بھلا آپ کو کیا لینا دینا ماہیر صاحب!" وہ آنکھ میں اتری نمی بڑی مہارت سے چھپا گئی تھی۔

"زندگی بعض لوگوں کو بار بار آزماتی ہے۔ ہم بھی انہی لوگوں میں سے ایک ہیں۔ ہمارا دل بھی زخمی اور روح بھی۔

یہ فیصلہ تمہارا اپنا ہے حریم! پھر کیوں اتنی تھکی تھکی شکست خوردہ لگ رہی ہو؟"

"اس لیے کہ شکست میرے نصیب میں لکھی گئی ہے۔ ہم نے تو ہارنا ہی تھا۔ ہار کر جیتیں یا جیت کر ہاریں۔" وہ لب کچل رہی تھی۔ اپنے لہجے کا درد چھپا رہی تھی۔

"تم میرے باہر آنے تک کا انتظار نہیں کر سکتیں؟" وہ بڑی امید سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"نہیں۔" حریم کے لہجے میں پتھروں جیسی سختی تھی۔

"ہم نے بہت اچھا سفر طے کیا ہے ماہیر! میں چاہتی ہوں کہ ہم اچھے طریقے سے ایک دوسرے کو الوداع کہہ دیں۔ آپ کو اپنے بچے کی قسم! مجھے آزاد کر دیں ورنہ میں خود کو ختم کر لوں گی۔"

"سفر کہاں طے کیا ہے؟ دو اڑھائی سال کی رفاقت کو سفر کہہ رہی ہو۔" ماہیر کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

"تو آج تم مجھے وداع کرنے آئی ہو؟ نہ جانے کیوں دل کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ حالانکہ تمہارا خط میرے پاس ہے۔ پھر بھی ایک آس تھی۔"

"یہ وقت وقت کی بات ہے ماہیر! اور یہ جو وقت ہے نا' کسی کے ساتھ مخلص نہیں ہوتا۔ آج مجھ پر مہربان اور کل کسی اور پر۔۔۔ کچھ لوگ اللہ کی زمین پر فساد پھیلانے کے لیے اترتے ہیں۔ کچھ لوگ محبتیں بانٹنے کے لیے تخلیق کیے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو دلوں کو اجاڑنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے اپنے دل ویران کھنڈر کی طرح سے ہوتے ہیں اور وہ کسی کا دل آباد نہیں دیکھ سکتے۔" وہ آنکھ کے سارے آنسو دل میں اتار گئی تھی۔ اسے ایسا ہی کرنا تھا۔ اس کی ذرہ بھر کمزوری پر سارے راز منکشف کر سکتی تھی۔

"حریم! کیا تم سمجھتی ہو کہ میں نے کمپنی کا پیسہ کھایا ہے؟ کیا تم مجھے بے ایمان اور جھوٹا سمجھتی ہو؟"

"نہیں۔" حریم کا دل کرلایا تھا مگر لبوں سے کچھ اور برآمد ہوا۔

"ہاں۔"

"میں تمہیں یقین کیسے دلاؤں؟ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ ایک یہ تمہارا دل ہی تو تھا۔ جو مجھ پر سچائی کی گواہی دے سکتا تھا۔ آج اس دل نے بھی دھوکا دے دیا۔ سچ ہی کسی نے کہا ہے۔ برے وقت میں سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔" ماہیر نے گویا ضبط کی انتہا کر دی تھی۔

"جاؤ حریم! تمہیں میں نے آزاد کیا۔ اپنے دل سے نکال دیا۔ جاؤ حریم! میری محبت سے تم آزاد ہو اور میں نے تمہیں اپنے نکاح سے بھی نکال دیا۔ تم مجھ پر حرام ہوئیں۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں' طلاق دیتا ہوں' طلاق دیتا ہوں۔۔۔ آج کے بعد دعا کرنا' میرا اور تمہارا سامنا کبھی نہ ہو اور ہاں' ایک بند لفافہ شاہنواز تمہیں دے گا۔ اسے کھول کر دیکھنا تم نے یقین کر لیا ہے نا کہ میں خائن ہوں' فراڈ کیا ہے میں نے کسی کا حق چھینا ہے۔ مگر میں نے اس بند لفافے میں موجود ایک ایک ثبوت کو دیکھ کر بھی یقین نہیں کیا۔ میرا دل کہتا ہے' حریم پاک ہے۔ وہ میرے پاس خالص دل لے کر آئی تھی۔ ان چھوٹی سوچ لے کر آئی تھی۔ مجھے اس بند لفافے میں موجود کسی ایک بھی ثبوت پر یقین نہیں آیا نہ کبھی آ سکتا ہے اور ہاں' ایک اور بات میرا بیٹا تمہاری گود میں ہے۔ دل چاہے تو اسے میری ماں کے حوالے کر جانا۔ اگر ساتھ لے کر جانا چاہو تو تمہاری مرضی میں عدالت میں اقبال جرم کرنے والا ہوں۔ مجھے اب تمام عمر جیل کی سلاخوں کے پیچھے رہنا ہے۔ جس کی خاطر مجھے لوٹ آنے کی جلدی تھی جب وہ نہیں تو پھر زندگی میں کچھ بھی نہیں۔۔۔ میں جانتا ہوں' خود کو بھی بیچ بھی دوں تو تین کروڑ کی رقم میں ادا نہیں کر سکتا۔ میرا کوئی اثاثہ نہیں جسے بیچ دوں۔

ایک معمولی سی چھت ہے جو میری ماں اور بھائی کے سروں کو چھپانے کا واحد آسرا ہے۔ میں اس گھر کو کسی بھی قیمت بیچ نہیں سکتا۔ میں اپنی ماں کو بے گھر نہیں کر سکتا۔ جاؤ حریم! چلی جاؤ کبھی لوٹ کر نہ آنا۔ میں نے اپنے دل کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر لیے ہیں۔ تم ایک جھوٹے' بے ایمان اور دھوکے باز آدمی کے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں۔ نہ رہو' میں تمہیں اپنے نام کے ساتھ قید بھی رکھنا نہیں چاہتا۔ میں نے تمہیں کوئی خوشی کوئی سکھ بھی تو نہیں دیا۔ جب میں نے تمہیں دیا ہی کچھ نہیں تو پھر لینے کی توقع کیوں کروں؟ میں کیوں اس حبس زدہ دنوں کا انتظار تمہارے حوالے کر دوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ زندگی نے اب میری قسمت سے سارے سکھ چھین لیے ہیں۔ میں ایک تلخ ترین زندگی تمہارے حوالے کر کے خود یہاں آگیا ہوں۔ یہ تمہاری مرضی پر منحصر تھا کہ تم ان

حالات میں رہتیں یا نہیں۔ تم نے جو فیصلہ کیا، میں نے اسے مان لیا' اب میں دل کی کہانیاں تمہیں کیوں سناؤں۔ جب رشتہ نہیں رہا۔ تعلق نہیں رہا حتی کہ محبت بھی نہیں رہی تو میں اپنے غم تمہارے ساتھ کیوں شیئر کروں۔" وہ تھکے تھکے قدم اٹھاتا پلٹ گیا۔ ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح جو پوری پونجی لٹا کر بالکل قلاش ہو کر اپنے گھر کو لوٹتا ہے۔۔۔۔ کیا آج ماہیر عالم سے بڑھ کر کوئی مفلس تھا؟

حریم نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ماہیر کو پلٹتے دیکھا۔ اس کا دل قل بازیاں کھاتا ہوا گویا ماہیر کے ہر قدم سے لپٹ لپٹ جارہا تھا۔ اس کی چشم نم نے اس منظر کو دیکھا اور دل داغ داغ ہو گیا۔ عزت پر محبت قربان ہو گئی تھی اور محبت کے تو مقدر میں قربانی دینا لکھا ہے اور جو محبت قربانی اور ایثار کے جذبے سے نابلد ہوتی ہے۔ دراصل وہ محبت نہیں' وہ جنون کی ایک قسم ہے۔ بے راہ روی ہے۔

اور اس نے فتح حاصل تو کی تھی۔ وہ ناکام کہاں ہوئی تھی۔ اس نے ایک نسل کو ایک خاندان کو بچالیا تھا۔ اس نے اپنی معصوم حانی کو بچالیا تھا۔ اس نے اپنے باپ کی بوڑھی آنکھ میں اترے خوف کو ریزہ ریزہ کردیا تھا۔ اس نے ان کی برسوں کی ریاضت کو مٹی میں رلنے سے بچالیا تھا۔

اس نے محسن کی محبت کو روگ لگنے سے بچالیا تھا اور اس نے زوباریہ درانی کے دل کو اپنا دل ہار کر بچالیا تھا۔ کیا حریم جمال قابل نفرت تھی؟

کیا وہ ماہیر کے دل سے اتر جانے کے قابل تھی؟ پھر بھی ماہیر نے اسے اپنے شہر دل سے نکال دیا تھا۔ کیونکہ حریم جمال نے اسے قسم دی تھی اور وہ قسم کو نبھانے والوں میں سے تھا۔ حریم جمال ایک خوش نصیب عورت تھی یا بد نصیب؟ وہ بے وفا تھی یا باوفا؟ اس نے دل کو بچایا تھا یا لہو کے تعلق کو؟ یہ تو وقت نے ثابت کر ہی دیا تھا کہ عورت چاہے تو نسلوں کو بچا سکتی ہے اور چاہے تو تباہی کے دہانے پر لے جاسکتی ہے۔

اس کا دل اپنے پیا کے قدموں تلے بچھ بچھ جارہا تھا اور لب دعاؤں کا حصار باندھ رہے تھے۔

اورے پیا' ہائے اورے پیا
رونے لگا کیوں دل پگلا رے
آیا کہاں سے' درد کا طوفان ہائے
آنسو بھی تو آتے نہیں' یادیں کہیں جائیں نہیں
ہنسی بھی تو آئے نہیں' درد دور جائے نہیں
جانے کیوں' پھر بھی یہ۔۔۔ دل رو دیا رے
اورے پیا ہائے! مورے پیا ہائے!
لاگے کہیں نہیں' مورا جیا رے
یہ عشق کیا ہے' کیسا نشہ ہے
یہ اک طوفان ہے' پاگل ہوا ہے
مجھ کو لے جا رے لوٹ کے نہ آرے
میں عاشق تیرا رے' تو پیا میرا رے
یہ ہجر تیرا ہائے' مجھے مل گیا ہائے
اورے پیا! ہائے' اورے پیا!

☼ ☼ ☼

وہ اک قیامت کا سفر کر کے گھر لوٹی تھی۔ اس کے اندر بھانبڑ جل رہے تھے۔ اس کے پیروں تلے انگارے بچھے تھے اور وہ ایک جنوں خیز کی جنونی محبت کو سکون دے کر آرہی تھی۔ وہ اس کے قول کے مطابق ماہیر عالم کی زندگی سے نکل گئی تھی۔

زوباریہ درانی کا جنون جیت گیا تھا۔ حریم جمال کی محبت ہار گئی تھی۔ اس کے کانوں میں آج بھی اس فون کال میں سے حانی کی سسکیاں سنائی دیتی تھیں اور پھر حانی کے درد میں ڈوبے الفاظ۔

"حریم! یہ نہ جانے کون پاگل عورت ہے۔ تم اس کی باتوں میں مت آنا۔ یہ پاگل ہے حریم' کبھی میرے قدموں میں گرتی ہے۔ کبھی مجھ سے معافیاں مانگتی ہے۔ رات رات بھر جائے نماز پر کھڑی روتی ہے۔ نہ جانے یہ کون ہے حریم! اس کا ماہیر بھائی سے نہ جانے کون سا تعلق ہے؟ تم میری خاطر کوئی بھی انتہائی فیصلہ نہ کرنا۔ میرا کیا ہے۔ میں نہ بھی رہی تو بھلا کسی کو کیا فرق پڑے گا۔ تم اذان کو جیتے جی یتیم مت کرنا حریم!

اس پاگل کی باتوں میں مت آنا۔" حانی بری طرح سے رو رہی تھی۔ یقیناً" وہ گھر والوں سے چوری چھپے اسے فون کر رہی تھی مگر اس کا فون ٹیپ کیا جارہا تھا۔ پھر کسی نے بڑی نرمی کے ساتھ حانی کے ہاتھ سے ریسیور پکڑ لیا۔ حریم کا رواں رواں سماعت بن گیا تھا۔ وہ بے حد خوفزدہ ہو رہی تھی کہ اب حانی پر تشدد کیا جائے گا مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ ریسیور میں سے ایک ٹھہری' رواں اور بے حد نرم آواز سنائی دی۔

"میں زوباریہ ہوں حریم!" آواز بھی تو کسی ساحرہ کی لگ رہی تھی۔ عجیب کھویا کھویا سا لہجہ تھا۔ نہ جانے وہ دیکھنے میں کیسی تھی۔

"جتنی اس بچی حانی کی عمر ہے نا۔۔۔ اتنے سال میں نے تمہارے ماہیر سے محبت کی ہے۔ اتنے سال میں نے اس کا انتظار کیا ہے۔ اتنے سال آبلہ پائی کا سفر کرتی رہی ہوں۔ اتنے سال ننگے پاؤں چلی ہوں۔ جب منزل قریب آئی تو پتا چلا کہ یہ راستہ کسی اور کا تھا۔ جس پر میں نے طویل ترین سفر کیا۔ اس تھکے ہارے مسافر کی بھلا کیا حالت ہوتی ہے؟ یا تو وہ کندھے جھکا کر بے دم ہو جاتا ہے یا پھر میری طرح بپھر جاتا ہے۔ میں بپھرے ہوئے طوفان کی طرح ہوں حریم! اگر ماہیر کی زندگی سے تم دور نہ ہوئیں۔ اگر ماہیر مجھے نہ ملا تو تمہارے اذان کو سچ مچ یتیم ہونا پڑے گا۔ اگر وہ میرا نہیں ہو سکا تو تمہارا بھی نہیں رہ پائے گا۔ میں اسے تم سے متنفر کردوں گی۔ وہ تم پر تھوکنا بھی گوارا نہیں کرے گا۔ وہ تمہیں دیکھنا بھی گوارا نہیں کرے گا۔ اگر میں اس مقصد میں بھی کامیاب نہ ہو سکی تو پھر ماہیر کو اپنے ہاتھ سے زہر پلادوں گی اور اس کا بچایا ہوا زہر خود پی لوں گی اور تم نہیں جانتیں حریم! میں ایسا کر سکتی ہوں۔ میں ایسا کردوں گی۔ میں ماہیر کو زہر پلادوں گی اور خود بھی زہر سے بھرا جام پی لوں گی۔ پھر تم ہم دونوں کے مرقد پر آنا۔۔۔ اور مجھے ماہیر کے برابر میں دفنا دینا۔ یہ عشق کی آگ شاید مرنے کے بعد ٹھنڈی ہو جائے۔" زوباریہ کی نرم بے حد نرم آواز میں درد کا جو طوفان تھا۔ حریم گویا سہم کر تھرتھرا گئی۔

"یہ کیسی محبت ہے زوباریہ! یہ تو محبت نہیں' اسے محبت کا نام مت دو۔ بھلا محبت پا لینے کا نام تو نہیں۔ کسی کے حصول کو محبت نہیں کہتے۔ محبت وجود خاکی کو کھو کر دراصل تخلیق ہوتی ہے۔ اس کے بعد ایک اور سفر شروع ہوتا ہے۔ یہ سفر سچا' خالص اور کھرا ہے۔ بس اس راہ کی تلاش بہت مشکل ہے۔"

"مجھے محبت کے فلسفے مت سمجھاؤ حریم! مجھے خوشی کا سندیسہ سنادو۔ یا میرے ساتھ ایک ڈیل طے کرلو۔" آواز پر گویا عجیب سی خماری طاری ہو گئی تھی۔

"کیسی ڈیل؟" حریم پھر سے کپکپا کر رہ گئی۔

"یا تو ماہیر کو میرے ساتھ شیئر کرلو۔ میں اس کی دوسری بیوی بن جاؤں گی۔" اس نے حریم کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔

"مجھے ماہیر کا بٹوارا منظور نہیں۔" وہ دھاڑ کر بولی۔

"تو پھر پورے کا پورا ماہیر مجھے دے دو۔" زوباریہ کا لہجہ اور بھی نرم ہو گیا۔ مٹھاس گویا اس کے لفظوں سے ٹپک رہی تھی۔

"ایسا بھی ممکن نہیں۔ تم واقعی پاگل ہو۔" حریم حلق کے بل چلائی تھی۔

"اچھا' تو حانی کو پھر بھول جانا۔۔۔ ہمیشہ کے لیے اور ماہیر کو صرف یاد کرتی رہنا۔ جس طرح میں نے حانی کو اغوا کرلیا ہے اسی طرح ماہیر تک پہنچنا میرے لیے مشکل نہیں۔" وہ شاید دھیمے سے ہنسی تھی۔ بہت خوب صورت گھنٹیاں بجاتی ہنسی کی آواز تھی۔

"ماہیر میرا نہ ہو سکا تو اسے تمہارا بھی نہیں رہنے دوں گی۔ تمہیں انڈر ورلڈ کے لوگوں کے حوالے کر دوں گی۔ دونوں بہنیں گوشت خور سرمایہ داروں اور اسمگلروں کے دل خوش کرتی رہنا۔ بس آدھا گھنٹہ ہے تمہارے پاس' جلدی فیصلہ کرلو۔" فون کھٹاک سے بند ہو گیا تھا۔ اس فون کال نے اس کے جسم کا سارا خون گویا چوس لیا تھا۔ وہ ماہیر کے پاس جانے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ اسے آخری دفعہ دیکھنا بھی تو تھا اور جب وہ گھر واپس آئی تو اس کا پہلا سامنا راحت بیگم سے ہوا۔ وہ بے قراری سے اس کی طرف آئی تھیں۔

"ماہیر کب تک آجائے گا حریم بیٹی! میرا بچہ کب تک واپس آئے گا۔" ممتا کی ماری اس عورت کی آنکھوں میں سوال تھے۔

"طلاق کا پروانہ لے کر آرہی ہوں۔ تمہاری دولت مند ہونے والی بہو بہت جلد ماہیر کو جیل سے چھڑوا لائے گی۔" وہ زہر خند ہو کر چلا اٹھی تھی۔ راحت بیگم تو اس کے لہجے کو سن کر گویا کانپ کر رہ گئیں۔

"حریم! میری بچی کیا ہوا؟ ماہیر سے لڑائی ہو گئی ہے۔ میری بیٹی! وہ بے قصور ہے۔ اسے عدالت بھی بری کر دے گی۔" وہ حریم کے اندر لگی آگ سے ناواقف تھیں۔ وہ اس کے غصے کو تحمل سے برداشت کر رہی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ حالات نے اس کے اندر غصہ بھر دیا ہے۔

"میں جانتی ہوں' وہ بے قصور ہے' بے گناہ ہے۔" اس کا دل کرلایا۔

"تجھے کیا ہوا ہے؟ حریم! بتا دے میرا دل پھٹ جائے گا۔" وہ ایک دفعہ پھر اس کی دلی کیفیات سے انجان بے صبری سے بولیں۔

"میرے دل کا جنازہ اٹھ رہا ہے۔ میرے منہ نہ لگو۔ مجھے تنہا چھوڑ دو۔" وہ ایک دم چلانے لگی۔ راحت بیگم گھبرا اٹھیں۔

"مجھے مت چھونا۔۔۔ میرے اندر آگ لگی ہے۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ مجھے تنہائی بخش دو۔" وہ اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ اس کی آواز میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ اس کے ہونٹوں میں کپکپاہٹ تھی۔ اس کے وجود میں تھرتھراہٹ تھی۔ اس کا پورا جسم زلزلے کی زد میں تھا۔

"تجھے ہوا کیا ہے؟ مجھے بتاؤ میری بیٹی۔" وہ ہاتھ جوڑے منت کر رہی تھیں۔ وقت بھی بڑے بڑے لوگوں کے سارے بل نکال دیتا ہے۔ وقت سے بڑا بھلا کوئی استاد ہے؟

"تمہارے بیٹے سے طلاق لے کر آرہی ہوں۔ چلاؤں نہ تو کیا جشن مناؤں؟" وہ غصے' دکھ اور کرب کی انتہا پر پہنچی ادب و احترام کا دامن بھی چھوڑ بیٹھی تھی۔

"طلاق۔" راحت بیگم کی آنکھیں گویا پھٹ پڑیں۔

"تجھے ماہیر نے طلاق دے دی؟" ان کے دل پر گویا یکے بعد دیگرے گھونسے پڑے۔

"طلاق دی نہیں۔۔۔ میں نے خود لی ہے۔" وہ بھل بھل گرتے آنسوؤں کو بے دردی سے پونچھتی سامان سمیٹ رہی تھی۔

"تم نے طلاق لے لی؟ کیوں؟" راحت بیگم نے اس سے بھی بلند آواز میں رونا شروع کر دیا۔

"اس لیے کہ وہ اوباش امیر زادی' ماہیر کے عشق میں پاگل تھی۔ اسے ماہیر چاہیے تھا۔ اگر میں طلاق نہ لیتی تو اس عورت نے ماہیر کو مار دینا تھا۔ حانی کو انڈر ورلڈ کے "کتوں" کے ہاتھ بیچ دینا تھا۔ اذان کو یتیم کر دینا تھا۔ اگر میں ماہیر کو نہ چھوڑتی تو اس نے یہ پورا خاندان تباہ کر دینا تھا۔ اب تو صرف حریم کا دل اور گھر اجڑا ہے۔ آپ کا ماہیر تو سلامت رہے گا نا۔ آپ کی نظر کے سامنے رہے گا۔ میں نے اپنے باپ کی عزت کو داغدار ہونے سے بچا لیا۔ میں نے ماہیر کو رات جیسی قبر میں اترنے سے بچا لیا۔" وہ رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی اور راحت بیگم بھی اس کے ساتھ باآواز بلند رو رہی تھیں۔

"وہ قبر سے نکل کر کیسے زندہ ہو گئی؟ وہ تو مر چکی تھی؟"

"وہ زندہ تھی۔ اس کی ماں نے آپ سب کے لیے اسے مار دیا تھا۔ وہ امریکہ میں مقیم تھی۔" نہ جانے کب شاہنواز چپکے سے اندر آگیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں وہ ہی لفافہ تھا۔ جو وہ حریم کو تھما رہا تھا۔

"تم کیسے جانتے ہو اسے؟" راحت بیگم نے پھٹی پھٹی آواز میں پوچھا۔

"میں اسے کافی عرصے سے جانتا ہوں۔ مگر مجھے یہ خبر نہیں تھی کہ وہ ماہیر عالم کے پیچھے مر مٹنے والی زوباریہ ہے۔ اللہ کی قسم! اگر مجھے پہلے خبر ہوتی تو میں اس کے

حلق پر چھری پھیر دیتا اور خود کو قانون کے حوالے کر دیتا۔" شاہنواز نپے تلے قدم اٹھاتا اس کے قریب آیا تھا۔

"بہت جلد بازی سے کام لیا ہے تم نے حریم! اتنی جلدی طلاق کا فیصلہ بھی کر لیا۔ تم مجھے تو بتاتیں' پھر دیکھتیں کہ تمہارا یہ بھائی کیسے اپنی جان کی بازی لگا دیتا۔ مگر تمہیں اجڑنے تو نہ دیتا۔ تمہاری آنکھ میں کبھی آنسو نہ آنے دیتا۔" وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھے نم آواز میں کہہ رہا تھا۔

"اس بند لفافے میں جو کچھ موجود ہے۔ کوئی بھی غیرت مند شوہر اس ثبوت کو دیکھ کر بندوق اٹھا سکتا تھا۔ مگر ماہیر نے ایسا نہیں کیا۔ اسے تم پر صبح سحر کی سپیدی جیسا یقین تھا پھر تمہارا یقین کیوں ہلکا ہو گیا۔"

"مجھے پچھتاووں کی راہ مت دکھاؤ شاہنواز! میں نے خود کو قربان کر دیا ہے اب میں ہرگز بھی پچھتانا نہیں چاہتی۔" وہ آنسو پونچھتی سامان اٹھا کر باہر آگئی تھی جب موبی نے اس کا رستہ روک لیا۔ آج وہ پھر سے خواجاؤں والے اسٹائل میں کھڑا تھا۔ نیلی آنکھوں میں کربناک کہانی زندہ تھی اور اس کربناک کہانی کا انجام موبی دیکھ رہا تھا۔

"کانچ کے شہر کی وہ عورت جیت گئی بھابھی! اور تم نے خود کو ہار دیا۔" وہ مخصوص انداز میں پیر زمین پر مار رہا تھا۔

"جنون جیت کر پھر بھی ہار جاتا ہے اور محبت ہار کر بھی جیت جاتی ہے۔" اس کے ہونٹ دھیرے دھیرے وا ہو رہے تھے۔ وہ پھر سے ایک خواب کے سفر میں تھا۔ اس پل حریم کو نہ جانے کیا ہوا تھا۔ وہ گویا موبی پر جھپٹ پڑی۔۔۔ وہ اسے مکوں کے ساتھ گھونسوں کے ساتھ مار رہی تھی۔ پیٹ رہی تھی۔ پھر اس نے اپنے پیر کی جوتی اتار لی تھی۔ اب وہ جوتے کے ساتھ اسے پیٹ رہی تھی۔ اس کے جوتے کی ضربیں موبی کے سر پر لگ رہی تھیں۔

"اپنا سارا دکھ' سارا کرب نکال دو بھابھی! اس گھر میں اپنے غم کی اس کہانی کو چھوڑ جاؤ بھابھی! اللہ نے چاہا تو خوشی تمہارے دل کو ضرور چھو لے گی۔" جب حریم تھک ہار کر موبی کو چھوڑ بیٹھی تو وہ ہنوز پہلے والے لب و لہجے میں دھیرے دھیرے بولا۔ حریم اس کی طرف متوجہ کہاں تھیں۔ اب وہ لفافہ چاک کر رہی تھی۔ لفافے میں تصویروں کا ایک ڈھیر تھا۔ یہ ساری تصویریں حریم کی شادی کی تھیں۔ مگر یہ تصویریں بھلا زوباریہ کے پاس کیسے پہنچی تھیں۔ اس کے علاوہ بے شمار کارڈز تھے۔ خطوط تھے آٹھ دس ڈائریاں تھیں۔

"یہ سب کیا تھا؟" حریم کو بس لحہ بھر لگا تھا بات کی گہرائی میں اترنے میں۔ ہر ڈائری کے پہلے صفحے پر زرجان عباس لکھا تھا اور آگے نہ جانے محبت کی کون سی قسم کی داستان رقم تھی۔

نہ جانے یہ محبت کیا تھی؟ اور یہ محبت کس کس انداز میں دلوں میں اترتی تھی؟

اور نہ جانے اس کی کتنی قسمیں تھیں؟ نہ جانے اس کے کتنے ہی روپ تھے؟ اس کی کتنی شکلیں تھیں اور ہر شکل میں محبت کون سا چہرہ لے کر جلوہ گر ہوتی تھی۔

کبھی میٹھا میٹھا درد جگا دیتی تھی۔ کبھی سراپا سلگا کر رکھ دیتی تھی۔ کبھی ایثار اور قربانی کے سبق سکھاتی تھی۔ کبھی جنون کا راستہ دکھلاتی تھی۔

یہ محبت زرجان عباس نے کی تھی نہ جانے کب سے' کتنے سالوں سے' کتنی صدیوں سے اور اس محبت کی خوشبو تک کو اس نے چھپا کر رکھا تھا اور آج کسی نے اس کے راز سے پردہ اٹھا دیا؟ بھلا زوباریہ درانی کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا؟

حریم گویا تھک ہار کر بکھر گئی۔ ٹوٹ گئی تھی اور موبی پھر سے وجد کے عالم میں تھا۔ وہ اپنے دھیان و گیان میں تھا۔

"اس کا کشکول پھر بھی خالی رہے گا بھابھی! شیشے کا وہ شہر سنسان ہی رہے گا۔ کسی بچے کی قلقاری کی آواز سنائی نہیں دے گی۔ کبھی بھی نہیں۔" وہ ہنسا تھا یا رویا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پائی اور وہ رکی بھی نہیں تھی۔

"تمہاری نحوست نے مجھے برباد کر دیا۔ کاش موبی! تم نہ ہوتے' تمہاری پچھلے اور اگلے وقتوں کی باتوں نے

مجھے ہمیشہ ایک خوف میں مبتلا رکھا تھا اور آج اس خوف نے تجھے چاٹ لیا۔" وہ ننھے اذان کو سینے میں سموئے خالی ہاتھ جا رہی تھی۔ سارا سامان وہیں پڑا رہ گیا تھا اور موبی کے لفظ اس کا پیچھا کر رہے تھے۔

"تیری آبادی کے لیے میرا دل دعا گو رہے گا ہمیشہ بھابھی! اللہ تجھے شاد رکھے۔ یہ موبی کی دعا ہے۔ ہم نے تجھے کچھ بھی نہیں دیا نہ محبت نہ عزت۔ مگر تم نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے۔ تم نے میرے ماہیر بھائی کو ایک طوفان کی زد میں آنے سے بچالیا ہے۔ تم نے اس گھر کو بچ بچ بچالیا۔ اللہ! تجھے آباد رکھے ـــ یہ موبی کی دعا ہے۔ خاص الخاص تیرے لیے، شیشے کے شہر کی اس عورت کا کشکول خالی رہے گا۔ خالی کردینے والے ہمیشہ خالی رہتے ہیں۔" موبی اب بلند آواز میں رو رہا تھا۔

✡ ✡ ✡

اداسی کے افق پر جب تمہاری یاد کے جگنو چمکتے ہیں\
تو میری روح پر ہجر کا رکھا ہوا پتھر\
چمکتی برف کی صورت پگھلتا ہے\
اگرچہ یوں پگھلنے سے یہ پتھر سنگریزہ تو نہیں بنتا\
مگر اک حوصلہ سا دل کو ہوتا ہے\
کہ جیسے سربسر تاریک شب میں بھی\
اگر اک زرد رو سہما ہوا تارا نکل آئے\
تو قاتل رات کا بے اسم جادو ٹوٹتا ہے\
مسافر کے سفر کا راستہ تو کم نہیں ہوتا\
مگر تارے کی چلمن سے\
کوئی بھولا ہوا منظر اچانک جگمگاتا ہے\
سلگتے پاؤں میں اک آبلہ سا پھوٹ جاتا ہے

آبلہ پائی کا سفر اور اس کا انتخاب راستوں کو ہمیشہ گم کردیتا ہے اور وہ گم راستوں کی مسافر ہی تو تھی اور اس کی راہنمائی کرنے کے لیے آج بھی اک ننھا سا تارہ جگمگا اٹھتا تھا۔ مگر اس کی بے نیازی اس ننھے سے تارے کو مایوس کردیتی تھی۔

جانی لاج کا لان اب بھی سرسبز تھا۔ بوا آج بھی لان میں بیٹھ کر دھوپ سینکتی تھیں۔ بابا اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھے اب جانی کا انتظار کرتے تھے۔ وہ اسلام آباد میں محسن کے ہمراہ رہتی تھی۔ ایک پیاری سی بچی نے ان کی جنت کو مکمل کردیا تھا۔

اذان اب اسکول جانے لگا تھا۔ سہ پہر کے وقت وہ لان میں فٹ بال کھیلتا تھا اور حریم اسے کھیلتا دیکھ کر دل ہی دل میں اس کی نظر اتارتی تھی۔

آج بھی سیاہ گیٹ کے اس پار لمبی سی گاڑی کے ٹائر چرچراتے تھے۔ سیاہ پینٹ، سیاہ شرٹ میں ملبوس گھنے ریشمی بالوں والے سر پر گلاسز ٹکائے، دھیمے نپے تلے پروقار قدموں سے چلتا ہوا وہ ناک کی سیدھ میں اندر چلا جاتا تھا اور کبھی کبھار حریم کو لان میں بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک کر رک جاتا۔

ہمیشہ کی طرح ٹھاٹ باٹ، شان و شوکت، آن بان لیے وہ اس کے مقابل کھڑا ہو جاتا۔ نظر چرا کے، سر جھکائے کچھ سوچتا ہوا خاموش، اداس باحیثیت، بااختیار ہر طرح کے جاہ و جلال کے باوجود عجیب سی لاتعلقی، بے نیازی اس کی شخصیت میں سے چھلکتی تھی۔ گویا اس دھن دولت سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس عزت، مرتبے، روپے پیسے نے اسے کچھ بھی نہیں دیا تھا۔ اپنی ذات میں گم ـــ اصول پسند، باانصاف، شفیق، حلیم، مہربان، رحم دل، صابر اور قانع تھا۔ وہ زرجان عباس تھا۔ محترمہ تابندہ فلک ناز کا پہلے شوہر سے تیسرا بیٹا۔

وہ آج بھی انہی گلیوں اور انہی راستوں پر چل رہا تھا۔ بغیر کسی صلے اور انعام کے۔ آج بھی بولتی خاموشی ان دونوں کے درمیان محو کلام ہوتی تھی۔ وہ آج بھی اظہار محبت سے جھجکتا تھا۔ وہ آج بھی اپنی محبت دل کے نہاں خانوں میں چھپائے ہوئے تھا اور حریم جمال آج بھی اس کی محبت سے بے نیاز تھی۔ سورج کے گرد طواف کرتی، چکر کھاتی بولتی خاموشی نے اس منظر کو دیکھا تھا اور بل کھاتی وہ ڈوبتے سورج کی کرنوں سے پیچھا چھڑاتی ان دونوں کے درمیان آموجود ہوتی۔

"پھر آگئے ہو زرجان۔"

"میں بھلا گیا ہی کب تھا۔ ازل سے یہیں ہوں، ابد تک یہی رہوں گا۔ مجھے آخر جانا کہاں ہے؟"

"میں تمہارے ساتھ ہوں نا ـــ غم کیوں کھاتے ہو۔" خاموشی اپنی ذات کا مان بخش رہی تھی۔

"ہونہہ، تمہارے ساتھ سے کوئی خوش ہو پاتا ہے۔"

"یہ تو تم نے ٹھیک کہا۔" خاموشی اداس ہوگئی۔

"کون سا اسم پھونکوں، جو تمہارا دل خوش ہو جائے؟"

"وہ اسم تمہارے پاس نہیں۔"

"تو پھر کس کے پاس ہے؟" وہ جانتے بوجھتے سوال کررہی تھی۔

"جس کے پاس ہے۔ وہ انجان بنی رہتی ہے۔"

"اور وہ کون ہے؟" خاموشی کو عجیب سا حسد محسوس ہوا۔

"حریم نا ـــ"

"ہاں۔"

"تم بھی نا زرجان!" خاموشی نے اپنا ماتھا پیٹا تھا اور پھر سست قدموں سے بھاگ گئی۔ کسی کے ننھے قدموں کی چاپ نے زرجان کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔

"زرجان انکل۔" وہ اس کی گود میں سوار ہوگیا۔

"کب آئے آپ۔"

"ابھی کچھ دیر پہلے۔" زرجان نے اس کی روشن پیشانی کو چوما اور ایک بڑا سا شاپر چپکے سے اس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ اب جانی کی جگہ اذان نے لے لی تھی۔ وہ جانی کی طرح اکثر فرمائشیں کرتا تھا اور اس کی فرمائش پوری کرنا زرجان کو پسند تھا۔

"زرجان بیٹا آئے ہیں۔" بوا ایک دم کھل اٹھیں۔

"کیسے ہو بیٹا! اب ذرا جلدی جلدی چکر لگایا کرو، مانو جانی کے جانے کے بعد تو یہاں الو بولنے لگے ہیں۔"

"ٹھیک ہوں بوا۔" وہ آہستگی سے بولا۔

"ٹھیک ہیں تبھی تو آپ کے سامنے ہیں۔ بیمار ہوتے تو میری طرح بیڈ پر لیٹے ہوتے۔" اذان کہاں چپ رہ سکتا تھا۔ پورا جانی کا جانشین تھا۔

"اذان! چلو اندر ـــ پھر سے فلو ہو جائے گا۔" حریم اسے بازو سے پکڑ کر اٹھا رہی تھی۔

"بوا! اسے لے جائیں اور میز پر سیرپ رکھا ہے۔ دوا بھی دے دیں۔"

"ٹھیک ہے بیٹا۔" وہ اپنے آگے بھاگتے اذان کے پیچھے چلی گئیں۔

"کیسی ہیں حریم!" بوا اور اذان کے چلے جانے کے بعد خاموشی کا مختصر وقفہ آگیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح زرجان نے ہی گفتگو کا آغاز کیا۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ گھاس کو جوتی کی نوک سے کھرچ رہی تھی۔

"جاب کیسی جا رہی ہے؟"

"بہتر ہے۔" نہ جانے کیوں حریم کو لگتا تھا کہ اس کے پاس لفظوں کا ذخیرہ ختم ہوگیا ہے۔

"آپ سے کچھ کہنا تھا؟" بہت سوچنے کے بعد زرجان کو مناسب الفاظ مل ہی گئے تھے۔ حریم بغیر چونکے سر ہلانے لگی۔

"کیا؟" وہ پوچھ رہی تھی۔

"مما یہاں آنا چاہتی ہیں۔" زرجان نے بہت سوچنے کے بعد بالآخر کہہ ہی دیا۔

"کیوں؟" حریم پوچھنا چاہتی تھی مگر پوچھ نہیں پائی۔ زرجان کو ایمرجنسی کال نے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا سو وہ معذرت کرتا ہوا بابا سے بغیر ملے ہی چلا گیا تھا جبکہ حریم کو سوچوں کے بھنور میں الجھا گیا۔

"محترمہ فلک ناز اور یہاں آئیں۔" اس کی سوچیں نہ جانے کہاں کہاں بھٹک رہی تھیں۔ شاید اپنی بیٹی کے حوالے سے کوئی معذرت، کوئی شرمندگی سے ترتیب دیا لفظوں کا نامہ لے آئیں۔ وہ برآمدے کے ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور اس کی سوچیں چار سال پہلے کے مناظر کو کھوج رہی تھیں۔ آج پھر سے دل میں میٹھا میٹھا درد انگڑائیاں لے کر جاگ اٹھا تھا۔ آج پھر جدائیوں کی کربناک سہ پہر خون کے آنسو رلا گئی تھی۔ آج پھر ماہیر سے آخری ملاقات یاد آگئی تھی۔

ماہیر شاید اسے کبھی بھی طلاق نہ دیتا مگر اس خط نے

ماہیر کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس خط کا لفظ لفظ آج بھی حریم کے دل پر لکھا ہوا تھا اور اسے لکھتے ہوئے حریم خون کے آنسو رو رہی تھی۔ جب ماہیر نے اسے پڑھا تھا تو نہ جانے اس کے دل پر کون سی قیامت اتری ہوگی۔ وہ آج بھی اس تحریر کے لفظ لفظ کو نہیں بھول پائی تھی۔

"سمجھ میں نہیں آتا' شروعات کیسے کروں۔ سلام' دعا کا وہ بے نام سا تعلق تو اسی صبح ختم ہو گیا تھا جب آپ کے ہاتھ میں ہتھکڑی لگی تھی۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے جو میں نے آپ کے ساتھ دن' ہفتے' مہینے اور سال گزارے ہیں۔ سب رائیگاں چلے گئے۔ وقت نہ جانے کس موڑ پر لے آیا ہے۔

مجھ لگتا ہے۔ اب ہم مزید ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ میں اس چھوٹے سے قید خانے میں آپ کی خبطی ماں اور پاگل بھائی کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ چھوٹی چھوٹی خواہشات کے حصول کے لیے میں ترس ترس کر زندگی نہیں گزار سکتی۔

آپ تو شاید سالوں جیل خانے سے نہ نکل سکتے اور میں آپ کے گھر والوں کے پیٹ کو بھرنے کے لیے مشقت کی چکی بھی نہیں پیس سکتی۔ میں امی اور موبی کو لے کر ہسپتالوں کے چکر بھی نہیں لگا سکتی۔ جو تکلیف دہ عذاب ناک زندگی مجھے بخش کر آپ جیل میں چلے گئے ہیں۔ مجھے یہ گھٹن زدہ زندگی نہیں چاہیے۔

میں بہت لمبی بحث میں نہیں پڑوں گی۔ صرف اتنی التجا ہے کہ مجھے آزاد کر دیں۔ آج سہ پہر کو میں آپ سے ملاقات کے لیے آؤں گی۔ میری یہ گزارش ہے کہ مجھ سے سوال مت کیجیے گا۔ میں آپ کے کسی سوال کا ٹھوس جواب نہیں دے پاؤں گی۔ مجھے صرف آپ کے نام سے آزادی چاہیے۔ میں آپ کے ساتھ سفر کی ابتدا میں ہی تھک گئی ہوں اور جب زندگی میں تھکن اتر آئے تو اس تھکن زدہ زندگی سے بھی چھٹکارا پا لینا چاہیے۔ ایک آپشن تو یہ ہے کہ آپ بہت خاموشی کے ساتھ بغیر کسی جرح اور تکرار کے مجھے فارغ کر دیں۔ اگر آپ ایسا نہیں کریں گے تو مجبوراً"

میں آپ کے نام ایک اور کیس عدالت میں دائر کروا دوں گی۔ یہ کیس بے جا تشدد اور جبر کا ہو گا۔

دوسرا کیس خلع کا ہو گا اور تیسرا کیس مجھ پر قاتلانہ حملے کا ہو گا۔ آپ شاید بھول چکے ہیں۔ یاد کیجیے' پیر ولی شاہ کے دربار کو۔ جب میں پیر رپٹ جانے کے باعث کھائی میں جا گری تھی۔ اس حادثے کو قاتلانہ حملے کا روپ دینا بہت آسان ہے اور میں ایسا کر بھی لوں گی۔ آپ تمام عمر پیشیاں بھگتتے رہیے گا اور آخری بات یہ ہے کہ اگر میرا بیٹا اذان بھی موبی کا دوسرا روپ ہوتا تو میں اسے بھی آپ کی دہلیز پر چھوڑ جاتی۔ میرا باپ دوست کی محبت میں اندھا ہو گیا تھا۔ بھلا کوئی ایسے خاندان میں رشتہ جوڑتا ہے؟ میں اس نحوست زدہ' کریہہ ماحول کا مزید حصہ نہیں بن سکتی۔

وہ لڑکا جو کبھی ستره سالہ بچہ بن جاتا ہے اور کبھی ستر سال کا بوڑھا۔ اسے میں کبھی سمجھ نہیں پائی۔ مگر اس کے قصوں اور کہانیوں کی نحوست نے میرے دل کی ہر خوشی کو چاٹ لیا ہے۔ مجھے اس کے ہر روپ سے نفرت ہے۔ مجھے اس کے وجود سے نفرت ہے۔ مجھے آپ کے گھر کے ان دو افراد سے نفرت ہے' جنہوں نے میری زندگی کو جہنم بنائے رکھا۔ میں آپ کی ماں اور بھائی کے ساتھ مزید نہیں رہ سکتی۔ کبھی نہیں' ہرگز نہیں مجھے طلاق چاہیے' امید ہے میرے دل کی خوشی کا خیال ضرور رکھیں گے۔" خط اختتام پذیر ہو گیا تھا۔

اسے ماہیر نے پرزے پرزے بھی کر دیا۔ اس خط کے اختتامی الفاظ تک وہ روتا بھی رہا تھا اور پھر اس نے حریم کی خوشی کا احترام بھی کیا تھا۔ اس نے حریم کو اپنے نام کی اس گھٹن اور حبس سے آزاد کر دیا تھا۔ مگر آج تک اس کا دل حریم کے اس فیصلے کی تلاش اور کھوج میں تھا۔ جو وجہ حریم نے اسے بتائی تھی۔ اس کا ذہن اس وجہ کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ وہ تسلیم کر ہی نہیں سکتا تھا یہاں تک کہ حریم چلی بھی گئی اور جیل خانے کی دیواریں اس پر مہربان ہوتی چلی گئیں۔

حریم کے چلے جانے کے بعد وقت کیسے اس پر مہربان ہوتا چلا گیا تھا؟ یہ معمہ آج بھی حل نہیں ہو پایا

تھا۔ یہ گرہیں آج بھی ایک گانٹھ کی شکل میں تھیں۔ ان الجھی گرہوں کو سلجھانا آج بھی مشکل تھا۔ کیونکہ ان ریشم کے لچھوں کو گرہیں لگانے والی نے آج تک کوئی بھی سرا ماہیر کے ہاتھ میں نہیں تھمایا تھا۔ چار سال پہلے ہوا کچھ یوں۔

✡ ✡ ✡

پورا ایک سال گزر گیا تھا۔ جیل اس کے لیے ایک قبر کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ اس جیل میں بھی نہ کوئی روزن تھا نہ کوئی دریچہ' ہاں شاہنواز کبھی کبھار ملاقات کے لیے آتا تھا۔ ایک وہ ہی تو تھا جو ابھی تک قدم سے قدم ملا کر چل رہا تھا۔ حالانکہ اب تو اپنی ذات کا سایہ بھی ساتھ چھوڑ گیا تھا۔

وہ بھی ایک زرد سی دوپہر تھی۔ اتنی ہی خاموش اور اداس۔۔۔ گویا وہ دوپہر پت جھڑ کے موسم کا دوسرا روپ تھی۔

شاہنواز نے ایک اور قیامت کی خبر اس کی سماعتوں میں اتار دی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ موبی دورے کی حالت میں گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ کہاں؟ یہ آج تک خبر نہیں ہو پائی تھی۔ اس کی خبطی ماں موبی کی جدائی میں کچھ اور خبطی ہو گئی تھی۔

ماہیر جو کبھی مایوس نہیں ہونا چاہتا تھا۔ نہ جانے کب' کیسے امید کا دامن بھی چھوڑ بیٹھا تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ وقت اس پر کبھی ابن کی طرح مہربان ہو کر نہیں برسے گا۔

وہ زرد دوپہر گلابی شام میں بدل رہی تھی جب اسے اطلاع ملی۔

"تمہاری ملاقات آئی ہے۔"

"بھلا کون ہو سکتا ہے؟" وہ کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے' شاہنواز تو ملاقات کر چکا تھا اور اس کے علاوہ بھلا کس نے یہاں آنا تھا۔

یہ ملاقات اسپیشل تھی۔ اسے ایک چھوٹے سے کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ کچھ دیر بعد ڈپٹی آف جیل کے ساتھ جو شخصیت اندر داخل ہوئی۔ ماہیر اسے دیکھ کر حیران ہی تو رہ گیا تھا۔

"تم۔۔۔" اس پر گویا حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

"ہاں میں۔" وہ دھیمے سے مسکرائی۔

"تم تو مجھ پر فاتحہ پڑھ چکے تھے نا' اور دیکھو میں عالم بالا سے بھی تمہارے لیے لوٹ آئی ہوں۔"

"تم یہاں کیسے آئیں؟ تم تو مر چکی تھیں نا۔" اسے اپنی بصارت پر گویا یقین نہیں آ رہا تھا۔

"بہت لمبی داستان ہے ماہیر! فرصت کے لمحوں میں سناؤں گی۔ تم بتاؤ' یہ جگہ تمہارے رہنے کی تو نہیں تھی۔ یہاں کیسے پہنچ گئے؟" دیدار یار اور قربت کے نشے نے عجیب سا سرور بھر دیا تھا اس کی نظر میں پورے نو سال بعد وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ جس کے ہجر نے اسے سرمئی رات بنا دیا تھا۔ یہ رات اب سحر کی طرف گامزن تھی۔

"یہ بھی بہت لمبی داستان ہے۔" ماہیر نے طویل سرد اور تھکن زدہ سانس کو خارج کیا۔ زولی کے اصرار پر وہ مختصر لفظوں میں ساری کتھا سناتا چلا گیا۔

"یہ وکالت نامہ ہے۔ سائن کر دو۔" وہ بغیر مزید جرح یا سوال کیے اپنے پرس سے وکالت نامہ نکالنے لگی۔

"کوئی فائدہ نہیں۔۔۔ چار مرتبہ میری ضمانت کی درخواست مسترد ہو چکی ہے۔" اس نے وکالت نامے کو بےزاری سے دیکھا۔

"اب نہیں ہو گی۔" وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

"ظاہر ہے۔ سفارش جو تگڑی ہے۔ مگر یاد رہے خاتون! جس کمپنی کی طرف سے مجھ پر کیس ہے۔ وہ بھی کچھ کم نہیں۔" وہ پھیکے سے لہجے میں بولا۔

"ہم پہاڑوں سے بھی ٹکرانے کا حوصلہ رکھتے ہیں ماہیر! بس جذبہ خالص ہونا چاہیے۔" وہ نفیس سا قلم اس کے ہاتھ میں تھما کر بولی۔

"اب میں دوسری ملاقات تم سے تب ہی کروں گی جب تم جیل سے باہر ہو گے۔" وہ مسکراتی ہوئی اٹھنے لگی

"زولی! ایک منٹ رکو۔" وہ خود بھی کھڑا ہو گیا۔

زوبی ناصرف رک گئی تھی بلکہ پلٹ بھی آئی۔
"تم نے شادی کرلی؟" نہ جانے کیسے یہ سوال اس کے لبوں سے پھسل پڑا۔
"شادی۔۔۔" زوبی کی آنکھ گویا رو دی۔
"شادی تو بہت دور کی بات ہے ماہیر! میں تو آج بھی اسی موڑ پر تمہارے انتظار میں دل بچھائے کھڑی ہوں۔ بس ایک تمہیں ہی میں نظر نہیں آتی۔ باقی تو سارا عالم میرے عشق کی گرمی کا گواہ ہے۔ میں تو تمہارے لوٹ آنے کی منتظر ہوں۔ نہ جانے کب پلٹو گے میری طرف، شاید اس وقت جب میں سچ مچ ایک مٹی کی ڈھیری تلے دب جاؤں گی۔"
"زوبی!" ماہیر گویا تھرا اٹھا۔
"تم آج بھی۔۔۔"
"ہاں، میں آج بھی تمہارے عشق میں پاگل ہوں۔ میں آج بھی خالی کشکول لیے کھڑی ہوں۔ میرا دل آج بھی خالی ہے۔ تم نے آج تک اس دل میں محبت کا کوئی دیا جو نہیں جلایا۔
یہ جو میرے سینے میں پھڑپھڑاتا دل ہے نا۔ MT-MERAPI کے آتش فشاں پہاڑ کی طرح ہے اور اسی پہاڑ کی طرح کئی مرتبہ لاوا اگل چکا ہے۔ آخری مرتبہ پچھلے سال کی ایک زرد سہ پہر کو یہ لاوا اگلا گیا تھا اور اس کے بعد یہ دل پرسکون ہو گیا ہے۔ اب اس دل میں کوئی آتش فشاں نہیں پھٹے گا کیونکہ میرا یقین، تمہیں میرے قریب لے آئے گا۔ تم میرے ہو کر رہو گے۔ اور میں اپنے دل سے ضد، غصہ، جنون، جذبات، حسد، نفرت ایک ایک شے کو اکھاڑ کر صحرائے عرب اور صحرائے کالاہاری کے حوالے کردوں گی۔ جتنا ان سب جذبات نے مل کر مجھے جلایا ہے اب ہمیشہ کے لیے ان کو بھی جلنا ہی پڑے گا۔" وہ نم نظروں سے مسکرائی۔
"تم آج بھی مجھ سے محبت کرتی ہو۔" نہ جانے کیوں ماہیر کچھ جھجک سا گیا تھا۔
"واشنگٹن کی ان سڑکوں سے پوچھ لینا۔ ہائی کے اس چرچ میں موجود اس بوڑھے سے پوچھ لینا۔ مونیکا سیلر زندہ ہوتی تو اس سے پوچھ لیتے۔ شاہنواز سے پوچھ لیتے اگر پوچھنا چاہتے ہو تو میری ماں فلک ناز سے پوچھ لیتے جس نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے، نو سال قید تنہائی کو میرا نصیب بنائے رکھا۔" وہ بے آواز رو رہی تھی۔ اس کے آنسو گالوں پر ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہے تھے۔
"محترمہ فلک ناز تمہاری ماں ہیں؟ تو کیا انہوں نے مجھے جیل بھجوایا ہے۔ میں ایک سازش کا شکار ہوا ہوں؟" ماہیر گویا چکرا کر رہ گیا۔
"ہاں، میری ماں نے تمہارے خلاف جھوٹا مقدمہ بنوایا ہے۔ تاکہ تمہیں میری نظروں سے اوجھل کر دیں۔ میں تم تک نہ پہنچ پاؤں۔ مگر دیکھو، میرے اللہ نے مجھے تم تک پہنچا دیا۔ میری ساری عبادتیں اور ریاضتیں منظور کرلی گئیں۔" اب وہ مسکرا رہی تھی۔ مگر آنسو تھے کہ ایک تواتر کے ساتھ بہے جا رہے تھے۔
"مجھ میں ایسا کیا۔۔۔ خاص ہے جو زوباریہ درانی کے قافلے راہ بھول بھول کر ادھر نکل آتے ہیں۔ جہاں جاتے ہیں۔ پلٹ آتے ہیں؟" ماہیر گویا ایک سحر کے زیر اثر تھا۔ اس ساحرہ کا سحر پورے نو سال بعد ماہیر عالم پر صرف ایک گھڑی میں طاری ہو گیا تھا۔ اس ساحرہ نے اپنے ساحر پر کوئی ایسا اسم پھونک ہی دیا تھا۔
"میرے دل کے کارواں اسی لیے تو پلٹ کر تمہاری طرف آتے ہیں کہ تم ہی میری منزل ہو۔" اس کی آنکھوں میں چمکتے ستاروں نے ماہیر کی آنکھوں میں روشنی سی بھر دی تھی۔
جیل کے تالے ماہیر عالم کے لیے کھول دیے گئے تھے اور صحرا صحرا وقت ابر باراں کی طرح اس پر مہربان ہوتا چلا گیا تھا۔
زوباریہ کے ساتھ نے اسے پارس کر دیا تھا۔ جس مٹی کو بھی ہاتھ لگاتا گویا سونا ہی سونا اگلنے لگتی۔ زندگی میں دوبارہ اس نے ناکامی کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ زینہ بہ زینہ کامیابی کی سیڑھی کے بلند ترین مقام تک پہنچ گیا تھا۔ زوباریہ کی دو فیکٹریاں اب چھ فیکٹریوں میں بدل گئی

تھیں۔ ان کا بزنس اب کئی ممالک تک میں پھیل چکا تھا۔
مگر ماہیر عالم صرف پیسہ بنانے کی مشین نہیں تھا۔ وہ زندگی کے ہر پل سے خوشی اور مسرت کشید کر رہا تھا۔ وہ رب رحیم کا شکر گزار تھا۔ جس نے اسے خواجہ اسجد کی طرف سے دی گئی آزمائش میں مبتلا کیا تھا اور اسی آزمائش کی بدولت اس پر حریم کی "اوقات" اور "اصلیت" کھل گئی تھی۔
اسے زندگی سے کوئی گلہ نہیں تھا۔ ایک بے تحاشا اطاعت گزار، وفادار اور محبت کرنے والی بیوی کی موجودگی میں وہ اس عمر رواں سے بھلا اور کیا چاہتا۔
اس کی زندگی میں کوئی کمی نہیں تھی اور زوباریہ کسی کمی کو اس کے قریب پھٹکنے بھی نہیں دیتی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زوباریہ کی محبت میں شدت اور بڑھ رہی تھی۔ یہ محبت کبھی کم ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ چاہے ماہیر اسے محبت دیتا یا نہ دیتا۔ لیکن اب تو وہ اس کی محبوب ترین بیوی تھی۔ وہ اس کی سوسائٹی کے مردوں کی طرح رات رات بھر باہر رہنے کا عادی نہیں تھا۔ وہ شراب نہیں پیتا تھا۔ وہ جوا باز نہیں تھا۔ وہ جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ وہ دھوکے اور فریب سے نفرت کرتا تھا۔ وہ صوم و صلوۃ کا پابند تھا۔ نمازی اور پرہیز گار تھا۔ باکردار تھا۔ باوفا تھا۔ اگر وہ اس سے کبھی محبت نہ بھی کرتا۔ اس کی محبت کے بدلے میں محبت نہ بھی دیتا تو کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ اتنی اعلا خوبیوں کے صدقے میں ماہیر عالم کی بے اعتنائی کو سہہ سکتی تھی۔ مگر وہ عہد کا پاسدار بھی تو تھا۔ عہد کو نبھانے والا بھی تو تھا۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنا کر وہ زوباریہ کی ذمہ داری اپنے سر لے رہا تھا۔ اس نے پورے دل کے ساتھ اس عہد کو نبھانے کا خود سے وعدہ کیا تھا۔
اور یہ زوباریہ درانی کی خوش قسمتی تھی کہ ماہیر عالم اسے مل گیا تھا۔ حالانکہ ماں کی ناگہانی موت اور بھائی کی گمشدگی نے بہت عرصہ تک اسے ایک غم کے فیز میں رکھا تھا۔ زوباریہ کی کوششوں اور بھرپور توجہ کی بدولت ہی تو وہ اس غم کی کیفیت سے نکل پایا تھا۔
ہر سکھ اور ہر خوشی کی موجودگی کے باوجود کچھ تو ایسا تھا۔ جو دل میں نہ جانے کون سا احساس بن کر ہولے ہولے چٹکیاں بھرتا رہتا تھا۔ وہ اس احساس کو سمجھ نہیں پاتی تھی۔
دو سال مزید گزرے تو اسے اس احساس کی چبھن کی وجہ سمجھ میں آگئی تھی۔ اور جب اسے اس کمی کا ادراک ہو گیا تو اس نے مزید دیر نہیں کی۔
بہت سے ٹیسٹ بہت سے علاج اور ہر طرح کی دوائیوں کے استعمال کے باوجود نتیجہ صفر تھا۔ کوئی بھی ڈاکٹر اس کے اندر کسی بھی بیماری کو تشخیص نہیں کر پایا تھا۔ اسے کسی بھی علاج کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ہر لحاظ سے فٹ تھی۔ تندرست تھی اس کے باوجود وہ اس خوشی سے بھلا محروم کیوں تھی؟ کوئی ایسا در نہیں تھا۔ جس پر زوباریہ کے ہاتھ کی دستک نہیں پڑی تھی۔ قابل سے قابل ترین ڈاکٹرز کے پاس ایک ہی جواب تھا۔
"اللہ کی طرف سے دیر ہے۔ آپ کو کسی بھی علاج کی ضرورت نہیں۔"
آج پھر وہ ایک ماہر ترین عمر رسیدہ لیڈی ڈاکٹر کے سامنے بیٹھی تھی۔
اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ کبھی بھی کسی ڈاکٹر سے رجوع نہیں کرے گی مگر اس کی ممتا کی طلب نہ جانے کہاں کہاں بھٹکائے جا رہی تھی اور اس کے لب پھڑپھڑا رہے تھے۔ اس کا دل کرلا رہا تھا۔
"یہ ایک سزا ہے۔ جو صرف میرے لیے ہے۔"

☼ ☼ ☼

ان دو سالوں میں وہ عورت نہ جانے کتنی مرتبہ آئی تھی۔ وہ سوالی بن کر آتی تھی اور اسے دینے کے لیے حریم کے پاس ایک لفظ اقرار کا نہیں تھا۔
آج پھر وہ سر شام ہی آگئی تھی۔ نہ پہلے جیسا غرور تھا اس میں نہ وہ ٹھاٹ باٹ پر اکڑ اور تکبر، نہ دھن دولت پر مان۔ اب تو وہ ایک عام سی ممتا کی ماری عورت

نظر آتی تھی۔ جس کے ہاتھ میں کاسہ تھا اور وہ مٹھی بھر خوشیوں کی طلبگار تھی۔ بھلا وہ عورت تھی کون؟

محترمہ تابندہ فلک ناز‘ کبھی ایک زمانے میں اس کی چاچی کے منصب پر فائز رہی تھیں۔ حریم کو کچھ عرصہ پہلے پتا نہیں تھا کہ وہ زرجان کے علاوہ زوباریہ درانی کی بھی ماں ہیں۔

پہلے پہل وہ یہی سمجھتی تھی کہ اپنی بیٹی کی طرف سے کوئی وضاحت نامہ لے کر آتی ہیں۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ تو زرجان عباس کے لیے سوالی بن کر آتی تھیں۔ جو آج بھی ایک خاموشی کے ہمراہ تنہا سفر کر رہا تھا اور وہ جان گئی تھیں کہ ان کے بیٹے کے حصے کی خوشیاں حریم جمال کے نام سے ہی وابستہ ہیں اور وہ اس کاسے میں اپنے بیٹے کا دل لیے بیٹھی تھیں۔

آج بھی ان کی آنکھیں نم تھیں۔ آج بھی ان کے ہونٹوں پر درخواست تھی۔ آج بھی وہ اس کی ایک ہاں کی منتظر تھیں۔

ارغوانی شام کا آنچل تھامے وہ عورت کبھی غرور و تکبر کا پیکر تھی۔ آج عمر رواں نے گویا اس کے غرور کے اونچے بت کو چکنا چور کر دیا تھا۔ اسی گھر میں وہ حریم جمال کو رد کر کے‘ ٹھکرا کر گئی تھیں۔ آج پھر اسی گھر کے آنگن میں سوالی بن کر کھڑی تھیں۔

”مجھے تم سے کچھ کہنا ہے حریم۔“ وہ اسے سر جھکائے منظر سے ہٹتا دیکھ کر ملتجی لہجے میں بولیں۔

”جی‘ فرمایئے۔“ وہ رک گئی تھی مگر پلٹی نہیں۔

”حریم! مجھے اور اذیت مت دو۔ میری ممتا پر ترس کھاؤ۔ تم بھی ایک بچے کی ماں ہو۔ ممتا کی تڑپ کو سمجھتی ہو۔“ فلک ناز کی آنکھوں میں آنسو مچل رہے تھے۔

”میں تمہیں شروع سے بتاتی ہوں۔ ذرا تحمل سے میری بات سننا۔“ انہوں نے کہنا شروع کیا تھا۔

”نہ جانے کب‘ کیسے‘ کس طرح سے زوباریہ کا یہ پاگل پن شروع ہوا تھا۔ پہلے پہل میں جھٹلاتی رہی۔ مگر اس کی خود کشی کی دو تین مرتبہ کوشش نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پھر میں نے کچھ غور و فکر کیا اور زوبی کو بہلانے کے لیے اس کی ماہیر سے منگنی کر دی۔ اپنے تئیں میں نے بڑی اچھی اسکیم سوچی تھی۔ زوبی امریکہ چلی جاتی۔ ماہیر کی شادی ہو جاتی۔ تب تک بیچ میں کئی سال آجاتے۔ زوبی بھی گزرتے وقت میں سنبھل جاتی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ میری کم عقلی‘ بے وقوفی اور زیادہ ہوشیاری نے زوبی کے ذہن کو‘ اس کی سوچ تک کو باؤنڈ کر دیا۔ وہ ماہیر کا خود کو پابند سمجھنے لگی۔

اس کی سوچوں‘ خیالوں اور خوابوں میں ماہیر کا تصور اور بھی پختہ ہو گیا تھا۔ نو سال وہ خود کو ماہیر سے وابستہ سمجھتی رہی اور میری تمام تر پلاننگ اس وقت دھری رہ گئی جب زوباریہ اچانک واپس آگئی۔

میں مانتی ہوں وہ غلط تھی۔ میں مانتی ہوں‘ اس نے جو کچھ کیا غلط کیا اور صرف اسی انتہا سے بچانے کی خاطر میں نے ماہیر کو جیل بھجوا دیا تھا۔ مگر میری پلاننگ یہاں بھی ناکام ہو گئی۔ میں چاہتی تھی کہ ماہیر کہیں دور بہت دور چلا جائے۔ جہاں زوبی کی پہنچ اور سوچ تک رسائی حاصل نہ کرے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ نہ جانے اس کے جذبے خالص تھے یا تمہارے نصیب کے دکھ بھاری تھے۔ مگر جو بھی ہوا‘ بہت برا ہوا۔ میرے تینوں بچوں میں سے ایک زرجان ہی تو تھا جو زوبی کو بہت محبت اور بھائیوں جیسا مان بخشتا تھا مگر اب وہ بھی زوبی کو دیکھنا تو دور اس کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتا۔

میں تم سے زوبی کے کیے گناہ کی معافی مانگنے نہیں آئی۔ وہ اس کا اپنا بھگتان ہے۔ یہ اس کے ہاتھ کی کمائی ہے۔ جو کچھ اس نے کیا ہے اس کی سزا کو کسی نہ کسی شکل میں اس نے ضرور ہی بھگتنا ہے۔ چاہے یہ سزا اولاد کی طرف سے آجائے‘ مال کی طرف سے یا جان کی طرف سے۔ بس ناداں انسان نہ سمجھتا ہے نہ سنبھلتا ہے۔

میں تمہارے پاس زرجان کی خوشیوں کی سوداگری کرنے آئی ہوں۔ تم زوبی کے گناہ کی سزا مجھے دے لو‘ مگر زرجان کو یوں رد نہ کرو نہ ٹھکراؤ۔ وہ بے قصور ہے۔ پھر بھی خالی ہے اور جس نے قصور کیا ہے۔ دل کو ڈھایا ہے۔ دل کا گنبد توڑا ہے وہ سب کچھ پا کر بھی خالی

ہے۔ وہ جو تقدیر لکھنے پر قادر ہے۔ وہ ہر تدبیر کو پھیر سکتا ہے الٹ سکتا ہے۔

کبھی جان‘ مال‘ زر اور زمین میں الجھا کر سزا مقدر کر دیتا ہے۔ کبھی اولاد کے معاملے میں آزماتا ہے۔ کبھی عطا کر دیتا ہے اور کبھی بے اولاد رکھتا ہے۔ کسی نہ کسی صورت میں سزا ضرور موجود ہوتی ہے۔ بس ایک نکتے کو سمجھنے کی دیر ہوتی ہے اور جزا اور سزا کا معاملہ سمجھ میں آجاتا ہے۔ تم سوچ لو بیٹا! جتنا چاہے سوچ لو۔ زندگی کی طویل شاہراہ ہے۔ بہت طویل سفر ہے بیٹا! بغیر ہم سفر کے اتنا طویل سفر طے نہیں کیا جا سکتا۔ جمشید سے محبت کے باوجود‘ جب اس نے مجھے طلاق دے دی تو میں نے زندگی کو اس کے نام پر ختم نہیں کیا تھا۔ زندگی نہ رکتی ہے نہ ٹھہرتی ہے۔ ہاں‘ ہم اپنی سوچوں کو ایک جگہ ٹھہرا لیتے ہیں۔ ہم محبت کو صرف ایک نام تک محدود کر لیتے ہیں۔ در اصل یہی ہمارا ایب نارمل پن ہے۔ زندگی کو نارمل انداز میں جینا سیکھو بیٹا! محبت میں سمندروں جیسی وسعت ہے۔ یہ ایک نام پر ختم نہیں ہو سکتی۔۔۔۔ تم زرجان کو سوچو‘ بہت سوچو ہر پہلو کو نظر میں رکھو‘ ہر زاویے پر غور کرو‘ میرا بیٹا ایسا نہیں کہ حریم جمال کے دل میں رائی برابر بھی جگہ نہ بنا سکے۔“ وہ رکی نہیں تھیں۔ چلی گئی تھیں ایک دفعہ پھر سے آنے کے لیے وہ روز آتی تھیں۔ روز جاتی تھیں۔ اسی امید پر کہ کبھی نہ کبھی پتھر میں سوراخ ہو ہی جائے گا۔

اور ایسا ہو بھی گیا تھا۔ جب بابا‘ بوا اور حانی‘ زرجان عباس کے حمایتی بن کر اس کے گرد دائرہ تنگ کرنے لگے تھے۔ تب حریم جمال کو خاموشی کا دامن پکڑنا ہی پڑا تھا۔

”حریم! اتنی پتھر نہ بنو‘ تمہیں ترس بھی نہیں آتا۔ بس کر دو یار! چھوڑ دو اس تنہائی کا دامن‘ بھول جاؤ ماضی کے زرد زمانوں کو۔ گلابی صبحوں کو خوش آمدید کہو۔ یہی زندگی ہے۔ یہی زندگی کا راز ہے۔ یوں ہی ہمیشہ سے ہوتا ہے۔ یہ کارواں اور قافلہ کہیں رکتا نہیں اور جہاں رک جاتا ہے۔ وہیں زندگی کا اختتام ہو جاتا ہے۔“ وہ خاموش تھی۔ اس خاموشی کے اقرار نے اس سے وابستہ رشتوں کو دائمی خوشی سے ہمکنار کر دیا تھا اور یہ خوشی کا سندیسہ زرجان تک بھی پہنچ گیا تھا۔ تبھی تو وہ تمام ضروری کام بھاڑ میں جھونک کر چلا آیا۔

آج نہ سر جھکا تھا اور نہ ہی نظر پر کوئی پہرہ تھا۔ آج وہ حریم جمال کو دیکھنے کا پورا اختیار رکھتا تھا۔

”مجھے یقین کیوں نہیں آتا کہ میں اتنا بانصیب ہو سکتا ہوں۔“ وہ اس کی اولین محبت تھی۔ وہ اس کے دل کی پہلی خوشی تھی۔ وہ اس کے مقدر میں نہیں لکھی تھی۔ تب بھی وہ خوش تھا۔ شاکر تھا۔ اب اسے زرجان عباس کا مقدر بنا دیا گیا تھا۔ وہ تب بھی خوش تھا‘ بے انتہا خوش تھا۔ اگر اس خوشی کو سمندروں میں ڈال دیا جاتا تو وہ جوش کے عالم میں طوفان لے آتے۔

”اور مجھے بھی یقین نہیں آتا کہ میں بھنور میں پھنس گئی تھی۔ ساحل تک کیسے پہنچی ہوں۔“ وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا دی۔ ابھی دل سے مسکرانا بہت مشکل تھا۔ مگر امید تو باقی تھی۔

”حریم! مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔“ جوش‘ خوشی اور جذبات کی گرمی نے اس کی گوری رنگت دہکا دی تھی۔

”کچھ مت کہو زرجان! میں سب جانتی ہوں۔ وہ سب کچھ جو تمہارے دل میں ہے۔ جو تم مجھ سے کہنا چاہتے ہو۔ وہ سب میں جانتی ہوں۔“ اس کی نظروں کے سامنے وہ ڈائریاں‘ خطوط اور بے شمار کارڈز گھوم گئے تھے۔ جو نہ جانے کب سے لکھے گئے تھے اور جنہیں دینے کا زرجان میں حوصلہ نہیں تھا۔ نہ جانے کیسے زوباریہ کے ہاتھ لگے تھے۔ اور اس نے ماہیر کے نام ارسال کر دیے۔ ماہیر کو پانے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ اور اس نے وہ سب کچھ کر بھی لیا تھا۔

”تم اس محبت کو نہیں جان سکتیں حریم! جو میرا دل تمہارے لیے محسوس کرتا ہے۔“ وہ پھر سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر حریم نے نرمی سے اسے ٹوک دیا۔

”پوری زندگی پڑی ہے۔ جو دل چاہے کہتے رہنا۔ میں کبھی روکوں گی نہیں۔ آج میری کچھ بات سن لو زرجان۔“ اس نے گویا درخواست کی تھی۔

"بولو میں تمہاری ہر بات سنوں گا۔ پلیز! ازان کے بارے میں کچھ ہدایت مت کرنا۔ وہ میرے لیے اللہ کی طرف سے دیا گیا تحفہ ہے۔ اسی کے بہانے تو میں اس گھر میں اور تم تک آنے میں کامیاب ہوا ہوں۔"

زرجان کی آنکھیں ہیروں کی کوٹ سے گویا بھر گئیں۔

"زرجان! میں ایک ادھوری عورت ہوں۔" حریم نے کہنا شروع کیا تھا۔

"ادھورا پن بھی اپنے اختیار میں نہیں ہوتا۔ یہ جو میرا دل ہے اس کا ایک کونا سیاہ ہو چکا ہے۔ یہ سیاہی غم اور دکھ کی اس شام میں میرے دل میں اتری تھی جب ماہیر کا نام میرے نام سے جدا ہو گیا تھا۔

یہ میری محبت کی انتہا تھی جو جدائی کا طوق میں نے اپنے گلے میں لٹکا لیا ہے۔ یہ میری محبت کا ایثار تھا جو میں خود کو قربان کر کے شاد ہوں۔ آج میں مانتی ہوں کہ تمہاری محبت ہر کھوٹ سے پاک تھی۔ میری محبت ہر ملاوٹ سے بھی پاک تھی۔ محبت وہ ہی ہوتی ہے جو غرض کے بغیر ہو۔ ایک جنوں کو سر پر سوار کر کے کسی کے دل اور گھر کو اجاڑنا محبت نہیں ہوتی۔

میرا دل اجڑ چکا ہے زرجان! اس میں نہ تازگی ہے نہ شادابی ہے نہ سبزہ ہے نہ ہریالی ہے۔ اس اجڑے دل میں کچھ بھی نہیں اور آج میں تم سے رب رحیم کو گواہ بنا کر کہتی ہوں۔ اس کھنڈر دل کو تمہاری خاطر ضرور آباد کروں گی۔ ہاں اس کے لیے کچھ وقت درکار ہو گا۔ مجھے کچھ ساعتیں عطا کر دینا۔ مجھے کچھ گھڑیاں دان کر دینا۔ میں اپنے دل کی زمین کو نئے سرے سے آباد کروں گی۔ اک نئی محبت کی فصل اگاؤں گی۔ میں پھر سے محبت کرنے کا سلیقہ سیکھوں گی۔ جہاں تک ازان کا سوال ہے تو اس کے بارے میں بھی میں فیصلہ کر چکی ہوں۔ میں کیوں تمہیں کسی آزمائش میں ڈالوں۔ میں ازان کو ماہیر کے حوالے کر دینے کا فیصلہ کر چکی ہوں۔"

"حریم! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ تم ازان کے بغیر کیسے رہو گی۔" وہ بری طرح سے بے چین ہو گیا۔

"دنیا کی بھیڑ میں بہت سے اپنے بہت ہی پیارے کھو جاتے ہیں۔ ان کے بغیر بھی تو رہ لیا جاتا ہے۔ ازان تو پھر اپنے باپ کے پاس رہے گا۔ میرے دل کے اطمینان کے لیے کافی ہے۔ ویسے بھی اب وہ باپ کی کمی کو محسوس کرتا ہے۔"

"مگر حریم!" وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا جب حریم نے پھر سے اسے ٹوک دیا۔

"مجھ سے ایک وعدہ کرو زرجان۔"

"کیسا وعدہ؟" اس کا رواں رواں سماعت بن گیا۔

"ہم یہ شہر یہ ملک یہ براعظم تک چھوڑ دیں گے۔ مجھے اب یہاں نہیں رہنا۔ یادوں کے یہ کارواں کبھی نہ کبھی زخموں سے کھرنڈ اتار دیا کریں گے اور میں ان زہریلی یادوں سے بھی چھٹکارا چاہتی ہوں۔ کیا تم میری بات مانو گے؟" وہ بڑی آس سے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں۔" زرجان بڑے مضبوط لہجے میں بولا۔

"میں تمہاری ہر بات مانوں گا۔ تم جو کہو گی۔ تم جو چاہو گی۔ میں تمہیں کبھی مجبور نہیں کروں گا کہ تم مجھ سے محبت کرو۔ ہاں مجھے کبھی بھی خود سے محبت کیے جانے سے مت روکنا۔ ہم ایک دوسری دنیا میں اپنا گھر آباد کریں اور میں خود اپنے ہاتھوں سے تمہارے دل کی زمین پر اپنی محبت کا بیج بوؤں گا اور میں اس کے لیے طویل ترین انتظار بھی کر سکتا ہوں۔" وہ روشن قندیلیں جلائے کھڑا تھا۔ حریم ان قندیلوں کو کیسے پھونک مار کر بجھا دیتی۔

کمرے میں موجود حبس اور گھٹن کا اثر خود بخود زائل ہو گیا۔ بولتی خاموشی جو عرصہ دراز سے زرجان کے ہمراہ تھی۔ کچھ خفگی اور ناراضی لیے دور بہت دور چلی گئی تھی۔ کبھی نہ آنے کے لیے کبھی نہ پلٹنے کے لیے۔ گلابی صبحیں ارغوانی شامیں حریم جمال کی منتظر تھیں۔ سو وہ ناشکری کیوں بنتی۔ وہ تنہائیوں کو اپنا مقدر سمجھ کر ایک ایب نارمل زندگی کیوں جیتی۔

اس نے ستاروں کی بارات کو اپنے آنگن میں اور اپنے دل میں اترتے دیکھا تھا۔ سو آگے بڑھ کر اس نے دل کے بند کواڑ کھول دیے۔

☆ ☆ ☆

زمیلہ بہت عرصے بعد پاکستان لوٹی تھی۔ زندگی کے جھمیلوں اور گھریلو مشکلات اور مجبوریوں نے ماں کے آخری دیدار سے بھی محروم کر دیا تھا اسے شاید ہر بیٹی بیوی اور ماں بن کر اس کی طرح مجبور ہو جاتی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ پاکستان میں اس کا منتظر کوئی نہ ہو گا۔ ماں تھی جو اس کے ملنے کی آس لیے چل بسی تھی۔ ایک بھائی تھا جو نہ جانے کہاں کھو گیا۔ جس کی واپسی کے انتظار میں ماں کی آنکھیں تھک گئی تھیں۔ اب تو صرف میکے کے نام پر ماہیر کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ اب تو وہ ہی اس کا سب کچھ تھا۔

ایئرپورٹ پر ڈرائیور اسے لینے کے لیے آیا تھا۔ یہ ڈرائیور ماہیر بھائی نے بھجوایا تھا۔ وہ حیران در حیران تھی۔

ایئرپورٹ سے لے کر اس شاندار محل میں آنے تک وہ حیران تھی۔ بچے بھی اس کے ہمراہ تھے۔ اور ماموں کی عالیشان رہائش گاہ کو حیران نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

اسے ایک شاندار ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ نہ جانے کیوں اس گھر کی ایک ایک قیمتی چیز کو دیکھ کر اسے اپنا آبائی مکان یاد آ رہا تھا۔ وہ گلیاں وہ ہی چوبارہ وہ دن وہ شامیں وہ راتیں نہ جانے کیوں اسے وہم سا محسوس ہوا یوں لگ رہا تھا ابھی بہت ہی نفیس سے موٹ میں ملبوس وہ چینی کی گڑیا کہیں سے نکل کر اس کے سامنے آ جائے گی۔ جس کی آنکھوں میں سادگی اپنا تمام تر حسن سمیٹے کسی معصوم نومولود کی طرح سوئی رہتی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے یوں لگ رہا تھا ابھی حریم اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بول اٹھے گی۔

"زمیلہ! تم آ گئیں؟"

بھلا وہم بھی حقیقت بن سکتے ہیں؟ ایک بے نام سی اداسی نے زمیلہ کے دل میں پنجے گاڑ لیے تھے۔ کچھ دیر بعد ماہیر آ گیا۔ زمیلہ کو لگا وہ بھائی کے سینے سے لگی تو آنسو بن کر بہہ جائے گی۔ مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔

ماہیر کے سینے کی خوشبو اسے اپنا باپ یاد دلا گئی تھی اور جو آنسو حریم کی بربادی کے غم میں سمیٹ رکھے تھے وہ ایک طوفانی بارش کی طرح سے برسنے لگے۔

"بس کرو گڑیا۔" وہ اداسی سے مسکرا دیا۔

"بھائی! میرے پیچھے کیا کچھ ہو گیا۔ امی چلی گئیں مولی کھو گیا۔ میرا بھائی میرا شہزادہ۔۔۔ نہ جانے وہ کہاں ہو گا؟" بہت عرصے کا لاوا تھا جو پھٹ پڑا اور وہ آنسوؤں کے طوفان میں بہنے لگی۔

"میں نے بہت کوشش کی تھی۔ بہت تلاش کیا ہے اسے۔ مگر نہ جانے مولی کو کون سی مٹی نگل گئی۔" وہ دھیرے دھیرے اس کے سر کو تھپک رہا تھا۔ جب زمیلہ کا دل کچھ سنبھل گیا تو وہ تھک کر بیٹھ گئی۔

"بھائی! آخر کیا ہو گیا تھا جو آپ نے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا۔" وہ کس بات کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ ماہیر سمجھ گیا تھا۔ تبھی تو اس کی آنکھوں میں ناگواری در آئی۔

"اس قصے کو مت چھیڑو زمیلہ! کوئی اور بات کرو۔"

"اور زوباریہ بھابھی کہاں ہیں؟" زمیلہ کے دل میں نہ جانے کیوں کانٹا سا چبھ گیا۔

"اسے تمہارے آنے کی خبر نہیں تھی۔ کچھ دیر پہلے گھر سے نکلی ہے۔ ابھی آتی ہی ہو گی۔ تمہاری اور زوباریہ کی بہت اچھی دوستی بھی تو رہ چکی ہے۔" وہ کچھ ہلکے پھلکے لہجے میں بولا۔ شاید اس اداس ماحول کی سوگواری وہ بھی محسوس کر چکا تھا۔

"اور بچے۔" اس کی آنکھ میں ابھی تک آنسو جمع تھے۔ جمع ہو رہے تھے۔ آج تو یہ آنسو رکنے کا نام بھی نہیں لے رہے تھے۔

"نہیں ہیں۔" اس نے بے حد لاپرواہی سے کہا۔ گویا بچے ہوں یا نہ ہوں۔ اسے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا۔

"ازان کہاں ہے؟" زمیلہ کی آنکھ پھر سے رو دی۔

"اپنی ماں کے پاس ہے۔" یہ دو لفظ نہ جانے کیسے اس کے منہ سے ادا ہوئے تھے۔

"آپ نے کبھی ازان سے ملنے کی کوشش نہیں کی؟"

"نہیں۔" وہ رکھائی سے بولا۔ تبھی ملازمہ لدی پھندی ٹرالی گھسیٹ لائی تھی۔ یہ مرتبہ، یہ حیثیت یہ شان و شوکت سب زوباریہ کے توسط سے ہی تو ملا تھا۔

"تو کیا بھائی نے ان آسائشات کے ساتھ سمجھوتہ کرلیا؟"

"بچے کیوں نہیں ہیں؟" اس کا دل رنگ رنگ کے لوازمات کو دیکھ کر اوب گیا۔

"اللہ کی مرضی۔" وہ زمیلہ کی طرف متوجہ نہیں تھا بلکہ بچوں کو مختلف چیزیں کھلا رہا تھا۔

"بہت پیارے بچے ہیں تمہارے۔" وہ تینوں کو فرداً "فرداً" چوم رہا تھا۔ انہیں اپنے ہاتھوں سے کھلا رہا تھا۔

"کیا یہ بچوں کی کمی محسوس نہیں کرتے۔" زمیلہ محض سوچ کر رہ گئی۔

"عفیفا کے ہاں بیٹی ہوئی ہے۔" وہ اسے مطلع کر رہی تھی۔ ماہیر دھیمے سے مسکرا دیا۔

"جانتا ہوں.... رات کو شاہنواز کی کال آئی تھی۔"

آج سے ڈیڑھ سال پہلے ماہیر نے شاہنواز کے مجبور کرنے پر فیفا سے اس کی مرضی جاننے کے بعد سادگی کے ساتھ نکاح کر کے رخصت بھی کر دیا تھا۔ اب وہ دونوں جدہ میں مقیم تھے۔ جانے سے پہلے شاہنواز اور زوباریہ کی اچھی خاصی تکرار ہو گئی تھی۔ ماضی میں وہ ایک دوسرے کے اچھے دوست رہ چکے تھے مگر نہ جانے کون سی بات تھی جو شاہنواز نکاح کے بعد بھی بگڑا بگڑا رہا۔ زوباریہ سے سیدھے منہ بات نہیں کر رہا تھا۔ اپنی شادی کے فنکشن میں ہی زوباریہ سے لڑا اور پھر اسی غصے میں اس نے ماہیر کی طرف سے دی گئی دعوت کو ٹھکرا دیا تھا۔

جانے سے پہلے وہ دونوں ماہیر سے ملنے کے لیے آئے تھے۔ وہ دونوں ہی بے تحاشا خوش تھے اور دونوں ہی زوباریہ کو دیکھ کر پھر سے اکھڑ اکھڑ گئے۔ بہر حال وہ دونوں ایک خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔

"اور کیا کچھ جانتے ہیں آپ؟" زمیلہ کے لبوں پر تلخ ترین تبسم امڈ آیا۔

"کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔" وہ اس کے بگڑے بگڑے تیور دیکھ کر چونک گیا۔

"حریم کو آپ نے طلاق کیوں دی؟" زمیلہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

"وہ خود مجھ سے طلاق چاہتی تھی۔ اس نے خود مجھے طلاق کے لیے مجبور کیا تھا۔ وہ مجھ سے شادی کر کے پچھتا رہی تھی۔ اسے یہ خوف تھا کہ اس کے ہاں کوئی مونی جیسا ایب نارمل بچہ نہ پیدا ہو جائے۔" ماہیر کی آنکھیں گویا لہو رنگ ہو گئی تھیں۔

"اس نے آپ سے طلاق کا مطالبہ کیا اور آپ نے اسے طلاق دے دی؟ کوئی وجہ نہیں پوچھی۔" اس کے سوال اتنے خطرناک نہیں تھے جس قدر اس کا لہجہ خطرناک تھا۔

"وہ میرے ساتھ مزید چلنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی اور میں نے اس کی خوشی سے بڑھ کر پہلے بھی کچھ نہیں چاہا تھا۔" ماہیر کا لہجہ بھی تلخ ترین ہو گیا۔

"اس کی خوشی تو آپ تھے۔ پھر اس نے آپ کو کیسے چھوڑ دیا۔" زمیلہ سلگ کر بولی۔

"ہونہہ خوشی۔" وہ استہزائیہ مسکرایا۔

"کیا آپ نے کبھی نہیں سوچا کہ حریم بھابھی کو کوئی آپ سے طلاق لینے پر مجبور بھی کر سکتا ہے۔" زمیلہ کے لفظوں میں بلا کی چبھن تھی۔

"کیا مطلب؟" اب کے سچ مچ وہ چونک گیا تھا۔

"بھائی! پتا ہے کیا ہوا؟" زمیلہ کا دل کرلا اٹھا تھا۔

"مجھے شاہنواز بھائی نے نہیں بتایا۔ وہ تو اس بات کو تمام عمر اپنے سینے میں چھپائے رکھتے کہ حریم بھابھی نے قسم دے رکھی تھی انہیں کہ کسی کو اس راز کا پتا نہیں چلنا چاہیے۔ مگر میرے بے تحاشا مجبور کرنے پر فیفا نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ وہ سب کچھ جو حریم کی بربادی کا سبب بنا۔ اس نے آپ کو اور حالی کو بچانے کے لیے اپنے دل کو اور محبت کو قربان کر دیا تھا۔ پتا ہے کیا ہوا؟ یہ سب کس نے کیا؟" زمیلہ نے آنسوؤں کے سمندر میں ڈوبتے ابھرتے ایک ایک زہر میں نہایا لفظ ماہیر کے گوش گزار کر دیا۔ ماہیر کے چہرے کا ہر رنگ بدل رہا تھا۔ کبھی سیاہ ہو جاتا، کبھی سفید پڑ جاتا۔ کبھی زرد ہو جاتا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو زمیلہ!" ماہیر کے لبوں سے اک نوحہ برآمد ہوا۔

"یہ سچ ہے بھائی! یہی تو سچ ہے۔ جو کچھ حریم بھابھی نے اس خط میں لکھا تھا۔ وہ سب جھوٹ تھا۔ جو کچھ بھابھی نے آپ سے خود کہا، وہ بھی جھوٹ تھا۔ سچ تو یہی ہے، زوباریہ کے عشق کی بھڑکتی آگ نے حریم بھابھی کو سر تا پا جلا کر راکھ کر دیا تھا۔" زمیلہ خاموش ہو گئی تھی۔ ماہیر بھی خاموش تھا اور ڈرائنگ روم کے دروازے کے باہر کھڑی زوباریہ کے دل کی دھڑکنیں تک خاموش تھیں۔ بس سانسوں کا شور سنائی دے رہا تھا اور دور بہت دور رونے کی آوازیں۔ کوئی بین کر رہا تھا، کوئی رو رہا تھا، کوئی چیخ رہا تھا اور کوئی ماتم کر رہا تھا۔ ان سب میں بس وہ ہی لوگ خاموش تھے۔ جو اپنے اپنے غم پر صبر کیے لب سیے بیٹھے تھے۔ دراصل یہی لوگ تو کامیاب تھے۔ دکھوں پر صبر کرتے تھے۔ خوشیوں پر شکر کرتے اور ناکام کون تھا؟ سراب کے پیچھے بھاگنے والا، تقدیر سے جھگڑنے والا۔ نصیب کے لکھے پر رونے والا اور دوسروں کے گھر کے چراغ چھین کر اپنے آنگن کے اندھیروں کو روشن کرنے والا۔ مسجد جیسے دل کو ڈھا دینے والا اور کسی کے تازہ تازہ لہو سے اپنی محبت کی کہانی لکھنے والا۔

☼ ☼ ☼

اب جو دیکھیں تو تو کوئی ایسی بڑی بات نہ تھی
یہ شب و روز و مہ و سال کا پر پیچ سفر
قدرے آسان بھی ہو سکتا تھا
ہم ذرا دھیان سے چلتے تو وہ گھر
جس کے در و بام پہ ویرانی ہے
جس کے ہر طاق میں رکھی ہوئی حیرانی ہے
جس کی ہر صبح میں شاموں کی پریشانی ہے
اس میں ہم چین سے آباد بھی ہو سکتے تھے

اب جو دیکھیں تو بہت صاف نظر آتے ہیں
سارے منظر بھی، پس منظر بھی
لیکن اس دیر خیالی کا صلہ کیا ہو گا
یہ تو سب بعد کی باتیں ہیں مری جان انہیں
دیکھتے، سوچتے رہنے سے بھلا کیا ہو گا
وہ جو ہونا تھا ہوا، ہو بھی چکا
لائنیں کٹتی رہیں لفظ بدلنے کے سبب
کوئی تحریر مسلسل نہیں ہونے پائی
حاصل عمر.... یہی چند ادھورے خاکے
کوئی تصویر مکمل نہیں ہونے پائی

شام غریباں کبھی کسی کے دل پر نہ اترے۔ کوئی منزل پر پہنچ کر بھٹک نہ جائے۔ راستے کبھی اجنبی نہ ہوں اور قافلے منزل کی راہ کبھی نہ بدلیں، خدا کرے کسی کے دل پر قیامت کی رات نہ اترے۔ مگر یہ رات ماہیر عالم کے نصیب میں لکھی تھی بھلا کیسے نہ دل پر اترتی کہ نصیب کا لکھا کوئی بدل نہیں سکتا۔

اب جو دیکھیں تو بہت صاف نظر آتے ہیں سارے منظر بھی، پس منظر بھی۔

وہ نماز پڑھ کر آرہا تھا۔ وہ اپنے دل کی ساری کثافت، ساری غلاظت، سارا کرب، سارے آنسو رب کے سامنے بہا کر آرہا تھا۔ وہ جسے کھو چکا تھا، اس کا سوگ منا کر آرہا تھا۔ اور جس نے اسے آگ کے دریا عبور کر کے پایا تھا اس کا سامنا کرنے کے لیے حوصلے جمع کر کے آرہا تھا۔

زمیلہ اپنے سسرالی گھر جا چکی تھی۔ گھر میں بچوں سے جو رونق محسوس ہو رہی تھی اس کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ زوباریہ اس وقت اسٹڈی روم میں ہو گی۔ یہ اس کی عبادت کا مخصوص وقت تھا۔ وہ نوافل ادا کرتی تھی۔ تلاوت کرتی تھی اور نہ جانے کون کون سے وظائف کرتی تھی۔

پورے ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ اس کے سامنے سر جھکائے کھڑی تھی۔ ماہیر اس کے چہرے کی طرف دیکھ نہیں پایا۔ اس کا سر بے حد جھکا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد اسے محسوس ہوا کہ زوباریہ بے آواز رو رہی ہے۔ اس کے

آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہے تھے اور پھر ایک دم اس نے بولنا شروع کردیا۔

"انگلیوں پر گنو' ہماری شادی کو کتنے سال ہوگئے ہیں اور آج تک کوئی رات ایسی نہیں گزری جب میں نے شکرانے کے نوافل ادا نہیں کیے۔ تمہیں پانا میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ اگر تم مجھے نہ ملتے تو میں نے تمہیں بھی مار دینا تھا اور خود کو بھی۔ میری محبت کا اندازہ کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ تم نے مجھے چھوڑ دیا تو میں رو گی ہو جاؤں گی۔ میں بھکارن ہو جاؤں گی یا پھر پاگل ہو جاؤں گی۔ میں نے تمہیں حاصل کرنے کے لیے وہ سب کچھ کیا ہے۔ جو میرے دل کو ٹھیک لگا۔ ایسی آگ بھڑکا دی تھی تمہارے عشق نے میرے دل میں کہ جو جو مجھے چھوتا رہا بس بھسم ہو کر رہ گیا۔ جس جس پر میں نے نگاہ کی راکھ کا ڈھیر بنتا گیا۔ اگر میں سمجھنا چاہتی تو مونیکا جیسی عورت کی زندگی سے بہت کچھ سمجھ لیتی پر مجھے سمجھ میں ہی تو نہیں آتا تھا۔ میں مانتی ہوں 'میں مجرم ہوں' میں گناہ گار ہوں۔۔۔۔ اور میں سزا کی طلبگار بھی ہوں۔" وہ دونوں ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ ماہیر بہت دیر تک خاموشی سے سنتا رہا تھا۔ اک طویل اور گہری چپ کے بعد وہ ٹھہرے ہوئے رواں لہجے میں دھیرے دھیرے بولنے لگا۔

"میں کون ہوتا ہوں۔۔۔۔ جزا اور سزا کا اختیار رکھنے والا۔ میں تو ایک حقیر سا آدمی ہوں۔ تم نے مجھے نہ جانے کیوں دیوتا بنا دیا تھا۔ میں معمولی سی سوچ اور معمولی ساذہن رکھنے والا ماہیر عالم کسی کو بھلا کیا سزا دوں گا۔ میں خوش قسمت ہوں کہ دو عورتوں نے مجھے چاہا۔ میں بد قسمت ہوں کہ میں تم دونوں کو خوش نہیں رکھ پایا۔ ایک وہ جو میرا ماضی تھی۔ ایک تم ہو جو میرے سامنے کھڑی ہو۔ اپنے منہ سے اقرار جرم کر رہی ہو۔ مجھ سے کہہ رہی ہو کہ میں تم پر خنجر چلا دوں مگر میں ایسا نہیں کر سکتا۔

اللہ نے اس حقیر آدمی کے دل کو بلا کا نرم بنایا ہے۔ مجھے درگزر اور معاف کردینے کی تعلیم دی گئی ہے۔ اور میں تمہیں معاف بھی کر سکتا ہوں مگر تم کیا کرو گی زوباریہ! حریم تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔" وہ گویا تھک سا گیا تھا۔ ٹوٹ سا گیا تھا' بکھر سا گیا تھا۔

"میں ایک بہت بڑی قیامت سے گزرا ہوں۔ تمہیں کیسے بتاؤں زوباریہ! میرا دل درد کا ایک سمندر بن گیا ہے اور یہ درد کا سمندر ہمیشہ میرے دل کی دیواروں کے ساتھ ٹکراتا رہے گا۔ میں تمہارے بارے میں بھلا کیا فیصلہ کروں تم نے مجھے کسی فیصلے کے اختیار کے قابل نہیں چھوڑا۔

بس اتنا کہوں گا کہ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ مخلص رہوں گا۔ میں تمہارا وفادار رہوں گا۔ تم کبھی بھی میرے رویے میں بدلاؤ نہیں پاؤ گی۔ میں تم سے ہمیشہ محبت بھی کروں گا اور تمہاری عزت بھی۔ پر یہ جو میٹھا میٹھا سا درد میرے دل میں کنڈلی مارے بیٹھ گیا ہے۔ یہ کیسے نکل پائے گا زوباریہ! بھلا یہ کیسے میرے دل کو درد کے اس احساس سے آزاد کر پائے گا؟" وہ لب بھینچ کر خاموش ہو گیا۔ زوباریہ کا سر اب بھی جھکا ہوا تھا۔ اگر ذرا سا سر اٹھا کر دیکھ لیتی تو دنگ رہ جاتی' ماہیر کا پورا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا مگر اس کے لہجے میں ذرہ بھر لڑکھڑاہٹ نہیں تھی اور وہ دھیرے دھیرے پھر سے کہہ رہا تھا۔

"میں تم سے ہمیشہ محبت کروں گا۔" اس کی آنکھ کے ساتھ دل بھی رو دیا تھا اور اس دل کے آنسو تو ہمیشہ گرتے ہی رہنے تھے۔ کوئی دیکھتا یا نہ دیکھتا۔

☆ ☆ ☆

کھڑکی کے پاس کا منظر بھیگا بھیگا تھا۔ درخت' پتے' پھول گویا ہر شے آنسو بہا رہی تھی۔ آسمان پر ایک بھی بدلی موجود نہیں تھی۔ یہ اس کی آنکھ کے آنسو تھے جو ہر منظر نم دکھ رہا تھا۔ کبھی کبھی دل کی ہر خوشی بجھے ہوئے چراغ کی مانند لگتی ہے اور کبھی کبھی سب کچھ پاکر' بھی ادھورا پن مقدر بن جاتا ہے۔ وہ چند سال پہلے کے کچھ منظر بھیگے وقت سے چرا کر یاد کرنا چاہتی تھی اور یہ یاد ہمیشہ آنسوؤں کی سوغات اٹھا لاتی تھی۔

صرف چند سال پہلے کی تو بات ہے۔ وہ خود کو ہر طرح کے دکھ اور غم سے آزاد محسوس کر رہی تھی۔ حالی کو بیچ دیا گیا تھا۔ حریم اس کی خواہش کے مطابق ماہیر کی زندگی سے دور چلی گئی تھی اور ماہیر اس تنہائی' اکیلے پن اور شکستگی کی بدولت زوباریہ کے خود بخود قریب آتا چلا گیا۔ حریم کی خود غرضی سے متنفر تو وہ ہو ہی چکا تھا اور مزید متنفر تو وہ وقتاً" فوقتاً" کرتی ہی رہتی تھی۔

پھر ایک دن کیا ہوا۔ وہ دن ماہیر کی رہائی کا دن تھا۔ اس دن زوباریہ بہت مصروف تھی۔ وہ گھر کی آرائش و زیبائش کروا رہی تھی۔ وہ ماہیر کے واپس آنے کی خوشی میں ایک جشن کا اہتمام کرنا چاہتی تھی۔ پھر بھلا کیا ہوا؟

وہ اس دن آفس میں موجود تھی۔ وسیع و عریض گلاس ٹیبل بے شمار آفیشل چیزوں سے بھری پڑی تھی۔ ترتیب سے رکھے ہوئے ٹیلی فون سیٹ' فائلیں' کمپیوٹر وہ لیپ ٹاپ پر بہت ضروری فائل دیکھنے میں منہمک تھی۔ جب سیکرٹری نے انٹر کام پر اطلاع دی۔

"میم! کوئی شاہنواز صاحب آئے ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"بھیج دو۔" اس نے معروف سے انداز میں جواب دیا۔ وہ کام کی طرف متوجہ تھی جب دروازہ کھول کر کوئی اندر داخل ہوا۔ زوباریہ نے سرسری سے انداز میں سر اٹھایا تھا مگر ایک دم ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔

"شیری! تم۔" اس کے سامنے شاہنواز بیگ کھڑا تھا۔ اکھڑے اکھڑے تیور لیے۔ کافی عرصہ بعد وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ بغیر بتائے جو وہ غائب ہوا تھا تو پھر آج ہی سامنے آیا۔ زوباریہ کو فطری سی خوشی محسوس ہوئی۔

"تم کب آئے؟ وہ بھی بغیر بتائے' چلے آئے تھے۔ کم از کم بتا تو دیتے۔ میں نے کافی تمہارا انتظار کیا تھا۔" وہ خوشدلی سے بولی۔

"بیٹھو نا۔"

"میں یہاں بیٹھنے نہیں آیا۔" شاہنواز کا لہجہ بے حد سرد تھا۔

"تو پھر؟" زوبی الجھی۔

"تم سے کچھ پوچھنا ہے۔" وہ ترش انداز میں بولا۔

"تو پوچھو۔" وہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"حریم اور ماہیر کے ساتھ تم نے اچھا نہیں کیا۔ برا کیا ہے تم نے زوباریہ! بہت برا۔" شاہنواز کا لہجہ بہت کھردرا اور نفرت لیے ہوئے تھے۔

"کسی کا دل اور گھر اجاڑ کر تم خود کو آباد نہیں کر پاؤ گی ۔۔۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں سمجھ نہیں پایا تھا۔ تم تو نفیس سی خوشنما پٹاری کے اندر چھپی ہوئی ناگن تھیں۔"

"اسٹاپ اٹ شاہنواز۔" زوباریہ نے نرمی سے اسے ٹوکا۔

"میں نہیں جانتی کہ تمہارا حریم سے کیا تعلق ہے۔ بہرحال میں نے جو کیا' ٹھیک کیا۔ اس پر مجھے قطعاً" پچھتاوا نہیں۔"

"تم نے اپنے لیے ظلم اور آگ خرید لی ہے زوباریہ! تم نے کسی کی بے بسی سے فائدہ اٹھایا ہے۔ تم نے ایک شاطرانہ چال چلی ہے۔ مگر دیکھ لینا' تم کبھی بھی کامیاب نہیں ہو پاؤ گی۔" شاہنواز کا چہرہ غصے کی زیادتی کے باعث تمتما اٹھا۔

"میں کامیاب ہو چکی ہوں۔" زوباریہ دھیرے سے مسکرا دی۔

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں اور ماہیر عنقریب شادی کر رہے ہیں اور تمہاری حریم' جس کا نہ جانے تم سے کیا تعلق ہے۔ نہ جانے کس ہمدردی میں تم یہاں چلے آئے ہو۔ بہرحال تمہاری حریم سے زرجان عباس شادی کر رہا ہے۔ میری ماں اور زرجان دونوں مجھ سے قطع تعلق کر چکے ہیں۔ اگر تم بھی برا بھلا کہنا چاہتے ہو تو شوق سے کہہ لو۔ میں زرجان اور ممی کا برا رویہ برداشت کر سکتی ہوں تو پھر جو بھی کہنا چاہتا ہے۔ شوق سے کہے۔"

"حریم میری بہن ہے اور بہنوں کے اجڑنے کا بہت دکھ ہوتا ہے زوباریہ! تمہاری جیتی بازی مات کر سکتا ہوں اللہ کی قسم! اگر مجھے حریم قسم دے کر نہ روکتی تو

میں تمہارا سارا کچا چٹھا ماہیر پر کھول دیتا۔" وہ زہر خند ہو رہا تھا۔

"جو کرنا ہے کرلو۔" وہ گویا ہر شے سے بے نیاز ہو چکی تھی اور شاہنواز گویا زہر کے گھونٹ بھر کر لوٹا تھا اور پھر اسی شام جب وہ خوشیوں کے دیے جلا رہی تھی تب عفیفا عتاب چلی آئی۔

"کوئی نصیحت کرنے آئی ہو تو بے کار میں وقت ضائع کرنا ہے۔" زوباریہ سر جھٹک کر بولی

"تم خون آشام بلا ہو زوباریہ! اور بلاؤں پر کچھ بھی اثر انداز نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ بلائیں اگر کسی کی زندگی پر نظر کرلیں تو تباہی لے آتی ہیں۔" وہ نفرت سے پور پور جل رہی تھی۔ زوباریہ سے اس انتہائی قدم کی امید رکھنے کے باوجود اس کا دل ابھی تک حقیقت سے انکاری تھا جو کچھ ہو چکا تھا۔ فیفا کو اب بھی خواب جیسا لگتا تھا۔

"تم میری دوست بن کر آئی ہو یا حریم کی ہمدرد؟" زوباریہ نے کٹیلے لہجے میں پوچھا۔ پہلے شاہنواز اور اب عفیفا کی آنکھوں میں اپنے لیے تنفر دیکھ کر اس کا دل پھیکا پڑ رہا تھا۔

"دوستی کا رشتہ تو تب ہی ختم ہو گیا تھا۔ جب تم میری اور ماہیر کی دوستی کو شک کی نظر سے دیکھنے لگی تھیں۔" فیفا نے تاسف بھرے انداز میں کہا۔

"اور یہ میری ماہیر سے محبت کی انتہا تھی۔ میں کسی کا نام اس کے نام کے ساتھ جڑا نہیں دیکھ سکتی۔" وہ گویا اپنی بے بسی سے خود بھی لاچار نظر آرہی تھی۔

"کسی کے دل کے ساتھ نہیں کھیلتے۔ جذبات کے ساتھ نہیں کھیلتے' زندگی کے ساتھ نہیں کھیلتے۔ اس کھیل کھیل کے چکر میں خود کا کھیل مت بنا لینا۔" فیفا کے لہجے کا روکھا پن اسے بے چین کر گیا تھا۔

"تم سب مجھے غلط سمجھتے ہو؟"

"تم نے جو کیا' غلط کیا؟"

"مجھے جو ٹھیک لگا میں نے وہ ہی کیا۔" وہ ابھی تک خود کو درست سمجھ رہی تھی اور یہی اس کی سب سے بڑی غلطی تھی۔

"تمہیں یہ غلطی بہت دفعہ رلائے گی بہت دفعہ۔" اس کا تاسف کسی طور کم نہیں ہو سکتا تھا۔

"تم مجھے بد دعا دے رہی ہو۔" زوبی کا لہجہ بلا کا روکھا تھا۔

"جس جس کا دل دکھا ہے یا دکھایا گیا ہے۔ وہ تمہارے لیے دعا نہیں کر سکتا۔" فیفا کو اداسی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور وہ دکھے دل سے پلٹی تھی۔ زوباریہ کے روکنے کے باوجود وہ وہاں رک نہیں پائی تھی۔ اس میں وہاں رکنے کا حوصلہ نہیں تھا اور وہ حیرانی سے سوچ رہی تھی کہ نہ جانے کیسے' کس طرح لوگ کسی کے دل کی قبر پر اپنے سپنوں کا تاج محل سجا لیتے ہیں۔ کیا ان کے دل سچ مچ احساس سے عاری ہوتے ہیں؟ یا پھر خوف خدا سے دور؟ یا پھر کسی کی بد دعا کی دہشت سے انجان ہوتے ہیں؟

اپنے ماضی کے تصور سے ہراساں ہوں میں
اپنے گزرے ہوئے ایام سے نفرت ہے مجھے
اپنی بے کار تمناؤں پہ شرمندہ ہوں
اپنی بے سود امیدوں پہ ندامت ہے مجھے
میرے ماضی کو اندھیرے میں دبا رہنے دو
میرا ماضی میری ذلت کے سوا کچھ بھی نہیں
میری امیدوں کا حاصل' میری کاوش کا صلہ
ایک بے نام اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں
کتنی بے کار امیدوں کا سہارا لے کر

میں نے ایوان سجائے تھے کسی کی خاطر
کتنی بے ربط تمناؤں کے مبہم خاکے
اپنے خوابوں میں بسائے تھے کسی کی خاطر

اب ایک اور تمنا تھی۔ ایک اور حسرت تھی' ایک اور خواہش تھی۔ جو رات دن سلگائے رکھتی تھی۔ تڑپائے رکھتی تھی اور جس کا حصول نہ جانے کہاں کہاں اسے بھٹکا رہا تھا۔

آج پھر وہ ولی شاہ کے دربار پر حاضری دینے کے لیے آئی تھی۔ وہ ایک ستون کے ساتھ ٹیک لگائے بری طرح سے رو رہی تھی اور اس کے کرب اور درد نے کئی آنکھوں کو اشکبار کر دیا تھا۔

"تجھے کیا چاہیے بیٹی۔" ایک نرم دل عورت اس کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔ اس عورت سے اس کی گریہ وزاری دیکھی نہیں جا رہی تھی۔

"محبوب یا محبت؟" وہ عورت سوال کر رہی تھی۔

"نہیں یہ دونوں چیزیں مجھے میسر ہیں۔" زوباریہ نے بلند آواز میں روتے ہوئے کہا۔ وہ ایک دفعہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

"تو پھر؟" اس عورت کی آنکھوں میں سوال تھا۔

"شوہر محبت نہیں کرتا؟ توجہ نہیں دیتا؟"

"میرا شوہر مجھ پر جان چھڑکتا ہے۔ میری ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتا ہے۔" اس کے لہجے میں ہلکا سا تفاخر بھر گیا۔

"کیا بچہ نہیں ہے؟" وہ گویا بات کی تہ میں اتر گئی۔

"ہاں۔"

"علاج کروایا؟"

"ہاں۔"

"دعا کے لیے آئی ہو۔" وہ عورت سوچنے لگی۔

"ہاں۔"

"تو پھر یوں کرو۔ اس مزار کے پچھواڑے میں چلی جاؤ۔ ایک سائیں جھونپڑی میں رہتا ہے۔ اس کی دعا میں بڑی تاثیر ہے۔ آج تک کوئی نامراد نہیں لوٹا۔ رات سے سائیں بیمار ہے۔ لوگ تو کہتے ہیں' اس کا آخری وقت قریب آگیا ہے۔ کیا پتا' جاتے جاتے تجھے دعا دے جائے۔" اس عورت کے لفظوں نے گویا اس کے اندر بجلی بھر دی تھی۔ وہ تڑپ کر اٹھی تھی اور پھر ننگے پاؤں مزار کے پچھواڑے کی طرف بھاگنے لگی۔

وہ ایک معمولی سی جھونپڑی تھی۔ ایک بستر تھا' بلا کا میلا کچیلا اور اس بستر پر ایک نحیف سا وجود آنکھیں موندے لیٹا ہوا تھا۔ اس کے پاس تین چار مرد حضرات بیٹھے تھے۔ اسے آتا دیکھ کر باہر نکل گئے۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
بساط دل	آمنہ ریاض	500/-
زرد موسم	راحت جبیں	600/-
زندگی اک روشنی	رخسانہ نگار عدنان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ نگار عدنان	200/-
شہر دل کے دروازے	شازیہ چوہدری	400/-
تیرے نام کی شہرت	شازیہ چوہدری	250/-
دل ایک شہر جنوں	آسیہ مرزا	450/-
آئینوں کا شہر	فائزہ افتخار	500/-
بھول بھلیاں تیری گلیاں	فائزہ افتخار	500/-
لگلاں دے رنگ کالے	فائزہ افتخار	250/-
یہ گلیاں یہ چوبارے	فائزہ افتخار	300/-
مین سے عورت	غزالہ عزیز	200/-
دل اسے ڈھونڈ لایا	آسیہ رزاقی	350/-
بکھرنا جائیں خواب	آسیہ رزاقی	200/-
زخم کو چھڑا حمی مسیحائی سے	فوزیہ یاسمین	250/-
اماوس کا چاند	بشریٰ سعید	200/-
رنگ خوشبو ہوا بادل	افشاں آفریدی	450/-
درد کے فاصلے	رضیہ جمیل	500/-
آج صحن پر چاند نہیں	رضیہ جمیل	200/-
درد کی منزل	رضیہ جمیل	200/-
میرے دل میرے مسافر	تسیم سحر قریشی	300/-
تیری راہ میں رل گئی	میمونہ خورشید علی	225/-
شام آرزو	ایم سلطانہ فخر	400/-

زوباریہ کچھ ٹھٹک گئی ___ اس کے خیال میں کوئی عمر رسیدہ بوڑھا سا آدمی سائیں کے روپ میں تھا۔ مگر وہ تو کوئی نوجوان تھا۔ اگر صحت مند ہوتا تو خوبروئی میں اس کا کوئی ثانی نہ ہوتا۔ گہرے سمندروں جیسی نیلی آنکھیں۔ بلا کے حسین نین نقش۔

"سائیں جی! کچھ مانگنے کے لیے آئی ہوں۔" زوباریہ نے وقت ضائع کیے بغیر بہت درد بھرے لہجے میں کہا۔ سائیں اس کی طرف پھر بھی متوجہ نہ ہوا۔

"سائیں جی! بہت دکھیاری ہوں۔ بہت تنہا ہوں' بے مراد ہوں۔ جھولی بھر دو نا۔" وہ سسکنے لگی۔

"سب کچھ پاس ہے۔ پھر بھی ادھوری ہوں۔" وہ تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔

"کانچ کے شہر کی اے عورت! بہت دیر کر دی تم نے۔" سائیں کی آواز میں عجیب سا جلال بھر گیا۔

"یہاں کیوں آئی ہو؟ میرے پاس تمہارے لیے کچھ بھی نہیں۔"

"کیوں کچھ نہیں؟ سارے جہاں کے لیے دعا کرتے ہو؟ میرے لیے بھی دعا کرو نا۔ رب سوہنا میری جھولی کو بھر دے۔ میرے آنگن میں بھی پھول ہی پھول کھل اٹھیں۔" وہ تڑپ کر بول اٹھی۔

"میرے پاس تمہارے لیے دعا بھی نہیں۔ لوٹ جاؤ' پلٹ جاؤ..... جو کچھ تم نے چھین لیا ہے' جو کچھ تمہیں مل چکا ہے۔ اس پر صبر کرو۔ شکر کرو۔" آواز پر غنودگی بھی طاری ہونے لگی تھی۔

"آپ کو کیسے خبر ہوئی۔ میں نے کچھ چھین کے حاصل کیا ہے؟" آپ کیسے" وہ کچھ حیران رہ گئی۔

"تم زوباریہ ہو نا' ماہیر عالم کی بیوی۔" سائیں کے لہجے میں یقین بول رہا تھا۔

"ہاں۔" اس نے بے ساختہ سر اثبات میں ہلا دیا۔

"تم نے کسی کا دل خالی کیا تھا نا؟" سائیں کی آواز کسی بوڑھے کی آواز سے مشابہہ ہو گئی تھی۔

"ہاں کیا تھا۔ اپنے دل کی مراد پانے کے لیے۔" زوباریہ کی آواز بہت پست تھی۔

"خالی کر دینے والے ہمیشہ خالی رہتے ہیں۔" بخار کی شدت نے سائیں کے پورے وجود پر بے ہوشی طاری کر دی تھی۔

"بی بی! سائیں کی صحت ٹھیک نہیں۔ آپ پھر کبھی دعا کے لیے آنا۔" دربار کا مجاور بہت ادب سے کہہ رہا تھا۔ وہ تھکے تھکے قدم اٹھاتی باہر نکل گئی۔

شاید اس کے نصیب میں خالی رہنا ہی لکھ دیا گیا تھا۔ تبھی تو جب حریم نے اذان کو ہمیشہ کے لیے ان کے حوالے کر دیا۔ تو ماہیر دوبارہ جا کر اذان کو زرجان کے چھوڑ آیا۔ زوباریہ کے رونے' چلانے کے باوجود اس کے گڑگڑانے کے باوجود ماہیر کی 'نا' ہاں میں نہیں بدلی تھی۔ وہ تو اذان کو ایئرپورٹ تک چھوڑنے کے لیے بھی نہیں گیا تھا۔

"یہ میری سزا ہے کہ تمام عمر میں اذان کو یاد کروں اور کبھی اس سے نہ ملوں ..... مجھے اپنی یہ سزا قبول ہے۔" حالانکہ یہ سزا تو زوباریہ کے لیے تھی۔ وہ تو خود بخود اس سزا میں حصہ دار بن گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اذان کی صورت میں ہی سہی' زوباریہ کی ممتا کو قرار آجائے۔ وہ ماہیر عالم کی اولاد سے اپنا دل بہلانے کو تیار تھی۔ مگر ماہیر کو یہ ہرگز بھی گوارا نہیں تھا۔

وہ چاہتا تھا کہ قرار چھین لینے والی کچھ تو "بے قراری" کے درد' کرب' اور اذیت سے آشنا ہو اور زوباریہ تھی کہ آج بھی دربدر بھٹک رہی تھی۔ کبھی مزاروں پر' کبھی درباروں پر' کبھی مسجدوں میں ایک دفعہ پھر وہ ولی شاہ کے مزار پر جا رہی تھی۔ اسے سائیں سے ملنا تھا اور اسے یقین تھا گویا کہ سائیں کی دعا سے اس کی بے چین' پیاسی ممتا ضرور سیراب ہو جائے گی۔

مزار کے پچھواڑے بنی جھگی آج خالی تھی۔ زوباریہ کا دل گویا دھک سے رہ گیا۔

"سائیں جی کہاں ہیں؟" وہ مزار کے مجاور سے پوچھ رہی تھی۔ جو اپنے دھیان میں مگن صحن میں جھاڑو لگا رہے تھے۔

"وہ تو جی اللہ کو پیارے ہو گئے۔" مجاور نے افسردگی

ہلایا۔

"لک..... کب؟" زوباریہ رو دینے کو تھی۔

"آج دسواں دن ہے۔" وہ رنجیدگی سے بولا۔ "سائیں چلا گیا یہ دنیا اس کے مطلب کی تھی بھی نہیں یہ دنیا دھوکا اور فریب ہے۔" "سائیں کو کیا ہوا تھا؟" زوباریہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"کچھ بھی تو نہیں' رب رحیم سے عشق کی لو لگا رکھی تھی۔ بس اس پاک ذات نے اپنے پیارے کو اپنے پاس بلا لیا۔" زوباریہ نے دیکھا۔ مجاور کی آنکھیں نم تھیں۔

"وہ اس فریبی دنیا سے تنگ تھا۔ وہ سچے راستے کا متلاشی تھا۔ سو وہ سب کچھ پا گیا۔"

"وہ سائیں بھلا کون تھا؟" اس کی آنکھوں میں سوال اتر آیا۔

"متواضع اور منکسر المزاج تھا۔ حق گو تھا۔ حق پرست تھا۔ طمع اور حرص سے خالی تھا۔ نیکی کا مبلغ تھا۔ رحم دل تھا۔ شب بے دار تھا۔ غریب تھا۔ رفیق تھا۔ تو بھی تھا اللہ کے بہت قریب تھا۔" مجاور کام چھوڑ کر سائیں کی یاد میں آنسو بہانے لگا۔

"نہیں' وہ ایک نو عمر نوجوان تھا۔ وہ کون سے شہر سے آیا تھا؟ وہ کس خاندان سے تھا؟" زوباریہ کو ایک واہم نے سرتاپا کپکپا کر رکھ دیا۔ سائیں کی باتوں سے اسے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ اس کی باتیں آج بھی زوباریہ کے ذہن میں محفوظ تھیں۔

"وہ ایک ہیجڑا تھا۔ منیب عالم اس کا نام تھا۔ بہت ہی اچھے گھرانے کا لڑکا تھا۔ اس کی وضع قطع' چال گفتار سے کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اس کا تعلق کس طبقے سے ہے۔ بس اللہ نے اسے منتخب کر لیا تھا۔

ہاں تھا' وہ شب بے داروں میں سے تھا۔ جو رات بھر جاگ کر عبادت کرتے ہیں۔" مجاور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ زوباریہ نے تھکی نظر سے مزار کے احاطے کو دیکھا اور چل دی۔

مجھے ساری بات سمجھ میں آگئی ہے منیب عالم! تمہارے پاس میرے لیے دعا کیوں نہیں تھی۔" اسے خالی ہاتھ ___ لوٹنا تھا۔ کیونکہ ماہیر عالم اور منیب عالم نہیں چاہتے تھے کہ وہ بامراد ہو۔ اس کے دل کو قرار آجائے۔ اسے قرار آنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ منیب عالم نے سچ کہا تھا۔ جو خالی کر دیتے ہیں۔ وہ خود بھی عمر بھر خالی رہتے ہیں۔ وہ زمین پر بہت نرمی سے قدم رکھ رہی تھی مگر پھر بھی..... آبلے تھے کہ زمین کی سختی کو برداشت نہ کرتے ہوئے پھوٹ رہے تھے۔ اور لہو تھا کہ فرش پر نشان چھوڑے جا رہا تھا۔

"میرا دل محبت کے احساس سے لبالب بھرا ہوا ہے۔ ہجر کے عذاب مجھ سے دور ہو گئے۔ محبت نے میرے دل کے جام کو بے تحاشا بھر دیا۔ کیا عجیب بات ہے کہ زوباریہ درانی کا دل محبت سے بھرا ہوا ہے اور اس کی گود خالی ہے۔" وہ شاید دھیرے سے مسکرا دی تھی۔ عجیب' اداسی میں لپٹی مسکان تھی جس نے گلابی شام کو بھی اداس کر دیا تھا مگر پھر بھی..... دل تو خالی نہیں تھا۔ آنکھ تو خالی نہیں تھی۔ دل تو زندہ تھا' امید تو باقی تھی اور طاق پر رکھے دیے ابھی تک روشن تھے اور انہوں نے عمر بھر روشن ہی رہنا تھا۔ اور ان دیوں کی جلن اور تپش نے ہمیشہ اسے دھیمے دھیمے سلگاتے رہنا تھا۔ اور وہ عمر رواں کے ہر موڑ پر رک رک کر ٹھہر ٹھہر کر پوچھ رہی تھی۔

"بھلا اس جنون' ضد' حسد' نفرت اور عشق کی انتہا نے مجھے کیا دیا؟"

"خالی پن۔" مزار کی اداس فضا نے ترحم سے اسے دیکھا تھا اور وہ دل میں کسک لیے پلٹ رہی تھی۔

عین عشق دیاں راہواں اوکھیاں سن
تو سوکھیاں جان کے ٹرپئی سی
عین عشق دا زہر' زہریلا سی
تو امرت سمجھ کے پی گئی سی

سبک خرامی سے چلتی ہوا بھی گویا افسردگی کا نغمہ پڑھ رہی تھی۔

عائشہ نصیر احمد

بے دل کے لیے موت

وہ نہایت زور و شور سے روتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ مینا جو اپنی وارڈ روب سیٹ کر رہی تھی اس کی سسکیوں پر پریشان ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا زرش۔۔۔؟ رو کیوں رہی ہو؟" وہ یہ سوال پوچھنا تو نہیں چاہ رہی تھی کہ پچھلے کچھ دنوں سے زرش ایک ہی فکر میں تو گھل گھل کر آدھی رہ گئی تھی۔ مگر نہ پوچھنا بھی بے حسی کا مظہر ہوتا اور مینا کم از کم اتنی بے حس تو ہرگز نہیں تھی۔

"ہونا کیا ہے۔۔۔ نوید کا فون آیا تھا۔" اس نے ہچکیوں کے بیچ بمشکل اپنی بات کہی اور پھر سے اپنا راگ سنانا شروع کر دیا۔

"اُفوہ! تو ایسا کیا کہہ دیا ہے اس نے۔" وہ تپی۔

"کہیں فون پر تین حرف تو نہیں دے مارے جو یوں قیامت مچادی ہے۔"

"مینا! تمہارے منہ میں خاک۔۔۔ کبھی تو کوئی ڈھنگ کی بات منہ سے نکال لیا کرو۔" وہ یکدم سے رونا بھول کر دہل کر بولی۔۔۔۔ مینا کی بات ہی کچھ ایسی تھی۔

"اچھا بتاؤ۔۔۔ کیا کہا ہے اس نے؟" الماری کا پٹ بند کرتے ہوئے مینا نے بے زاری سے اسے دیکھا۔

"کہا نہیں ہے۔۔۔ سنایا ہے' دل کی بھڑاس نکالی ہے۔ طنز میں بھگوئے جوتے مارے ہیں۔" اس کے ایک ایک لفظ سے اس کا شدید غصہ جھلک رہا تھا۔

"اب اگر میرے باپ نے دوسری شادی کر ہی لی ہے اور۔۔۔ ماں کے نام پر اس چڑیل کو لا کر ہمارے سروں پر بٹھا ہی دیا ہے تو کیا اس میں میرا قصور ہے۔"

"بری بات زرش۔۔۔ وہ بزرگ ہیں۔" مینا کو ان کے لیے اس کا چڑیل کہنا انتہائی ناگوار گزرا اور اس نے اس کا اظہار بھی کر دیا۔

"بزرگ نہیں ہیں وہ۔۔۔ ہماری ہنستی بستی زندگی کو اجاڑ دینے والا ایک عذاب ہیں۔" اس کی آواز بلند ہوئی تھی۔ مینا نے گھبرا کر بے اختیار دروازے کی سمت دیکھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ زرش کی یہ زہر افشانیاں نہ سن لیں۔

"کیا ملا بابا کو یہ سب کر کے۔۔۔ کیوں ہماری اچھی بھلی زندگی میں یہ زہر گھول دیا۔" روہانسے لہجے میں کہتے وہ تھکے ہوئے انداز میں بیڈ پر بیٹھ گئی۔ مینا کو اس پر ترس سا آنے لگا۔

"کیوں اپنا جی جلا رہی ہو زرش۔۔۔ یہ کوئی اتنی بڑی بات تو نہیں۔"

"یہ بہت بڑی بات ہے مینا۔۔۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بے بسی سے بولی۔

"کتنے۔۔۔ کتنے۔۔۔ خوش تھے ہم اپنے چھوٹے سے گھر میں۔۔۔ کتنا خیال رکھتے تھے ان کا۔ کس چیز کی کمی تھی جو انہوں نے ایک غیر عورت کو لا کر اس گھر میں ہماری خوشیوں میں حصے دار بنا دیا۔ جب ہمیں ماں کی ضرورت تھی تب تو انہوں نے خود دن رات ایک کر کے ہماری پرورش کی اور اب۔۔۔ جب سب کچھ سیٹ ہو گیا تو اب انہیں شادی کا خیال آیا۔۔۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتیں مینا۔۔۔ بابا کے لیے میرا جی کتنا برا ہو رہا ہے۔ میں انہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔" کہتے کہتے وہ ایک بار پھر رونے لگی۔

"بس کرو زرش! خود غرضی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ زندگی کی خوشیوں پر بابا کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ میرا یا تمہارا۔" مینا تنگ آگئی تھی اس کے ہر روز کے واویلے سے۔

"کیا مطلب ہے تمہارا یہ کہنے کا۔ اس سے پہلے کیا بابا ایک دکھ بھری۔۔۔ زندگی جی رہے تھے۔"

"نہیں۔۔۔!" مینا نے ایک گہری سانس لی۔

"لیکن انہوں نے زندگی کو زندگی کی طرح برتا بھی نہیں ہے صرف ہماری وجہ سے۔ ہمیں ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا۔ ہماری تربیت میں کوئی کسر نہیں رکھی۔ ایک وقت میں تو انہوں نے اپنی جاب تک چھوڑ دی تھی۔ صرف اس لیے کہ ہم پر سوتیلی ماں کا سایہ نہ پڑے اور اب جب انہیں یقین ہو گیا ہے کہ ہم اپنی ذمہ داریاں خود اٹھانے کے قابل ہیں اور اپنے گھروں کی ہونے جا رہی ہیں۔۔۔ تو اب اگر انہوں نے دوسری شادی کر بھی لی تو اس سے تمہیں کیا فرق پڑا زرش! کون سی قیامت آگئی۔ تم یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ ہماری شادیوں کے بعد وہ کتنے اکیلے ہو جاتے۔ ان کا تو کوئی بیٹا بھی نہیں ہے کہ بہو یا پوتے پوتیوں کا سکھ دیکھ پائیں۔"

"میں وہ سب نہیں جانتی لیکن بابا کو کم از کم اپنے سمدھیانے کے بارے میں تو سوچنا چاہیے تھا۔ اب کیسے ان کی بیٹیاں اپنے سسرال والوں کے طعنے تشنے سنیں گی۔" اسے یہی فکر دامن گیر تھی۔

"کوئی نہیں دے رہا تمہیں طعنے تشنے۔۔۔ ایک نوید کے فون کو تم نے سر پر سوار کر لیا ہے۔ ابھی معاملہ تازہ ہے اس لیے سب بڑھ چڑھ کر بول رہے ہیں کچھ دنوں بعد سب بھول بھال جائیں گے۔ یونہی لوگوں کے خوف سے ہم اپنے زندگی کے فیصلے کرتے رہے تو ہو گیا کام۔" اس نے غصے سے کہا۔ پھر قدرے توقف سے

اسے نرم لہجے میں سمجھاتے ہوئے بولی۔

”دیکھو زرش اب بہت ہوا۔ بس ختم کرو یہ ہنگامہ۔ کیوں بابا کو گلٹی فیل کروانا چاہ رہی ہو تم۔ انہوں نے ایسا کیا کر دیا ہے کہ تم اس طرح ان سے اکڑے رہتی ہو۔ نہ ان سے بات کرتی ہو۔ نہ ان کی کسی بات کا جواب دیتی ہو۔ تمہارا پرابلم نئی ماں سے ہے نا۔ تو ٹھیک ہے تم ان سے بات مت کرو مگر بابا کے ساتھ اپنا بی ہیویئر ٹھیک کر لو پلیز۔“

”نہیں کر سکتی۔ جب تک میرا غصہ گرم ہے تب تک تو بالکل نہیں کر سکتی اور ویسے بھی اب انہیں میری کوئی ضرورت رہی بھی نہیں ہے۔ ان کی نئی بیگم ہیں نا۔ ان کی سننے اور اپنی سنانے کے لیے۔ ان کے ساتھ خوش رہیں وہ۔“ تنفر سے کہتے وہ مزید رکے بنا کمرے سے نکل گئی۔ مینا بے بسی اور تاسف کے ملے جلے احساس میں گھر گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

زرش اور مینا کا نکاح ہو چکا تھا اور جب تین ماہ بعد ان کی رخصتی کی ڈیٹ فکس کی گئی تب ہی بابا نے نئی ماں کی صورت میں انہیں شادی کا اچھا سرپرائز گفٹ دیا۔ زرش شاکڈ تھی اور وحیکا تو مینا کو بھی لگا تھا مگر زرش کی نسبت وہ سمجھ دار بھی تھی اور ذمہ دار بھی۔ اس نے جلد ہی خود کو سنبھال کر اس صورت حال سے سمجھوتا کر لیا اور نا صرف سمجھوتا کر لیا بلکہ گھر کے اس نئے فرد کو بہت اچھے طریقے سے ویلکم بھی کیا۔ اسے تو اپنی ماں کی صورت تک یاد نہیں تھی۔ ساری عمر ماں کے لیے ترستے رہنے کے بعد اب اگر قدرت نے سوتیلی ہی سہی لیکن ماں جیسا رشتہ اسے عطا کر ہی دیا تھا تو وہ اس کی قدر کرنا چاہتی تھی۔

زبیدہ بیگم کوئی جوان جہان دوشیزہ نہ تھیں بلکہ عمر کی چار دہائیاں دیکھنے والی ایک بردبار اور مشفق سی خاتون تھیں۔ نوجوانی میں ہی بیوہ ہو جانے کے بعد اپنے بھائی کے ساتھ رہائش پذیر تھیں جو اتفاق سے بابا کے عزیز دوست مبشر انکل کے کزن تھے۔ مبشر انکل نے ہی اپنی دوستی اور خیر خواہی کا ثبوت دیتے ہوئے بابا کی توجہ اس طرف دلائی تھی۔ ورنہ تو وہ ایسا خیال ہی دل سے نکال چکے تھے اپنے پرسکون ندی کی مانند گزرتے شب و روز میں خوش و مطمئن تھے کہ مبشر انکل نے اس میں طغیانی برپا کر دی تھی۔ وہ چونکے۔ سنجیدہ ہو کر سوچنے پر مجبور ہوئے اور پھر ایک دن جا کر بڑی خاموشی سے انہیں نکاح پڑھا کر گھر لے آئے۔

ان کو اپنی بیٹیوں کی خفگی کا ڈر تو تھا مگر ساتھ ہی یہ احساس بھی تھا کہ ان کی بیٹیاں بہت سمجھ دار ہیں۔ وہ جلد ہی اپنی اس نئی ماں کو قبول کر لیں گی۔ اور مینا نے تو ایسا کیا بھی تھا مگر زرش کو اپنے بابا کے پہلو میں کھڑی اس عورت کو دیکھ کر جتنی نفرت پہلے دن محسوس ہوئی تھی۔ اب روز بروز اس میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بے حد جذباتی اور حساس لڑکی تھی۔ گھنٹوں بیٹھی سوچتی رہتی۔ کڑھتی رہتی۔ کبھی زیادہ اداس ہوتی تو رو بھی دیتی۔ اس نے کبھی اپنے بابا کو شیئر کرنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ وہ صرف اس کے بابا تھے اور اب کسی کے شوہر کے روپ میں انہیں دیکھنا اس کے لیے کتنا مشکل تھا یہ کوئی اس کے دل سے پوچھتا۔ وہ اب ان سے اپنے دل کی ہر بات شیئر نہیں کر سکتی تھی۔ بغیر ناک کیے ان کے کمرے میں نہیں جا سکتی تھی۔ وقت بے وقت ان سے فرمائش نہیں کر سکتی تھی۔ اور تو اور وہ اپنی مرضی سے ان کے لیے کچھ بنا بھی نہیں سکتی تھی کہ کچن بھی انہوں نے آتے ہی سنبھال لیا تھا۔ اور مینا کہتی تھی۔

”یہ ان کی محبت ہے‘ وہ کہتی ہیں تم دونوں چند دنوں کی مہمان ہو یہاں۔۔۔ تم لوگوں کو صرف آرام کرنا چاہیے۔ حالانکہ خود انہیں یہاں آئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں اس کے باوجود انہوں نے جتنی اچھی طرح سے گھر سنبھالا ہے۔ یقیناً ”ہمارے جانے کے بعد بابا کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“ تب زرش کا دل چاہتا کہ وہ چیخ چیخ کر روئے۔

اس عورت نے نا صرف اس کے بابا کو چھین لیا تھا بلکہ اس گھر پر بھی قابض ہو گئی تھی اور مینا بے وقوف

اسے اس کی محبت سمجھ رہی تھی۔ کتنے پرائے پرائے سے لگنے لگے تھے بابا اس عورت کی بدولت۔ زرش نے ان سے بات چیت بند کر دی اور زبیدہ بیگم کو تو وہ کوئی لفٹ کرواتی ہی نہیں تھی۔ حالانکہ وہ اس پر اپنی محبتیں نچھاور کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار نظر آتی تھیں مگر زرش کو ان کے وجود سے ہی چڑ سی ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

مینا‘ ان کے ساتھ اسی وقت شاپنگ کر کے لوٹی تھی۔ دروازہ زرش نے کھولا مگر بغیر کوئی دلچسپی ظاہر کیے اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگی۔ جب مینا نے اسے پکارا۔

”رکو زرش۔۔۔ یہاں آؤ۔“ زرش نے رک کر اسے دیکھا پھر سست قدموں سے چلتی ہوئی دھم سے صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ کچھ دنوں پہلے تک وہ اپنی شادی کے حوالے سے بہت ایکسائیٹڈ تھی۔ مگر اب ایکدم سے ہی سارا جوش و خروش ماند پڑ گیا تھا۔

”میں پانی لے کر آتی ہوں۔“ اس کے بیٹھتے ہی وہ اٹھ کر کچن کی جانب بڑھ گئیں۔

”عجیب ہو تم زرش! ہم اتنے تھکے ہوئے آئے ہیں۔ تم سے اتنا نہ ہوا کہ ہم سے پانی کا ہی پوچھ لو۔“ اس نے دبے لہجے میں ڈانٹا تھا۔ وہ بے نیازی ناخنوں سے کھیلتی رہی۔

”اپنی شاپنگ دیکھ لو۔ کیسی ہے؟“ اس کا موڈ بھانپ کر مینا کو ہی خود کو نارمل کرنا پڑا۔

”تم لائی ہو تو اچھی ہی ہوگی۔“ اس نے شاپرز کی طرف دیکھا تک نہیں تھا۔ وہ لب بھینچے چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر خود ہی شاپرز کھول کھول کر دکھانے لگی۔

”یہ دیکھو۔۔۔ یہ تمہارے لیے امی نے پسند کیا ہے۔“ موتیوں کے نازک کام سے مزین سی گرین کا ایک ڈریس نکال کر مینا نے اس کی جانب بڑھایا۔

”ضرورت نہیں ہے مجھے۔۔۔ تمہاری امی کی پسندیدہ چیزوں کی۔“ ایک ایک لفظ پر زور دیتے وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں اپنی شاپنگ خود کر سکتی ہوں اور انہیں بھی سمجھا دینا کہ شادی کی تیاریوں میں خود کو ہلکان کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ان کے بغیر بھی سب کچھ ہو رہا تھا اور اب بھی سب کچھ ہو ہی جائے گا۔ محبت کے ان جھوٹے مظاہروں سے میں متاثر نہیں ہونے والی۔ ان کی شادی بابا سے ہوئی ہے سو وہ خود کو انہی تک محدود رکھیں ہم پر مسلط نہ ہوں۔“ اس کی آواز بلند تھی اور لاؤنج سے کچن تک کا فاصلہ ہی کتنا تھا۔ مینا نے شرمندگی سے ہاتھوں میں منہ چھپا لیا۔ اپنے کمرے کی طرف آتے ہوئے اس نے ان کا سفید پڑتا چہرہ دیکھا تھا اور پھر نخوت سے سر جھٹکتے وہاں سے چلی آئی۔

☼ ☼ ☼

شادی کے دن قریب آتے جا رہے تھے۔ مگر اس دن کے بعد زرش نے انہیں اپنی شادی کی کسی بھی چیز میں دلچسپی لیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ مینا البتہ ہر بات میں ان سے مشورہ لے رہی تھی۔ اسے اس کے حال پر چھوڑے زرش اپنے آپ میں خوش تھی۔ بابا کے ساتھ بھی اس کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اول تو وہ ان کے سامنے آنے سے گریز کرنے لگی تھی۔ اور اگر ناشتے یا کھانے پر سامنا ہوتا بھی تو ان کی باتوں کے جواب میں وہ ہوں‘ ہاں سے زیادہ کچھ نہیں کہتی تھی۔

رخصتی سے ایک رات پہلے جب مینا اسے سمجھا رہی تھی کہ۔

”وہ بابا سے اپنے سارے گلے شکوے دور کر لے‘ کل جب انہیں ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلے جانا ہے۔ اتنے پیار کرنے والے بابا کے لیے اگر وہ دل میں بدگمانی رکھ کر جائے گی تو یہ بہت برا ہوگا۔“ تب بابا خود ان کے کمرے میں چلے آئے اور بہت ساری باتیں کی تھیں۔ اور اٹھتے ہوئے جب اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر انہوں نے کہا۔

”میں جانتا ہوں‘ میری گڑیا مجھ سے بہت ناراض

ہے۔" تب ضبط کے سارے بند توڑ کر وہ ان کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ سب ہی شکوے، شکایتیں آنسوؤں میں بہا ڈالے تھے۔ اس کا سر تھپکتے ہوئے اس لمحے بابا کی آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں۔

اور پھر زرمینہ فواد کے سنگ رخصت ہو گئی اور زرشہ نوید کی بن کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نوید کے گھر چلی آئی۔ شادی کے اوّل دن تو جیسے پر لگا کر اڑے تھے۔ ہنی مون کا گولڈن پیریڈ ختم ہوا تو خاندان کی دعوتیں شروع ہو گئیں۔ اس عرصے میں وہ صرف ایک بار بابا سے ملنے گئی تھی۔ بعد میں مینا نے فون کر کے اسے وہاں آنے کے لیے کہا بھی تھا۔ مگر اس نے منع کر دیا۔ اس عورت کی وجہ سے اب زرش اپنے میکے جانے سے بھی کترانے لگی تھی۔

اس دن وہ نوید کے ایک دوست کے ہاں ڈنر پر جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی جب مینا کا فون آ گیا۔ اس نے زیادہ لمبی بات نہیں کی، بس بابا کی خرابی طبیعت کا بتایا اور فون بند کر دیا اور یہاں زرش کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مینا نے وضاحت سے بات بتائی بھی نہیں تھی۔ زرش نے اسے کال بیک کرنے کی کوشش کی، مگر وہ موبائل ہی آف کر چکی تھی۔ نوید آیا تو اسے پریشان دیکھ کر خود بھی پریشان ہو گیا۔

"نوید! بابا کی طبیعت بہت خراب ہے، مجھے ابھی وہاں لے چلو پلیز۔" اس کا بازو پکڑے وہ ہراساں لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"لیکن پتا تو چلے انہیں ہوا کیا ہے۔"

"وہی تو مینا نے بتایا نہیں ہے، پتا نہیں کیا ہوا ہو گا انہیں، میرا دل بہت گھبرا رہا ہے نوید پلیز۔" وہ رو پڑی۔

"اچھا ٹھیک ہے، میں گاڑی نکالنے جا رہا ہوں، تم رونا بند کرو، سب ٹھیک ہو گا۔" وہ اسے تسلی دیتے ہوئے باہر نکل گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ بابا کے پاس تھی۔ تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھے بابا بہت کمزور سے لگ رہے تھے، اسے دیکھتے ہی مسکرائے۔

"بابا! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟" ان کے پاس بیٹھ کر ان کے کاندھے پر سر رکھتے ہوئے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"ارے مجھے کیا ہوا ہے، میں تو بالکل ٹھیک ہوں، تمہیں اپنے بابا کی یاد نہیں آتی نا، اسی لیے مینا نے مذاق کیا ہو گا تم سے۔" وہ ہنس رہے تھے، زرش نادم سی ہو گئی۔

"جی نہیں، کوئی ٹھیک نہیں ہیں آپ، ذرا دیکھیے اپنے آپ کو کتنے کمزور ہو گئے ہیں، خیال نہیں رکھتے نا اپنا۔" وہ ناراضی سے کہنے لگی تھی۔ روئی روئی سی آنکھیں لیے مینا بھی پاس ہی کھڑی تھی۔ اتنے میں ہی زبیدہ بیگم سوپ کا پیالہ لیے کمرے میں داخل ہوئیں۔ چہرے پر اپنی مخصوص نرم مسکراہٹ لیے۔

"یہ کیا بھئی، آج تو ہماری بیٹیاں اور داماد آئے ہیں اور تم آج بھی یہ پھیکا سوپ پلانے آ گئی ہو۔"

"جی نہیں بابا، آج تو آپ کو یہی پینا پڑے گا۔ خاطریں تو ہماری ضرور ہوں گی، مگر آپ وہ سب بالکل نہیں کھائیں گے جو ہم کھانے والے ہیں۔ اسی لیے جلدی سے منہ کھولیے۔" ان کے ہاتھ سے سوپ کا باؤل لے کر مینا پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔ جبکہ وہ اس سے حال احوال پوچھنے لگیں۔

"کیسی ہو زرش؟"

"اچھی ہوں۔" اس نے مختصراً جواب دیا۔ بلکہ نہ دیتی اگر بابا نہ ہوتے۔

"تم نے تو یہاں آنا ہی چھوڑ دیا ہے، شادی کے بعد لڑکی پرائی ضرور ہو جاتی ہے، مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ میکے کو ہی بھول جائے۔" ان کا انداز سادہ تھا، مگر زرش کو ان کی بات بہت کھلی۔

"نہیں تو... میں میکے کو تو نہیں بھولی، بس..."

آگے کا جملہ اسے سوجھ نہیں رہا تھا اور ان کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔

"جانتی ہو زرش، بابا کو کل رات انجائنا کا اٹیک ہوا تھا۔" وہ مینا کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گئی، جب مینا نے بتایا۔

"نہیں۔" اس کی رنگت زرد پڑ گئی اس انکشاف پر۔

"میں نے صبح یہاں فون کیا تو امی نے بتایا، اصل میں انہیں بابا نے منع کیا تھا، ہمیں کچھ بھی بتانے سے، مگر میرے پوچھنے پر وہ خود کو روک نہیں پائیں۔ میں نے تو یہ سنتے ہی اسی وقت فواد کو فون کر کے آفس سے بلوایا اور یہاں آ گئی۔" مینا نے تفصیل بتائی۔

"تو تم نے مجھے پوری بات کیوں نہیں بتائی فون پر۔" زرش کو حیرت ہوئی۔

"میں نے... میں نے سوچا کہ شاید... تم نہ آؤ، اس لیے ادھوری بات بتا کر ہی فون بند کر دیا کہ تمہیں ایمرجنسی فیل ہو اور تم چلی آؤ۔" مینا کا لہجہ قدرے دھیما ہوا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے مینا... تم مجھے کیا سمجھتی ہو، میں کیا بابا کی بیماری کی خبر سن کے بھی نہ آتی۔" وہ تاسف سے کہہ رہی تھی۔

"سچ کہوں تو ہاں، آج کل تم جتنی بے حس ہو گئی ہو اس سے میرا سوچنا کچھ زیادہ غلط بھی نہیں، اتنے دن ہو گئے تمہاری شادی کو، تم صرف ایک بار بابا سے ملنے آئیں، اس کے بعد پلٹ کر پوچھا بھی نہیں، نہ ہی انہیں کوئی فون کیا، کیا شادی کے بعد تم نے انہیں اپنی ولدیت سے بھی خارج کر دیا ہے زرش! جو یوں غیروں کی طرح برتاؤ کرنے پر اتر آئی ہو۔" مینا کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی تلخی گھل گئی تھی اور اس کی آنکھوں میں نہ جانے کہاں سے ڈھیر سارے آنسو اُمڈ آئے تھے۔

"میں یہاں کیوں نہیں آنا چاہتی، تم جانتی ہو۔" اس نے گلوگیر لہجے میں کہا تھا۔

"اور اسی لیے مجھے زیادہ غصہ آتا ہے۔" مینا کی آواز بلند ہوئی۔

"ختم کیوں نہیں ہوتا تمہارے دل کا زہر، دیکھا نا تم نے زرش، بابا کی طبیعت کس طرح اچانک سے خراب ہوئی۔ وہ بھی رات میں، ہم تو تھے نہیں، امی بھی نہ ہوتیں تو سوچو کیا ہوتا ان کا، تم صرف اپنے بارے میں سوچتی ہو زرش، کبھی ایک لمحے کے لیے بھی سوچا ہے کہ تب کیا ہو سکتا تھا۔ انہوں نے دوسری شادی کیا کر لی، ہم تو ان کی ساری قربانیاں، ساری محبتیں بھلائے ان سے تعلق ہی توڑ بیٹھی ہو، اپنے گھر میں خوش ہو، مگر بابا کو اتنے سالوں بعد ملی خوشی تم سے برداشت نہیں ہو رہی۔"

"ایسا نہیں ہے۔" اس نے کمزور سے لہجے میں اپنا دفاع کیا۔ مینا ہونٹ کاٹتے ہوئے چند لمحے اسے دیکھتی رہی، پھر ایک گہری سانس لے کر اس کے قریب آ بیٹھی۔

"دیکھو زرش! میں نے تمہیں پہلے بھی سمجھایا تھا، پتا نہیں تمہیں یہ بات سمجھ کیوں نہیں آتی۔ نوید کو پانے کے بعد تو تمہیں احساس ہو جانا چاہیے کہ زندگی میں ایک محبت کرنے والے، ایک مخلص ساتھی کے ساتھ کی کتنی ضرورت ہوتی ہے، ہر لحمہ، ہر قدم پر، جس سے انسان اپنے دکھ سکھ شیئر کر سکے۔ جس کے سامنے اپنے دکھڑے رو سکے۔ اس کے ساتھ ہنس سکے، اس کے ساتھ بول سکے، کتنے سال ہو گئے ہماری امی کی ڈیتھ کو۔ بابا نے اتنی عمر تنہا ہی گزار دی اور اب جب امی کی صورت ان کی تنہائیوں کو ایک مخلص اور مہربان ساتھی ملا ہے تو ہمیں بجائے خفا ہونے کے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

ہم بیٹیاں ہیں زرش، ہم محبت کے دعوے کر سکتی ہیں، اسے عملی طور پر نبھا نہیں سکتیں۔ فرض کرو بابا شادی نہ کرتے تو کیا ہم روز، روز یہاں آ سکتے تھے۔ ان کی دیکھ بھال کرنے کے لیے، ان کا خیال رکھنے کے لیے، فواد آج مجھے میرے ایک ہی بار کہنے پر یہاں لے آئے، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ صرف ایک دن کی بات ہے، لیکن اگر میں انہیں ہر دوسرے روز یہاں آنے کے لیے کہوں تو پہلی بار ان کے ماتھے پر شکنیں آئیں گی۔ دوسری بار وہ پس و پیش سے کام لیں گے اور تیسری بار صاف منع کر دیں گے۔ یہ ہوتی ہے ہماری حد زرش اور ہم اسے پھلانگ نہیں سکتے اور اس رات جب بابا کی طبیعت خراب ہوئی۔ اگر تب امی ان کے پاس نہ ہوتیں تو خدانخواستہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ مگر انہوں نے اپنے بھائی کو فون کیا اور وہی انہیں اسپتال

لے کر گئے۔ ہمیں تو تب خبر بھی نہیں تھی زرش اب تم فیصلہ کرو کہ جو تم نے بلاوجہ کا بیر ان سے باندھ لیا ہے اس سے تم خود کس حد تک مطمئن ہو۔ دیکھ رہی ہو نا کتنی اچھی طرح خیال رکھ رہی ہیں ہمارے بابا کا کتنا پیار اور احترام ہے ان کے انداز میں بابا کے لیے۔ کیا ہمیں اس بات کے لیے ان کا شکر گزار نہیں ہونا چاہیے کہ اب جب ہم اپنے گھر جائیں گے تو ہمیں بابا کی کوئی فکر نہیں ہوگی۔ کیونکہ ان کا خیال رکھنے کے لیے ان کی بیوی ان کے پاس ہے۔" مینا بے حد سنجیدگی سے اسے سمجھا رہی تھی۔ اور اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ دل سے نکلتے ان آنسوؤں نے اندر کی ساری کثافتوں کو دھو ڈالا تھا۔ بدگمانی اور بے گانگی کے حصار میں قید اس کی اندر کی ضدی لڑکی نے اپنی نفرت سے آگے کبھی کچھ سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ اسے صرف اپنے مجروح جذبات نظر آرہے تھے۔ کسی اور کی خوشی افسردگی سے اسے کوئی مطلب نہیں تھا۔

"وہ تم سے بھی بہت پیار کرتی ہیں زرش۔۔۔ تم ایک بار انہیں سمجھنے کی کوشش تو کرو ان کے پاس جاؤ ان سے گلے شکوے دور کرلو۔" اس پر اپنی باتوں کا اثر ہوتے دیکھ کر مینا نے اسے مزید اکسایا تھا۔ وہ سر جھکائے اپنے آنسو صاف کرتی رہی۔ مینا سے یہ نہیں کہہ پائی کہ اس پر شرمندگی کا غلبہ اتنا شدید ہے کہ وہ اس وقت اپنا سامنا نہیں کرسکتی تو ان کا کیسے کرے گی جس کے لیے کچھ دیر پہلے تک نہ اس کے دل میں کوئی عزت تھی نہ محبت صرف بے زاری تھی۔

اس سے پہلے مینا اس سے مزید کچھ کہتی وہ خاموشی سے اس کے سامنے سے اٹھ آئی تھی۔ مینا اسے دیکھتی رہ گئی۔

اس کا ظرف اتنا بڑا تھا نہ اس کے پاس اتنی ہمت تھی کہ زرش ان کے سامنے جاکر کھلے الفاظ میں اپنے سابقہ رویوں کی معافی مانگ سکتی۔ ندامت اور پشیمانی کا احساس شدید تھا مگر ابھی تلافی کی ایک اور صورت بھی موجود تھی۔ الفاظ سے نہ سہی اپنے طرز عمل سے تو وہ انہیں بتا ہی سکتی تھی کہ وہ کتنی شرمندہ ہے اور اپنی تمام بدتمیزیوں اور بدصورت رویوں کے لیے پوری طرح تیار تھی۔ تھوڑی دیر بعد نوید اس سے پوچھ رہا تھا۔

"تو تم آج یہیں رکو گی؟"

"ہاں۔۔۔"

"ٹھیک ہے میں کل تمہیں لینے آجاؤں گا۔" وہ جانے کے لیے پلٹا تھا۔

"کل نہیں پرسوں۔" اس نے جلدی سے پیچھے سے آواز دی۔

"پرسوں۔" ٹھٹک کر رکتے ہوئے اس کے انداز میں واضح ناراضی تھی۔

"پلیز۔۔۔" اس کی آنکھوں کی التجا دیکھ کر وہ موم پڑ گیا۔

"او کے۔۔۔ مگر یہ پرسوں سے ترسوں نہیں ہونا چاہیے۔" اس نے پہلے ہی تنبیہ کردی۔

"نہیں ہوگی ڈونٹ وری۔" وہ بے اختیار ہنس دی

مینا بھی تین دن کے لیے یہیں تھی اور اس نے زرش کو بھی رکنے کے لیے کہا تھا۔ زرش ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ سجائے یہ خبر مینا کو سنانے چل پڑی۔ وہ جانتی تھی مینا کو خوشی بھی ہوگی اور حیران بھی۔ وہ اپنے بارے میں مینا کا یہ تاثر زائل کرنا چاہتی تھی کہ زرش کبھی نہیں سدھر سکتی اور اسی لیے اس نے اپنی اندر آئی اس مثبت تبدیلی کو مینا سے شیئر کرنے کا سوچا تھا۔ اور اس کے بعد اس نے اس عورت کو اپنی ماں ہونے کا احترام اور مان بخشا تھا جس کے رشتے سے وہ آج تک منکر ہوتی آئی تھی۔ وہ ان کی بیٹی تھی اور اب سے یہ احساس وہ پورے دل سے محسوس کرنا چاہتی تھی۔ اس حقیقت کو کھلے دل سے تسلیم کرنے کے بعد ہی وہ اپنی ذات کا خالی پن بھر سکتی تھی اور زرش یہ بات اچھی طرح جان گئی تھی۔

عالیہ حرا

"ہمیں دوسروں کے معاملے میں بولنا ہی نہیں چاہیے اس سے ہم ہی برے بنتے ہیں اور ہماری زندگی میں ہی بگاڑ پیدا ہوتا ہے میں نے اپنی زندگی سے یہ ہی سبق سیکھا ہے۔" طلعت خالہ بولتی ہوئی چلی گئیں۔

اور ان کے بولے گئے جملوں کی بازگشت میرے ارد گرد تھی میری زندگی کا بگاڑ۔ میری زندگی کی ناکامی' میری زندگی کا سبق میری آنکھیں جلنے لگیں۔

"میرا گھر۔" میرا سینہ جلنے لگا۔

"میاں بیوی کے درمیان انا نہیں ہوتی محبت ہوتی ہے محبت کا توازن ہوتا ہے اور رشتوں میں توازن ہو تو تعلق مضبوط ہوتا ہے خیال دھیان کے دھاگے اس تعلق کو مربوط کرتے رہتے ہیں۔ ذرا سی توجہ ساتھی کو کتنی خوشی سے ہمکنار کرتی ہے۔ اپنے دل سے پوچھو۔" طلعت خالہ نے اس کے دل پر ہاتھ رکھا تھا۔

"واصف کی توجہ تمہارا کتنا خون بڑھاتی تھی اس سے اندازہ کرو کہ تمہارا خیال رکھنا اسے کتنا نشاط کرتا ہوگا۔" میں نے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔

"اصل چیز تمہاری ساس نندیں نہیں۔ دیور' جیٹھ' جٹھانی نہیں اصل سسرال میں حصہ تمہارے شوہر کا ہے شوہر نہ ہو تو باقی رشتے کچے ہیں اور ان کچے رشتوں کو مضبوط کرنے کے لیے تمہیں اپنے شوہر کے دل پر راج کرنا چاہیے۔"

"راج۔" میری آنکھیں نم ہونے لگیں۔

"میں تو راج کرنا ہی نہیں چاہتی تھی میں تو رہنا چاہتی تھی ان کے سنگ' ان کی محبت کے سائے میں۔" میرے دل سے ٹھنڈا سانس نکلا۔

"زندگی کو گزارو نہیں۔ اسے اپنے ساتھ اپنی خواہشوں اور امنگوں کے ساتھ چلاؤ اور رشتوں کا حسن محبت سے پیدا ہوتا ہے۔ اور تمہیں محبت کرنا نہ آئی۔"

"محبت۔" میں رودی۔ میں تو محبت سے ہی سب کچھ جیتنا چاہتی تھی مگر میری محبت کو غلط رنگ دے دیا گیا۔

"قصور تمہارا ابھی نہیں ہے بچے' ماں سرپر نہ ہو تو انسان یوں ہی خوار ہوجاتا ہے۔ ازدواجی رشتوں کے مطابق کچھ باتیں ماں بتاتی ہے اور کچھ وہ تجربے سے سیکھتا ہے ان دونوں چیزوں کے لیے تجزیاتی نگاہ ضروری ہے۔"

میری بھیگی ہوتی آنکھوں کے سامنے طلعت خالہ کی خوشگوار مکمل زندگی تھی کیسے خالو ان کا دھیان رکھتے تھے۔ بچے جان دیتے ہیں' ان کی جٹھانی' دیورانی فون کرکر کے اپنے مسئلے پوچھتی تھیں۔

ایسا ہی تو میں نے چاہا تھا۔ ایسا ہی مکمل روپ تو میں بھی بھرنا چاہتی تھی کیسے کیسے خیال دھیان نہ رکھا۔ کیسے کیسے جذبے نہیں مارے' رات گئے تک کچن کی صفائی ستھرائی میں لگی رہتی تھی کہ ساس صبح اٹھ کر خوش ہوجائیں اتنے میں واصف اس کا انتظار کرتے کرتے سوجاتے تھے۔ چھٹی کا دن واصف اس کے ساتھ گزارنا چاہتے تھے اور وہ آنے والی نندوں کے لیے پکوان بنارہی ہوتی۔ واصف باہر نکل جاتے۔

نتیجہ اس کی زندگی میں کیا آیا ناراضی خفگی دوریاں۔ اور ساس نے آرام سے کہہ دیا۔

"جب شوہر ہی خوش نہیں ہے تو ہماری خوشی کا کیا سوال۔"

یعنی خادمہ کے فرائض بھی پورے کیے اور بری بھی بنی وہ پھوٹ پھوٹ کر رودی تھی۔

اس نے تو اپنی ماں کی زندگی سے یہ ہی سیکھا تھا۔ جان توڑ محنت' خدمت' مشقت اور اسے کیا صلہ ملا۔ اسے تو اس ایک سال کے عرصے میں اولاد بھی نہ ملی۔ ساس کینہ توز نظروں سے دیکھنے لگی۔

نندوں کی آنکھیں میں سوال تھا تو۔ واصف کی آنکھوں کی بے گانگی اور لاتعلقی شرم و حیا تھی کہ وہ شوہر بیوی کے درمیان وہ حد بھی پار نہیں کرسکی تھی جو ازدواجی تعلقات کا خاصہ ہوتی ہے۔

اور بیگار کی محنت فرصت کے لمحات نہ ملتے کہ واصف ہی وہ حد پار کرلیتے۔

ابھی تک دونوں انجانی سی سرحدوں پر کھڑے تھے اور کھڑے بھی کب تھے۔ اس کے اندر بے چینی کے بھنور بننے لگے۔

"اس کی زندگی کا سفینہ ڈوبنے کو تھا اگر ڈوب گیا تو۔"

وہ پاؤں جلی بلی کی مانند ادھر سے ادھر ٹہلنے لگی۔

طلعت خالہ کی باتوں نے اس کی آنکھیں کھول دیں۔ سسرال ہی نہیں وہ تو شوہر ہی کھورہی تھی۔ اس کی محنت' مشقت' شبانہ روز جدوجہد کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس کی ساس اپنے بیٹے کی گود بھری دیکھنا چاہتی تھیں اس نے خالی آغوش کو دیکھا دل میں ہوک اٹھی۔

"ہم کیا کرسکتے ہیں کیا بولیں جب اولاد ہی بضد ہو۔ واصف کو بچے چاہئیں۔"

یعنی نہ ہونے میں اس کا قصور تھا۔

"ہوسکتا ہے مسئلہ' کمی بیشی واصف کے اندر ہو۔" طلعت خالہ نے کتنے یقین سے کہا تھا۔ "مرد قابل فخر رہنے کے لیے کبھی کبھی یونہی بھی ہر چیز نظر انداز کرتا ہے کبھی تم نے اس بابت واصف سے بات کی ہے۔" اس کا سر جھک گیا تھا۔ اس کی مصروفیت نے واصف کو لاتعلق کردیا تھا۔ حالانکہ اس کی کتنی خواہش تھی دیور دیورانی کی طرح باہر جائے گھومے۔ واصف کے ساتھ ٹائم گزارے۔ مگر ہوتا کب تھا۔

"دریہ تمہارے تو بچے نہیں ہے ذرا ناشتا بنالو۔ روٹی ڈال لو۔ سالن تو دریہ بنائے گی۔ دریہ ذرا کچن دیکھنا۔ بھابھی سموسے رول بنادیں۔ میرے دوست آرہے ہیں پلیز بھابھی اپنا پرپل سوٹ دے دیں۔ مجھے اپنی دوست کی سالگرہ میں جانا ہے۔" اور اچھا بننے کے چکر میں ساری رسمیں سارے کام نبٹائے جاتی ایسے میں واصف اگر آواز دے لیتا۔ تو اس کا جواب یہ ہوتا۔

"پلیز واصف گھر میں مہمان ہیں۔ بھابھی کے منے کی طبیعت خراب ہے۔

آپ یہ اخبار دیکھیں میں ابھی برتن دھو کر آئی۔ اب واصف آپ بچے تو نہیں ہیں نا۔"

اچھا بننے کے چکر میں کتنا غلط کرجاتے ہیں ہم۔

"اوائل شب زفاف کے دنوں میں دونوں فریقین کو ایک دوسرے کی توجہ' دھیان' محبت' بے ساختگی کی ضرورت ہوتی ہے اور مرد اس چیز کو تمام عمر دیکھنا چاہتا ہے۔

اپنے تعلق کے درمیان وہ کسی دیوار کو حائل نہیں دیکھ سکتا۔ دوریاں اسی لیے پیدا ہوتی ہیں اور تمہیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے تھا اور یہ کہ تمہارے بچے نہیں ہیں لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ساری عمر نہ ہوں۔

آج کل دو چار سال تو کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتے۔

تم مایوس ہو کر ادھر آبیٹھیں۔ واصف دوسری شادی کرلے گا۔ تمہارا ادھر آنے کا مقصد کیا تھا۔ ادھر ہی آنا تھا تو سسرال کا بیگار کیمپ کیوں نبھایا؟ کیوں حساب نہیں لیا۔ کیوں حساب نہیں مانگا۔ اگر تمہارے ماں باپ نہیں ہیں تو تمہاری زندگی اتنی سستی ہوگئی بیٹا کہ ٹشو پیپر کی طرح مسلی جائے۔"

طلعت خالہ نے اس کی آنکھیں کھول دیں۔

"تم بھاگ کر تو نہیں گئی تھیں نا اور واصف اپنی ماں کا بچہ ہے۔ کرلے گا دوسری شادی تمہارے حصے میں کیا آیا۔"

خالی گھر میں طلعت خالہ کی آواز کی بازگشت تھی اور اس کا بے چین بے قدر بھرایا ہوا دل۔

"ایک بات یاد رکھو بیٹا۔ حق بیٹھ کر نہیں ملا کرتا ہمیں حقوق کی جنگ لڑنی پڑتی ہے۔ بچہ ہونا یا نہ ہونا اللہ کے اختیار میں ہے مگر شوہر کو اس طرح سے چھوڑنا چہ معنی دارد۔

مجھے تو دہاں عمرو کے دوران چین نہیں ملا میں نے سوچ لیا تھا کراچی سے ہو کر اسلام آباد جاؤں گی اور کھینچتی ہوں تمہاری بہنوں کے کان بھی۔ انہوں نے اپنے بہناپے کو کیا نبھایا۔" کتنی اپنائیت' خلوص خالص پن تھا خالہ کے انداز میں وہ پھوٹ پھوٹ کررو دی۔

قدم قدم پر امی یاد آرہی تھیں۔ مائیں اتنی جلدی کیوں مرجاتی ہیں۔

"امی! میں کتنی اکیلی' تنہا اور ویران ہورہی ہوں۔

میرے گھر کی میرے سہاگ کی سلامتی کی کون دعا کرے گا۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اور قطرہ قطرہ رات گزرتی رہی۔

"میں ہوں تیرے ساتھ۔ خود کو ہلکان مت کر۔" صبح پھر آ گئیں طلعت خالہ سیدھی اسپتال سے آرہی تھیں تواسہ ہوا تھا۔

"خالہ بھی ماں ہوتی ہے۔" اس کی متورم پلکیں دیکھ کر آبدیدہ ہو گئی تھیں۔

"میں تیرے لیے لڑوں گی اگر واصف دوسری شادی کرتا ہے تو میں خود اس کے ہونے والی سسرال میں جا کر کہوں گی کہ پہلے اپنے ہونے والے داماد کا ٹیسٹ کروالیں کہیں بانجھ تو نہیں۔"

میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"دیکھ تو سہی تیرے لیے کیسے میں واصف کو چھری تلے لیتی ہوں۔" طلعت خالہ پر جنون سوار تھا۔

"اگر تو اجڑی تو بسے گا وہ بھی نہیں۔" طلعت خالہ کا حتمی انداز تھا۔

"یہ فضیلہ کہاں ہے؟" طلعت خالہ ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

"میکے گئی ہیں بھابھی۔"

"کب سے؟"

"ایک ہفتہ ہو گیا ہے۔"

"اور ابوبکر کہاں ہوتا ہے؟"

"وہ کبھی گھر آجاتے ہیں کبھی سسرال میں ہی سو جاتے ہیں۔"

"اور تم۔۔۔ تم اکیلی یہاں۔"

میں نے سر جھکا لیا۔

"میرے اکیلے پن کی کس نے پروا کی تھی اور کون کر رہا تھا وہ بھی نہیں جن کے ساتھ میں ایک عرصہ رہی اور وہ بھی نہیں جس کے ساتھ ساری عمر گزارنے کا خواب لے کر گئی تھی۔"

"شاباش ہے لڑکی۔" انہوں نے میری جانب طنز سے دیکھا۔

"اب بھی تمہیں زندگی گزارنا نہیں آیا۔ بے کار کی خدمتیں پالتی رہیں یہ اجر ملا۔"

"میں کیا کرتی خالہ! میرے اندر اکڑ نہیں ہے مروت، وفا شعاری ہے خود غرضی نہیں ہے۔ مجھے بس محبت بانٹنا اچھا لگتا ہے۔"

"اعتدال! میرے بچے اعتدال کی راہ اختیار کرلینا چاہیے انسان کو اتنا تر نوالہ بھی نہیں بننا چاہیے کہ ہر کوئی نگل لے۔ اور نہ اتنا کڑوا کہ اگل دے اور اب تو خدمت گزاروں کو خدمت گار ہی سمجھ لیا جاتا ہے۔ تم نے اپنی بھاوج سے سبق نہیں لیا۔ اس کے انداز ہی سیکھ لیتیں کم سے کم میاں پر قبضہ ہی کرلیتیں کچھ تو وہ میدان مار لیتیں۔" طلعت خالہ کو مجھ سے جانے کیا کیا امیدیں تھیں۔

"قبضہ کرلینے سے سچی محبتیں تو نہیں ملا کرتیں۔" میں نے نم پلکوں کو چھپا لیا۔

"بی بی۔ اس دور میں تو ناممکن لاحاصل ہے اور سچی محبت کی تلاش میں تم کھوٹی محبت کو بھی کھو دو گی کیا دوسری شادی کرو گی۔"

"ہا!!" میرا دل بند ہونے لگا۔

"تو پھر۔ میاں کو ہی قبضے میں کرنا ہے نا۔ تجھے نہیں سمجھ آئے گا۔ تیرا علاج ہے میرے پاس۔"

"علاج۔ واصف کا تو رشتہ بھی طے ہو گیا ہے جب میں آئی تھی تو بھنک میرے کانوں میں پڑی تھی۔"

"اور تو اتنے آرام سے آگئی۔" خالہ کی آواز میں تحیر تھا۔

"میں کیا کرتی۔" میرے اندر بے بسی تھی۔ چھین کر تو میں نے کبھی بھی نہیں کھایا تھا۔

"اپنی سمجھ بوجھ، عقل، شعور، آگہی تعلیم کو بھاڑ میں جھونک دے۔ تجھ میں اور گاؤں کی زیتون بانو میں کیا فرق ہے۔"

اب کے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"خالہ!!" میرے اندر سے کراہ سی نکلی۔

خالہ کو مجھ پر ترس آگیا۔ تبھی باہر بیل ہوئی۔ میں نے چہرہ صاف کرتے ہوئے جا کر دروازہ کھولا۔ ابوبکر

بھائی تھے۔ اندر چلے گئے۔ اور میں سالن دیکھنے کچن میں آگئی اندر دونوں باتیں کرتے رہے موضوع سخن میری ذات ہی تھی۔

"تم بھائی ہو تمہیں سوچنا چاہیے بیٹا ماؤں کے مرنے کے بعد بیٹیاں لاوارث نہیں ہو جاتیں پوچھ کچھ کرنا تمہارا فرض ہے۔" جواب میں جانے انہوں نے کیا کہا خالہ کی تیز آواز ابھری۔

"اور تم نے یقین کرلیا۔"

"کیا کرتے۔"

"کوئی ٹیسٹ۔ کوئی رپورٹ۔ انتظار۔"

"آپ کو معلوم ہے کہ ان معاملوں میں انتظار نہیں ہوتا۔" میں اندر ہی اندر چور ہو گئی۔

بس یہ ہی ایک وجہ۔ ایک کمی تھی جس نے مجھے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ واقعی اگر ایسا ہوا۔ میں بانجھ ہوئی تو۔ تو بھی تو واصف نے شادی کرنا ہی تھی تو ابھی کیوں نہیں۔

"شاباش بیٹا! بہن کو کنویں میں جھونک دو۔ طلاق لے کر اگر آجاتی ہے تو تم ذمہ دار ہو۔ تمہاری بیگم کو تو کسی بات کی پروا ہی نہیں ہے کون آیا کون گیا رکھوالن بناؤ گے یا خادمہ۔۔۔ یہ تم بھائی کا حق ادا کرو گے۔"

جواب میں گہری خاموشی۔

آنسو میری آنکھوں سے بھل بھل بہہ رہے تھے۔ زندگی کتنی مشکل ہو گئی تھی کوئی میرے دل سے پوچھتا بھابھی تو مجھے پسند ہی نہیں کرتی تھیں۔ خدانا خواستہ اگر ساری عمر کے لیے آجاتی تو انہوں نے بھٹی میں جھونک دینا تھا۔

میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے اک دھند تھی کچھ نظر نہیں آرہا تھا میں روٹیاں پکا رہی تھی۔ خالہ کیا کرسکتی تھیں جب نصیب ہی خراب ہوں۔

☼ ☼ ☼

"جب تک تیرا گھر نہیں بس جاتا میں ادھر ہی رہوں گی امبرین کی فکر تھی خیر سے اب فارغ ہو گئی ہے۔ کل تیرے سسرال جاؤں گی۔" خالہ کا محبت آمیز انداز، خیال رکھنے والا لہجہ، میرے دل کو پرسکون کر گیا کوئی ہے جو میرا بھی ہے سچے دل سے۔ مکمل اپنے پن سے۔

"اگر واصف کی شادی طے ہے تو میں کہوں گی پہلے تمہارا حساب برابر کرلے۔"

"خالہ!" میرا سانس رکنے لگا۔

"زندگی خواب سفر نہیں ہے دریہ اور نا ہی ان معاملوں میں معجزے ہوتے ہیں اللہ کی حاکمیت سے ہی پانسے پلٹے جاتے ہیں۔ ہماری تمہاری زندگی اتنی سستی نہیں ہے۔ کہ یوں بے بسی کی انتہا پر پہنچا دی جائے۔"

"خالہ! میں کیسے؟" میں خود بے بسی کی انتہا پر تھی۔

"یہ تلخیاں زندگی کی حقیقتیں ہیں۔ دریہ ان کو فیس کرنا سیکھو۔ اور اپنے بارے میں خود سوچو، خود فیصلہ کرو کہ تم اس قابل ہو جو تمہارے ساتھ ہو رہا ہے۔"

"خالہ! زندگی تو گزر گئی ہے اب۔" وہ خود ترسی کی انتہا پر تھی خالہ لمحہ بھر کو خاموش ہو گئیں۔

"زندگی تو ہماری نہیں گزری تو تمہاری کیسے گزرے گی اٹھتر سال ہے میری عمر۔ شوہر ہے، بچے ہیں ہنسی خوشی عمر گزری ہے تم اپنی عمر رو کر کلس کر دنیا والوں سے چھپ کر گزارنا چاہتی ہو۔ جبکہ تمہارے بہن بھائی اپنی اپنی زندگیوں میں مصروف تمہارے لیے نہیں، تمہارے نہیں۔"

اور میں ایک ٹک خالہ کی شکل دیکھے گئی۔

"اور خالہ اگر میں بانجھ ہوئی تو۔۔۔" میرا دل بند ہو رہا تھا۔

"اور اگر وہ ہوا تو۔۔۔" خالہ کی بات پر میں خاموش ہو گئی۔

"اگر تو بانجھ بھی ہوئی نا تو کوئی رنڈوا۔ بچے والا تیرا نصیب بنا دوں گی۔"

"خالہ۔" میں سسک سسک کے رو دی۔ خالہ نے اپنی گود میں میرا سر رکھ لیا۔

"رونا مسئلے کا حل نہیں ہے زندگی کو صرف گزرنا ہی نہیں ہوتا سکھ کے ساتھ گزرے تو بات ہے۔ جب ہم دکھوں کے ساتھ مقابلہ کرسکتے ہیں تو پھر کیوں

سرنگوں ہوں۔ ناپسندیدہ لوگوں کے ساتھ رہنے سے بہتر ہے کہ راستہ بدل لیا جائے۔ اس میں عزت بھی ہے اور فخر بھی۔"

خالہ میری ڈھارس بندھا رہی تھیں۔

"واصف سے میں نے محبت کی تھی اور واصف کو چھوڑنا آسان نہیں تھا۔ اور واصف مجھے چھوڑ سکتے ہیں۔ ان کے لیے یہ سب اتنا آسان ہوگا یا ہو سکتا ہے" میں گم سم سی ہو گئی۔ میرے آنسو خشک ہو گئے۔ دعا کے لیے اٹھے ہوئے ہاتھ گر گئے۔

میں تقدیر کے فیصلے کا انتظار کرنے لگی۔

تقدیر۔ جس نے میرے نصیب میں جانے کیا رقم کر رکھا تھا۔

میری آنکھیں شدید بہنے کی خواہش میں جلنے لگیں۔

خالہ واصف کے گھر چلی گئی تھیں۔ بھائی کو لے کر۔

میں نے پوری کھڑکی کے پردے کھولے اور باہر دیکھنے لگی تازہ ہوا نے مجھے چھولیا۔

میں نے کھڑکی چوکھٹ سے سر ٹکا دیا۔ مجھے خالہ کی آمد کا انتظار تھا۔ احساس' جذبے' سب ساکت تھے۔ وقت گزر رہا تھا۔ دھیرے دھیرے۔ آہستہ آہستہ۔ دھیمی رفتار سے گھڑی کی ٹک ٹک میرے دل پہ ہو رہی تھی۔

کبھی دل رک جاتا۔ کبھی سانس چلنے لگتی۔ وقت منصف ہے۔ مگر فیصلہ حسب منشاء کرے تو منصف وگرنہ!؟

خالہ آگئیں۔ ٹھہرا ہوا وقت چلنے لگا۔ اور میرا سانس رکنے لگا۔ خالہ خاموش تھیں فخر سے اٹھا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ صوفے پر ڈھنے کے سے انداز میں بیٹھی تھیں۔

"بھائی۔" میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دور دور تک آخری سیڑھی تک بھائی نہیں تھے۔

"خالہ! قریب آکر میں نے انہیں پانی کا گلاس دیا۔ ایک گھونٹ لے کر واپس رکھ دیا اک دکھ ان کے چہرے پر رقم تھا غم والم کا احساس تھا۔ ان کی پلکیں بھیگی سی محسوس ہوئیں۔

"خالہ!" میں دوزانو بیٹھ گئی۔

"میں نے کہا تھا نا واصف کی امی کا فیصلہ ہوتا ہے واصف تو بس۔" انہوں نے سر جھکا لیا۔

"ہوگا وہی جو وہ چاہیں گی۔" میں نے تسلی دینے کے لیے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"نہیں۔ ہوتا وہی ہے بچے جو اللہ چاہتا ہے۔ جو رب کی مرضی ہوتی ہے۔"

"وہ نہیں مانے نا۔"

"وہ ظالم' سنگدل' ناقدر شناس شقی القلب' بے درد لوگ ہیں انہیں خدا کا خوف نہیں ہے۔ اچھا ہوا جو تو بچ گئی تیرا اور ان کا ساتھ بس ادھر تک ہی تھا۔" انہوں نے میری جانب دیکھا۔ میں انہیں دیکھتی رہ گئی۔

"ایسے لوگوں سے واسطہ رکھنا خود انسانیت کی بے عزتی ہے اپنا فیصلہ اپنا انصاف اللہ پر چھوڑ دینا چاہیے۔ ورنہ!

اللہ نے ضرور ہمارے لیے کچھ بہتر سوچ رکھا ہوگا۔"

خالہ کی تمہید اور ان کا لہجہ سن کر میں گر سی گئی۔

"فیصلہ ہو گیا۔ واصف نے دوسری شادی کرلی۔ اب مجھے ادھر ہی رہنا ہوگا۔" خالہ نے گہرا سانس لے کر ٹیک لگالی۔ کچھ ہونے کا' کچھ انہونا ہونے کا احساس مجھے ڈرانے لگا۔

"خالہ!" میں نے ان کا گھٹنا ہلایا۔

"ایسے رشتوں کو توڑ دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔ جن میں وفا نہ ہو۔ محبت نہ ہو۔ خدمت گزاری کا احساس نہ ہو۔"

"خالہ۔" پیاس نے میرے گلے میں ببول اگا دیے۔

"میں نے ان سے بات کی انہیں ان کی غلطی کا احساس دلایا۔ بچے کے لیے ایک دم سے اتنا بڑا قدم اٹھانا ضروری نہیں ہے اس کے لیے علاج اور انتظار کے ساتھ دعا ضروری ہے۔ مگر وہ لوگ ہتھے سے اکھڑ گئے۔

تمہیں بانجھ کہہ رہے تھے میں نے کہہ دیا کہ اگر واصف بانجھ ہوا دیر واصف کی جانب سے ہوئی تو! انہوں نے بہت برا لہجہ اختیار کر لیا کتنی بدتمیز' احساس سے عاری جذباتی عورت ہے تمہاری ساس" سر جھکائے خالہ بول رہی تھیں۔ میرا دم آنکھوں میں ٹھہر گیا۔

"اس عورت کا بیٹا اس سے زیادہ جلد باز سوچا نہ سمجھا۔ دیکھنا خطا کھائیں گے۔"

"خالہ۔لہ۔"

"واصف نے کھڑے کھڑے تین دفعہ طلاق دے دی۔"

"ہا آہ۔" میرا سانس رک گیا۔

"وہ لوگ تو بس انتظار میں تھے۔ کوئی تمہاری جانب سے بولے۔" گھڑی کی ٹک ٹک رک گئی۔ منتظر احساس میں ٹھٹک گئے ایک دم سے میرے چہرے پر بارش شروع ہو گئی۔ "خالہ!" میں بے یقین ہوئی۔ انہوں نے پانی کا گلاس سائیڈ پر رکھ کر میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ میں نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"بس۔ خدا کا شکر ہے۔ مزید خوار ہونے سے بچ گئیں۔ یقیناً" رب نے تیرے لیے کچھ بہتر رکھا ہوگا۔" خالہ مطمئن تھیں۔ اور میں سب کچھ اجاڑ کر بیٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

وقت رک گیا تھا۔ انتظار تھا۔ واصف ضرور آئیں گے آہٹیں منتظر تھیں۔ خواب زندہ تھے واصف کا مسکراتا چہرہ بلاتا تھا۔ اب اس بے درد نے سب تعلق توڑ لیے۔

سب کے افسوس کے فون آئے۔

محض لفاظی تھی میرے لیے کوئی اپنے کام چھوڑ کر آ نہیں سکتا تھا۔ اور کسی نے میری زندگی ہی ختم کر دی تھی۔ کتنے دن ہو گئے خالہ بھی نہیں آئیں میں گم سم ساکت خلاؤں میں تکا کرتی۔ کونوں' کھدروں میں جھانکا کرتی۔ میری قسمت کے اندھیرے میرے ساتھ تھے۔

بھائی تو ویسے بھی دور ہی تھے۔ بھابھی بوجھ سمجھنے لگیں ایان کے ساتھ وقت گزارنے لگی تو انہوں نے گھر کے کاموں میں الجھا کر نوکرانی کی چھٹی کرا دی۔

جانے کتنا عرصہ بیت گیا۔ اب تو دن و ماہ کا حساب کتاب ہی فضول تھا اب زندگی کے دن گزر رہے تھے کہ ایک دن خالہ آگئیں۔

"ٹھیک ہو۔" انہوں نے مجھے ساتھ لگا لیا میں مسکرا دی۔

"کیا کرتی رہتی ہو سارا دن۔"

"وہی جو میرا نصیب ہے۔"

"نصیب ہم خود بھی بنا لیتے ہیں زندگی اتنی مشکل نہیں ہے جتنا ہم سمجھ لیتے ہیں۔ تمہاری عدت ختم ہو گئی۔"

"عدت" میں ان کی شکل دیکھنے لگی۔ انہوں نے خود ہی انگلیوں پر حساب لگایا۔

"ہاں ختم ہو گئی ایک ہفتہ اوپر ہو گیا ہے۔"

میں نے واصف کے نام کی عدت بھی گزار لی۔ وقت اتنی تیزی سے گزرتا ہے کیا۔

"اپنا شناختی کارڈ دے دو مجھے میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر جا رہی ہوں آسٹریلیا۔" اور میں ہکا بکا بیٹھی رہ گئی۔

"کیا کہہ رہی ہیں خالہ آپ؟" بھابھی اندر آگئیں۔

"ہاں۔ میں اس کی عدت ختم ہونے کا انتظار کر رہی تھی اگلے ماہ تک میں نے چلے جانا ہے یہ میرے ساتھ جائے گی۔"

"کس رشتے سے۔" تیکھے چتون تھے۔

"اپنائیت کے رشتے بیٹی کے ناتے سے۔ محبت کے رشتے سے۔"

"ابھی اس کے بھائی زندہ ہیں۔" بھابھی کا لہجہ بے درد تھا۔

"اللہ انہیں سلامت رکھے۔" خالہ جان نے منہ پھیر لیا بھابھی اٹھ کر چلی گئیں۔

"صفت کی نوکرانی ملی ہوئی تھی اب اڑیں گے

ہاتھوں کے تو تے۔"

"خالہ۔" میں دو زانو ہوئی۔

"مجھے ادھر ہی رہنے دیں۔ میں نے کیا کرنا ہے۔"

"تم نے وہی کرنا ہے جو گھر گرہستی والی عورتیں کرتی ہیں۔

جتنا رونا تھا رو لیا تم نے ماتم بھی کرلیا عدت بھی گزارلی۔ اب صبر کا پھل دیکھنا۔ خبردار جو پچھلوں کو روئیں انہیں یاد کیا وہ اس قابل ہی نہیں ہیں۔"

انہوں نے مجھے ساتھ لگا کر تسلی و تشفی کے پھاہے میرے سر پر رکھے۔ مگر اب ہجر کی ماری کو قرار ہی کب تھا۔

رات وہ بھائی سے بات کررہی تھیں۔ ان کی بات نے مجھے چونکا دیا۔

وہ میرا رشتہ بھائی سے مانگ رہی تھیں۔ اپنے چھوٹے بیٹے نثار کے لیے۔

بھائی تذبذب کا شکار تھے۔ اور میں حیران۔

"بس میں نے کہہ دیا ہے اچھی طرح سوچ لو۔ فون پر نکاح ہوگا ولیمہ کھانے ادھر ہی آجانا۔"

خالہ اپنے سارے پروگرام تیار کیے بیٹھی تھیں خوشی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔

"مجھے شادی نہیں کرنی نثار بھائی بہت اچھے ہیں۔"

"اور اس اچھے انسان کے لیے اچھی لڑکی کی ہی تلاش ہے۔"

خالہ مسکرائیں۔ اور میری پیشانی چوم لی۔

صبح بھائی نے بھی اسے ناممکن بنادیا۔

"ریان اس کا عادی ہوگیا ہے۔ بچے اس سے مانوس کیسے رہیں گے۔"

"اور جب بچے بڑے ہوجائیں گے تو دریہ تنہا کیسے رہے گی تم لوگ تو اپنی اپنی زندگی میں مصروف ہوگے۔"

بھائی خاموش ہوگئے۔

"اسے نوکرانی بنا کر ساتھ رکھنا ہے کیا ساری عمر کے لیے۔"

"بہنیں نوکرانی نہیں ہوتیں بھائی کے گھر۔" بھابھی نے بھی مداخلت کی۔

"بی بی اگر تمہاری بہن کے ساتھ یہ کچھ ہوتا تو بھی تم ایسا ہی کرتیں۔" خالہ اب بھابھی کے مدمقابل تھیں۔

"خالہ میں تو آپ کے بھلے کی ہی بات کررہی ہوں اب آپ سمجھنا نہ چاہیں تو اور بات ہے۔ بانجھ ہے دریہ۔" اور میں ان سنگ دلانہ لفظوں کی اذیت برداشت کرتی بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔

"میں جانتی ہوں بی بی۔ مجھے نہ سمجھاؤ۔ بتاؤ بیٹا تمہاری کیا مرضی ہے۔"

وہ بھائی کی جانب متوجہ ہوئیں۔

"اچھی طرح سے سوچ سمجھ لو۔ وقت ہے ابھی تمہارے پاس۔"

اور بھائی بھابھی کی باتوں میں نہیں آئے۔ بھابھی بالکل نہیں چاہتی تھیں کہ یہ نکاح ہو اور میں تو بالکل بھی نہیں۔ مگر میری قسمت میں جانے کیا لکھا تھا۔

کس طرح سے ہوا' کیسے سب بہن بھائی راضی ہوئے میرا نکاح فون پر ہوگیا۔ اور میں خالہ کے ساتھ آسٹریلیا آگئی۔

نثار واقعی مجھ پر نثار ہوتے' بہت دھیمے مزاج کے مرد۔ غصہ ان میں بالکل نہیں تھا۔ دھیرے دھیرے بات کرنا سمجھ بوجھ رکھنا۔

میں گم سم۔ خوفزدہ سی تھی۔

نثار کے ساتھ برا ہوا میرے جیسی لڑکی جو بانجھ بھی ہو' کیسے اس شاندار سے شخص کا نصیب بن گئی اولاد تو عورت کا نصیب ہوتی ہے۔ میں محبت ہی نہ کرسکی۔

خالہ نے مجھے ہتھیلی کا چھالہ بنالیا اور میں منتظر تھی وقت کی آندھی چلنے کی جو ایک بار پھر چلے گی اور میرا آشیانہ بھسم کردے گی۔

جب حقیقت نثار پر کھلے گی۔ خالہ نے جانے کیوں مجھے بہو بنالیا۔ شاید کفارے کے طور پر۔

اور۔ ایک بار پھر میرا آشیانہ شعلوں کی زد پر تھا۔

میرے خدشے بے بنیاد نہیں تھے۔ چھٹے مہینے خالہ نے میرا چیک اپ کروالیا اور میں تو لق و دق صحرا میں

کھڑی رہ گئی میرے حواس شش در تھے۔

رپورٹ میرے ہاتھوں میں تھی۔ اور میں گم سم ہوتی ہوئی۔ زمین بوس ہورہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"دریہ! واصف کا فون ہے تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

میں جو کچن میں تیزی سے مصروف تھی ٹھٹک کر رک گئی۔

"مجھے کسی سے بات نہیں کرنا۔" میں پھر قورمہ میں چمچہ چلانے لگی۔

"ایک بار بات کرلو اس کی تسلی ہوجائے گی۔" خالہ بضد تھیں۔

"خالہ مجھے کسی سے بات نہیں کرنی نہ تسلی کے لیے نہ اطمینان کے لیے' کسی نے میرے متعلق سوچا تھا؟" میں سنگدل ہوگئی۔

"معافی مانگنا چاہتا ہے تم سے۔"

"مجھے ضرورت ہی نہیں ہے۔"

خالہ پلٹ گئیں۔ فون پر جانے کیا بات ہوئی فون بند ہوگیا۔ خالہ لان میں نکل گئیں میں نے کچن کی کھڑکی سے جھانکا۔

نثار بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے طیب' ازلان اور عبدالرحمن میرے بچے' میرے جگر گوشے' میرے وجود کا حصہ۔

جی ہاں! انہیں میں نے جنم دیا ہے۔ میں بانجھ نہیں ہوں۔ نثار نے مجھے مکمل کردیا۔ مجھ پر الزام تھا۔ جو واصف کی امی نے لگایا تھا میری رپورٹ چینج کرواکر۔ واصف ماں کے کہے میں آیا اس پر کسی محبت اور وفا کا اثر نہیں ہوا۔

اب! وہ اپنی جلد بازی کی معافی مانگنا چاہتا تھا اک بار مل کر خالہ کی منتیں کرتا تھا۔ اس کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔

مگر اب کیا فائدہ۔ میں خوش تھی میں اس سے نہیں ملنا چاہتی تھی۔ میں اپنی خوبصورت زندگی میں کوئی ہلچل' کوئی تلاطم نہیں چاہتی تھی میں نے اپنی زندگی میں بہت آنسو بہائے تھے اب گنجائش نہیں تھی۔

"کیا ہورہا ہے بھئی۔" نثار اندر آگئے۔

میں نے چمکتی مسکراتی آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

"کافی چاہیے ہوگی۔"

"ہاں!" وہ شرارت سے جھکے اور میرا ہاتھ تھام لیا۔

"ہاٹ کافی۔" میں کھلکھلائی۔

"نثار' خالہ"! میں چیخی۔

"اوں ہوں وہ بچوں میں مصروف ہیں۔"

وہ میری چالاکی سمجھتے تھے۔ اک سرشاری سی میرے اندر اترتی چلی گئی۔ ایک اطمینان و سرور نشاط لمحے میری زندگی میں ہمیشہ کے لیے آگئے تھے۔ بانجھ میں نہیں تھی بانجھ واصف تھا۔

☆ ☆

سلویٰ علی بٹ

مکمل ناول

قرآن کریم کے چوتھے پارے کی چوتھی سورۃ سورۃ النساء کی انیسویں آیت میں پاک پروردگار ارشاد فرماتا ہے۔

"اور ان کے ساتھ (بیویوں) اچھا سلوک کرو اگر وہ تم کو ناپسند بھی ہوں تو ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ اس میں بہت کچھ بھلائی رکھ دے۔"

بائیس برس گزر گئے۔ اسے اس آیت کو پڑھ کر یونہی ٹھٹکتے ہوئے۔ اس کے لفظ بہ لفظ معنی مفہوم اور ترجمہ اسے اچھی طرح سے ذہن نشین تھا۔ اکثر اوقات ڈرائیونگ کرتے کلاں میں پانی کا چھڑکاؤ کرتے فائلوں پہ سائن کرتے یا تنہا لیٹے ہوئے یہ پاک ترجمہ اس کے کانوں کی بازگشت بن جایا کرتا تھا۔ اس کا برسوں سے معمول چلا آرہا تھا وہ ہر جمعتہ المبارک کو نماز جمعہ ادا کر کے سیدھا اسٹڈی روم میں چلا جاتا جزدان میں لپٹے قرآن پاک کا، بڑی عقیدت و احترام سے چوتھا پارہ کھولتا۔ ایک نقطے پہ نظریں جمائے جمائے دل و دماغ ماضی کے رستوں پر سرپٹ دوڑنے لگتے۔ ایسے لمحوں میں اب پچھلے تھوڑے عرصہ سے کبھی کبھار آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ ان گہری سوچوں کے نقش صرف پچھتاوے تھے۔ ظاہر ہے ان پچھتاووں کا تعلق رشتوں سے تھا مگر یہ بھی نہیں تھا کہ وہ ہر رشتوں میں بے ایمان رہا تھا۔ اگر ایسا کچھ ہوا بھی تھا تو کم از کم اسے بے ایمانی کے زمرے میں نہیں رکھا جا سکتا تھا۔

چھوٹی موٹی غلطیاں ضرور سرزد ہوئی تھیں ان میں بھی اس کے اختیار یا شعور کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ کچھ انسانوں کی تقدیروں میں یونہی ہیر پھیر پایا جاتا ہے۔ چھوٹی سی غلطیوں کی سزا کسی کبیرہ گناہ سے کم نہیں ملتی۔ تب تقدیر کا انسان سے اور انسان کا رب سے تعلق چھڑ جاتا ہے۔ اس کے بائیس سال کی سزا جو کٹنے میں نہیں آرہی تھی۔

اس نے تین سو تین سال کے اس عرصہ کو جس میں قریبی رشتے اس کے ہمراہ تھے۔ لاکھوں بار سوچا تھا۔ اس کی یادداشت میں جتنی باتیں اور یادیں محفوظ تھیں انہیں ہزاروں بار پھر سے دوہرایا مگر کہیں بھی اتنا غلط نہیں ہوا تھا کہ اس قدر شدید پکڑ ہوتی۔ وہ نہ جانے کتنی دیر ماضی کے گرداب میں پھنسا رہتا کہ اسماعیل کی آواز نے اس کی محویت توڑ دی۔

"صاحب جی، شمعون آئے ہیں، میں نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔" وہ خالی نظروں سے اطلاع دینے والے کو تکتا رہا۔

اسماعیل پچھلے تیس سال سے ملازم اپنے صاحب کا مزاج شناس تھا۔ اس کی خاموشی پہ مڑ پلٹ گیا۔

قرآن پاک کو بند کر کے اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ جلتی آنکھوں کو بند کیا تو ان میں نمی تیر گئی۔ کرسی کے بازوؤں پر اپنے ہاتھوں کا سارا بوجھ ڈال کر وہ اٹھا تھا۔ سست اور بے جان قدموں سے خود کو گھسیٹتا ڈرائنگ روم کے دروازے پر آرکا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے پرانے سنگی ساتھی ایسے، جیسے ــــ دو بھائی اپنے باپ کی کل جائیداد میں آدھے آدھے کے وارث ہوتے ہیں۔

سفید کلف لگے کاٹن کے شلوار قمیص میں ملبوس شمعون احمد بھی شاید نماز جمعہ ادا کر کے حسب معمول ادھر ہی آگیا تھا۔ وہ جو ڈرائنگ روم کے

دروازے میں ایستادہ وجود کو دیکھ کر کھڑا ہو چکا تھا اس کی آنکھوں کی سرخی اور ویرانی دیکھ کر واپس بیٹھتا چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

رات کے دو بجے اس نے اپنے کمرے میں قدم رنجہ فرمایا۔ دروازے کے ہینڈل کو گھما کر لاک کر کے چابی دور سے ہی سنٹر ٹیبل پہ اچھال دی۔ چابی اس طرح پھینکنے سے کمرے کے پرسکون ماحول میں خاصا ارتعاش پیدا ہوا تھا۔ بیڈ پہ دلہن بنی بیٹھی عائلہ کا دل انتہائی رفتار سے دھڑکنے لگا۔ وہ دھیرے سے کسمسا کے مزید سمٹ گئی۔

اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے رک کر سلجھے ہوئے بالوں کو پھر سے سلجھایا اور اضطراری کیفیت میں کمرے کے چکر لگانے لگا۔ عائلہ نازک لمحوں کی پراسراری خاموشی پر اندر ہی اندر کپکپا رہی تھی۔ مہندی لگے ہاتھوں کو مضبوطی سے ایک دوسرے میں جکڑ کر اپنی گھبراہٹ پہ قابو پانے کی کوشش کی۔

بیڈ کراؤن کے دروازے سے گرے مخملی کیس نکال کر وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"ہم دونوں پہلی بار ایک دوسرے کو دیکھ رہے اور مل رہے ہیں ورنہ اب تک ہماری جان پہچان صرف نام کی حد تک تھی۔ اب یہ بے نام سا تعلق رشتے میں بدل گیا ہے۔ یہ ہماری پہلی بات چیت ہے مجھے وعدے اور قسمیں نہیں کھانی آتیں' یہ سب بہت اسٹوپڈ لگتا ہے کہ آپ کسی کو جانے بغیر بہت سی توقعات جوڑ لیں یا پھر دوسرے فریق پر بوجھ ڈال دیں میرے نزدیک توقعات بوجھ ہی ہوتی ہیں' جب ہم اندر سے کمزور ہوتے ہیں تو اپنی اس بزدلی پر پردہ ڈالنے کے لیے اپنی امیدوں اور خواہشات کو کسی دوسرے سے وابستہ کر لیتے ہیں توقعات کا نام دے کر' میرے نزدیک توقعات کی یہی تعریف ہے۔ بہرحال آپ کا مجھ سے متفق ہونا قطعاً ضروری نہیں ہے۔" کچھ دیر رک کے اس نے لمبی سانس خارج کی۔

"پچھلی صدیوں میں جب کوئی غیر متوقع دانش کی بات کر جاتا تو لوگ اسے فلاسفر کہتے تھے اور اس صدی میں سائیکو' اصل میں ہم سے یہ برداشت ہی نہیں ہوتا کہ....." وہ یکدم چپ کر گیا۔

شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ موقع کی مناسبت سے ٹریک سے ہٹتا جا رہا ہے۔ جلد ہی صحیح ٹرین پکڑ لی۔

"اینی وے' مجھ سے تمہارا غائبانہ تعارف تو ہو ہی چکا ہو گا' پھر بھی میرے پیرنٹس حیات نہیں ہیں' صرف ایک شادی شدہ بہت لاڈلی بہن ماریہ ہے۔ جس نے تمہیں میرے لیے پسند کیا تھا۔ صرف ایک بہن ہے کوئی لمبی چوڑی ذات برادری کے جھمیلے نہیں ہیں اگر اس رشتے کو اچھے سے نبھاؤ گی تو ہمیشہ میری گڈ لسٹ میں شامل رہو گی اور وائز....." اس نے پھر باقی کا جملہ کھا لیا تھا۔ کم از کم نتائج سے تو آگاہ کر دیتا۔

"اسپیڈ بریکر۔" دلہن کے دل میں اس دولہا کے لیے یہ خیال آتے ہی بڑی خوب صورت سی مسکان ہونٹوں کے کناروں پہ رینگ گئی۔ اس نے اس کے ہاتھ میں گرے کیس کو دیکھا جس نے پتا نہیں آج کی رات کھلنا بھی تھا کہ نہیں۔

"ایک بات طے ہے کہ اب تم میری بیوی اور عمر بھر کی ساتھی ہو' تمہارا ماضی کیا تھا؟ اس میں کون تھا' مجھے یہ جاننے کی خواہش ہرگز نہیں' میرے گزرے کل میں کیا کچھ بیتا تم بھی اس کی جانچ پڑتال میں مت پڑنا۔ آج کی تاریخ جس میں ہم اس بندھن میں بندھے ہیں نوٹ کر لو' ہم دونوں اس تاریخ کے بعد کے تمام واقعات پہ ایک دوسرے کے سامنے جواب دہ ہوں گے کسی ماضی کے لیے نہیں۔" اب وہ دائیں ہاتھ کی انگلیوں کبھی کھول اور بند کر رہا تھا۔ سر جھکائے بالکل خاموش جیسے کہنے کو کچھ بچا ہی نہ ہو۔ پھر دھیرے سے کیس کھولا اور اس میں ڈائمنڈ کا لاکٹ چین نکال کر اسے پہنا دیا۔

"چلیں آپ نے یہ تو تسلیم کیا کہ میں آپ کی بیوی اور عمر بھر کی ساتھی ہوں۔" اس نے کبھی کی جھکی

نگاہیں اٹھا کے اس کی چوڑی پشت کو دیکھا جو وارڈروب میں سر دیے کھڑا تھا۔

آج کی اس خوب صورت رات کے لیے صرف یہ دلاسا کافی نہیں تھا۔ اس کی بامعنی گفتگو کا مقصد اور کچھ حصہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ جو شخص ماضی سے جتنا کلستا ہے وہ پرچھائی بن کر اتنا ہی اس کے اندر زندہ رہتا ہے۔

"تعریف نہ گہرا لہجہ' آنکھوں کی پرکشش چمک اور ہونٹوں پہ مسکان تک نہ تھی اس شخص کے' زندگی کی نئی شروعات' آزمائش اور تنگ گھیرے کے ساتھ' ایسی بدنصیبی' روسو کا جانشین۔"

اس کے کپڑے لے کر واش روم میں چلے جانے کے بعد اس نے پشت پہ تکیوں پہ سر ڈال دیا۔ اپنی کم مائیگی کا احساس حد سے بڑھ رہا تھا۔ وہ کوئی سطحی ذہن یا دقیانوسی لڑکی نہیں تھی مگر جو ابھی ہوا تھا اسے بے اختیار رلا گیا۔

وہ واش روم سے نکل کر بیڈ دراز سے کچھ لینے لگا مگر میرون بھاری کامدار لہنگے میں سجے سنورے روپ نے اسے متحیر سا کر دیا تھا۔

تکیوں سے ٹیک لگائے' بند آنکھوں اور بھیگے چہرے نے اس کی ساری توجہ سمیٹ لی۔ وہ کب سے اس صبیح چہرے کو دیکھنے سے گریز برت رہا تھا۔ جس پر اب اس کا پورا حق تھا۔ لمحہ بھر کو جی میں آیا کہ انگلیوں کی پوروں سے سارے آنسو چن لے شاید اس کی نظروں کا گہرا ارتکاز تھا کہ عائلہ نے آنکھیں کھول دیں۔ اسے اپنے قریب جھکا پا کر ہڑبڑا کے سیدھی ہو گئی۔ عمیر رضا کو ایسا لگا جیسے کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔

"چینج کر لو' خود کو بہتر فیل کرو گی۔" اب کچھ تو کہنا ہی تھا۔

"میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔" وہ دراز میں سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر لے کر کمرے سے ملحقہ ٹیرس پہ چلا آیا۔

☆ ☆ ☆

صبح دس بجے کسی کے دروازہ کھٹکھٹانے پر اس کی آنکھ کھلی تھی۔ بمشکل بیدار ہوتے اس نے مندی مندی آنکھوں سے اردگرد کا جائزہ لیا۔ خود کو نئی جگہ پہ پا کر ساری نیند ہی اڑن چھو ہو گئی۔ دروازے پہ جو کوئی بھی تھا اب جا چکا تھا۔ اس نے اپنی سائیڈ پہ نظریں دوڑائیں' بیڈ خالی تھا۔ وہ دوپٹہ پھیلاتی اٹھ بیٹھی۔ تبھی اس کی نگاہ سامنے والے صوفے پر گہری نیند سوئے ہوئے عمیر رضا پر پڑی۔ وہ رات اسے تھوڑی دیر کا کہہ کر گیا تھا۔ وہ چینج کر کے آئی اور لیٹ کر اس کا انتظار کرنے لگی تھی۔ پھر اسے بالکل ہوش نہ رہا کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

اس نے رات سے اب اسے سوئی ہوئی حالت میں نظر بھر کر دیکھا تھا۔ کتنا مکمل اور خوب صورت تھا۔ ماریہ اپنے بھائی کی تعریف کے پل باندھ دیا کرتی تھی۔

ڈوپٹہ پھر سے درست کر کے 'بال سمیٹ کے ڈھیلے کیچو میں جکڑے اور چپل اڑس کر باتھ روم کی طرف چلتی معاً "پلٹ آئی۔

"ابھی کوئی پھر سے اٹھانے آجائے گا اور عمیر یہاں سو رہے ہیں۔" اس میں سوئے ہوئے عمیر کو جگانے کی ہمت تبھی نہیں تھی۔ تھوڑی دیر کشمکش میں گھرے رہتے ہوئے اس نے عمیر کو دو' تین آوازیں بھی دیں۔ اس کی آواز پست تھی یا وہ بے خبر سو رہا تھا۔ ساری ہمت مجتمع کر کے اس کے ہولے سے کندھا ہلا دیا۔ دوسری بار پہ ہی وہ اٹھ گیا۔

"ہوں ہک۔۔۔ کیا ہے؟" مدہوش آنکھوں میں رت جگے کی سرخی تھی۔

"کوئی باہر بلانے آیا تھا' آپ ادھر اٹھ کے بیڈ پہ آجائیں' یونہی سب۔۔۔" وہ یکدم سرخ چہرہ لیے خاموش ہو گئی۔ دوسروں کے تجسس کا خوف اس کے چہرے پہ عمیر نے محسوس کر لیا تھا۔ چادر اور تکیہ اٹھائے بیڈ پہ آگیا۔ وہ ابھی منہ دھو رہی تھی کہ دوبارہ دروازہ بجنے لگا۔ جلدی سے تین' چار پانی کے چھپاکے مار کر اس نے باہر آکر دروازہ ان لاک کیا۔ عمیر لیٹتے ہی پھر سے سو گیا تھا۔

"شکر ہے تم اٹھ گئیں' میں تیسری بار آرہی ہوں مگر تم لوگ گہری نیند میں تھے' اسی لیے واپس مڑ گئی' چلو تم ناشتا کر لو' پھر تھوڑی دیر ریسٹ کر کے پارلر چلی جانا' اس عمیر سے کوئی پوچھے' گھر کا واحد مرد ہے اور ابھی اتنے کام ادھورے پڑے ہیں۔"

ماریہ نے مسکرا کر سارا شیڈول بیان کر کے عمیر پہ تاسف سے سر ہلایا۔ وہ بھی اس گھر کی بیٹی اور واحد عورت تھی۔ اس پہ بھی بہت ذمہ داریاں تھی۔ پھر اس کا اکلوتا بھائی تھا۔ سارے ارمان اسی پہ پورے کرنے تھے۔

"ماشاء اللہ بہت پیاری لگ رہی ہو' کسی کی نظر نہ لگ جائے میری بھابھی کو۔" اس نے اپنے دوپٹے کے پلو سے عائلہ کے چہرے پہ پانی کے ننھے قطروں کو صاف کیا۔ وہ جو حسن (اپنے بھائی) اور دادی اماں کا پوچھنے والی تھی اس کی اس محبت بھری حرکت پر شرمندہ ہو گئی۔

"عمیر کیسا لگا تمہیں' اچھا ہے نا' صورت میں اور سیرت میں بھی' میں ایسے ہی اپنے لاڈلے بھائی کی تعریف نہیں کرتی' دنیا بھر کے مردوں سے اچھا ہے۔" وہ واقعی اپنے بھائی سے بہت محبت کرتی تھی۔ اس کے بارے میں بات کرتے ہوئے وہ خود ہی سوال کیے اور جواب دیے جاتی۔ ایسے میں اس کی آنکھوں میں ایک انوکھی سی چمک ہوتی' جیسے ابھی اس نے بولتے ہوئے عمیر کے ننگے پاؤں کو چادر سے ڈھانپ دیا تھا۔

پھر ماریہ نے چند ایک ادھر ادھر کے سوال کیے۔ وہ عمیر کے مسلسل شادی سے انکار پر خاصی ڈری ہوئی تھی۔ کل بھی اس نے اسے بہت سی تاکیدیں کر کے بھیجا تھا۔ اب عائلہ کا مسکرا مسکرا کر "سب اچھا ہے" کا سگنل دینے پر اس کی پریشانی کافی کم ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

زندگی میں بہت سی تبدیلیاں آگئی تھیں۔ اپنے گھر میں وہ صبح اٹھ کر ناشتا بناتی تھی۔ حسن' دادی اماں' ابو اور وہ مل کر ناشتا کرتے۔ حسن آفس کے لیے اور وہ خود اسکول کے لیے نکل جاتی۔ دوپہر کو کھانا بنانا' شام میں ٹیوشن پڑھانا' رات کو حسن کا انتظار اور سب نے مل کر کھانا کھانا روز کا معمول تھا۔

عائلہ معذور بچوں کے اسکول میں ٹیچر تھی۔ ماریہ کا شوہر شمعون احمد اس اسکول کو ڈونیشن دیا کرتا تھا۔ ان دنوں اسکول میں اینول چیریٹی شو تھا۔ جس میں شمعون اور مسز شمعون احمد کو اسپیشلی مدعو کیا گیا تھا۔ ماریہ پہلی بار آئی تھی۔ میڈیم کے حکم کے مطابق عائلہ نے اسے پورے اسکول کا وزٹ کروایا۔ تبھی ماریہ کو یہ معصوم سی لڑکی' آہستہ سے ہنسنے والی اور ٹھہر ٹھہر کر بولنے والی بہت پسند آئی تھی۔ اس نے پہلی ملاقات میں اسے اپنے اکلوتے بھائی کے لیے فائنل کر لیا تھا۔ عمیر رضا کا ماریہ کے سوا کوئی قریبی رشتہ نہیں تھا۔ ان کی والدہ کی وفات دس سال اور والد کی تین سال قبل ہوئی تھی۔ ماریہ کی شادی کو سوا سال ہو گیا تھا۔ تب سے اسے بھائی کی فکر دامن گیر رہنے لگی تھی مگر وہ ٹال جاتا۔ اب کے اس نے شمعون کو اپنے ساتھ لگا کے اس بیڑے کو پار لگا ہی دیا تھا۔

شادی کے چوتھے روز ہی عمیر آفس چلا گیا۔ اس کے دل میں آیا کہ وہ اسے جانے سے روک لے۔ پھر عمیر کا رویہ اسے چپ کروا گیا۔ وہ کافی ریزروڈ اور کسی حد تک الگ تھلگ اور خاموش سا رہتا۔ کسی سے بھی بات کرتے ہوئے اس کا لہجہ نرم ہوتا وقتاً "فوقتاً" وہ مسکراتا بھی تھا۔ بظاہر ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ شاید اس کی پہلی گفتگو کا اثر تھا کہ وہ اسے کسی اور ہی زاویے سے پرکھنے لگی تھی۔ کبھی وہ خود کو سمجھاتی "عمیر بہت اچھے ہیں میں یونہی وہم پال رہی ہوں۔"

وہ اپنی نئی نویلی دلہن کے لیے بے تاب نہیں رہتا تھا' اس کے ہونٹوں پہ شوخ فقرے یا تعریف کے دو لفظ نہیں آتے تھے۔ اسے کوئی خاص پروٹوکول نہیں دے رہا تھا۔ ایسی ہی کئی ملا کے سوچیں اس کی پریشانی کا باعث بن رہی تھیں۔

ماریہ نے بھی صرف دو بار چکر لگایا تھا۔ ان دونوں میاں بیوی میں مثالی محبت تھی۔ شمعون چاہے دو روز کے لیے آؤٹ آف سٹی جاتے' ماریہ کو ضرور لے جاتے۔ اب بھی وہ کئی دن سے اس کے ساتھ بزنس ٹور پہ تھی۔ یہاں پر ہوتی تب بھی چار' پانچ گھنٹوں کے لیے ہی آتی۔ گھر میں دو مستقل نوکر اسماعیل اور اس کی بیوی گل بانو تھے' وہ ان کا بھی لمبا چوڑا انٹرویو لے چکی تھی۔ اب ان کے بارے میں جاننے کے لیے کچھ خاص نہیں بچا تھا۔ اس نے ماریہ سے فون پہ اپنی تنہائی کی شکایت کی۔

"عائلہ یہ اب تمہارا گھر ہے' گھر کے کاموں میں دلچسپی لو' عرصہ سے اس گھر کو ایک عورت کی ضرورت تھی' اب تم آگئی ہو نا' پورے استحقاق کے ساتھ اس کی حفاظت کرو' نئے سرے سے ڈیکوریشن' شاپنگ' ایسے چھوٹے موٹے کام' تمہیں تنہائی کا بالکل احساس نہیں ہو گا۔ میری جب سے شادی ہوئی ہے صرف ایک رات ٹھہرنے دیا ہے شمعون نے' وہ بھی عمیر

کی طبیعت ناساز تھی۔"

ماریہ نے اسے پیار سے سمجھا کے مفید مشورے بھی دیے۔ بھائی بھابھی سے اس کا میکا تھا۔ اگلے روز عمیر کو آفس بھیج کر گل بانو کے ساتھ پورے گھر کا تفصیلی جائزہ لیا۔ واقعی میں بہت ساری جگہوں پہ بے ترتیبی تھی۔ جو ایک دن میں سمیٹنا مشکل تھی۔ اس نے صفائی کا آغاز اپنے بیڈ روم سے کیا۔

"گل بانو یہ بائیں سائیڈ دیوار والی چیئرز یہاں سے ہٹا کر ٹی وی لاؤنج کے سامنے خالی دیوار کے ساتھ رکھ دیتے ہیں۔ جب صوفہ ہے تو چیئرز کی کیا تک بنتی ہے اور یہ لیپ ٹاپ فائلوں والی ٹیبل اور میوزک سسٹم ادھر سوئچ بورڈ کے پاس ٹھیک رہے گا' سارے کمرے میں تاریں ہی تاریں بکھری پڑی ہیں' ڈریسنگ ٹیبل ادھر سے ہٹا کر چیئرز والی جگہ پہ سیٹ ہو جائے گا۔" اس نے بڑی باریک بنی سے سارا معائنہ کر ڈالا تھا۔

"اس طرح کمرہ بھی کھلا کھلا سا لگے گا بی بی جی۔" گل بانو نے بھی اپنی رائے دی تھی۔

"اور ہاں گل بانو یہ پرانے ڈیکوریشن پیسز یہاں سے ہٹا دو' میں بازار سے نئی خریداری کروں گی۔" اس نے تنقیدی نگاہوں سے سارے شو پیسوں کو جائزہ لیا۔

"آپ کو پتا ہے جب ماریہ بی بی ہوتی تھیں تو وہ اور صاحب جی چھٹی والے روز گھر کی سیٹنگ بدل دیا کرتے تھے۔ وہ ان کاموں کے بہت شوقین ہیں سجے سنورے گھر کے' جب سے ماریہ بی بی گئی ہیں کسی چیز کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔" گل بانو پرانی ملازمہ تھی۔

"چلو اب ہم جو آ گئے ہیں' ویسے عمیر کو یہ سب پسند آئے گا نا۔" اس کے بتانے کے باوجود بے یقین ہوئی تھی۔

"کیوں نہیں پسند آئے گا جی' آپ اتنی محبت سے سب کر رہی ہیں' مجھے یہ سب کہاں کرنا آتا ہے' ایک دفعہ تھوڑا سامان ادھر ادھر کیا تھا یہ کام کرنے والیاں اوپر اوپر سے جھاڑ پونچھ کر جاتی ہیں' ہم خود ملازم ہیں انہیں کیسے ٹوکیں۔" اس نے اپنی کم عقلی کا اعتراف کرتے کام کرنے والیوں کی نااہلی کا بھی رونا رویا۔ پھر وہ شروع ہوئی تو شام تک اس نے خاصا کام نبٹا لیا تھا۔

پردے' کشن اور صوفوں کے کورز' بیڈ شیٹس وغیرہ سے لے کر ٹی وی لاؤنج اور کسی حد تک کچن کی بے ترتیبی بھی سمیٹ ڈالی۔ ہر طرف نفاست سی جھلکنے لگی۔ باقی کا کام کل پہ چھوڑ کے وہ نہانے چلی گئی۔ عمیر کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔

گھر میں قدم دھرتے ہی اسے تبدیلی کا احساس ہوا مگر اس نے زیادہ توجہ نہ دی۔ چینج کرنے کے لیے بیڈ روم میں آتے ہی اس تبدیلی کو واضح انداز میں دیکھ بھی لیا نا صرف سیٹنگ بلکہ ہر چیز اپنی جگہ پر بہت صاف ستھری لگ رہی تھی۔ اسے خوش کن حیرت ہو رہی تھی۔ عمیر کو اس کا یہ سب کرنا اچھا لگا تھا۔ بہت اپنائیت کا احساس ہونے لگا تھا۔

"کھانا تم نے بنایا ہے؟" پہلا ذائقے دار لقمہ نگلتے ہی اس نے پوچھا۔ یہ گل بانو کے ہاتھ کا بنا ذائقہ نہیں دوسرا اس کے سوا بھلا کون تھا۔

"کیا ہوا' ٹھیک نہیں بنا۔" اس کے پوچھنے پر وہ گھبرا گئی۔

"نہیں' کھانا واقعی بہت لذیذ بنا ہے' گھر کا یہ چینج بھی سب کچھ اپنا اپنا سا لگ رہا ہے' تھینکس فار آل دس۔" اس نے کھانے سے ہاتھ روک کے اس کی محنت کا صلہ اپنے الفاظ کی صورت میں دے دیا تھا۔ جن کی وہ منتظر رہتی تھی۔

"آپ کو واقعی سب بہت اچھا لگ رہا ہے۔" عمیر کی تعریف نے اس پہ شادی مرگ کی کیفیت طاری کر دی تھی۔

"ہاں' آپ کی ایفرٹ اور ایفی شینسی سراہے جانے کے قابل ہے' ماریہ سچ کہتی تھی کہ اس گھر کو ایک عورت کی ضرورت ہے' جو اس پہ بھرپور توجہ دے سکے۔" اس نے اپنے تاثرات بلاوجہ چھپائے نہیں تھے۔ اس نے اتنی محنت کی تھی۔ وہ سراہے جانے کی حق دار بنتی تھی۔

رات کو ــــــ آخری کام اسے کافی کا مگ دے کر بیڈ پہ آ کر لیٹ گئی۔ عمیر کی عادت تھی کہ وہ کافی کا مگ

پی کر سوتا تھا ورنہ اسے نیند نہیں آتی تھی۔ اس عجیب و غریب عادت کا بھی گل بانو نے بتایا تھا۔

تکیہ سر کے نیچے درست کر کے وہ آڑی ترچھی لیٹ گئی۔ اسے ہوش نہ رہا وہ نیند کی آغوش میں اتر گئی۔

سوا بارہ کے قریب اس نے فائلیں بند کر کے سائیڈ پہ رکھ دیں۔ لیپ ٹاپ بند کر کے پیچھے رخ موڑ کے دیکھا تو اسے سویا ہوا پایا۔ یہ تھکاوٹ کا اثر تھا۔ ورنہ جب تک وہ اپنا کام ختم کر کے بیڈ کے دوسرے کونے پہ نہ آ جاتا وہ بھی جاگتی رہتی۔ عمیر کے ٹوکنے پر اس نے آہستگی سے کہا تھا۔

"حسن بھی جب تک گھر نہیں آتے تھے' مجھے نیند نہیں آتی تھی۔ میری عادت ہے' آپ فکر نہ کریں' اور بھلا اتنی جلدی نیند بھی کہاں آتی ہے۔" وہ سہولت سے اس کے اعتراض کو ٹال گئی تھی۔ اس نے بھی دوبارہ منع نہیں کیا۔ اب وہ کوشش کرتا کہ جلدی کام ختم ہو جائے اسے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے۔ کرسی کو بغیر آواز پیدا کیے پیچھے کھسکا کے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ بیڈ کے کونے سے چادر اٹھا کے اس پر اچھی طرح ڈال دی۔ فل کولنگ کرتے اے سی کا ٹمپریچر کم کیا اور سائیڈ دراز سے سگریٹ پیکٹ اور لائٹر نکال کر حسب معمول ٹیرس پہ آ گیا۔

☼ ☼ ☼
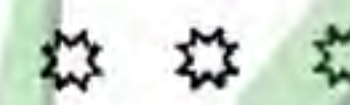
"کوئی آ رہا ہے کیا؟" اسے سر شام ہی کچن میں مصروف دیکھ کر اس نے استفسار کیا تھا۔

"ماریہ کا فون آیا تھا' وہ رات ہی انگلینڈ سے لوٹی ہے وہ اور شمعون ڈنر پہ آ رہے ہیں۔" اس نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔

ویک اینڈ تھا وہ صبح سے نکلا اب لوٹا تھا۔ اسی لیے ماریہ کے فون کی بھی خبر نہیں تھی۔

"گڈ نیوز' ایک مہینہ ہو گیا ہے اپنی بہن سے ملے ہوئے۔" وہ اس کے آنے کا سن کر خاصا خوش ہو گیا۔

"ہاں ماریہ کے لیے مٹن بریانی اور میٹھے میں فیرنی ضرور بنا لینا' اسے بہت پسند ہے' شمعون کے لیے چکن کے ساتھ چپاتیاں بنانا کیونکہ وہ مٹن اور چاول وغیرہ شوق سے نہیں کھاتا' رشین سلاد اور زیرے والا رائتہ' باقی چائنیز کے لیے میں آرڈر بک کروا دیتا ہوں۔" ریفریجریٹر سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر اس نے لمبی ہدایات دیں۔

"جو آپ کو پسند ہے اس کی لسٹ بھی بتا دیں' یہ سب کر کے جو ڈھیر سارا وقت بچے گا آپ کی رغبت اور شوق کے نذر کر دوں گی۔" وہ چیخ کر بولی۔ ماریہ کی آمد پہ وہ یونہی خوشی سے بے حال ہوتے نان اسٹاپ بولا کرتا تھا۔ ورنہ عام روٹین میں لفظوں کی گنتی جاری رہتی تھی۔

وہ اس کے ارد گرد منڈلاتی رہتی کہ شاید وہ مجھ پہ توجہ دے' قریب بٹھا کے کوئی بات' یا دیا پریشانی شیئر کر لے مگر یہ اس کی خواہش ہی تھی۔

"میں نے کبھی کوئی فرمائش نہیں کی' ہمارا کیا ہے؟ سلاد کھا کر بھی گزارا کر لیں گے۔" گھونٹ گھونٹ پانی پیتے وہ مسکرا رہا تھا۔ اس نے بیوی کے تیوروں کا نوٹس نہیں لیا تھا۔

"آپ باہر چلے جائیں' یہاں بہت گرمی ہے' اتنے سارے کام باقی ہیں' تھوڑی دیر میں وہ لوگ آ جائیں گے۔" بلاوجہ آنکھوں میں آنے والی نمی کو چھپانے کے لیے اس پلیٹ میں ٹماٹر کاٹنے شروع کر دیے۔ عمیر نے فوراً محسوس کر لیا۔ بغیر کچھ کہے شیلف پہ گلاس دھر کے باہر چلا گیا۔

آٹھ بجے کے قریب وہ لوگ آ گئے تھے۔ وہ کچن میں آخری مراحل میں کام نبٹا رہی تھی۔ ایک نظر اپنے حلیے پہ ڈال کر گل بانو کو باقی کاموں کی ہدایات کرتی وہ کمرے کی طرف بھاگی۔

"سچ ماریہ' تم انگلینڈ میں رہ کر اتنی زیادہ خوب صورت ہو گئی ہو' پہلے والی تو کہیں سے لگ ہی نہیں رہیں' وہاں کی آب و ہوا بہت راس آئی ہے تمہیں' نکھری نکھری کیوٹ۔" وہ ماریہ کا ہاتھ پکڑے کہہ رہی تھی۔ جو خوش دلی سے مسکراتے ہوئے اس کے

تبصرے سن رہی تھی۔

"ہر کوئی یہی کمنٹس دے رہا ہے' ویسے شمعون کے بارے میں کیا خیال ہے؟ وہ بھی بہت ہینڈسم ہو گئے ہیں نا۔" ماریہ نے ابرو سے دوسری طرف اشارہ کیا۔

"مجھے تو شکل سے زیادہ ان کے مزاج رنگین لگ رہے ہیں' ہنس مکھ سے بلاوجہ قہقہے لگاتے۔" اس نے بھی عمیر کے ساتھ باتوں میں معروف شمعون کو دیکھ کر کہا۔ عمیر بھی خلاف معمول خاصا خوش مزاج ہو رہا تھا۔

"ان کی کچھ نہ پوچھو' وہاں سے آنے پہ راضی نہیں ہو رہے تھے موصوف' بزنس ٹور صرف آٹھ روز کا تھا' باقی کے بائیس دن یونہی گھومتے پھرتے رہے' ان کا دل پھر بھی نہیں بھر رہا تھا مگر میں کافی اداس ہو گئی تھی۔ بہت مشکلوں سے واپسی کے لیے راضی کیا۔" اس نے کنگ کیے ہوئے چھوٹے بالوں کو کان کے پیچھے اڑستے دیر سے آنے کی وجہ بتائی۔

"بٹ عائلہ تم بہت چینج ہو گئی ہو' شادی سے پہلے والی میں اور اب میں بہت فرق ہے۔ میں نے فیل کیا تھا مگر اپنا وہم سمجھ کر ٹال گئی۔ یہی سوچا اگر کوئی پرابلم ہوتی چلو تم نہ سہی' عمیر تو ضرور ڈسکس کرتا۔۔۔۔ بظاہر اب بھی کچھ خاص نہیں مگر نہ جانے کیوں؟ میرا شعور کہتا ہے کچھ ہے' عمیر سے جھگڑا چل رہا ہے۔" جیسا اس نے ماریہ کا جائزہ لیا تھا۔ ویسا اس نے بھی زیرک نظری کا مظاہرہ کر دیا تھا۔ وہ سٹپٹا سی گئی۔ ماریہ نے غلط وقت پر حملہ کر دیا تھا۔

"نہیں۔۔۔ ایسا کچھ بھی نہیں' جھگڑا کیوں ہو گا بھلا؟ تم اپنے بھائی کی جتنی تعریفیں کرتی تھیں اس سے بھی بڑھ کر ہیں۔ دراصل وہ شام کو لوٹتے ہیں اور میں پیچھے اکیلی' میں نے گھر کے کافی کام سنبھال رکھے ہیں پھر بھی تنہائی بہت فیل ہوتی ہے' ورنہ وہ بے چارے تو مجھے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں' مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں۔" اس قدر تفصیل سے جواب دیتے ہوئے اس نے شاید اس سے زیادہ خود کو مطمئن کیا تھا۔

"تنہائی کیسی' اپنا گھر اور شوہر ہے' بلاوجہ ٹینشن مت لیا کرو' اپنے میکے چلی جایا کرو' کبھی میری طرف چکر لگا لیا کرو اگر پھر بھی بوریت دور نہ ہو تو عمیر کو وجہ بے وجہ کال اور ایس ایم ایس کر کے تنگ کر لیا کرو' میں بھی یہی حربہ آزماتی ہوں' یہ اور بات ہے کہ شمعون میری اس حرکت سے بہت چڑتے ہیں' ان تمام نصیحتوں کے باوجود بھی کام نہ بنے تو عمیر سے کہو کہ وہ کوئی "اسپیشل" بندوبست کرے' سچی مجھے پھوپھو بننے کی بڑی خواہش ہے۔" اس نے اپنے تئیں مفید مشورے دیتے رخ کس طرف موڑ دیا تھا؟

"یہ اپنا قیمتی شوق خود اماں بن کر پورا کر لو' ہمارا ابھی ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" اس کا مطلب سمجھ کر اس نے بے دلی سے مسکرا کر جواب دیا اور کھانا لگانے اٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو۔" بہت ہی کوفت زدہ ہیلو تھی۔ کب سے بیل ہو رہی تھی۔ گل بانو نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ اسے بیڈ شیٹ چھوڑ کر آنا پڑا۔

"عائلہ! میں بول رہی ہوں۔" اسے ماریہ کی پُرجوش۔۔۔ آواز سنائی دی۔

"ہائے ماریہ کیسی ہو؟" ایک لحہ میں ساری کوفت اڑنچھو ہو گئی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں' تم اپنی اور عمیر کی سناؤ۔"

"ہم دونوں بھی بہتر ہیں' وہ تھوڑی دیر ہوئی آفس کے لیے نکل گئے ہیں۔" وہ سیٹ گود میں رکھے قریبی صوفے پہ بیٹھ گئی۔

"اچھا تم لوگ ہمارے ہاں رات ڈنر پر انوائٹ ہو۔"

"ابھی دو روز قبل تم گئی ہو اور اب ہم آئیں' سب خیریت ہے نا؟" اسے اچنبھا ہوا تھا۔ ماریہ آٹھ دس روز میں چکر لگایا کرتی تھی۔ خود وہ دو تین بار ہی صرف اس کی طرف گئی تھی۔

"سب خیریت ہے میڈم' بس تمہارا منہ میٹھا کروانا ہے۔" اس کا قہقہہ بہت جان دار تھا۔

"کس خوشی میں منہ میٹھا کرواؤ گی۔" وہ اس گفتگو سے الجھ رہی تھی۔

"یاد ہے تم نے پرسوں کہا تھا یہ اپنا قیمتی شوق تم خود اماں بن کر پورا کر لو' انہی الفاظ کی قبولیت کی خوشی میں مٹھائی کھلاؤں گی۔" وہ چہک رہی تھی۔

"کک' کیا' سچ ماریہ' تم ماں بننے والی ہو۔" اس کی آواز بھی خوشی سے کپکپانے لگی تھی۔

"آف کورس یار' ابھی ہماری فیملی ڈاکٹر کی کال آئی تھی' میری رپورٹس پوزیٹو ہیں' تم ہماری خوشی کا اندازہ نہیں کر سکتیں۔" خوشی کا اندازہ اس کے لہجے کی کھنک سے ہو رہا تھا۔

"بہت' بہت مبارک ہو' اللہ تم دونوں کو سدا یونہی رکھے۔" آنکھ کے کونے سے انگلی سے آنسو صاف کرتے اس نے سچے دل سے دعا دی تھی۔ اسے اپنی نند سے بہت انسیت تھی۔ وہ بھی اس کا بہت چاؤ کرتی تھی۔

"میں شمعون کو منع کر رہی ہوں' وہ میری ایک نہیں سن رہے' نہ جانے کس کس کو فون کر رہے ہیں' رات کو گرینڈ ڈنر بھی ارینج کر لیا۔" اس کے شکایتی انداز میں بھی شوہر کے لیے محبت کی آمیزش تھی۔

"تمہیں کیا؟ اپا جان کو یہ خوشی اپنی مرضی سے سیلیبریٹ کرنے دو۔ اور سنو اپنا خیال رکھنا' شام کے ارینجمنٹ میں نہ لگ جانا۔" اس نے محبت بھری ہدایت بھی جاری کر دی۔

"ارے کہاں' میں ناشتا تیار کر رہی تھی جب ڈاکٹر کی کال انہوں نے ریسو کی۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کر ڈالتے' تب سے مجھے بیڈ پر بٹھایا ہے باقی کا ناشتا بھی خود ہی بنایا' اب فون پہ لوگوں کے کان کھا رہے ہیں' دیکھنا شام کو ایسا لگے گا جیسے آنے والے بچے کی خوشی نہیں بلکہ عقیقہ ہو رہا ہے۔" اس سچویشن پر دونوں نے قہقہہ لگایا تھا۔

"اچھا شمعون مجھے بلا رہے ہیں' تم لوگ ٹائم پہ آ جانا' میں فون رکھتی ہوں۔" اس نے کھٹ سے فون بند کر دیا۔ وہ بھی ریسیور کریڈل پہ ڈال کر یونہی بیٹھی رہی۔

شام عمیر کی واپسی ہوئی تو وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ بریف کیس اور کوٹ ایک طرف رکھ کے وہ ڈھیلا ڈھیلا سا صوفے میں دھنس گیا۔ وہ اس کا انداز دیکھ کے جلدی سے پانی لینے چلی گئی۔

"بہت تھک گئے ہیں۔" اسے پانی کا گلاس پکڑاتے ہوئے اس نے پوچھ لیا۔

"نہیں دو میٹنگز تھیں' بے زار ہو گیا ہوں' تھکا نہیں ہوں' پتا نہیں کہاں سے یہ اسٹوپڈ لوگ اٹھ کے جاتے ہیں' بزنس کی الف' بے سے بھی واقفیت نہیں ہوتی' سارا دماغ چاٹ لیا' پلے پھر بھی کچھ نہیں پڑا' وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔" ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر کے اس نے گھونٹ گھونٹ پانی پیا۔ وہ عام روٹین میں یوں اپنے آفس کے معاملات ڈسکس نہیں کرتا تھا۔ بے زاری یا حد سے بڑھی ہوئی کوفت کہ وہ اپنی بھڑاس نکالنے لگا تھا۔ وہ چپ چاپ اسے سنے گئی۔

"چائے بناؤں۔" اس کے خاموش ہو جانے پہ اس نے کوٹ اور بریف کیس اٹھا لیا۔

"ہاں اور کباب بھی فرائی کر لینا۔" وہ شام میں صرف چائے کا عادی تھا۔

وہ کچن میں گئی تو وہ بھی اٹھ کے شاور لینے چل دیا۔ نہا کر وہ تازہ دم ہو گیا تھا۔ ایک ہاتھ سر کے پیچھے رکھے' بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بڑے پرسکون انداز میں آنکھیں موندے ہوئے تھا۔

"چائے۔" اس کی آہٹ وہ محسوس نہیں کر پایا تھا۔ اسے آواز دینا پڑی۔

"ادھر ہی رکھ دو' صبح سے یہی اندر انڈیل رہا ہوں' دوپہر کو بھوک بھی نہیں لگی۔" اس کے ٹرے رکھتے پہ اس نے ذرا اپنی طرف کھسکائی۔

"اگر آپ نے کھانا کھانا ہے تو میں لگا دیتی ہوں۔" وہ بھی قریب بیٹھ گئی۔ وہ زیادہ تر شام کی چائے لاؤنج یا

لان میں پیتے تھے۔

"نہیں' اب رات کو کھاؤں گا۔" اس نے کپ اٹھا کر عائلہ کی طرف بڑھایا۔ وہ خالی چائے کے چھوٹے گھونٹ بھرتے ہوئے اسے غور سے دیکھتی رہی۔ جو مکمل اپنی پلیٹ پہ جھکا تھا۔ گیلے بالوں کو انگلیاں پھیر کر سلجھا لیا تھا' آنکھوں میں ہلکی ہلکی سرخی اور پیشانی پہ متفکر سی چند لکیریں' یہ شخص دل کے بہت قریب محسوس ہونے لگا تھا۔ آخر اس کا مجازی خدا بھی تھا۔ ایسی پہیلی جو سلجھتی ہی نہیں تھا۔ وہ لاکھ چاہتی منفی سوچوں کو اپنے ذہن سے جھٹک دے مگر ایسا کرنہ پاتی وہ خاموش طبع تھا لیکن اسے اس کے انداز میں اپنے لیے گریز نظر آتا۔ وہ کبھی اس سے اس کے بارے میں یا معمول کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں دلچسپی نہ لیتا' اپنے کام سے کام یا پھر ضرورت کی بات' جب ماریہ آجاتی یا وہ اپنے کسی دوست سے فون پہ بات چیت کر رہا ہوتا تو اس کی زبان رکنے میں نہ آتی۔ وہ مسلسل بولے چلا جاتا۔ مسکراتا' قہقہہ لگاتا۔ یہ نظراندازی خاص اس کے لیے تھی۔

"ماریہ کی کال آئی تھی۔" کباب کی پلیٹ آدھی سے زیادہ خالی ہو چکی تھی۔

"اچھا کیا کہہ رہی تھی' خیریت سے ہے۔" اس نے لمحہ بھر کے لیے ہاتھ روکا تھا۔

"بالکل خیریت سے ہے' رات کو ڈنر پہ انوائٹ کیا ہے۔" وہ اپنی ٹھنڈی ہوتی چائے کے سپ لینے لگی۔

"ڈنر پہ کیوں؟ ابھی وہ پرسوں ہی ہو کر گئی ہے۔" اس نے خالی کپ ٹرے میں رکھ کے ٹشو سے ہاتھ صاف کیے۔ اسے بہن کی آمد کا انتظار رہتا تھا مگر خود وہ کبھی کبھار ہی اس کی طرف چکر لگاتا تھا۔ اسے زیادہ جانا پسند نہیں تھا۔

"کوئی سرپرائز ہے' جائیں گے تو بتائے گی۔" ماریہ کی خوشخبری کی اطلاع دینے کی ہمت نہیں تھی۔ اپنے اور اس کے درمیان رشتے کی نوعیت کا احساس آڑے آگیا تھا۔ وہ اس کا شوہر سہی مگر کبھی اس انداز کی گفتگو حتی کہ ذرا سا رومانٹک جملہ تک اس کے لیے نہ بولا تھا۔ وہ اس کو بے تکلفی سے یہ نہیں بتا سکتی تھی۔

"میں تھوڑی دیر ریسٹ کرلوں' تم تیاری کرلینا۔" اس نے بھی زیادہ کھوج نہیں لگائی۔ اس کے ٹرے اٹھاتے ہی سیدھا ہو کر لیٹ گیا۔

✡ ✡ ✡

دروازے پر مسلسل دستک نے اس کی نیند توڑ دی تھی۔ مندی مندی آنکھیں کھول کر دائیں طرف سوئے عمیر کو دیکھا اور پھر دوسری نظر وال کلاک کو' جو رات کے ڈیڑھ بجا رہا تھا۔ کسلمندی سے اٹھتے دروازہ کھول دیا۔

"وہ بی بی جی' عمیر صاحب کے کچھ دوست آئے ہیں' میں نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے' وہ صاحب جی کو بلا رہے ہیں۔" دروازے پہ اسماعیل کھڑا تھا۔

"کون سے دوست ہیں اسماعیل' جو یوں بے ٹائم آگئے ہیں۔" اس اطلاع کو حیرانی سے سنتے اس کی پوری آنکھیں کھل گئی تھیں۔

"وہ اکثر آتے رہتے ہیں' صاحب کے پرانے جاننے والے ہیں' ابھی وہ یہاں سے اسلام آباد چلے گئے ہیں۔" وہ پرانا ملازم تھا۔ اسے آنے جانے والوں کی پہچان تھی۔

"اچھا تم جاؤ' میں عمیر کو جگاتی ہوں۔" وہ سخت جھنجلا گئی تھی۔ وہ سرہانا تالمٹ گیا۔

آج شہر بھر میں ہڑتال تھی۔ وہ بارہ بجے کے قریب ہی لوٹ آیا تھا۔ ساری شام فائلوں میں سر دیے رہا اور جلد ہی سونے کے لیے لیٹ گیا۔ اب عائلہ کو اس کے دوستوں کی آمد کی وجہ سے اسے اٹھانا پڑ رہا تھا۔ وہ بھی اس خبر پر پریشان سا وقت دیکھتا ڈرائنگ روم میں چلا آیا۔

"السلام علیکم مسٹر عمیر رضا' معذرت خواہ ہیں اتنی رات گئے آپ کو ڈسٹرب کرنے پر۔" وہ تینوں مودبانہ کھڑے ہوگئے۔

"وعلیکم السلام' اتنا مہذب بننے کی قطعی ضرورت نہیں کیونکہ اب میں ڈسٹرب ہو ہی چکا ہوں اور ایسا تم لوگ فرسٹ ٹائم نہیں کر رہے۔" خوش مزاجی سے طنز کرتے اس نے تینوں کو باری باری گلے لگایا۔

"سچ کہہ رہا ہوں یار' آج ہم نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا' بس قسمت ہمیں تمہارے در پہ کھینچ لائی۔" راشد نے اپنے ہیرو والے لہجے میں ڈائیلاگ بولا تھا۔

"چلو اس بار قسمت پہ ٹال دیتے ہیں اگلی بار احتیاط کرنا' ویسے قسمت ایسا تم لوگوں کے ساتھ مہینے میں تین چار بار کرتی ہے۔" عمیر نے راشد کو چھیڑتے قہقہہ لگایا۔

"لو بھلا پچھلے چار ماہ سے احتیاط ہی برت رہے تھے اگر اتنی احتیاط کافی نہیں تو اگلی بار چار سال بعد چکر لگائیں گے' تم شادی کے بعد صرف پرائے ہی نہیں توتا چشم بھی ہوگئے ہو' ہم جب بھی لاہور آتے ہیں ملے بغیر ہی لوٹ جاتے ہیں۔" آذر نے خاصا برا سا منہ بنا کر وضاحت پیش کی۔

"ضرور آیا کرو یار' یہ اب بھی تم لوگوں کا گھر ہے اور میری شادی کا ہماری دوستی سے کوئی تعلق نہیں۔" اس نے آذر کے کندھے کے گرد بازو لپیٹ کر اس کا موڈ ٹھیک کرنا چاہا۔

"یہ کیا کولڈ ڈرنک' ہمیں نہیں پینی' صبح سے چائے پی پی کر جل گئے ہیں اور اب یہ کولڈ ڈرنک تم جلدی سے کھانے کا بندوبست کرواؤ' ہڑتال نے تو ہمارا بیڑہ غرق کر دیا' میٹنگز بھی کینسل ہوگئیں' دن بھر خوار ہوتے رہے' کوئی ریسٹورنٹ بھی نہیں کھلا تھا۔" اسماعیل کے کولڈ ڈرنک لانے پر خاموش بیٹھا سعد چلا اٹھا تھا۔

"یار قسم سے میں نے اس فیض فیبرکس والے کو نہیں چھوڑنا' کل سے ہڑتال کی کال تھی تو اسے ہمیں رات کو بتانا چاہیے تھا' جب ہم لاہور کی حدود میں داخل ہوگئے' تب انفارم کر رہا ہے۔" آذر نے ہوا میں اچھالا۔

"تم لوگ کولڈ ڈرنک پیو میں کھانے کا آرڈر دے کر آتا ہوں۔" انہیں باتیں کرتا چھوڑ کے وہ کچن میں چلا آیا۔ فریج کھولا اس میں دو تین بچے ہوئے سالن پڑے تھے۔ یہ وہ انہیں نہیں کھلا سکتا تھا۔ عائلہ ہفتے بھر کا کھانا بنا کر فریز نہیں کرتی تھی۔ عمیر کو بھی تازہ پکا پسند تھا۔ پھر وہ دو ہی لوگ تھے۔ رات کے اس پہر وہ بازار بھی نہیں جا سکتا تھا۔

وہ آنکھوں پہ بازو رکھے لیٹی تھی کہ عمیر چلا آیا۔

"سو رہی ہو۔" اس نے بہت آہستگی سے پوچھا تھا۔

"نہیں تو' کچھ کام تھا۔" وہ جلدی سے بازو ہٹا کے اٹھ بیٹھی۔

"ہاں میں کھانے کا کہنے آیا تھا' ہڑتال کی وجہ سے وہ لوگ اسلام آباد واپس نہیں جا سکتے میرے بہت اچھے فرینڈز ہیں۔ صرف ایک سالن کی ڈش' بہت بھوک لگی ہے ذرا جلدی' تمہیں زحمت تو ہوگی۔"

"نہیں زحمت کیسی' میں بنا دیتی ہوں۔" وہ چپل اڑس کر اس کے ساتھ باہر آگئی۔

"میں اسماعیل سے کہتا ہوں گل بانو کو بھیج دے وہ تمہارا ہاتھ بٹا دے گی۔" اس کی سعادت مندی کے پیش نظر اسے بھی احساس ہوا تھا۔

"نہیں رہنے دیں گل بانو کے بیٹے کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی' میں نے شام کو بھی اسے جلدی فارغ کر دیا تھا۔ آپ فکر نہ کریں میں کرلوں گی۔"

گل بانو اور اسماعیل کا ایک ہی بیٹا تھا۔ جو بڑی منتوں مرادوں سے پیدا ہوا تھا۔ آج اس کی طبیعت خراب تھی۔ وہ سارے گھر میں ماں کے پیچھے روتا اور چھپتا پھر رہا تھا۔ عائلہ نے اسے جلدی بھیج دیا تھا۔ پھر رات کا کھانا بنا کر اپنے اور عمیر کے لیے نکال کر باقی انیکسی میں گل بانو کو بھجوا دیا۔

تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے بھی اسے گھنٹہ بھر لگ ہی گیا تھا۔ اسماعیل نے مدد کروانے کو کہا مگر رات کے اس پہر اس کا یوں کچن میں کھڑے ہو کر کام کروانا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اسی لیے سہولت سے انکار کر دیا۔

"اسماعیل صاحب سے کہو ٹیبل لگا دی ہے۔" اس

نے کارپٹ میں بیٹھے اونگھتے ہوئے اسماعیل کو جگایا۔
اس نے زیادہ اہتمام نہیں کیا تھا۔

"بالآخر اس سب کا مقصد کیا ہے؟ فائرنگ 'احتجاج' ریلیاں' دھرنے اور نہ جانے کیا کچھ' جو کچھ کر رہے ہیں لوگ' یہ سب پر امن احتجاج کے زمرے میں تو نہیں آتا۔" وہ سب افسوس سے سر ہلاتے اسی بحث میں الجھے ہوئے تھے۔

"یہ سب کچھ ہم جیسے پر آسائش زندگی گزارنے چار کنال کی کوٹھی کے ایئر کنڈیشنڈ اور فرنشڈ روم میں بیٹھے ہوئے امیر زادوں کی سمجھ سے بالاتر ہے یہ وہ لوگ ہیں جن کے پیروں تلے سے زمین تک کھینچ لی گئی ہے

'خالی بیٹھ تم یہ سب سوچ کر مزید اپنا دماغ پلپلا نہ کرو۔" اس کے لہجے میں دکھ سا گھل گیا تھا۔ وہ بہت تاسف سے یہ سب کہہ رہا تھا۔ وہ تینوں خاموشی سے اسے سنتے رہے۔

"صاحب جی کھانا لگ گیا ہے آجائیں۔" اسماعیل دروازے میں کھڑا بول رہا تھا۔

"اتنی جلدی' ابھی تو صرف سوا گھنٹہ ہوا ہے۔"
حیران وہ تینوں ہی تھے مگر سعد کی حیرانی قابل دید تھی۔

"اسے کہتے ہیں ایفی شینسی۔" آزر نے سعد کی معلومات میں اضافہ کیا تھا اور ہال میں جانے کے لیے اٹھ گئے۔

☼ ☼ ☼

"کیا تم یونہی سارا دن کاموں میں لگی رہتی ہو' یہ کرلوں وہ کرلوں' اب یہ تھوڑا سا رہ گیا اور وہ مکمل ہو گیا۔"
ماریہ پچھلے دو روز سے آئی اس کی روٹین نوٹ کر رہی تھی۔ شمعون بزنس ٹور پہ آؤٹ آف کنٹری گئے ہوئے تھے۔ ماریہ کی حالت کے پیش نظر اب وہ اسے ہر جگہ اپنے ساتھ لے جانے سے گریز کرتا تھا۔

"شام کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے' خود کو بزی رکھنے کا بہترین مصرف ہے کام' کام اور بس کام' پھر یاد نہیں تم نے ہی سمجھایا تھا کہ گھر میں دلچسپی لو۔"

وہ ڈسٹنگ چھوڑ کے اس کے پاس آبیٹھی۔
"مگر اس قدر دلچسپی کا تو میں نے نہیں کہا تھا' میں نوٹ کر رہی ہوں تم خود پہ ذرا سی بھی توجہ نہیں دیتیں' نہ بجتی سنورتی ہو' عمیر تم سے شکوہ نہیں کرتا۔ میں ذرا سا بھی روٹین سے ہٹ جاؤں شمعون فوراً" ٹوک دیتے ہیں انہیں میرا یہ سب کرنا اچھا لگتا ہے۔" اسے بتاتے ہوئے اس نے نمکو کی پلیٹ سے چمچہ بھر کے منہ میں رکھا۔

"اب ہر کوئی تمہارے شمعون کی طرح نہیں ہوتا' مجھے سادگی اچھی لگتی ہے اور عمیر کو بھی کیونکہ اس نے بھی کبھی خاص اصرار نہیں کیا۔" دل میں اچانک اٹھنے والی ٹیس کو دباتے وہ بظاہر مسکرا رہی تھی۔ وہ بہن کے ساتھ اتنا نارمل رہتا تھا کہ وہ اس کے رویے کے بارے میں کچھ محسوس ہی نہ کرپائی تھی۔

"اوں..... ہوں میں نہیں مانتی' میری شادی کو کون سا بیس برس بیت گئے ہیں جب میں اور عمیر کہیں باہر جایا کرتے تھے۔ وہ مجھے صرف کپڑے پہننے پر مائی کہہ کر ڈانٹ دیا کرتا تھا' مجھے ہر سوٹ کے ساتھ میچنگ جوتے اور جیولری دلواتا تھا۔ اسے عورتوں کا اوور میک اپ تو نہیں مگر خود پہ ذرا توجہ دینا اچھا لگتا ہے۔" ماریہ نے فوراً" نفی میں سر ہلا کے اس کے کہے کو رد کر دیا۔ وہ اس سے اتفاق کرنے کو تیار نہیں تھی۔ عائلہ نے بھی تکا ہی چھوڑا تھا۔

"ہاں تو..... وہ..... وہ میں نے بتایا نا کہ مجھے یہ سب زیادہ پسند نہیں' عمیر جانتے ہیں اسی لیے کبھی زیادہ زور نہیں دیا' ہاں کچھ خاص ہو تو' میں تیار ہو جاتی ہوں۔" حالانکہ وہ "خاص دن" کبھی بھی نہیں ہوا تھا۔
عائلہ خاصی بوکھلا گئی تھی۔ اگر اسے عمیر کی اس عادت کا علم ہوتا تو وہ ماریہ کو یہ جوابات نہ دیتی۔ پھر بھی اس نے جلدی سے سب اپنے اوپر ڈال کر اسے بری الذمہ کر دیا۔

"ہاں وہ کبھی بھی کسی پر اپنی مرضی مسلط نہیں کرتا' لیکن تم لائٹ سا میک اپ کرلیا کرو' اس طرح اس پہ امپریشن پڑے گا۔" ماریہ نے نمکو کی پلیٹ اس کی

طرف بڑھاتے اپنے تئیں بڑا مفید مشورہ دیا۔
"یعنی تم فائدہ اور خوشی اپنے بھائی کا ہی سوچ رہی ہو' بھابھی کو نو پرافٹ' مجھے تمہارے بھائی پر امپریشن نہیں پریشر ڈالنا ہے۔" وہ دونوں ہنسنے لگی تھیں۔

"عائلہ جب ماما کی ڈیتھ ہوئی تو میں خود بخود عمیر کے لیے ماں جیسی بن گئی۔ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھنا' دیکھ بھال کرنا اور جب..... جب پاپا کی ڈیتھ ہوئی تو مجھے بھی پتا نہیں چلا اس نے کب پاپا کی جگہ سنبھال لی ویسی محبت اور شفقت' وہ میرے لیے مضبوط سائبان بن گیا' ہم دونوں نے ایک دوسرے کو بہت سنبھالا ہے' ایک دوسرے کو سہارا دیا۔ والدین کی کمی پوری کی۔ یوں تو ایک بار نہ جانے کس موڈ میں عمیر نے کہا تھا اگر میرا بیٹا ہوا نا تو میں اس کا نام زین رکھوں گا' مجھے یہ نام بہت پسند ہے' اب میں نے شمعون سے کہا تھا کہ اپنے بیٹے کا نام زین رکھوں گی مگر وہ حمزہ پہ اڑا ہوا ہے آئی وش کہ میرے بیٹے کی پرسنالٹی عمیر جیسی ہو۔"
ماں باپ کے ذکر پہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے آنکھوں کو رگڑتے ہوئے اس نے پہلی بار شمعون کے لیے خفگی کا اظہار کیا تھا۔ یہ عمیر سے محبت کا ثبوت تھا۔ عائلہ نے اس دھوپ چھاؤں جیسی لڑکی کو پیار سے گلے لگالیا۔

☼ ☼ ☼

ماریہ کی پریگننسی کے آخری دن چل رہے تھے۔ عمیر اور عائلہ اسے لینے کے لیے گئے تھے مگر شمعون نے اسے بھیجنے سے انکار کر دیا وہ لمحہ بھر کے لیے اسے خود سے دور کرنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ روزانہ اسے فون کر کے حال احوال پوچھتے تھے۔ اب وہ خود ملنے نہیں آتی تھی مگر دونوں جاکر چکر لگا آتے۔ عمیر نے بچے کے لیے بہت زیادہ شاپنگ بھی کرلی تھی۔ وہ سب بے تحاشا خوش تھے۔ دونوں خاندانوں کا پہلا بچہ جنم لینے والا تھا۔
اسماعیل اس کے سامنے دھرا خالی کپ اٹھانے آیا تھا کہ عمیر کے موبائل کی بیل ہونے لگی۔

"ہیلو' شمعون۔" اس نے اسکرین پہ اس کا سیل نمبر دیکھ لیا تھا۔ ساتھ ہی ہاتھ سے اسماعیل کو رکنے کا اشارہ دیا۔

"کیا؟ کس ہاسپٹل' ڈونٹ وری یار' ہم پہنچ رہے ہیں۔" اس نے تیز لہجے میں بات مکمل کر کے سیل آف کر دیا۔ وہ اسماعیل سے کچھ کہنا بھول کر ڈائننگ ہال میں آگیا۔

"تم جلدی سے چینج کرو' ماریہ ہاسپٹلائزڈ ہے' اس کی طبیعت خراب ہے۔" وہ جو ٹیبل سے برتن سمیٹنے کے بعد اسے صاف کر رہی تھی خاصی گھبرا گئی۔ اگلے پچیس منٹ میں وہ ہاسپٹل میں تھے۔ شمعون لیبر روم کے باہر ہی کھڑا تھا۔

"کیسی ہے ماریہ؟" ڈاکٹرز کیا کہہ رہے ہیں؟"
عمیر بہت بے تاب ہو رہا تھا۔

"وہ اندر لیبر روم میں ہے' ابھی تھوڑی دیر قبل آپریشن شروع ہوا ہے' اس کا بی پی بہت شوٹ کر گیا تھا عمیر' بہت تکلیف میں تھی وہ' ڈاکٹرز نے مجھے سائن کروائے ہیں وہ کہہ رہے تھے کہ ہم ماں کو بچا سکتے ہیں یا بچے کو' میں نے ماریہ کی زندگی کے پروانے پر دستخط کر دیے ہیں' بھلا مجھے اس کے سوا کیا چاہیے عمیر۔"
شمعون اس کے کندھے پر سر رکھ کر رو دیا تھا۔ وہ تینوں قریبی بینچ پر بیٹھ گئے۔ پھر باری باری جا کے نفل بھی ادا کیے۔ ہر ایک منہ میں مسلسل کچھ پڑھتا جا رہا تھا۔ وہ سب پریشان اور خاموش تھے۔ کون' کس کو دلاسا دیتا' تقریباً" بارہ بجے کے قریب لیبر روم کا دروازہ کھل گیا تھا۔ ماریہ کا سیزیرین ہوا تھا۔ ڈاکٹرز باہر آگئے۔ شمعون اور عمیر تیزی سے ان کی طرف لپکے۔

"مسٹر شمعون مبارک ہو' بیٹا پیدا ہوا ہے۔"
چہرے پر پریشانی کے واضح آثار کے باوجود ڈاکٹر بمشکل مسکرا دیا تھا۔

"ماریہ کیسی ہے ڈاکٹر' اسے کچھ ہوا تو نہیں' وہ بالکل ٹھیک ہے نا۔" اس نے جیسے بیٹے کی خبر سنی ہی نہیں تھی۔ اسے صرف ماریہ کی فکر تھی۔

"مسٹر شمعون وہ ابھی انڈر آبزرویشن ہیں' آئی

ہوپ کہ چند گھنٹوں میں ہوش آجائے گا مگر فی الحال کچھ کہا نہیں جاسکتا' آپ اس کے لیے دعا کریں 'جس نے آپ کے بیٹے کی جان بچائی ہے وہ اسے بھی نئی زندگی عطا کرے گا۔" ڈاکٹر ان سب کو کشمکش کی کیفیت میں امید کا دامن تھما کے چلا گیا تھا۔

"عمیر ۔۔۔ عمیر یہ ڈاکٹر کیا کہہ رہا تھا؟" وہ سکتے میں بول رہا تھا۔

"دعا ۔۔۔ دعا 'اسے دعا کی ضرورت ہے عمیر 'اس کی زندگی خطرے میں ہے 'یہ سب کیونکر ہو گیا 'میں اس کے بغیر نہیں رہ پاؤں گا 'مجھے بچہ نہیں چاہیے تھا 'نہیں چاہیے تھا بچہ۔" وہ ہسٹریائی انداز میں چلانے لگا تھا۔ عمیر نے اس کو بمشکل قابو پا کر بینچ پہ بٹھایا۔ وہ خود بہت اضطراب میں گھرا ہوا تھا۔ رات انہیں دعائیں مانگتے اور ایک دوسرے سے نظریں چراتے گزر گئی۔ کسی انہونی کا دھڑکا آپ کی آدھی جان نکال لیتا ہے۔

وہ سب بھی صبح ہونے تک پژمردہ ہو چکے تھے۔ بچے کو نرسری میں شفٹ کر دیا تھا۔ ان تینوں میں سے کسی نے بھی جا کر بچہ نہیں دیکھا تھا۔ ان کا ذہن ماریہ کے علاوہ اور کچھ سوچ ہی نہیں پا رہا تھا۔

"آپ کے مریض کو ہوش آگیا ہے مگر طبیعت ابھی زیادہ سنبھلی نہیں ہے 'آپ پلیز باری باری تھوڑی دیر کے لیے انہیں دیکھ سکتے ہیں 'زیادہ دیر رکنے کی اجازت نہیں 'پریشانی والی ہرگز کوئی بات مت کیجیے گا۔" نرس نے انہیں ہدایات نامہ دیا جسے انہوں نے بڑی بے تابی سے سنا اور اس کے جاتے ہی وہ ایک ساتھ اندر داخل ہو گئے تھے۔

ماریہ کی آنکھیں کھلی اور اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ ان کے نیچے رات بھر میں ہلکے سیاہ حلقے واضح ہو رہے تھے۔ رنگت سرسوں کی طرح پیلی ۔۔۔ تھی۔ خشک ہونٹ 'حالانکہ پریگننسی کے تمام عرصہ میں اس کے چہرے پر گلابیاں کھلتی رہی تھیں۔ ممتا کا بہت نور تھا۔ اس نے سرنج والے ہاتھ سے آکسیجن ماسک اتار دیا۔

"ماریہ تم ۔۔۔ تم ٹھیک ہو نا۔" شمعون پرنم آنکھوں سے پوچھ رہا تھا۔

"تم ۔۔۔ تم رو کیوں رہے ہو شمعون 'میں بہتر ہوں تو تم سے باتیں کر رہی ہوں 'تمہارے ۔۔۔ آنسو پھر سے میری تکلیف بڑھا دیں گے۔" اس نے نقاہت زدہ آواز میں شمعون کو رونے سے منع کیا۔ اس کا گلا خشک ہو رہا تھا وہ بار بار تھوک نگل رہی تھی۔ شمعون نے آستین سے چہرہ پونچھا 'چپکے سے عمیر اور عائلہ نے بھی 'یہ ہنس مکھ سی لڑکی ان سب کو بہت عزیز تھی۔

"میں تمہیں جلدی سے گھر لے جانا چاہتا ہوں ماریہ 'تمہاری اس زندگی اور موت کی کشمکش نے مجھے بہت تھکا ڈالا ہے۔ اس ایک رات میں میں نے اپنی پوری زندگی کا حوصلہ آزمایا ہے 'میں تمہیں لمحہ بھر بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دوں گا۔" شمعون نے اس کے ٹھنڈے ہاتھ کو تھام لیا۔ وہ بالکل بچوں کی طرح بی ہیو کر رہا تھا۔

"اللہ نہ کرے۔" وہ زیر لب بڑبڑائی تھی۔ اس کی بڑبڑاہٹ عمیر اور عائلہ نے سن لی تھی اور پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔

"عمیر 'عائلہ تم سب اس طرح چپ چاپ کیوں کھڑے ہو؟ باتیں کرو مجھ سے "آپ کی خاموشی مجھے پریشان کر رہی ہے 'بولو عمیر بھائی میں تمہیں سننا چاہتی ہوں۔" اس نے عمیر کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ جسے تھام کر عمیر نے بوسہ دیا۔

"تمہارے لیے ہم پریشان نہیں ہوں گے تو اور کون ہو گا؟ تم نے ہمیں کتنا ڈرایا بھی تو ہے 'تم ایسا کرو گی پھر ہم سب روئیں گے ہی۔" اس نے اپنے نم لہجے کو زبردستی خوشگوار بنانے کی کوشش کی۔

"شمعون تم نے بیٹا دیکھا ہے 'کیسا ہے وہ؟" بیٹے کے ذکر پہ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک ابھری۔ عائلہ نے اس بار اس کے بات بدلنے کو بغور نوٹ کیا تھا۔

"نہیں 'وہ ہم دونوں کا بیٹا ہے 'میں تمہارے بغیر اسے کیسے دیکھ لیتا۔" اس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

"یہ بھی بھلا کوئی جواز ہے 'رب کی نعمت سے یوں منہ نہیں موڑا کرتے 'میں اور تم الگ تھوڑی ہیں 'تم نے دیکھا یا میں نے 'ایک ہی بات ہے۔" اس کے انداز میں شمعون کے لیے ہلکا سا شکوہ تھا۔

"میں نے کبھی تمہارے بغیر نوالہ بھی نہیں توڑا ' اب میں اکیلا اس وجود کا حق دار کیسے بن جاتا جس کے لیے تم پوری رات سے تکلیف کاٹ رہی ہو 'میں ابھی جا کے لے آتا ہوں 'ہم ایک ساتھ اسے پہلی بار محسوس کریں گے۔" وہ اس کے بالوں کو سہلاتا نرمی سے کہہ کر باہر چلا گیا۔ عائلہ نے نرمی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس سے بالکل کوئی بات نہیں ہو پا رہی تھی۔

"عمیر تم اور عائلہ میرے بچے سے بہت پیار کرنا 'اس کا بہت خیال رکھنا 'جیسے میں تمہارا اماں کے جانے کے بعد رکھا کرتی تھی ۔۔۔ میں۔"

"مگر تم کہیں نہیں جا رہی ہو ماریہ۔" عمیر نے بہت درشتی سے اسے ٹوکا تھا۔

"تمہیں یاد ہے تم مجھے اماں جان کہہ کر چڑایا کرتے تھے۔ تب مجھے بہت برا لگتا تھا اور اب میں اس احساس سے آشنا ہو گئی ہوں مگر افسوس ۔۔۔ افسوس عمیر۔" اس کا ربط ٹوٹ گیا تھا۔ اب وہ خود رونے لگی تھی۔ ہر طرف مایوسی ہی مایوسی تھی۔

"پلیز ماریہ 'تم ایسی باتیں بالکل نہ کرو 'ہم سب تمہارے ساتھ ہیں 'یوں مایوس مت ہو 'تم خود اپنے بیٹے سے پیار کرنا اسے سنبھالنا 'تم ماں ہو اس کی۔" عائلہ آگے بڑھ کر کہتے ہوئے رونے لگی تھی۔ اس سے اس کا دکھ برداشت نہیں ہو پا رہا تھا۔ وہ شاید انہیں کچھ باور کروا رہی تھی۔

"یہ لو ہمارا بیٹا۔" شمعون نرسری سے بچہ لے آیا تھا۔ اس کی دائیں سائیڈ پہ لٹا دیا۔

"ہائے شمعون 'کتنا کیوٹ ہے 'گول مٹول سا۔" وہ بڑی حسرت سے ہنس رہی تھی حالانکہ اس کے گلے سے ہنسنے سے بڑی کھوکھلی سی آواز نکل رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ ممتا کا احساس جاگ اٹھا تھا۔ لمحہ بھر کو سب اپنی تکلیف بھول کر اس معصوم میں کھو گئے جو ان کی توجہ سمیٹ لے گیا تھا۔

"عائلہ تم بتاؤ یہ کس پہ گیا ہے۔" وہ اس کے چہرے پہ آہستگی سے ہاتھ پھیر رہی تھی۔ اس نے سر کو تھوڑا سا اوپر کیا ہوا تھا اور اسے ہولے ہولے چھو رہی تھی۔

"چھوٹے بچوں کا جلدی پتا نہیں چلتا 'ان کے خدوخال بدلتے رہتے ہیں مگر کچھ کچھ واقعی شمعون بھائی پہ لگ رہا ہے۔ معصوم اور گلابی سا۔" عائلہ نے بھی نرمی سے اس کا گال چھوا۔

"میں اپنے بیٹے کو گود میں لوں گی 'مجھے بیٹھنے کے لیے سہارا دو۔" اس نے کسی کو مخاطب کیے بغیر اٹھنے کی ناکام کوشش کی۔

"نہیں 'نہیں ابھی تم نے آکسیجن ماسک اتارا ہے پھر تمہارے دونوں ہاتھوں پہ ڈرپ لگی ہوئی ہے 'کچھ دیر میں ۔۔۔"

"نہیں شمعون مجھے ابھی اسے گود میں بھرنا ہے ورنہ پھر شاید میں کبھی ۔۔۔" اس نے شمعون کو ٹوک کر بیڈ کی سائیڈ کو مضبوطی سے پکڑ کر اٹھنا چاہا مگر اس کوشش میں اس کا سانس اکھڑ گیا تھا 'اس کی بات بھی بیچ میں رہ گئی۔ اس کے جسم کو ہلکے ہلکے جھٹکے لگنے لگے تھے۔ عمیر نے آکسیجن ماسک اس کے منہ پر لگانا چاہا 'اس نے پوری طاقت سے عمیر کا ہاتھ پرے جھٹک دیا۔ عائلہ نے پھرتی سے بچے کو روتے ہوئے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ اندر آتی نرس اس کی حالت سے خوفزدہ ہو کر ڈاکٹرز کو لینے واپس بھاگ گئی۔ جبکہ شمعون نے ہراساں ہو کر اس کے جھٹکے کھاتے وجود کو کندھوں سے تھام لیا۔ وہ تیز ہوتی سانسوں کے بیچ کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔

"عا ۔۔۔ عائلہ 'تم ۔۔۔ مم 'میرا ۔۔۔ بچہ ۔۔۔ تت ۔۔۔ تت 'تم۔" ڈاکٹرز تیزی سے اس کی طرف بڑھے مگر تب تک اس کا ربط اور سانس ٹوٹ چکا تھا۔ وہ تڑپتا جسم

ساکت ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ڈیڑھ ماہ بہت قلیل عرصہ ہوتا ہے دنیا میں صرف واحد رشتے کے گزر جانے کا غم منانے کے لیے اپنے خون کا دکھ جب تک سانس چلتی ہے ساتھ ہی ہر دم رہتا ہے۔ وہ اس صورت حال کو قبول کرنے کو تیار ہی نہیں تھا کہ وہ اب اس دنیا میں تنہا رہ گیا ہے۔ وہ روزانہ آفس سے سیدھا قبرستان چلا جاتا' کبھی دوپہر کو ہی آفس سے اٹھ آتا' کھانا پینا بہت کم کر دیا تھا۔ گہری سوچوں میں غرق خلاؤں میں گھورتا رہتا یا پھوٹ پھوٹ کر روئے جاتے۔ عائلہ کے لیے اسے سنبھالنا خاصا مشکل ہو گیا تھا' وہ بھی اس صورت میں جب کوئی دلاسا اور تسلی و تشفی اس پر اثر نہیں کر رہی تھی۔ عائلہ خود اس کی حالت پہ اتنا بوکھلائی ہوئی تھی کہ اسے چھیڑنے کی ہمت کرنا بس سے باہر لگتا تھا۔

آج ویک اینڈ تھا۔ پہلے وہ دوستوں کی طرف چلا جاتا کرتا تھا۔ اب یہ بھی خاموشی کی نذر ہو جاتا۔ وہ ناشتا کر کے کمرے میں جا کے لیٹ گیا۔ چھت کو یک ٹک گھورتا اور کبھی آنکھوں پر بازو رکھ لیتا۔ وہ بے چین کروٹیں بدل رہا تھا۔ عائلہ کب سے کمرے میں چھوٹے موٹے کام نبٹاتے اس پہ نظر رکھے ہوئے تھی یہ بکھرا بکھرا سا شخص دل کے زیادہ ہی قریب محسوس ہونے لگا تھا۔

"عمیر آپ ماریہ کے بیٹے حمزہ سے مل آئیں۔" اس نے اسے متوجہ کرنے کے لیے ذرا اونچی آواز میں کہا۔

"آں... نہیں کیوں؟ مجھے نہیں جانا۔" اس نے چونک کر صاف انکار کر دیا۔

"آپ کو سکون ملے گا اور دل بھی بہل جائے گا۔" اس نے ایک اور کوشش کی۔ وہ پورے مہینے سے اس کی طرف نہیں گیا تھا۔ عائلہ کا جی چاہتا تھا کہ وہ جا کے بچے کو دیکھے مگر یہاں کسی کو ہوش ہی نہیں تھا۔

"میں رونا نہیں چاہتا اور حمزہ کو دیکھ کر مجھے خود پہ ضبط نہیں رہتا' ویسے بھی مجھے لمحہ سکون سے کوئی غرض نہیں' میں بے سکون زیادہ بہتر ہوں۔" وہ ایک ٹرانس میں بولتا جا رہا تھا۔ وہ زندگی کی طرف آنے کو آمادہ ہی نہیں تھا۔ بے شک غم بھلائے جانے والا نہیں تھا مگر یوں معمولات زندگی سے کٹ جانا بھی دانشمندی نہیں تھا۔

"عمیر۔" اس نے بیڈ پہ قریب بیٹھ کے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"ماریہ نے جاتے ہوئے آپ کو ایک ذمہ داری سونپی تھی کہ میرے حمزہ کا خیال رکھنا اس سے پیار کرنا ہم اس معصوم وجود کو کس بری طرح اگنور کر رہے ہیں کیا وہ اس سلوک کا مستحق ہے؟ اگر ماریہ زندہ ہوتی تب بھی ہمارا رویہ اس کے ساتھ یہی ہوتا؟ اب اگر وہ نہیں رہی تو اس میں اس بچے کا کوئی قصور نہیں' یہ اللہ کی قدرت ہے' موت برحق ہے'

جو چلا گیا وہ لوٹ کر نہیں آئے گا مگر جو ہے اسے..." اس کی آنکھوں اور لہجے میں نمی آگئی تھی۔ وہ بہت غور سے اسے سن رہا تھا۔

"اس کے بیٹے کے ساتھ ہمارا یہ رویہ یقیناً" اس کے لیے بھی تکلیف کا باعث ہو گا' جب تک محبت دینے والے زندہ رہیں تب تک محبتوں میں حساب کتاب نہیں ہوتا' کچھ کمی یا زیادتی کے ساتھ سب چلتا رہتا ہے مگر جب محبت دینے والے ہمیشہ کے لیے دور ہو جائیں تو ان کی محبتیں قرض ہو جاتی ہیں' آج اس کی اماں جان نہیں رہی مگر ان کا لخت جگر ہمارا منتظر ہے' ہمیں اسے خوش آمدید کہہ کے سینے سے لگانا ہے' وہ ماریہ کے جسم کا حصہ ہے' اسے سینے سے لگا کے' آپ کا دکھ کم ہو جائے گا' بہت سکون ملے گا آپ کو' اگر آپ نے اس کے بیٹے کو سینے سے لگا کے نہ چوما عمیر تو ماریہ آپ کو کبھی معاف نہیں کرے گی کبھی نہیں۔" وہ اسے سنتے ہوئے رونے لگا تھا۔ اس کے آنسو کنپٹی کو بھگوتے تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔ وہ بھی رو رہی تھی۔

"زندگی کی حقیقتیں رلانے کے لیے ہی ہوتی ہیں۔"

اس سے اپنا ہاتھ چھڑا کے وہ اٹھ بیٹھا۔ دائیں ہتھیلی سے اپنے آنسو پونچھے۔

"میرے کپڑے نکالو اور خود بھی تیار ہو جاؤ' ہم حمزہ سے ملنے جا رہے ہیں اور وہ سارا سامان بھی گاڑی میں رکھوا دو جو میں نے اس کی پیدائش سے پہلے خرید رکھا تھا۔" اس کی تبدیلی پہ وہ ہولے سے مسکرا دی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ واپس لوٹ آئے گا۔

☆ ☆ ☆

حمزہ کو گود میں لے کر اسے واقعی اس میں سے ماریہ کی خوشبو آئی تھی۔ اس نے سوئے ہوئے حمزہ کو بے اختیار' بے تحاشا چوما تھا۔ پھر وہ اکثر اس سے ملنے جانے لگا تھا۔ اس کی نارمل زندگی کی طرف لوٹنے میں اس بچے کا ہی عمل دخل تھا۔ وہ پہلے سے بہتر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ عائلہ کا بھی شکر گزار تھا جس نے اسے اس ٹوٹنے کے عمل میں سہارا دیے رکھا۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام' شمعون تم..." عمیر ناشتا کر رہا تھا شمعون کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ کیونکہ اس کے ہاتھ میں بے بی بیگ اور دوسرے بازو میں سویا ہوا حمزہ تھا۔ عائلہ تھرماس میں سے چائے کپ میں انڈیل رہی تھی۔ فوراً" رک گئی۔

"ہاں ضروری کام تھا' شام تک انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ تم شاید آفس جا رہے ہو۔" وہ اسے آفس کے لیے تیار دیکھ کے تذبذب میں پڑا تھا۔ اس نے بے بی بیگ نیچے رکھ دیا۔

"نہیں' میں آفس نہیں' تم بیٹھو ناشتا کرو۔" عمیر کو گھبراہٹ میں اور کچھ نہ سوجھا۔

"نہیں شکریہ' تم ناشتا کر لو تو ڈرائنگ روم میں آ جانا بھابھی آپ بھی ساتھ آئیے گا۔" وہ کہہ کر رکا نہیں تھا۔ اس کی سنجیدگی نے عمیر کو دھڑکا لگا دیا تھا۔ اب بھلا ناشتا کس سے ہضم ہونا تھا۔ وہ سب چھوڑ کے عائلہ کو سر کے اشارے سے چلنے کا کہہ کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

وہ دونوں اس کے سامنے والے صوفے پہ براجمان اس کے بولنے کے انتظار میں چپ چاپ تھے۔ انہیں تین چار منٹ گزر گئے۔ وہ سر جھکائے جانے کہاں ڈوب گیا تھا۔ عمیر نے گلا کھنکارا۔

"شمعون ایوری تھنگ از او کے۔" اس سے مزید تجسس برداشت نہیں ہو پا رہا تھا۔ بہت مشکلوں سے اب کہیں جا کے سنبھلے تھے وہ۔

"عمیر..." اس نے لمبی سانس خارج کی۔

"مجھے بالکل سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ میں کیا کہوں' کہاں سے شروع کروں؟ مجھے اور کوئی نہیں ملا میں جس کے پاس جا کے اپنا دکھ سنا سکتا' کوئی ہمدرد نہیں ہے میرا' میں بہت مشکل میں ہوں عمیر' میرا بیٹا' میرا لخت جگر ہی میرے لیے مشکل بن گیا ہے' کتنا بدبخت باپ ہوں میں' اپنے بن ماں کے بچے کو خود پہ بوجھ سمجھنے لگا ہوں۔ میں بہت مجبور ہوں عمیر' کوئی بھی تو میرا ساتھ نہیں دے رہا' میری سگی... سگی ماں کو مجھ سے ہمدردی نہیں ہے' اسے اپنے پوتے سے زیادہ اپنی سوشل ایکٹیویٹیز عزیز ہیں۔ ڈھائی ماہ میں تین گورنس بدل چکا ہوں' ماریہ کا دکھ کم نہیں ہوا اور اوپر سے اس کا رونا بلکنا مجھ سے قطعی برداشت نہیں ہوتا' جب سے پیدا ہوا ہے' خوراک سے زیادہ' دوائیوں پہ گزارا کر رہا ہے' اب تو ڈاکٹر نے صاف کہہ دیا ہے کہ بچے کی پرورش کا ٹھیک سے بندوبست کریں ورنہ آپ کو اس سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں گے۔" وہ سر جھکائے اپنے آنسو پینے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ ان دونوں کے دل دہل گئے تھے۔ اس کے چہرے اور انداز میں بے بسی کی واضح تحریر رقم تھی۔

"پلیز عمیر' تم لوگوں کے سوا میرے پاس کوئی رشتہ نہیں ہے' میرا درد بانٹ لو' ماریہ کی زندگی بچانا ہمارے اختیار میں نہیں تھا مگر اس کی زندگی ہم بچا سکتے ہیں' میں اپنی ماریہ کی نشانی کو یوں تڑپتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ پلیز عمیر... پلیز اسے میری التجا سمجھ لو یا خود غرضی'

مجھ بد بخت کے اس بیٹے کو گود لے لو' لے لو اسے۔"

وہ زارو زار رونے لگا۔ وہ دونوں اس کے اس غیر متوقع جملے پہ ساکت وصامت رہ گئے تھے۔ عمیر میں اتنی سکت نہیں تھی کہ اسے اٹھ کے چپ کروا دیتا۔

"کچھ بولو عمیر' یوں چپ نہ رہو' مجھے برا بھلا کہو' میری بے عزتی کرو مگر انکار مت کرنا' میں بہت لاچار ہو گیا ہوں' اسے اکیلا نہیں سنبھال سکتا' میں ماں نہیں بن سکتا' کچھ کہو عمیر۔" وہ اپنی مجبوری بتا کے منت و سماجت کر رہا تھا۔ اگر وہ یوں روتا پیٹتا نہ تب بھی عمیر انکار نہ کر پاتا۔ اب مسئلہ صرف اس کے اقرار کا نہیں تھا۔ اس نے ساتھ بیٹھی عائلہ کو سوالیہ نظروں سے تکا۔ وہ اس شخص کی نگاہوں کی التجا کو کیسے نظر انداز کر جاتی۔ ہولے سے اثبات میں سرہلا گئی۔ عمیر کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی۔ وہ اٹھ کے شمعون کے قریب آیا اور جھک کے حمزہ کو اس کی گود سے اٹھا لیا۔ شمعون کی سانس اور آنسو ساکن ہو گئے تھے۔ اس نے خالی نظروں سے اپنی خالی جھولی کو دیکھا۔ وہ اسی مسمریزم کی کیفیت میں اٹھا۔ اس نے آخری بار بیٹے کو پیار کیا نہ پیچھے مڑ کر دیکھا' سست روی سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔

"ماریہ کی محبتیں مجھ پر قرض ہیں عائلہ' میں اکیلا اس قرض کا بوجھ نہیں اتار سکتا' تم میرا ساتھ دو گی نا عائلہ۔" اس نے پہلی بار اس سے کچھ مانگا تھا۔ اسی لیے اثبات میں سرہلا گئی۔

☼ ☼ ☼

اب زندگی نئے رخ پر چل نکلی تھی۔ وہ خود کو ہر طرح سے مصروف رکھ کے بھی بے چین اور الجھی سی رہا کرتی تھی۔ وہ ساری کیفیتیں کہیں جا سوئی تھیں۔ اب اس کے چہرے پہ اطمینان اور سکون رہا کرتا تھا۔ اس نے حمزہ کو پرخلوص نیت سے قبول کیا تھا۔ وہ سارا وقت اس کے ساتھ مگن اور خوش رہتی۔ اس کی معصوم قلقاریاں سارے گھر میں گونجتیں تو خاموشی میں جان سی پڑ جاتی۔

شمعون شروع کے دو چار ماہ بیٹے سے ملنے آیا پھر انہوں نے اس کی شادی کی خبر سنی اور وہ غائب ہو گیا۔ عمیر میں بھی بہت سی مثبت تبدیلیاں آئی تھیں۔ وہ اب بولنے لگا تھا بے شک حمزہ کے بارے میں ہی' اس کا رویہ عائلہ کے ساتھ بہت بہتر ہو گیا تھا۔ وہ اس پر بھی توجہ دیتا تھا۔ شاید وہ اس کا احسان مند تھا۔ اس نے حمزہ کے لیے اس کے اندر سچی ممتا دیکھی تھی۔ وہ ماں نہیں تھی مگر ماں جیسی تھی۔ عمیر کو اس سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ بلکہ وہ اسے بہت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

"السلام علیکم!" حسن کی آواز پہ اس نے مڑ کر دیکھا۔

"وعلیکم السلام بھائی آپ لوگوں کی طرف آنے کا سوچ ہی رہی تھی' اچھا ہوا جو آپ چلے آئے۔" وہ بھائی کو دیکھ کر کھل اٹھی تھی۔

"بس آج کل پہ ٹال کے سوچتی رہنا' آنا کبھی نہیں۔"

"نہیں حسن پہلے میں گھر میں اکیلی بور ہوتی تھی' اس لیے جلدی چکر لگا لیا کرتی' اب حمزہ کے ساتھ دن کیسے گزر جاتا ہے پتا ہی چلتا۔" حمزہ کے منہ میں کھچڑی کا چمچہ ڈالتے اس نے وجہ بیان کیا۔

"جی ہاں' اب آپ ایک عدد بیٹے کی اماں جان بن گئی ہیں' ہمارے شکوے خاطر میں لانے کی بجائے لمبی چوڑی وضاحتیں پیش کرتے ہوئے فرار کے رستے ڈھونڈے جاتے ہیں آپی نو۔" اس نے آرام دہ انداز میں ٹانگیں آگے پھیلاتے اسے شرارت سے لتاڑا۔

"دو چار روز میں چکر لگا کر آپ کا شکوہ دور کر دوں گی' البتہ ہم جو آپ سے شادی کا شکوہ کتنے سالوں سے کرتے چلے آرہے ہیں' آپ کان کیوں نہیں دھرتے' اب تو خاصے اسٹیبلش بھی ہو چکے ہیں۔" عائلہ نے ڈھونڈ کے وہ موضوع چھیڑ لیا۔ جس سے اس کی جان جاتی تھی۔

"ارے لڑکی' میں آفس سے سیدھا آرہا ہوں' کوئی چائے' پانی خاطر مدارات' یہ بخیے بعد میں ادھیڑ لینا۔"

اسے بروقت بہانہ مل گیا تھا۔ وہ اپنی پھوپھی زاد سے منسوب تھا۔ ابھی شادی کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔

"سوری حسن' بالکل یاد نہیں رہا' ابھی گل بانو سے کہہ کر آتی ہوں' تم حمزہ سے کھیلو۔" اس نے اس کا ٹشو پیپر سے منہ صاف کر کے حسن کو پکڑا دیا۔ پلیٹ چمچے اٹھائے کچن میں چلی گئی۔ وہ حمزہ کو گدگداتے ہوئے اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرنے لگا تھا۔

"شمعون آتا ہے۔" چائے بناتی عائلہ سے حسن نے پوچھا۔

"اب تو نہیں' شروع کے چند ایک مہینے آیا۔ پھر سننے میں آیا کہ اس کی ماں نے ان کی شادی زبردستی اپنی بھانجی سے کروا دی' شادی کے بعد صرف ایک دفعہ آیا اور پھر انگلینڈ شفٹ ہو گیا۔" اس نے چائے بنا کر اسے پکڑاتے ساری تفصیل بتا دی۔

"وہ تو ماریہ سے بہت محبت کرتا تھا پھر اتنی جلدی شادی۔" اسے بھی سن کر حیرت ہوئی۔

"تو ڈاؤ کہ وہ بہت محبت کرتا تھا' اس خبر کو لے کر عمیر کا موڈ بھی بہت خراب رہا تھا۔ لیکن ہمارا رشتہ ماریہ کے ساتھ تھا' وہ رہی نہیں' اس کی نشانی ہمارے پاس ہے' رہا شمعون' تو ہم کسی کی زندگی پہ پابندیاں تھوڑی بٹھا سکتے ہیں۔" اس نے بات ختم کرنے کے انداز میں کہتے بار بار نیچے گرتے حمزہ کو اٹھا کر گود میں بٹھا لیا۔

"حمزہ بہت سمجھ دار ہو گیا ہے' پہلے میرے پاس نہیں آتا تھا' ابھی بالکل نہیں رویا' شاید اسے میری پہچان ہو گئی ہے۔" حسن نے اس کی طرف بسکٹ بڑھایا جس کو اس نے پکڑ لیا۔

"ماموں کیا کہہ رہے ہیں' حمزہ تیز ہو گیا' آپ تیز ہو گئے ہو' بتایا نہیں ماموں کہ آپ بھاگنے بھی لگے ہو۔" وہ اسے گدگدا رہی تھی۔ جو ماں کی شرارت پہ مسلسل ہنستا چلا جا رہا تھا۔

"چلو اب تم دونوں کے بیچ بھاگم بھاگ ہوا کرے گی' ویسے بھی کافی وقت ہے نیکسٹ اولمپکس میں' تب تک تم اتنی ایکسپرٹ ہو جاؤ گی کہ اس میں حصہ لے سکو۔" حسن نے سنجیدگی سے کہا تھا مگر اسے بے اختیار ہنستا دیکھ کر خود پہ قابو نہ رکھ سکا۔

"رئیلی عائلہ! تم اسے بالکل سگے بیٹے کی طرح چاہتی ہو۔" اس کا والہانہ انداز دیکھ کر وہ اکثر سوچتا تھا۔ آج کہہ بھی دیا تھا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" اس نے برا سا منہ بنایا۔

"یہ میرا ہی بیٹا ہے۔ بالکل سگا اور لاڈلا' پتا ہے میں نے سوچا اٹھارہ سال کی عمر میں حمزہ کی شادی کر دوں گی اور بیس سال کی عمر میں دادی اماں' کتنی اچھی لگوں گی نا' ینگ سی دادی اماں۔" وہ پوری طرح اس میں مگن تھی۔

"اور اگر تب تک شمعون اسے آکر لے گیا تو ــــ" بلا ارادہ ہی اس کے منہ سے نکل گیا تھا۔ حمزہ کے ہاتھ سے کھیلتی وہ وہیں منجمد ہو گئی۔

اسی دم عمیر نے اندر قدم دھرا تھا۔ وہ ان دونوں کے آخری الفاظ سن چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

فاروق لغاری بزنس کی دنیا کا بہت بڑا نام' انہوں نے ایک گرینڈ فنکشن ارینج کیا تھا۔ عمیر پارٹیز اور فنکشن وغیرہ بالکل اٹینڈ نہیں کرتا تھا۔ اس پارٹی کو وہ اس لیے اٹینڈ کرنے آیا تھا کیونکہ اس میں سعد' آذر اور راشد اسلام آباد سے مدعو تھے اور وہ اپنی مسز کے ہمراہ آرہے تھے۔ وہ بھی بطور کپل مدعو تھے۔ ان تینوں کے بے حد اصرار پہ اس نے نیم دلی سے ہامی بھرلی تھی۔ اگر ان کی وائف نہ آرہی ہوتی تو وہ بھی عائلہ کو کبھی لے کر نہ جاتا۔

"عائلہ رات ہمیں پارٹی میں جانا ہے' آٹھ بجے تک تیار ہو جانا۔" وہ ٹائی کی ناٹ باندھ رہا تھا' "میں حمزہ کو کبھی اکیلا ـــــ چھوڑ کر نہیں گئی۔" وہ اس کے یوں کہنے پر کشمکش و پنج میں پڑ گئی۔ اسے معلوم تھا وہ پارٹیز اٹینڈ نہیں کرتا اتنی لیٹ نائٹ پارٹیز میں بچے ساتھ نہیں لے جائے جاتے "حمزہ کو گل بانو سنبھال لے گی۔ تھوڑی دیر کے لیے ہی جانا ضروری ہے۔"

وہ اس کے انکار کی وجہ سمجھ رہا تھا مگر وہ انہیں ہاں کرچکا تھا۔ وہ بھی تو نہیں ٹل رہے تھے۔

"اچھا ــــ" اس نے ذرا دیر کو سوچا۔ وہ اسے صاف منع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ پہلی بار اسے باہر کہیں ساتھ لے جا رہا تھا۔ اسے بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ حمزہ کا بھی مسئلہ تھا۔

"ایسا ہے کہ تھوڑی سی ٹائمنگ ــــ چینج کرلیتے ہیں' تقریباً" دس بجے چلے جائیں گے تب تک میں اسے سلادوں گی اور دو گھنٹے سے زیادہ نہیں رکیں گے' میں پل بھر بھی اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔" اس کے چہرے اور آنکھوں میں سچائی کی تحریر رقم تھی۔ عمیر نے مسلسل دیکھتے ہوئے اثبات میں سرہلادیا۔

پھر اس کا سارا دن یہی سوچتے گزر گیا کہ وہ شام کو کیا پہنے گی۔ اسے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ وہ عمیر کو کس رنگ میں اچھی لگتی ہے یا اس کا پسندیدہ رنگ یا لباس کون سا ہے؟ اسے کچھ بھی تو اندازہ نہیں تھا۔ وہ بہت فکر مند ہو رہی تھی۔ دوپہر میں اس نے کلینزنگ اور اسکن مساج کرلیا۔ عام روٹین میں وہ یہ کام نہیں کرتی تھی۔ اس نے ساری وارڈ روب کے سارے کپڑے نکال کر بیڈ اور کچھ نیچے قالین پہ ڈھیر کر رکھے تھے۔ بہت سے اس کی شادی کے تھے۔ جنہیں ایک بار بھی استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ بالآخر اس نے جانچ پرکھ کے بلیک کلر کی ساڑھی سلیکٹ کرلی۔ جس کے بازو اور گلے کے کنارے اور پلو پر اچھا خاصا سلور کام تھا۔ اس نے ساڑھی کبھی زیب تن نہیں کی تھی۔ یونیورسٹی اور کالجز میں اس نے دو تین بار ساڑھی پہنی تھی۔ لڑکیوں اور ٹیچرز نے بہت تعریف کی تھی۔ اسی لیے اس نے یہی منتخب کرلی۔

شام کو عمیر کی کال آگئی کہ وہ لیٹ آئے گا' وہ خود تیار رہے اور اس کے بھی کپڑے نکال کے رکھ دے۔ وہ اپنے لیے گرے تھری پیس کا کہہ کر گیا تھا۔ اس نے نو بجے کے قریب بمشکل حمزہ کو سلایا تھا۔ وہ ابھی جاگنے کے موڈ میں تھا۔ اس کے دونوں اطراف میں تکیے رکھے تاکہ اسے ماں کی غیر موجودگی کا احساس نہ ہو وہ احتیاط سے تیار ہونے لگی۔ ساڑھی باندھ کے اس نے آئینے میں خود کو دیکھا۔ وہ اپنے سلکی بالوں کو اکثر باندھ کر رکھتی تھی۔ ابھی اس نے انہیں پشت پہ کھلا چھوڑا تھا۔ بہت عرصہ بعد اس نے میک اپ کیا تھا۔ وہ ساڑھی کے پلو کو ٹھیک سے کندھے پہ ٹکا رہی تھی کہ عمیر دروازہ کھول کر داخل ہوا۔ دونوں کی نظریں مل کر ٹھٹک گئیں۔ اس کی پلکیں بار حیا سے جھکی کانپتی جا رہی تھیں۔ وہ بھی تو وہیں جم گیا تھا۔ وہ ہاتھ مروڑتی' جھجکتی ہوئی اس کے سائیڈ سے ہو کر باہر نکل گئی۔ صوفے پر گر کے اس نے اپنی تیز ہوتی سانس کو بحال کرنے کے لیے لمبے لمبے سانس لیے۔ صوفے کی پشت کے ساتھ گردن ٹکا کے خود کو پرسکون کیا تھا۔

"گل بانو' ڈریسنگ ٹیبل کے ساتھ ہی میرے بلیک سینڈل پڑے ہیں' وہ اٹھا لاؤ۔" پھر سے اندر جاکے عمیر کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

"یہ لیں بی بی جی' یہی ہے نا۔" اس نے سینڈل نیچے رکھ کے تصدیق چاہی۔

"ہاں' وہ صاحب کیا کر رہے ہیں؟" اس نے یوں دھیمے سے پوچھا۔ جیسے وہ یہی کہیں موجود ہو۔

"جی وہ تیار ہو کے' بال بنا رہے ہیں۔" وہ اسے جواب دے کر ٹیبل سے خالی گلاس اور جگ اٹھا کر لے گئی۔

"سب ریڈی ہے تو چلیں۔" بلیک ڈنر سوٹ میں ملبوس خوشبو کا معطر سا جھونکا چاروں اطراف پھیل گیا تھا۔ عمیر رضا کو اپنے جذبات پر بہت اختیار تھا۔ جس کا اسے اندازہ بھی تھا۔ اب جبکہ وہ صبح خود ہی شام کے لیے گرے تھری پیس منتخب کرکے گیا تھا تو عائلہ کو بلیک کلر میں دیکھ کے نا سمجھی میں اپنے لیے بلیک ڈنر سوٹ نکال لیا تھا۔ ان کے رشتے میں الجھاؤ تھا یہ بات اور اس کی وجہ سے وہ مکمل طور پر آگاہ تھا۔ وہ پہلے ہر طرح سے اس کے ساتھ نارمل رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ اب کچھ عرصہ سے اسے یہ کوشش نہیں کرنی پڑ رہی تھی۔ سب کچھ خود بخود ہوتا جا رہا تھا۔ وہ جب اس کے آس پاس مگن ہوتی تو فائلوں کے ڈھیر میں سے سر اٹھا کر

ایک بھٹکتی ہوئی نگاہ اس پر ڈال لیا کرتا تھا۔ حمزہ کے ساتھ چھوٹی چھوٹی باتوں اور شرارتوں میں لگی اس کی ساری توجہ سمیٹ لیتی۔ وہ زیادہ دیر کے لیے اوجھل ہوتی تو اس نے بالکل بے اختیار ہو کر دو ایک بار اسے بلاوجہ کسی کام سے آواز دی تھی۔ اس کی موجودگی کا احساس اسے اطمینان سا بخش جاتا تھا۔ اسے اپنے اندر کی اس تبدیلی کا واضح احساس تھا۔ ابھی اسے بے اختیار کرنے کو کچھ اور بھی تھا۔

وہ نیچے جھک کر سینڈل کا اسٹیپ بند کر رہی تھی۔ بائیں طرف سے ساڑھی کا پلو سارا زمین پہ ڈھلک چکا تھا۔ نیچے جھکنے سے سلکی بالوں نے اس کے پورے چہرے کا احاطہ کر رکھا جنہیں دوسرے ہاتھ سے پرے کرنے کی ناکام کوشش بھی کر رہی تھی۔

"جی ــــ" اچانک عمیر کی آواز پہ اس نے ہاتھ روکا تھا۔ اسی لمحے اپنی پوزیشن کا بھی احساس ہو گیا تھا۔ وہ صرف چند قدم کے فاصلے پر ہی کھڑا تھا۔ پھر دو قدم آگے بڑھ کر تھوڑا' سا جھکتے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ پہلے نیچے گرے پلو کو اٹھا کر کندھے پہ سیٹ کیا' سر جھکا کے نرمی سے سینڈل کا اسٹیپ بھی بند کر دیا۔ پھر شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے بالوں کو چہرے سے ہٹا کر احتیاط کے ساتھ کان کے پیچھے اڑس دیا۔

اس کی آنکھوں کی چمک کو زیادہ دیر دیکھنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ تبھی اس نے ایک اور جسارت کر ڈالی۔ اس کے سرخ گالوں پہ انگلیوں کی پوریں پھیری تھیں۔ اس معتدل مزاج بندے کا یہ انداز عائلہ کو اپنا جسم بے جان لگ رہا تھا۔ اس کے سانسوں کی ہلکی گرم تپش اس کے چہرے سے ٹکرا رہی تھی۔ یہ سب کتنا انوکھا اور عجیب تھا۔

"چ ــــ چلیں۔" ان لمحوں کو ٹالنے کے لیے بمشکل اس کے منہ سے نکلا تھا۔

"ہاں' سب مکمل ہے' چلیں۔" وہ ایک جذب کے عالم میں ٹھہر ٹھہر کے بولا تھا۔

پارٹی میں اچھا خاصا رش تھا۔ مردوزن کا اندازہ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ ایک رنگ و بو کا سیلاب تھا۔ زیورات اور ملبوسات سے لدی پھندی عورتیں' میک اپ سے بھرپور چہرے' خوشبوؤں کے جھونکے' سرگوشیاں اور قہقہے گونج رہے تھے۔ عمیر اسے چند ایک لوگوں سے ملواتا' رش سے گزار کر اگلی سائیڈ پہ لے گیا تھا۔ جہاں سعد' آذر اور راشد اپنی مسز کے ہمراہ موجود تھے۔

"ہائے یار تم آگئے' میں ابھی ناامید ہو کے' تمہیں کال کرنے ہی والا تھا۔" سب سے پہلے راشد اس کی طرف بڑھا۔

"پرامس کیا تھا پھر کیوں نہ آتا۔" وہ مسکراتے ہوئے اس کے گلے لگ گیا۔

"ویسے مسٹر عمیر جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' آپ اتنے فرماں بردار تو کبھی بھی نہیں رہے۔" آذر نے سوچنے کی مصنوعی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

"یار تمہیں نہیں پتا' اب یہ شادی شدہ ہو گیا ہے اور شادی کے بعد ہر مرد کو اتنا فرماں بردار تو ہو ہی جانا چاہیے کیونکہ اسی میں عافیت ہوتی ہے۔" سعد نے عائلہ سے ملتی اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرکے آنکھ دبائی۔ اس کے کان بھی ادھر ہی لگے ہوئے تھے۔

"جی کیوں نہیں' جتنے آپ فرماں بردار ہیں' میں خوب جانتی ہوں' خدا آپ جیسا شوہر سب کو دے۔" ترکی بہ ترکی شمائلہ کا جواب آیا تھا۔

"اب روایتی عورتوں کی طرح شک کر رہی ہو تم۔" سعد نے معصومیت کی انتہا کردی تھی۔ وہ سب ان کی نوک جھوک سے محظوظ ہو رہے تھے۔

"میں کیوں شک کروں گی اور یہ آپ نے مجھے روایتی کس خوشی میں کہا۔" اس نے خفگی سے منہ پھلا لیا۔

"بھابھی اگر آپ اجازت دیں تو ہم سب مردوں والے گروپ کو جوائن کرلیں' پکا وعدہ اس کا بازو پکڑ کر رکھوں گا' چھوڑوں گا نہیں۔" راشد نے شرارت سے ابھی سے اس کا بازو مضبوطی سے تھام کر اجازت مانگی تھی۔

"تم شمائلہ بلاوجہ ہی سعد بھائی پہ شک کرتی اور انہیں ٹوکتی رہتی ہو' اس طرح مرد اور بگڑتے ہیں' سعد

بھائی ایسے لگتے نہیں ہیں' بس جولی سے ہیں یونہی تمہیں تنگ کرتے رہتے ہیں۔" ان سب کے جاتے ہی وہ سب بھی ایک خالی میز پہ بیٹھ گئیں۔ عائلہ ان سب سے اپنے شادی والے روز اور پھر ماریہ کے ڈنر پہ ملی تھی۔ ان سے اچھی علیک سلیک بھی تھی۔

"اب ایسی حرکتیں نہیں کرتے کیونکہ میں کھینچ کے رکھتی ہوں' شادی سے پہلے کے ہزارہا قصے خود مجھے سنائے تھے۔" شمائلہ نے اپنے خدشات کی وضاحت کی۔

"فارگاڈ سیک یار! ایسے فلاپ اسکینڈل ہر شوہر اپنی بیوی کو سناتا ہے' ٹین ایج میں ہر لڑکا کسی لڑکی کو محبت سے زیادہ فلرٹ پہ بلیو ہوتا ہے مگر یہ سب زیادہ عرصہ نہیں چلتا' ان سب کرتوتوں کی ہیپی اینڈنگ ہم جیسی کسی ایک آدھ پہ ہو جاتی ہے۔" راشد کی مسز سعدیہ نے کولڈ ڈرنک پیتے جیسے ناک پر سے مکھی اڑائی۔ عائلہ تب سے چپ چاپ انہیں سن رہی تھی۔

"سعدیہ از رائٹ! اب تم عمیر بھائی کی مثال لے لو' تم اپنے شوہر کے فلرٹ کا رونا رو رہی ہو اور ان کی تو بہت زبردست داستان محبت تھی ماہین سے' اچھے خاصے مجنوں ہوا کرتے تھے۔ پھر کیا ہوا؟ ماہین چھوڑ کے چلی گئی' عائلہ بھابھی آگئیں' پرانی کہانی ختم' نئی شروع' دیٹس اٹ۔" آذر کی مسز نے نہ جانے کتنے سالوں سے دبی ہوئی چنگاری کو مثال کے ذریعے ہوا دے دی تھی۔ اس چنگاری نے عائلہ کا پورا بدن دہکا دیا۔ اس نئے ذکر پر رنگت متغیر ہو گئی تھی۔ اس کے کان سائیں سائیں کرنے لگے تھے۔

"آپ اسے سمجھائیے نا عائلہ بھابھی۔" سعدیہ نے بے حس و حرکت عائلہ کو ٹھوکا دیا۔

"ویسے سچ سچ بتائیں' عمیر بھائی نے اپنی فلاپ اسٹوری ضرور سنائی ہوگی' آپ کا کیا رسپانس تھا؟ آج سعد مجھے بتا رہے تھے کہ عمیر چھ سال بعد کسی پارٹی میں شرکت کر رہا ہے' وہ بھی بے حد اصرار پر' ورنہ جب ماہین ہوتی تھی' تب ان لیلیٰ مجنوں کا ہر جگہ ہونا لازم تھا۔ یہ خوامخواہ کے مہمان ہوتے تھے۔" وہ تینوں اب اپنی بھول بھال کر اس قصے میں چٹخارے لے رہی تھیں۔ ان کے پاس بیان کرنے کو بے شمار قصے تھے۔ عائلہ کے بولنے یا کچھ کہنے کی باری ہی نہیں آ رہی تھی۔ اس نے ہونٹوں پہ پھیکی سی مسکراہٹ سجانے پر اکتفا کر رکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

واپسی کا سارا رستہ بہت خاموشی سے کٹا تھا۔ گھر آ کے اس نے اپنے کمرے میں صوفے پہ سوئی ہوئی گل بانو کو جگا کر ٹیکسی میں بھیجا۔ باری باری دونوں نے کپڑے تبدیل کیے اور وہ حمزہ کے برابر لیٹ گئی' جبکہ وہ سگریٹ اور لائٹر لے کر ٹیرس پہ چلا آیا۔ سگریٹ سلگا کے لمبا سا کش لیا۔ ہوا کے سپرد کیے دھوئیں کے مرغولے میں بہت سی یادیں بھی بکھر گئیں۔

"کیا بات ہے ماہین؟ کچھ پریشان ہو۔" ریسٹورنٹ میں الگ تھلگ سی ٹیبل پہ بیٹھے اس نے تیسری بار پوچھا تھا۔ مگر وہ کچھ نہیں کہہ کر پھر سے ٹال گئی۔ وہ صبح سے اسے ملنے کو بلا رہی تھی۔ وہ میٹنگ میں مصروف تھا پھر ڈیلی گیشن آگیا۔ اسے بمشکل شام کو فرصت ملی تھی۔ جبکہ وہ اسے بلا کے اب چپ چاپ ہاتھ مروڑ رہی تھی۔ وہ بہت عرصہ سے ایک دوسرے کے واقف تھے۔ وہ بھلا کب یوں پریشان ہونے والی لڑکی تھی۔ ہر دم ہنستا مسکراتا' شوخ و چنچل سے انداز۔ وہ بولتے وقت کبھی بھی نہیں سوچتی تھی۔ اچھا یا برا ٹھک سے سامنے والے کے منہ پہ دے مارتی۔

"کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟ بتایا تھا میں نے میٹنگ اور پھر۔۔۔"

"ایسا کچھ نہیں ہے عمیر۔" اس نے فوراً اس کے خیال کی تردید کر دی۔

"آئی تھنک تم کچھ کہنا چاہ رہی ہو مگر کہہ نہیں پا رہیں' صبح سے شام ہو گئی مگر تم الفاظ نہیں ترتیب دے پائیں' کچھ بہت خاص۔"

اب کے اس نے صحیح طور پر اس کا چہرہ پڑھ لیا تھا۔ اسے حیرت تھی اس لبرل لڑکی پہ کیونکہ اس کی خاموشی

نے اس کے اندازے کا ثبوت دے دیا تھا۔ ان دونوں کے مابین خاصی بے تکلفی تھی۔ وہ اپنے مسائل شیئر کرتے ہوئے سوچتے تھے نہ ہی گھبراتے تھے۔

"پلیز ماہین جلدی سے اسٹارٹ پکڑو' کب سے اسکوائش کے گلاس دھرے ہیں' مجھے سخت بھوک لگی ہے' دوپہر میں لنچ بھی نہیں کیا تھا۔" عمیر نے دہائی دی۔

"ایکچوئیلی تم اپنے۔۔۔ پاپا کو لانے والے تھے۔" اس نے ہچکچاتے آغاز کر دیا تھا اب پھر لمبا توقف تھا۔

"حد ہوتی ہے۔" اس نے دل ہی دل میں خود کو ڈانٹا۔ اس بولڈ لڑکی کو اپنی حالت پر غصہ آنے لگا تھا۔

"ہاں میں نے پاپا کو تمہارے متعلق بتا دیا ہے' انہیں کوئی اعتراض نہیں' تم مجھے ٹائم دے دو' میں انہیں لے آؤں گا۔" اس نے بالآخر گلاس کو قریب کھسکا ہی لیا۔

"تم۔۔۔ اپنے پاپا کو۔۔۔ نہ لانا۔۔۔ کبھی بھی نہیں۔" اس نے "کبھی بھی" پہ خاصا زور دیا تھا۔ یہی ہچکچاہٹ تھی۔ صرف اس جملے کو ادا کرنے کا لمحہ عذاب بنا ہوا تھا۔

"کیوں؟" اسٹرا ہوا میں معلق ہو گیا تھا۔ اس کا "کیوں" بہت کھوکھلا تھا۔ چند روز پہلے تک ماہین اس معاملے کی وجہ سے اس کے سر پر سوار ہو رہی تھی۔

"ختم کرو اس سارے سسپنس کو' ایکس پلین کرو" اس کی طبیعت پہ غصہ عود آیا تھا۔ وہ یونہی اسے ہلکا پھلکا لے رہا تھا۔ اب باقی کا مرحلہ وضاحتی تھی۔ یہاں اسے ہچکچانا تھا نہ ہی رکنا۔ دلائل تو وہ سوچ کر آئی تھی۔

"یو نو عمیر' میں صاف گو اور حقیقت پسند ہوں' خلوص بھرے رشتوں میں مجھے جھوٹ درکنار' مبالغہ آرائی بھی پسند نہیں' میں تم سے بھی سچ بولوں گی۔" خاصا سوچ کر اس نے محبت بھرے رشتوں کی بجائے "خلوص" کا لفظ استعمال کیا تھا۔

"چند ماہ قبل' میری نیٹ پہ عفان سے دوستی ہوئی تھی۔ امریکہ میں رہتا ہے اس کی فیملی اور بھی کئی رشتے دار وہیں سیٹل ہیں' میرے لیے وہ ٹائم پاس کرنے کی حد تک بہت اچھا فرینڈ تھا مگر جب میں نے اسے تمہارے پرپوزل کا بتایا تو اس نے بھی جواباً" مجھے پرپوز کر دیا۔ میں حیران ہوں مجھے قطعاً" ایسی امید نہیں تھی مگر وہ واقعی میرے لیے سیریس ہے۔"

محتاط انداز میں بولتے ہوئے بھی وہ پرپوزل کے ذکر پر خاصی پرجوش ہو گئی تھی۔

"اس لیے تم اتنی ٹینشن لے رہی ہو' انکار کر دو' وہ محض ٹائم پاس دوست ہے' نیٹ پہ صرف دوستی کی جاتی ہے رشتے داری نہیں۔" جی تو اس کا چاہا تھا کہ ایک کھینچ کر تھپڑ اس کے منہ پر دے مارے مگر ضبط لازم تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہتے اس نے کہنیاں مضبوطی سے ٹیبل کی سطح پر جما دیں۔

"انکار کیوں؟ کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔" اس نے انتہائی رسان سے کہہ دیا تھا۔

"کیا یہ معقول وجہ کافی نہیں ہے کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو اور عنقریب ہم شادی کرنے والے ہیں۔" وہ بہت مشکلوں سے خود پر ضبط کیے ہوئے تھے۔ ورنہ وہ جس پرسکون لہجے میں اس کی محبت کا مذاق اڑا رہی تھی وہ اس کا حشر نشر کر دیتا۔

"لیکن عمیر' مجھے اس کا پرپوزل تم سے بہتر لگا' میں نے تمہیں صاف بتا دیا' تمہیں دھوکے میں نہیں رکھا' رہ گئی محبت تو یہ صرف چند دن کی راگنی ہوتی ہے' شادی کے بعد سارے جذبات نزلہ' زکام بن کر بہہ جاتے ہیں' پھر تم ٹھہرے بزنس مین دو جمع دو کرنے والے' وہ امریکن نیشنلٹی ہے' اس کے فیملی ممبر امریکہ کے حکومت وقت میں بھی ہیں اور یہاں پاکستان میں بھی' پولیٹکس میں ان کا اچھا خاصا ہولڈ ہے' اس کے انکل سابق منسٹر رہ چکے ہیں اور اس بار بھی ان کے چانسز پکے ہیں' پولیٹکل فیملی ہے فائدہ ہی فائدہ۔" اسی سوچ اور چمک دمک سے اس نے یہ فیصلہ لیا تھا۔ اسے عمیر کے جذبات اور غصہ کی قطعاً" پروا نہیں تھی۔ اپنے تئیں وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

"اگر تم اتنا بڑا اسٹینڈ اس کے امریکن ہونے پہ لے رہی ہو تو نو پرابلم میں اپنا بزنس وائنڈ اپ کر کے تمہارے ساتھ امریکہ شفٹ ہونے پہ تیار ہوں' میرے لیے تمہاری خوشی ہر چیز سے بڑھ کر ہے۔" اس نے بے بسی کا کڑوا گھونٹ بھر کر آخری تیر چلایا تھا۔ وہ اسے کھونے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ جان کر بھی کہ وہ بے وفا نکلی ہے۔

"فار گاڈ سیک عمیر! فرق اس کے امریکن ہونے میں نہیں بلکہ پولیٹکل فیملی کا ہے' اگر اس پوائنٹ سے ہٹ کر سوچا جائے تو تمہارے اور میرے بیچ صرف محبت ہی ایک اسٹرانگ ریلیشن بنتا ہے' آج کل اتنی بزی اور فاسٹ لائف میں ہمیں کب یہ احساس ہوتا ہے کہ ہمارے ہمراہ چلنے والا ہم سفر ہے' دوست' محبوب' شوہر یا پھر ہماری روٹین لائف کا حصہ۔" اس نے کندھے اچکا کر نادر خیالات کو چٹکی میں بیان کر دیا تھا۔ اسی پل عمیر رضا نے صدق دل سے دعا مانگی تھی کہ یہ لمحے جھوٹ ہو جائیں۔ بلاشبہ اسے اس لڑکی کے بولڈ اور کانفیڈنٹ ہونے پر بڑا فخر تھا۔ اس کی یہی صاف گوئی اس کا مان' غرور اور محبت سب کچھ چھین کر لے گئی تھی۔ وہ کانفیڈنٹ نہیں بلکہ اوور کانفیڈنٹ تھی۔ اس کے لہجے میں اپنے کیے پر کوئی شرمندگی نہیں تھی۔ اپنی اس نئی اچیومنٹ پہ فخر تھا۔ بہت آسانی سے اس نے عمیر رضا کی محبت کو یرطرف کر دیا تھا۔

لمبی سانس خارج کر کے اس نے اس کی خالی سیٹ کو دیکھ کر گلاس ونڈو سے باہر اترتی گہری رات پہ نظریں جما دی تھیں۔ یہ رات اس کے اندر کہیں اتر گئی تھی۔ اچانک وہ تیز گاڑی کے ہارن پہ چونکا تھا۔ سامنے والے گھر میں کوئی اتنی رات گئے آیا تھا۔ اس نے یادوں سے جلتی آنکھوں کو انگلیوں سے آہستہ آہستہ دبایا تھا۔ ساہن کے ساتھ اس آخری ملاقات کو وہ اکثر یاد کرتا تھا۔ سگریٹ کے آخری ٹکڑے کو جوتے تلے مسل کر وہ ٹیرس سے ہٹ گیا۔

✡ ✡ ✡

"پلیز حمزہ بیٹا تنگ نہیں کریں۔" عمیر نے چوتھی بار اسے بڑے پیار سے منع کیا تھا۔ کھانا کھا کے وہ ٹی وی آن کر بیٹھا۔ نیوز چینل پہ کرنٹ افیئر چل رہا تھا۔ وہ بہت انہماک سے مگن تھا مگر اس کی گود میں چڑھا حمزہ ہر دس' پندرہ سیکنڈ بعد ریموٹ کے بٹن پر انگلی رکھ کے چینل بدل دیتا۔

"حمزہ جان' پاپا کو کیوں تنگ کر رہے ہو؟ ادھر میرے پاس آؤ۔" وہ کچن سمیٹ کر ان کے پاس ہی آ بیٹھی۔ وہ کب سے عمیر کی آواز سن رہی تھی۔

"نن۔۔۔ ناں۔" اس نے ماں کو نفی میں سر ہلا کر منہ سے بھی انکار کر دیا۔

"اگر ماما پاس نہیں آنا تو پاپا کو۔۔۔"

"السلام علیکم۔" حسن کی سلام پر اس کی بات بیچ میں رہ گئی۔

"ماں بیٹے میں کوئی ناراضی چل رہی ہے۔" وہ اندر آتے اسے کہتے سن چکا تھا۔

"عمیر ٹی وی دیکھ رہے ہیں اور یہ بار بار چینل بدلتا جا رہا ہے' اسی لیے اپنے پاس بلا رہی تھی۔" اس نے مسکرا کے بیٹے کی شرارت بتائی۔ وہ عمیر سے مصافحہ کر کے بیٹھ گیا۔

"کھانا لگواؤں حسن۔"

"نہیں' میں کھانا کھا کے آ رہا ہوں' تم کو ضروری خبر دینی تھی' ابھی چلا جاؤں گا۔" اس نے کھڑی ہوئی عائلہ کو واپس بٹھانا چاہا۔

"چلو' گل بانو کو چائے کا کہہ کر آتی ہوں' حمزہ کا فیڈر بھی لے آؤں۔" وہ اس کے انکار کو خاطر میں نہ لاتی ہاتھ چھڑا گئی۔

"تمہاری جاب کیسی جا رہی ہے حسن؟ گھر میں سب خیریت ہے نا۔" عمیر' حمزہ کی شرارت سے اکتا کر ٹی وی بند کر کے حسن کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"جاب اور گھر بالکل ٹھیک ہیں۔" اس نے مودبانہ جواب دیا۔

"ہاں جلدی سے ضروری خبر بتا دو اور دادی اماں اور ابو جان کی بھی۔" فیڈر ٹیبل پہ رکھ کے اس نے

زبردستی حمزہ کو باپ کی گود سے اٹھایا جو پھر سے ٹی وی آن کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"وہ دونوں بھی خیریت سے ہیں دراصل دادی اماں نے میری شادی کی تاریخ طے کر دی ہے۔" اس نے ذرا جھجکتے ہوئے اپنی شادی کا بتایا۔

"سچ حسن' تاریخ بھی طے ہو گئی اور تم نے مجھے اس موقع پہ یاد نہیں رکھا۔" حیرانی اور خوشی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ شکوہ بھی کر دیا تھا۔

"انکل اور پھپھو پرسوں بغیر بتائے ہی آ گئے' سب نے اتنا اصرار کیا کہ میری سنی ہی نہیں گئی' وہ تاریخ لے کے ہی اٹھے۔"

"میں تمہاری شادی پہ ایک ہی شرط پہ آؤں گی بھئی اگر تم میرے بیٹے کو شہ بالا بناؤ گے تو۔" اس نے دودھ پیتے حمزہ کو گدگدایا۔ اس کو بھائی کی شادی کا بہت ارمان تھا۔ پھر اس کے آ جانے کے بعد دادی اور ابو بالکل اکیلے رہ گئے تھے۔ وہ تو کام پہ چلا جاتا تھا۔

"کیوں نہیں یار' مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے' میرا ایک ہی بھانجا ہے اور بھانجے کی اماں کو ہم ناراض کر نہیں سکتے۔" حسن نے مسکراتے ہوئے حمزہ کے بال بگاڑے۔

"عمیر بھائی پہ نیکر شرٹ والا شہ بالا کچھ عجیب سا نہیں لگے گا۔" اس نے جان بوجھ کر عائلہ کو چھیڑا۔ جو اپنے بیٹے کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں سنتی تھی۔

"نیکر شرٹ کیوں' میرا بیٹا ماشاء اللہ سے چلتا ہے' شیروانی پہنے گا شادی پہ۔" وہ دونوں اس کی بات پہ مسکرا دیے۔

"کون سی تاریخ رکھی ہے؟" اسے تاریخ پوچھنا جلد یاد آ گیا تھا۔

"اگلے مہینے کی اٹھارہ تاریخ۔"

"یعنی صرف بیس دن باقی ہیں اور آپ کی شادی کے ٹھیک چار روز بعد حمزہ کی دوسری سالگرہ ہے۔" اس نے انگلیوں پہ حساب لگا کر بتایا۔

"لاسٹ ٹائم تم لوگوں نے سیلیبریٹ نہیں کی تھی۔" گل بانو نے چائے لا کر اسے تھما دی۔ وہ دونوں پی چکے تھے۔

"ہاں اس دفعہ عائلہ کہہ رہی تھی تو میں نے بھی سوچا تھوڑی رونق ہو جائے گی' ہم نے اپنے بیٹے کی کوئی بڑی خوشی سیلیبریٹ نہیں کی' تم بھی اپنی مسز کے ساتھ آنا۔" عائلہ کی بجائے عمیر نے اسے بتایا۔

حسن کے جانے کے بعد وہ کمرے میں آ کے لیٹ گیا۔ عائلہ سوئے ہوئے حمزہ کو اس کے برابر لٹا گئی تھی۔ وہ باہر شاید کچن میں مصروف تھی۔

"کوئی مسئلہ ہے' آپ کب سے یونہی لیٹے ہیں؟" اس نے پریشانی سے استفسار کیا۔ وہ کافی دیر میں اندر آئی تھی۔ اس کے خیال میں عمیر سو گیا تھا۔ مگر وہ یک ٹک چھت کو گھورے جانے کہاں گم تھا کہ اس کے آنے کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔

"آں۔۔۔۔ نہیں۔" وہ یکدم چونکا اور پھر کروٹ بدل لی۔

"لائٹس بجھا دوں۔" وہ خالی اس کی پشت کو دیکھتی رہ گئی۔

"بجھا دو۔" کافی مدھم آواز تھی۔ وہ حمزہ کو سیدھا کر کے خود بھی لیٹ گئی۔

"سنو۔" اس نے ذرا سا رخ اس کی طرف موڑ کر پکارا تھا۔

"شش۔۔۔۔ شمعون پاکستان لوٹ آیا ہے۔" اندھیرے میں ابھری اس کی آواز عائلہ کا سینہ چیر گئی تھی۔

✲ ✲ ✲

عمیر' شمعون سے خود ملنے گیا تھا۔ اسے اس کے تاثرات اور حالات دونوں اچھے نہیں لگے تھے۔ وہ اس سے مل کر یہ نتیجہ نکال پایا تھا کہ اس سے کچھ بھی توقع رکھی جا سکتی ہے۔ شمعون نے چند روز میں آنے کا کہا تھا۔ عمیر کے دل کو دھڑکا لگ گیا تھا۔ اس کو خود سے زیادہ عائلہ کی فکر تھی۔ وہ تو حمزہ کے بغیر ایک پل نہیں کاٹتی تھی۔ وہ بھی کب ماں کا دور ہونا برداشت

کرتا تھا وہ عمیر سے بھی محبت کرتا تھا۔ جب وہ آفس جاتا تو مچل مچل کر روتا' ساتھ جانے کی ضد کرتا۔ مگر عمیر کے پاس صرف تب تک رہتا جب تک عائلہ آس پاس موجود ہوتی' ادھر وہ دوسری طرف گئی وہ بھی فٹ باپ سے بھاگ کر ماں سے جا چمٹتا۔ اس نے عائلہ کے رویے میں کبھی بھی اس کے لیے کوئی کمی دیکھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ تو اسے سگا اور اکلوتا بیٹا کہتی تھی۔

اب جب سے اس نے عائلہ کو بتایا تھا اس نے رو رو کے برا حال کر لیا تھا۔ عمیر نے اسے بہت حوصلہ تسلی دی تھی کہ کچھ بھی نہیں ہو گا۔ حمزہ ہمارے پاس ہی رہے گا۔ وہ اس کے اتنے دلاسوں پر چپ سی ہو گئی پھر حسن کی شادی کے ہنگامے تھے شادی میں صرف دس روز باقی تھے۔ وہ روز وہاں کا چکر لگاتی بڑی پھپھو مدد کے خیال سے جلد آ گئی تھیں۔ انہوں نے کافی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ شمعون کی آمد کا دھڑکا الگ سے تھا۔ وہ حمزہ کو ساتھ ساتھ لگائے پھرتی۔ اسے اکیلا لان تک میں نہ جانے دیتی۔

رات حسن کا فون آیا تھا۔ اس نے عائلہ کو لے کر جیولر کے پاس جانا تھا۔ اس نے حمزہ کو نہلا کر کپڑے پہنائے اور پھر خود نہانے چلی گئی۔

"آپ ابھی تک گئے نہیں۔" وہ شاور لے کر نکلی تو عمیر کو کمرے میں ٹہلتا پایا۔

وہ اس سے ضروری کام کے سلسلے میں باہر جانے کا کہہ رہا تھا۔

"نہیں چلا جاؤں گا' تم ایسا کرو اپنے بال سمیٹ کر' ڈرائنگ روم میں آ جاؤ۔" وہ رک کر الجھی ہوئی سی نظر اس کے دراز بالوں پہ ڈال کے نکل گیا۔ بالوں کو سلجھا کے بینڈ میں جکڑا اور سلیقے سے ڈوپٹہ اوڑھے وہ باہر نکلی۔

ڈرائنگ روم میں براجمان شخصیت اس کی سوچوں کے برعکس تھی۔۔۔۔۔۔ اپنی کانپتی ٹانگوں اور بے جان وجود کو قائم رکھنے کے لیے اسے دروازے کا سہارا لینا پڑا تھا۔

"السلام علیکم۔" شمعون نے فوراً اس کی حالت نوٹ کر لی تھی۔ سر جھکا کے بیٹھے عمیر رضا نے شمعون کے سلام پہ سر اٹھایا اور اس بت کو بغور جانچا۔

"وہ۔۔ اس طرح کرو' جا کر گل بانو کو دیکھو' کب سے چائے کا کہہ کر آیا ہوں' تم خود جاؤ اور حمزہ کو ادھر ہی بھیج دو میرے پاس۔" عمیر رضا کو لحہ بھر میں اس کی حالت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے سامنے آ کر جان بوجھ کر زور سے بولا تھا' ساتھ ہی اسے منظر سے ہٹانا مناسب لگ رہا تھا۔

"آپ' آپ؟ ذرا باہر آئیں۔" وہ کہہ کر تیزی سے پلٹ گئی۔

"اب کیا ہے؟" وہ کچن کے دروازے کے ساتھ لگ کے کھڑی تھی۔

"یہ کس لیے آئے ہیں۔؟ اگر یہ حمزہ کو لینے آئے ہیں تو ان کو صاف منع کر دیں' میں ہرگز اپنا بیٹا نہیں دوں گی' وہ میرا بیٹا ہے۔"

وہ ہچکیوں سے رو دی تھی۔ وہ بالوں میں ہاتھ پھیرتا چپ رہ گیا تھا۔ وہ اسے آنے سے کیسے روک سکتا تھا۔

"پلیز عائلہ وہ اسے لینے تھوڑی آیا ہے' مل کے چلا جائے گا۔" ابھی کچھ تو کہنا تھا۔ وہ اس سے زیادہ خود کو تسلی دے رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس موقع پہ آ جائے جبکہ حسن کی شادی تھی اور شادی کے چار روز بعد حمزہ کی سالگرہ تھی۔ جس کے لیے وہ دونوں بہت ایکسائٹڈ تھے شمعون کے ارادے نیک نہیں تھے۔

"وہ حمزہ کو نہیں لے کر جائے گا۔" وہ بڑی امید سے پوچھ رہی تھی۔

"شاید نہیں' جلدی سے چائے لے کر آؤ' میں حمزہ کو لے جا رہا ہوں۔" وہ اس کا کندھا تھپک کر رام کر گیا وہ ٹرالی لے کر آئی تو حمزہ' شمعون کی گود میں تھا۔ وہ اس سے آہستگی سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ عمیر بہت بے بسی سے یک ٹک انہیں دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ ماں کو سامنے پا کر وہ شمعون کی گود سے اترنے کو مچلا تھا۔ اس نے اسے چھوڑ دیا۔ بیٹے کو سینے سے لگا کر اسے پرلطیف ٹھنڈک کا احساس ہوا تھا۔

"ماما۔۔۔ یہ۔۔۔" وہ ٹرالی پہ انگلی دھرے پوچھ رہا تھا۔ وہ دو سال کا تھا اور باتیں بھی کرتا تھا۔

"بیٹا چائے۔" اس نے مختصراً" جواب دیا۔

"ماما۔۔۔ آئے (چائے) پاپا۔ آئے۔" اس کے پاپا کہنے پر شمعون نے اچانک دیکھا مگر وہ عمیر کو کہہ رہا تھا۔

"ماما' پاپا آئے۔۔۔ دے پاپا آئے۔" وہ اس سے عمیر کے لئے چائے مانگ رہا تھا۔ تاکہ وہ خود اسے دے کر آسکے۔ عمیر کے چھوٹے چھوٹے کام وہ خود کرنے کی ضد کرتا تھا۔

"یہ لو بیٹا' دھیان سے۔" عائلہ نے اس کے چھوٹے سے ہاتھوں میں پلیٹ میں کپ رکھ کے تھما دیا۔

"تھینک یو' گڈ بوائے۔" اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے بڑھ کر کپ پکڑ لیا۔ اس نے شمعون کو چائے پکڑائی۔ ان لمحوں کی خاموشی ان دونوں کی رگوں پہ سرائیت کر رہی تھی انہوں نے کبھی بھی اس کی واپسی یا پھر بیٹے کے مطالبے کا تصور ہی نہیں کیا تھا۔ وہ شاید یہ بھی بھول چکے تھے کہ یہ ان کا سگا بیٹا نہیں۔

کسی کو خلوص نیت اور سچی محبت کا دیا گیا ایک پل بھی ہمیشہ کی خوبصورت یاد بن جاتا ہے یہ تو پھر دو سال کا عرصہ تھا۔

"پاپا۔۔۔ اور۔" اس کا اشارہ ٹرالی میں رکھے دوسرے لوازمات کی طرف تھا۔ ارد گرد میں صرف اس اکیلے بچے کی آواز گردش کر رہی تھی جس کے یہ تینوں نفوس ہی امیدوار تھے۔

"نو تھینکس بیٹا' آپ کو چاہیے تو ماما سے لے لو۔" عمیر نے اسی نرمی سے انکار کر دیا۔ وہ شمعون کے بولنے کا منتظر تھا۔ یہ معنی خیز چپ برداشت سے باہر ہو رہی تھی۔ حمزہ' شمعون کے سامنے رکھی ٹرالی کے قریب جاکے نیچے قالین پر بیٹھ گیا۔ ٹرالی کے نچلے حصے کی پلیٹوں میں سے ایک ہاتھ میں تین بسکٹ اور دوسرا ہاتھ پورا نمکو کا بھر لیا۔ کہنی سے ٹرالی کا سہارا لے کر کھڑا ہو کے اس نے دونوں چیزیں عمیر کی گود میں جاکر ڈال دیں۔

"حمزہ بہت ہوشیار اور سمجھ دار ہو گیا ہے۔" شمعون نے تمہید باندھ لی تھی۔

"ہاں۔" وہ بلاوجہ ہی مسکرا دیا۔

"میں نے۔۔۔ یہ پونے دو سال حمزہ کے بغیر بہت مشکل سے کاٹے ہیں۔ انگلینڈ چلا گیا تھا' کئی دفعہ آنے کی کوشش کی مگر۔۔۔" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس مگر کے آگے اس کی مجبوریاں تھیں یا جانے کیا؟

"آپ نے کبھی فون کر کے بیٹے کی خیریت بھی دریافت نہیں' کبھی اس کو دیکھنے کو بھی جی نہیں چاہا' آئی مین نیٹ بھی تو تھا' حتی کہ آپ نے جاتے وقت اسے ملنا یا ہمیں اطلاع دینا بھی گوارا نہ کیا۔" عائلہ نے تمہید سن کر اس پہ چڑھائی کر دی تھی۔ وہ اس کی موجودگی ہی بمشکل برداشت کیے ہوئے تھی۔

"وہ۔۔۔ دراصل جب حمزہ کو یہاں چھوڑ کر گیا تو چند ہفتوں بعد میری مدر نے اپنی بہن کی بیٹی ثمین سے انگلینڈ میں' میری شادی کروا دی۔" اس نے خفت سے انتہائی نامعقول وجہ بتائی۔ اس کی شادی کے ذکر پہ عمیر کے لب بھینچ گئے تھے وہ اس کی بہن کی محبت کا دم بھرتا تھا مگر اس کے مرنے کے چند مہینے بعد ہی بیاہ رچا لیا تھا۔

"آپ اپنی نئی نویلی دلہن میں اس قدر انوالو ہو گئے کہ اپنے نومولود بچے کو بھی فراموش کر دیا۔" اس کا مزاج بہت تلخ ہوتا جا رہا تھا۔ شمعون بھیگی بلی بن گیا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ جو وہ کہنے آیا ہے وہ اتنا آسان نہیں ہوگا۔

"خیر تب نہیں تو اب سہی' آپ جب تک یہاں ہیں حمزہ سے ملنے آسکتے ہیں۔" اس نے کندھے اچکا کر اپنے تئیں بڑی سخاوت کا مظاہرہ کیا۔ یہی جملہ بول کر وہ اس کی آمد کا اصل مقصد جاننا چاہتی تھی۔

"کیا مطلب ہے آپ کا بھابھی یہ میرا بیٹا ہے' میں چاہے اس فراموش کر دوں' میرا ہی خون رہے گا' مجھے اس سے ملنے کی کسی کی اجازت کی قطعاً" ضرورت نہیں ہے۔" اسے عائلہ کی طنزیہ گفتگو بہت چبھ رہی تھی اس نے خاصے تپے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"خوش نصیب ہیں کہ اس کی رگوں میں آپ کا خون دوڑ رہا ہے ورنہ اجازت تو کیا اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے تھے' دوسرا یہ کہ یہ صرف آپ کا نہیں' ہمارا بھی بیٹا ہے۔" اس کے الفاظ اسے سوئیوں کی طرح چبھے تھے وہ طیش کے مارے کھڑی ہو گئی۔ تب سے چپ ان کی گولہ باری دیکھتا عمیر جھٹ سے عائلہ کی طرف بڑھا۔ اسے مسئلہ بڑھ جانے کا اندیشہ تھا۔ شمعون ہر پہلو پہ بہت سوچ سمجھ کر آیا تھا اسے عائلہ سے اس رویے کی قطعاً" توقع نہیں تھی۔ اس کے ذہن میں کہیں سوتیلی ماں اور دوسری عورت کا تصور موجود تھا۔ وہ بھی جان گیا تھا کہ کچھ بھی ممکن ہو سکتا ہے یوں گھگھیانے سے اس مسئلے کا حل نہیں نکلے گا۔ اسے یوں بیٹے سے غفلت اور اتنی جلدی دوسری شادی کی غلطی کا بھی احساس تھا۔ اس نے بڑی نرمی سے عائلہ کو واپس بٹھا دیا تھا۔

"عمیر میں نے ماما کی بے حد ضد پر ثمین سے شادی کی تھی۔ اس پونے دو سال کے عرصہ میں میں اس کی ضدی اور ہٹ دھرم طبیعت سے اچھی طرح واقف ہو چکا ہوں۔ وہ میری زندگی کا خوفناک باب ہے جس سے میں شاید چھٹکارا بھی نہیں پا سکتا۔" وہ بہت ڈھیلا پڑ چکا تھا۔ اب اپنی رام کہانی سنا رہا تھا۔

"ثمین کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں وہ۔ وہ ماں نہیں بننا چاہتی' میری زندگی بہت بے سکون ہو کے رہ گئی ہے۔ میں اپنے لیے کوئی سکون کی راہ تلاش کرتا پھر رہا ہوں' میں۔ میں حمزہ کو واپس لے جانا چاہتا ہوں۔" اس نے وہ مدعا بیان کر ہی دیا۔ جس کا انہیں دھڑکا تھا۔ عائلہ سمیت عمیر رضا کو بھی لگا جیسے بھاری چھت اپنا وزن لیے ان کے سروں پہ آگری ہو۔

"واہ مسٹر شمعون' آپ کی ماں آپ کے چند روز کے' بن ماں کے بیٹے کے لیے اپنی سوشل ایکٹوٹیز قربان نہیں کر سکتی۔ آپ کے گھر نوکروں کی فوج ہے مگر اس نومولود بچے کی کوئی کیئر نہیں کر پاتا تب بقول ڈاکٹرز کے مرتے ہوئے بچے کو زندہ رکھنے والے لاسٹ آپشن ہم تھے۔ تب بھی آپ بے بس تھے اور اسے ہماری جھولی میں ڈال دیا پھر آپ کی ماں نے بے بس کر کے دوسری شادی کروا دی' اب آپ کی بیوی ماں بننے پہ راضی نہیں تو آپ کو بھولا بسرا بیٹا یاد آگیا یعنی اگر وہ ماں بن جاتی تو یقیناً" اسے لینے نہ آتے' آپ کو بیٹا نہیں' بلکہ اپنی تنہائیوں سے فرار کے لیے کسی دوسرے وجود کی ضرورت ہے' آپ کو شرم آنی چاہیے اپنی بزدلی پر جسے آپ بے بسی اور مجبوری کا نام دے کر چھپاتے پھر رہے ہیں۔" اس نے سانس لینے کا توقف کیا۔

"حمزہ ہمارا بیٹا ہے اور آپ اسے ہرگز نہیں لے جا سکتے ابھی نہ پھر کبھی۔" وہ بہت بپھری ہوئی تھی قطعی لہجے میں تنبیہہ کرتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ شمعون نے بھی زیادہ نرم پڑنا مناسب نہیں سمجھا وہ بھی کھڑا ہو گیا۔

"بہر حال آپ کچھ بھی فرض کرتے رہیں' حمزہ میرا بیٹا ہی رہے گا' صرف چند روز کے لیے چھوڑ کر جا رہا ہوں تاکہ آپ اپنی ذہنی حالت درست کر لیں اور خود کو تیار بھی۔" وہ بھی کڑے تیوروں سے گھور تا لحاظ کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

"میری ذہنی حالت کا ابھی اندازہ نہیں ہے آپ کو' آپ اپنے بیٹے کو ہمارے پاس امانت نہیں رکھوا کے گئے تھے بلکہ ہمیشہ کے لیے سونپ گئے تھے اور ماریہ نے آخری وقت میں' اس کی دیکھ بھال کی تاکید مجھے کی تھی۔"

"سب کچھ یاد ہے مجھے' آپ سے یاد دہانی کروانے نہیں آیا بلکہ آپ لوگوں کو یاد دہانی کروانے آیا ہوں کہ میں حمزہ کا باپ لوٹ آیا ہوں' مائنڈ اٹ۔" شمعون نے بپھرتے ہوئے اس شور کے خوف سے عمیر کی گود میں دبکے حمزہ کو جھپٹنا چاہا۔ مگر اس سے پہلے عائلہ نے اسے عمیر سے چھین لیا۔ حمزہ کب سے خوفزدہ تھا۔ اب اس چھینا جھپٹی پر رونے لگا۔ بالآخر عمیر اڑے ہوئے حواسوں سے دونوں کے بیچ آگیا۔ ورنہ ابھی حمزہ کی کھینچا تانی شروع ہو جاتی۔

"شمعون یار وہ عورت ہے' جذباتی ہے' تم عقل سے کام لو' یہ سب اتنا اچانک ہو رہا ہے۔ ہمیں سوچنے کا موقع دو۔" اس نے شمعون کو مضبوطی سے پکڑ کر واپس بٹھایا۔ جو قابو سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔

"جاؤ یہاں سے اب نہ ادھر آنا' چپ کرواؤ حمزہ کو۔"

اس نے تیز تیز سانس لیتی' شمعون کو نفرت سے گھورتی عائلہ کی توجہ بیٹے کی طرف دلائی۔

"جا رہی ہوں مگر آپ اس سے کہہ۔"

"میں تمہیں کہہ رہا ہوں جاؤ۔" وہ گلا پھاڑ کے دھاڑا تھا۔ وہ کانپتی ہوئی اسے سینے سے بھینچے باہر دوڑ گئی۔

☼ ☼ ☼

شادی کی پہلی رات سے لے کر اب تک صرف وہی ٹیرس پہ کھڑا ہوتا آیا تھا۔ اب اس کے ساتھ عائلہ بھی شامل ہو گئی تھی۔ جیسے ابھی رات کے اگلے پہر بھی ایک دوسرے سے بے نیاز' ذرا فاصلے پہ الگ تھلگ سے کھڑے تھے۔ شمعون نے صرف برتھ ڈے کی رات تک کی مہلت دی تھی۔ اسی رات حمزہ کو اپنے ساتھ لے جانا تھا۔ وہ بہت روئی تھی' لڑی تھی۔ ان دونوں کے مابین طویل بحث ہوئی جو بالکل لاحاصل رہی۔ وہ ماں تھی اور عمیر باپ' پھر وہ اس کی اکلوتی' لاڈلی بہن کا بھی رشتہ تھا۔ وہ بھی حمزہ سے بہت محبت کرتا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ مرد تھا اور عائلہ عورت اسے اپنے جذبات پہ اختیار تھا۔ اس نے اس مسئلے پر چاروں اور سوچا تھا۔ ایک بار شمعون کے گھر جا کے اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر التجا بھی کی تھی۔ مگر وہ بھی کسی طور راضی نہیں تھا۔ وہ اس کے بیٹے کو زبردستی رکھنے کے حق دار نہیں تھے اگر وہ ایسا واویلا کرتے تو وہ یقیناً "کورٹ تک جاتا اور قاعدے قانون میں جذبات و احساسات کی کوئی جگہ نہیں ہوتی

اس کے پاس.
ہر طرح کا اختیار تھا اور ان کے پاس صرف سچے کھرے جذبات۔

وہ حقیقت کو مد نظر رکھتے ہوئے تھا اور عائلہ ممتا کو۔ وہ چاہتی تھی کہ عمیر اس لڑائی میں اس کا ساتھ دے' اس کا ہمنوا بنے' اس نے اسے بہت سمجھایا تھا کہ یہ سب سود ہو گا۔ سارے جھگڑے اور سمجھانے کا یہ نتیجہ نکلا تھا کہ وہ اس ساری صورت حال کا اور مزید بگڑنے کا ذمہ دار صرف اسے ٹھہرانے لگی تھی ان کے رشتے میں ایک محسوس کیے جانے والا کھنچاؤ در آیا تھا۔ اختلاف رائے نے ان کے مابین بہت سے فاصلے حائل کر دیے تھے۔ وہ اس معاملے کو مل بیٹھ کر سلجھانے کی بجائے یکسر لاتعلق ہو گئے تھے۔ عائلہ کا اپنا موقف اور شمعون کا باپ ہونے کی حیثیت سے اپنا نقطہ نظر۔ دونوں ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔ عمیر ان دونوں کے بیچ پس کر رہ گیا تھا۔ عائلہ کی ممتا اور عمیر کی حقیقت پسندی۔ مختلف فیصلوں نے ان دونوں کو اپنے اپنے خول میں بند کر دیا تھا۔

"آپ اسموکنگ کیوں کرتے ہیں؟؟" اس کے چوتھی سگریٹ سلگانے پہ اس نے چپ کا قفل توڑا۔

"کبھی کبھار ہی کرتا ہوں۔" اس نے سرمئی دھواں فضا کے سپرد کیا۔

"ہاں مگر چین اسموکرز کی طرح' کرتے کیوں ہیں؟؟" اپنی طرف آتے دھوئیں کو ہاتھ سے اڑاتے اس نے دوبارہ سوال دہرایا۔

"کہتے ہیں سکون ملتا ہے۔" اس نے سنی سنائی دہرائی۔

"اچھا' واقعی۔" وہ طنزیہ ہنسی۔ اس نے بغور اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

"نہیں یہ انسانی سائیکی ہے کہ ہم اپنی بے بسی اور پریشانیوں سے چھٹکارا پانے کے لیے کسی بھی شے کو ——— سکون کے طور پر منتخب کر لیتے ہیں۔ یا پھر اپنے ذہن پر طاری کر لیتے ہیں جیسے کہ تمہیں حمزہ اپنے لیے سکون کا گہوارہ لگتا ہے۔" اس نے اس کی دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"آپ واقعی ایسا سوچتے ہیں۔" اب وہ بھی اس کی طرف پلٹی۔

"تمہارے اور میرے سوچنے سے کچھ نہیں ہوتا' شمعون عمل کرنے والا ہے۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ اپنے آپ کو تیار رکھو۔" اس نے چٹکی بجا کر راکھ جھاڑی تھی اور نیچے دیکھنے لگا۔

"اپنے مشورے اپنے پاس رکھیں۔ میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ حمزہ کو کسی بھی قیمت پہ واپس نہیں کروں گی' میری اولاد ہے وہ' میں نے ان ہاتھوں سے اسے پالا ہے۔" وہ اس کے قریب آئی ہاتھ آگے کیے رونے لگی تھی۔ وہ اس کی روتی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

"اس کے لیے راتوں کو جاگی ہوں' اس کی تکلیف کو' یہاں' اپنے دل میں محسوس کیا ہے' میں نے تو اس کے گندے کپڑے بھی کبھی گل بانو یا کسی اور نوکر سے نہیں دھلوائے' اسے قدم قدم چلنا سکھایا' رات جب تک اس کے سر کے نیچے بازو اور اسے اپنے سینے سے نہ لگاؤں مجھے نیند نہیں آتی۔ میں نے کبھی اس سے پہلے اپنے منہ میں نوالہ نہیں ڈالا' اس کے ذہن کی صاف سلیٹ پہ لفظ رقم کیے اس نے پہلی بار مجھے ماں پکارا' میں ماں نہیں بنی عمیر مگر جب اس نے مجھے ماں کہہ کر پکارا تو مجھے یوں لگا کہ پیروں تلے جنت آ گئی ہے' پلیز عمیر میرا بیٹا مجھ سے مت چھینو' میں مر جاؤں گی عمیر! مجھے بچا لو۔" وہ اچانک ـــ زار و زار رونے لگی تھی۔ اس نے بے اختیار اس کے گرد بازو لپیٹ کر اسے سینے سے لگا لیا۔ اس کی آنکھوں سے دو قطرے اس کے بالوں میں جذب ہو گئے۔ وہ اس کے احساسات سے بخوبی آگاہ تھا۔ ان پونے دو برس میں اس نے کبھی حمزہ کے لیے اس کی محبت میں دکھاوا یا کھوٹ محسوس نہیں کی تھی۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ سارے حالات اس کی خواہشات کے مطابق بدل دیتا۔

"تم کچھ کرو گے نا عمیر۔" وہ اس کے سینے سے الگ ہو کر ہاتھ پکڑے پوچھ رہی تھی۔ لب تسلی دینے کا وقت بھی گزر چکا تھا۔ اس کا شدت سے جی چاہا ان آنکھوں کی امید کبھی نہ ٹوٹنے دے۔

"وہ نہیں مانے گا عائلہ' ہمیں ماننا پڑے گا۔" اس نے رک رک کر بالکل سچ کہہ دیا وہ اس کے ہاتھ جھٹک کر الگ ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں امید کی جگہ تپش در آئی تھی۔

"وہ نہیں مانتا یا تم نہیں مانتے عمیر رضا' جو حق کے اسباق تم مجھے پڑھاتے ہو' وہ میرے پلے نہیں پڑتے تم مردوں کو صرف حق وصولنا آتا ہے اور فرض کی ادائیگی کے وقت تم لوگ من گھڑت بہانے گھڑ کر گڑگڑاتے ہو' جب اس ذلیل' کمینے انسان نے باپ ہونے کا فرض ادا نہیں کیا تھا تو آج حق کا دعوے دار کیوں ہے؟ اور تم عمیر رضا جو ساتھ دینے پر حقیقت پسندی کی مہر لگا رہے ہو یہ بھی جھوٹ ہے کیونکہ تمہاری فطرت بھی صرف وصولنے کی ہے' اسی لیے تمہیں وہ سچا لگ رہا ہے' تم نے بھی تو ہمیشہ میرے فرض سے جان چھڑائی ہے۔ میں بھی کس پتھر سے سر پھوڑ رہی ہوں تمہیں میرے جذبات کی کبھی بھی پروا نہیں رہی۔ اگر تمہارا اور میرا رشتہ اب تک قائم ہے تو صرف میری برداشت کی بدولت ورنہ تم نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ میرا قصور یہ ہے کہ میں خاموش رہی' کبھی احتجاج نہیں کیا اور تم میری اس خاموشی کا ناجائزہ فائدہ اٹھاتے رہے' کبھی ہنس کر بات نہیں کی مجھ سے میری ذات کا احوال تک نہیں پوچھا نہ ہی کبھی اپنی ذات تک کی رسائی کا کوئی اختیار مجھے دیا۔

میں تو اتنی بد نصیب ہوں کہ اپنی تکلیف ـ تمہیں یعنی اپنے شوہر کو بتانے کے لیے سو بار سوچنا پڑتا ہے۔ تم یہ جو فائلوں میں سر دے کے مجھے نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے ہو میں اندھی نہیں ہوں' سب دیکھ سکتی ہوں تمہاری معروفیات یا پھر گریز۔ ہم دونوں میاں بیوی اور یہ ہمارا گھر نہیں بلکہ ہم دونوں انجان مسافر اور یہ ٹرین ـ یہ دونوں انجان مسافر لمبے سفر کی طوالت کو کاٹنے کے لیے یونہی ادھر ادھر کی باتیں بھی کرتے ہیں۔ لنچ کھانے میں سے مروتاً" ایک دوسرے سے صلح بھی مارتے ہیں اور ایک کہیں

ضرورتا" اٹھ کر چلا جائے تو اس کے سامان اور جگہ کا دھیان بھی رکھتے ہیں اور اگر وہ انجان مسافر ہم سے پہلے کسی اسٹیشن پر اتر جائے تو ہمیں اپنی منزل پر پہنچنے تک اس سے بچھڑنے کا قلق رہتا ہے۔ یہ ہے میرے رشتے کا نقشہ 'تمہاری اس بے اعتنائی کی جو پوشیدہ وجہ ہے وہ بھی میں جانتی ہوں 'پوچھا اس لیے نہیں کہ راکھ میں بھی چنگاری چھپی ہوتی ہے۔" اس نے آخری جملہ چبا چبا کر بولا تھا۔

وہ اسے کڑے تیوروں سے گھور رہی تھی۔ اس نے سارے حساب بے باق کردیئے تھے۔ وہ منہ کھولے اس کے طنز میں بجھے تیر کھا رہا تھا۔ اس ایک ایک لفظ اس کی سماعتوں کے لیے بہت بھاری تھا۔ وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ بظاہر بے نیاز نظر آنے والی اتنی گہری نکلے گی۔ اسے اپنے خراب رویے کا احساس شروع میں بہت ہوتا تھا۔ اس نے کوشش کی خود میں بدلاؤ لانے کی مگر عائلہ کی خاموشی نے اسے بہت حوصلہ دیا تھا۔ جو کچھ بھی ہوا جس کا ذمہ دار وہ اسے ٹھہرا رہی تھی۔ یہ بالکل غیر ارادی سرزد ہوتا گیا۔ اس نے کبھی جان بوجھ کر اس کی حق تلفی نہیں کی تھی۔ حمزہ کی جس طرح سے اس نے نگہداشت کی وہ اس کا ہمیشہ سے مشکور و ممنون تھا مگر کہا کبھی نہیں 'یہ نہ کہنا ہی آج اس کی سب سے بڑی خطا بن گیا تھا۔ اب تو فیصلے کا وقت نزدیک تھا۔ اک دوسرے کو وضاحتیں 'صفائی یا اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کا نہیں۔

"مگر حمزہ میری اولاد ہوتا یا میں ماں بنی ہوتی تو آج اسے مجھ سے کوئی چھیننے نہ آتا' میں حمزہ واپس کردوں گی مگر اس سے پہلے تم میرے تین سال کا حساب دو' اس شمعون احمد سے کہو میرے یونے دو سال واپس لوٹا دے۔" کتنی حسرت تھی اس کے لہجے میں۔

"تین سال۔" اس نے گم صم سا دوہرایا۔ تین سال گزر گئے اسے پتا ہی نہیں چلا۔ اسے مرد ہو کر یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ اپنی اولاد کا سگا باپ نہیں بن سکا۔ اس نے کبھی اپنی اولاد یا بچے کے متعلق سوچا ہی نہیں۔ عائلہ نے اس کی توجہ کس طرف دلادی تھی یعنی وہ بھی حمزہ کو ہی پاکر مطمئن تھا۔ اس کمی کی طرف کبھی دھیان ہی نہیں گیا۔ وہ شاید یہ الزام بھی اس پہ دھر رہی تھی۔

"ہم۔۔۔ مانتا ہوں مجھ سے یہ سب انجانے میں سرزد ہوگیا' میں خطاکار ہوں میں تمہارا شوہر' تم سے معافی مانگ لیتا ہوں' جو ہوا جانے دو' ہم دونوں نئے سرے سے زندگی کا آغاز کریں گے بہت محبت اور صاف نیت کے ساتھ 'ایک دوسرے کا سہارا بن کر۔" اس کی اتنی لمبی تقریر کے جواب میں وہ بھی بہت کچھ کہہ سکتا تھا۔ وہ بہت نرم اور مٹھاس بھرے لہجے میں اس ہٹ دھری سے ہٹانا چاہ رہا تھا۔

"دنیا کی کوئی ایسی ماں نہیں ہے' جو شوہر کو حاصل کرنے کے لیے اپنی اولاد کی قربانی دے دے۔ اس کا انداز سخت اور قطعی تھا۔ وہ اپنے فیصلے سے ایک انچ ہی ہٹنے کو تیار نہیں تھی۔ اسے ہر وہ شخص اپنا دشمن لگ رہا تھا جو شمعون کی طرف داری کرتا۔

"نہیں ہے وہ تمہارا بیٹا۔" ضبط کرتے کرتے آخر وہ بھی چیخ پڑا تھا۔ ہر طرح سے سمجھا کے دیکھ لیا تھا۔ اس پہ کوئی بھی نرمی اثر نہیں کر رہی تھی۔ وہ بھی پھٹ پڑا تھا۔

"نہیں ہے وہ تمہاری اولاد 'جس کی ہے اسے واپس کرنا ہوگی' جب تمہاری اولاد ہوگی تو تم سے کوئی شمعون چھیننے نہیں آئے گا' میں خود اسے برتھ ڈے کی رات اسے لوٹا کے آؤں گا اور خبردار اگر اب ایک بھی جذباتی لفظ منہ سے نکالا۔" جتنی وہ شدت سے چلایا تھا وہ سہمی نہیں تھی بلکہ شدید حیرت سے آنکھیں کھولے اسے تکے جا رہی تھی۔

"میں اس کے لیے اسٹینڈ لوں گی' مجھے تمہاری ضرورت ہے نہ۔۔۔ پروا۔" وہ یونہی اسے دیکھتی اپنی مرضی جتا کر مڑ گئی تھی۔ ساری بحث سمٹ گئی تھی۔

وہ اندر چلی گئی تھی۔ اس کی جگہ خالی ہوگئی تھی۔ اس نے اپنے اندر کی کھولن دباتے ہوئے دونوں ہاتھوں کو مضبوطی سے ٹیرس کی ریلنگ پہ جمادیا اور پھر سگریٹ اور لائٹر نکل کر سگریٹ سلگانے لگا۔

یوں تو تم روشنی قلب و نظر ہو لیکن
آج وہ معجزہ دکھلاؤ کہ کچھ رات کٹے

☆ ☆ ☆

اس رات کے بعد ان کے مابین دوبارہ کوئی بات نہیں ہوئی نہ حمزہ شمعون کی نہ ہی عام روٹین کی۔ وہ ایک دوسرے سے یکسر لاتعلق اور بے گانہ ہوگئے تھے۔ دونوں ہی مخاطب کرنے کی کوشش نہ کرتے وہ اس کی خاموشی سے بالکل اندازہ نہیں لگا رہا تھا کہ اس کا آگے کا لائحہ عمل کیا ہے۔ وہ سنبھل گئی ہے یا مزید بکھر گئی ہے۔

اس کی اپنی اذیت بھی کچھ کم نہ تھی۔ جسے وہ مردانگی کی آڑ میں چھپا لینے کی کوشش کرتا رہتا۔ وہ اب اس کی طرح رو نہیں سکتا تھا۔ آفس میں بھی کسی کام میں جی نہ لگتا۔ وہ ریوالونگ چیئر پہ سامنے فائل کھولے لیپ ٹاپ آن کیے گم صم سا بیٹھا رہتا۔ فائلوں کا ڈھیر لگ جاتا وہ پڑھے بغیر سائن کر دیتا یا پھر آفس سے ملحقہ ریسٹ روم میں چلا جاتا۔

وقت پر لگا کر اڑ گیا تھا۔ عین وقت پر دھماکہ ہوگا یا سمجھوتہ 'وہ بالکل بے خبر تھا'

اس نے کتنے روز بعد اسے مخاطب کر ہی لیا تھا۔

"کل حسن کی مہندی ہے لیکن میں حمزہ کو لے کر آج ہی چلی جاؤں گی۔" وہ بال بنا رہا تھا جب اس نے اطلاع دی۔ عمیر نے آئینے میں سے اس کے نڈھال سراپے کو بغور دیکھا۔ وہ ہمیشہ کہیں آنے جانے کے لیے اجازت مانگا کرتی تھی۔

"ہوں۔" اس نے ہنکارا بھرا۔ وہ فورا" کمرے سے باہر چلی گئی۔ وہ اس کی جاتی پشت کو تکتا رہ گیا۔ اس نے خود گفتگو کا آغاز کیا تھا وہ بھی اس بہانے اس سے کچھ باتیں کرنا چاہ رہا تھا مگر اس نے مزید موقع ہی نہیں دیا تھا۔ وہ اپنا مطلوبہ جواب لے کر یہ جا وہ جا۔ وہ یونہی اس سے کتراتی پھر رہی تھی۔ جہاں وہ ہوتا وہاں سے ہٹ جاتی۔ بلاوجہ ہی کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتی۔ اس کی نظروں سے اوجھل۔ اس نے نہ تو عمیر کو آنے کا کہا تھا نہ ہی یہ پوچھا تھا کہ وہ کب آئے گا؟

اگلے دن وہ ناشتے کی ٹیبل پہ تنہا بیٹھا تھا۔ وہ اس کی ناراضی کے باوجود ٹیبل پہ ضرور آتی تھی۔ اس نے تین سالوں میں کبھی بھی اکیلے ناشتا یا ڈنر نہیں کیا تھا۔ اس کے کل آفس لوٹنے سے قبل وہ جا چکی تھی شادی کے بعد وہ کبھی بھی اپنے گھر ٹھہرنے نہیں دے گئی۔ اس کی طرف سے کبھی پابندی نہیں لگی تھی وہ خود ہی نہیں رکتی تھی۔

رات ٹیرس پہ کھڑے یا بستر پہ کروٹیں بدلتے گزری تھی۔ اب اس کا ناشتا کرنے کا بالکل موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ اسی لیے وہ سامنے دھرے لوازمات کو گھور رہا تھا۔ تبھی اس کے موبائل کی بیپ ہونے لگی۔

"ہیلو السلام علیکم عمیر بھائی۔" دوسری طرف ہشاش بشاش آواز حسن کی تھی۔

"وعلیکم اسلام 'کیسے ہو؟ اس نے بھی موڈ قدرے بہتر کرلیا۔

"میں ٹھیک ہوں مگر آپ سے اور آپ کی مسز سے بہت ناراض ہوں۔" اس کا لہجہ شکایتی تھا۔

"بھئی ہم سے اور ہماری مسز سے کیا غلطی ہوگئی۔؟" عمیر اس کے انداز پہ ہلکا سا مسکرا دیا۔

"غلطی نہیں جرم کہوں گا کہ دولہا آپ لوگوں کو یعنی اپنی بہن کو خود فون کر کے آنے کا کہہ رہا ہے' پرسوں رات کو عائلہ سے بات ہوئی تو مکمل یقین دلا رہی تھی کہ کل ہی آجاؤں گی 'کل سارا دن اس کا انتظار کرتے رہے' اس کا موبائل آف 'گھر کا فون مسلسل بجتا رہا اور آپ سارا دن اہم میٹنگز میں۔" حسن بولتا جا رہا تھا اور اس کا وجود سن ہوتا جا رہا تھا۔

"اور آج مہندی والے دن بھی تقریبا" دس بجے چکے ہیں وہ محترمہ ابھی تک غائب ہیں 'ایسی ہوتی ہیں اکلوتی بہنیں۔ آپ پلیز اسے چھوڑ جائیں ورنہ میں سخت ناراض۔۔۔"

وہ اپنی ہی دھن میں کون سے گلے شکوے کیے جا رہا تھا وہ مزید سن نہ پایا۔ اس کا فون والا ہاتھ اس کے پہلو میں گر گیا تھا۔

"اگر وہاں نہیں گئی تو پھر کہاں گئی۔؟"

✲ ✲ ✲

قریب کی کسی مسجد میں موذن بڑے پر سحر انداز میں تہجد کی اذان دے رہا تھا۔ دو الگ الگ جگہوں پہ' الگ بستروں پہ سوئے ہوئے وجود اس پاک کلام کی پکار پر اٹھ بیٹھے' دونوں نے وضو کیا اور جائے نمازیں بچھالیں۔ ایک نے سر پہ سفید جالی دار ٹوپی لی اور دوسرے نے اپنے سر اور جسم کے گرد ـــــ بڑی چادر اوڑھی اور تہجد کے نفلوں کے لیے نیت باندھ لی۔

نوافل ادا کر کے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے۔ مانگنے کے لئے کیا تھا۔؟ بائیس سال کم عرصہ تو نہیں ہوتا ایک ہی دعا' ایک ہی التجا کے لیے بدلتا وقت انہیں بھی بدل گیا تھا۔ ان میں سے ایک عائلہ تھی۔ جسے واپسی کا سفر از بر تھا مگر کیا لوٹنا ممکن تھا؟ اس نے آخری الفاظ جو اس شخص سے بولے تھے وہ اسے ہمیشہ ستاتے تھے۔

"مجھے تمہاری ضرورت ہے نہ ہی پروا۔"

اور اس ضرورت اور پروا نے اسے کتنا تڑپایا تھا یہ وہی جانتی تھی۔ حمزہ کو چن لینے کا فیصلہ اگر صحیح تھا تو عمیر رضا کو چھوڑنا بھی غلط تھا۔ بیٹے کے بچھڑ جانے کا خیال دامن گیر نہ ہوتا تو وہ کب کی لوٹ چکی ہوتی۔ گھر سے نکلتے ہوئے اسے عمیر پہ اس قدر غصہ تھا کہ اپنے اور اس کے رشتے حتیٰ کہ اپنے دل میں پلنے والی اس کی محبت کا خیال بھی نہیں کیا تھا۔ حمزہ ہر سوچ پر حاوی تھا۔ بدگمان اس قدر تھی کہ بیٹا جینے کا سہارا کافی لگ رہا تھا مگر پیچھے رہ جانے والا دل دھڑکنے کا سبب تھا اس کا اندازہ جلد یا بدیر ہو گیا تھا۔ وہ واپسی کا رخت سفر نہیں باندھ سکتی تھی۔ حالانکہ کئی بار ارادہ کیا اور توڑ دیا۔

عمیر رضا کے حصے میں بھی بائیس برس کی خواری تھی۔ وہ حالات اور معاملات کو ہر پہلو سے پرکھتا رہا غلط کون تھا؟ وہ جس نے پونے دو سال ایک شیر خوار بچے کو اپنی ممتا کی محبت سے سینچا تھا شمعون جو اس کا سگا باپ تھا یا وہ خود' جو اس سارے مسئلے کو حقیقت پسندی سے سلجھانا چاہتا تھا۔ قصور چاہے ایک کا ہو یا تینوں کا مگر نقصان تینوں کا ہوا تھا۔

تینوں کو اپنا دکھ دوسرے سے بڑا لگتا۔ عمیر رضا اپنی ہر صبح اس امید پہ شروع کرتا کہ شاید آج وہ لوٹ آئے اور رات کے اختتام پہ وہ مایوس کھڑا ملتا۔ اس کے دوستوں نے اکثر اسے مشورہ دیا کہ وہ دوسری شادی کر لے۔ مگر کبھی بھی کسی دوسری کا تصور نہ کر سکا۔ اسے تنہائی کی وحشت نے کبھی نہ ستایا۔ اس تنہائی اور انتظار کی کیفیت میں بھی سرور تھا۔ ہر روز ایک امید اور امنگ کے ساتھ آغاز کرتا' کسی کی تلاش میں جیسے چلتے جانا' بھیڑ میں کسی چہرے کو ڈھونڈنا۔ اگر یہ سب تکلیف دہ تھا تو کیف آگیں بھی تھا۔

وہ سالوں سے ایک دعا مانگتا چلا آرہا تھا۔ جسے نہ جانے کب قبولیت ملنی تھی۔ کبھی کبھار بے بسی اور دوری ناقابل برداشت ہو جاتی تو وہ یوں ہی رونے لگتا تھا۔ جیسے ابھی جائے نماز پہ بیٹھے گھٹنوں کے گرد اپنے بازو لپیٹے سر جھکائے وہ رو رہا تھا۔

ہجر میں آہ و بکا رسم کہن ہے لیکن
آج یہ رسم ہی دہراؤ کہ کچھ رات کٹے

✲ ✲ ✲

"آیئے عمیر رضا۔" آذر نے آگے بڑھ کر آفس کا گلاس ڈور وا کیا تھا۔

"آذر باقی سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی جا رہا ہے' لیکن مجھے یہاں کی کمپنی کے لیے کچھ ایکسپرٹ اور ٹیلنٹڈ لوگوں کی ضرورت ہے' تاکہ شروعات ہی بہتر سے کی جائے' اینڈ یو نو میں نے زیادہ تر لاہور میں رہنا ہے' اچھا اسٹاف مل جائے گا تو میری فکروں میں بھی اضافہ نہ ہو گا' مجھے اس طرف سے تسلی رہے گی۔" اس نے اپنا مدعا پوری تفصیل سے بیان کر دیا۔

"خیر مشکلات بہت سی آئیں گی' تم بتا رہے تھے کہ لاہور سے کچھ اسٹاف یہاں شفٹ کر دیا ہے۔" آذر نے انٹرکام پہ چائے کا آرڈر پاس کرا کے پر سوچ انداز میں کہا۔

کبھی آذر' سعد اور راشد اکٹھے پارٹنرشپ پہ بزنس کیا کرتے تھے۔ ان کا کاروبار ترقی کرتا گیا اور وہ بڑی خوش اسلوبی سے ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ سعد اپنی فیملی کے ساتھ انگلینڈ چلا گیا۔ راشد کراچی شفٹ ہو گیا اور آذر ابھی تک اسلام آباد میں ہی تھا۔ جب سعد پاکستان آتا تھا تو وہ چاروں اکٹھے ہو جاتے تھے۔

"چند لوگ لایا ہوں اسلام آباد سے مگر وہاں بھی تو ضرورت ہے' اب اس کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے اپنی برسوں کی بنی ساکھ اور محنت کو برباد نہیں کر سکتا۔" وہ انگلیوں سے اپنی پیشانی مسل رہا تھا۔

"ہوں اور وہ جو نوبل گروپ انڈسٹریز نے چند لوگ بھیجے تھے' ان کا کیا بنا؟" کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اس نے سوالیہ نظریں عمیر پر گاڑ دیں۔

"ان کی ڈیمانڈز بہت زیادہ ہیں' جو میں فی الوقت پوری نہیں کر سکتا' پھر جو اسٹاف لاہور سے ٹرانسفر کیا ہے اس کے لیے رہائش کا بندوبست' سب سے بڑا ایشو تھا جو اب بمشکل کہیں حل ہوا ہے۔"

"مجھ سے نیو ٹیلنٹ لے لو' ود آؤٹ ڈیمانڈز۔" آذر نے چیئر کو دائیں سے بائیں گھماتے آفر کی اور چائے کی ٹرے تھامے ملازم کو اندر آنے کا اشارہ دیا۔

"نیو ٹیلنٹ' ود آؤٹ ایکسپیرینس۔" عمیر نے تھوڑے رد و بدل سے اس کا کہا دہرایا۔ اس کی مشکلات کی وجہ یہ تجربہ ہی تھا۔ وہ تجربہ کار افراد کا اسٹاف بھرتی کرنا چاہتا تھا جو مل نہیں رہا تھا۔

آذر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ زین نے دروازے میں سے جھانک کر اندر آنے کی اجازت چاہی۔

"مے آئی کم ان سر؟" اس نے فائلوں کا ڈھیر اٹھا رکھا تھا۔

"پلیز کم ان۔" آذر نے اجازت دیتے ٹیبل پہ پہلے سے بکھری فائلوں کو سمیٹ کر مزید کے لیے جگہ بنائی۔

"اس لڑکے زین کو ہی لے لو عمیر' اس چوبیس برس کے نوجوان کو میں نے صرف ڈگری کی بنا پر جاب دے دی تھی' مگر یہ اس قدر برلیئنٹ ہے کہ بعض اوقات مجھے اس کی ایڈوائز اور ایفی شینسی پہ حیرت ہوتی ہے۔" آذر نے' زین کو بھی بیٹھنے کا اشارہ دیا۔

عمیر رضا نے گردن موڑ کر دائیں طرف بیٹھے اس نوجوان کو دیکھا جس کا ذکر ہو رہا تھا۔ اس پہ پہلی نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹک گیا' اس ـــ خوبرو کے تیکھے نقوش نے اس کے دل کی دھڑکن بہت تیز کر دی تھی۔ اس پہ جمی نگاہیں ہٹائے بغیر اس نے پوچھا۔

"پورا نام کیا ہے تمہارا؟"

"زین سر ـــ زین عمیر رضا۔" اس کے گہرے ارتکاز سے جھجکتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

✲ ✲ ✲

چائے کی ٹرے ہاتھ میں تھامے وہ کمرے سے باہر کھڑا تھا۔ آفس سے لیٹ وہ روز ہی ہو جاتا تھا' مگر آج اسے خاصی دیر ہو گئی تھی۔

وہ تو سارے کام نبٹا کر فائلیں دینے آذر صاحب کے آفس گیا تھا۔ وہاں موجود عمیر رضا نے اس کا اچھا خاصا انٹرویو لے ڈالا تھا۔ اس کے موبائل کی بیٹری بھی ڈاؤن تھی' جب گھر لوٹا تو ماں خاصی پریشان ہو چکی تھی۔ انہوں نے خاموشی سے کھانا کھایا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ ماں کو منانا بھی ضروری تھا۔ اس نے جھجکتے ہوئے ہمت کی۔

"ماما اندر آجاؤں۔" تھوڑا سا دروازہ کھول کر اس نے اندر جھانکا۔

"آجاؤ۔" آہستگی سے اجازت دے کر وہ پھر سے کتاب کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"ماما ـــ وہ میں آپ کے لیے چائے بنا کر لایا تھا۔" چائے کی ٹرے کو بیڈ کراؤن پہ دھر کے وہ گھبرایا ہوا سا تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔" چند لمحے خاموش رہ کے اس نے پرے کھسکتے بیٹھنے کو جگہ دی۔

"ایکسٹریملی سوری ماں' میں آفس سے سیدھا گھر ہی آتا ہوں' اپنے فرینڈز سے ملنے بھی ویک اینڈ پہ جاتا ہوں' وہ راحیل میرا کولیگ بتا رہا تھا کہ وہ آفس سے سیدھا اپنے فرینڈز سے ملنے چلا جاتا ہے۔" ماں کو چائے دے کر اس نے دوست کی مثال دے کر اپنی

پوزیشن واضح کی۔
"تو تم بھی کل سے فرینڈز سے مل کر گھر آنا' ویسے چاہو تو ابھی بھی جاسکتے ہو۔" چائے کا کپ لیے اس نے اس نئی اطلاع پہ اسے گھورا۔
"میں تو صرف ایگزیمپل دے رہا تھا۔" زین نے جلدی سے صفائی دی۔
"مجھے اچھی طرح یاد ہے ابھی پرسوں ہی ساجد اپنی امی کی ناراضی کا ذکر کررہا تھا' میں نے بتایا کہ میری ماں مجھ سے کبھی ناراض نہیں ہوتی' تو وہ جو چھوٹی چھوٹی آنکھوں والی سارہ ہے نا' کہنے لگی سب ہی کی مائیں ناراض ہوتی ہیں' آپ کی کیوں نہیں۔" اس نے نسوانی آواز میں سارہ کی نقل اتاری۔
"یہ تم نے مشرقی عورتوں والے وہم کب سے پالنا شروع کردیے۔" عائلہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ زین نے اس کی خفگی کو کس قدر لیا تھا۔
"یہ سچ ہے کہ میری سویٹ ماں' مجھ سے بھی ناراض نہیں ہوسکتیں۔" اپنی کافی کا مگ سائیڈ پہ رکھ کر وہ ماں کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا' اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ جو دیکھ لی تھی۔ عائلہ اپنی انگلیاں آہستگی اور نرمی سے اس کے بالوں میں چلانے لگی' اس نے پرسکون ہوکر آنکھیں موندلیں۔
"ماما آج ہمارے سر کے پاس ایک ــــ صاحب آئے تھے۔ وہ اپنا بزنس اسلام آباد میں سیٹل کررہے ہیں' وہ مجھے دیکھ کر یوں ٹھٹک گئے جیسے کبھی کبھار آپ میری کسی حرکت پہ ٹھٹک جایا کرتی ہیں۔" اس نے ماں کو بہت دلچسپی سے یہ سب بتایا۔
"وہ بہت سوبر اور ریزروڈ سے تھے' پرسنالٹی ایسی کہ بندہ خود بخود رعب میں آجائے' نہایت نرم مزاج' مجھے ان میں بہت اٹریکشن فیل ہورہی تھی' نہ جانے کیوں؟ میرے دل میں خیال آیا اگر میرے پاپا ہوتے تو بالکل اسی طرح کے ہوتے اینڈ یو نو ماں تب میں حیران رہ گیا جب سر نے ان سے الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے ان کا نام عمیر رضا لیا۔" وہ کہیں کھو سا گیا تھا۔
"عمیر رضا۔" عائلہ کے سینے کے اندر سانس ڈول گئی' زین کے بالوں میں چلتی انگلیاں تھم گئیں۔
"زین ــــ" اس نے اپنے یخ بستہ ہاتھ بے اختیار اس کے گالوں پہ رکھ دیے۔
"ماما' کیا ہوا؟ آپ کے ہاتھ اتنے ٹھنڈے کیوں ہورہے ہیں؟" وہ ان کے ہاتھ مضبوطی سے تھام اٹھ بیٹھا۔ پاپ کے ذکر پر اس کی ماں کی یہ ہی حالت ہوجایا کرتی تھی۔ وہ اس موضوع سے بہت گریز کرتا تھا۔ اب بھی اس نے یوں ہی اپنا اندازہ بیان کردیا تھا۔
"میں ــــ میں بالکل ٹھیک ہوں' کچھ نہیں ہوا مجھے' تمہیں میں نے کتنی بار منع کیا ہے کہ رات کو کافی پی کر نہ سویا کرو۔" عائلہ نے خود کو کمپوز کرتے بات بدل دی تھی۔ اس نے رات کو کافی پینے والی عادت بھی عمیر کی چرائی تھی۔
"کافی نہ پیوں تو نیند نہیں آتی۔" وہ جانتا تھا عائلہ بات بدل گئی ہے۔ اب یہ ہی جواز عائلہ کے پوچھنے پر زین نے بھی دیا تھا۔
"اچھا اب کافی پی لی ہے نا' جاؤ جاکر سوجاؤ' صبح جلدی اٹھنا ہے' مجھے بھی نیند آرہی ہے۔" اس نے زین کو واضح ٹالنا چاہا اور بیڈ کی چادر سیدھی کرنا شروع کردی۔ اس وقت اسے مکمل تنہائی میسر تھی۔
"اوکے ماما' گڈ نائٹ۔" وہ فوراً سے پیشتر اٹھ گیا اور ماں کے ہاتھوں پہ بوسہ دیا اور دروازہ بند کرکے نکل گیا۔ اس نے گومگو کی کیفیت میں لائٹ آف کی' زیرو پاور کی روشنی کی اور بیڈ پہ لیٹ گئی۔
"عمیر رضا۔" اندھیرے میں اس نام کی بازگشت ہوئی تھی اور آنکھوں سے دو آنسو لڑھک گئے۔

✡ ✡ ✡

"ماما دیکھ لیں' آج میں حسب معمول جلدی گھر آگیا ہوں۔" اس نے سلام منہ میں رکھتے ماں کو تیسری بار یاددہانی کروائی۔
"جی بیٹا جی' آج آپ خلاف معمول جلدی گھر آگئے ہو اور تب سے باور کروا رہے ہو۔" وہ اس کے مسلسل حسب معمول کے جھوٹ پر چڑ ہی گئی تھی۔

"یہ کیا ماما' آپ اپنی دفعہ زیادہ دیر برداشت نہیں کرتیں' فوراً" بدلہ چکادیتی ہیں۔" اس کو عائلہ کی سچائی کڑوی لگی تھی۔
"اور تم جو مسلسل غلط بیانی سے کام لے رہے ہو۔" عائلہ نے اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورا۔
"چلیں آیا تو ہوں نا۔" وہ خفیف سا مسکرایا۔
بہت دنوں بعد وہ اکٹھے رات کا کھانا بڑے خوش گوار موڈ میں کھا رہے تھے۔ ورنہ وہ روز ہی لیٹ آتا تھا اور تب تک عائلہ کا غصہ سوا نیزے تک پہنچ چکا ہوتا' پھر اسے روزانہ ہی سوری کرتے ہوئے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنا پڑتا اور ان کی ڈھیروں نصیحتیں۔
نیپکن سے ہاتھ صاف کرکے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
"کافی۔" عائلہ نے مسکراتے ہوئے اس کی بات اچکی۔ وہ کبھی کبھار جب موڈ میں ہوتا تو اس کے لیے چائے بنایا کرتا تھا۔ وہ جب لان میں آئی تو وہ چکر لگا رہا تھا' یہ چھوٹا سا لان' اس میں رکھے گملے اور پھول سب زین کی محنت کا ثبوت تھے۔ اسے باغبانی کا بہت شوق تھا۔
"زین تمہیں اس نئی کمپنی میں کوئی پرابلم تو نہیں اور وہ تمہارے باس کیسے ہیں؟" عمیر رضا نے آذر سے کہہ کر خاص طور پر زین کو اپنی کمپنی میں رکھوایا تھا۔ اسے اس لڑکے کے تیکھے نقوش بڑے ہی بھلے معلوم ہوتے تھے۔
"اچھے انسان ہیں' اپنے ایمپلائرز کا بہت دھیان رکھتے ہیں' ان کا زیادہ تر بزنس لاہور میں ہے' اسی لیے کبھی یہاں اور کبھی وہاں۔" اس نے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے سر کی تعریف کی۔
"ان کا کوئی بیٹا نہیں ہے۔" اس نے یوں ہی سادگی سے بات برائے بات پوچھ لیا۔
"ٹھیک سے معلوم تو نہیں' مگر ایک لڑکا جو لاہور سے شفٹ ہوا ہے' اس نے بتایا تھا کہ سر کی بیوی ہے نہ کوئی اولاد' وہ اپنے بہت بڑے بنگلے میں تنہا رہتے ہیں۔" اس نے اپنی حاصل کردہ معلومات دی۔
"شاید انہوں نے شادی نہ کی ہو' ویسے بھی امیر لوگ تنہائی پسند ہوتے ہیں۔" ساڑھی کا پلو اچھی طرح سمیٹتے ہوئے اس نے قیاس آرائی کی۔
"بٹ آئی تھنک کہ ان کے ساتھ کہیں کچھ مسنگ ہے' وہ ہر نوجوان لڑکے سے بہت ڈیٹیل سے اس کا نام اور والد کا نام پوچھتے ہیں' میرے ساتھ بھی ایسا ہی کیا تھا اور پچھلے دنوں انٹرویو کے لیے آنے والے ہر لڑکے کے ساتھ ان کا یہ ہی رویہ تھا۔" اس نے اپنا غور سے کیا گیا مشاہدہ بیان کیا۔ ان کی اسی حرکت نے اسے مجبور کردیا تھا کہ وہ لاہور والے اسٹاف سے ان کے متعلق چھوٹی چھوٹی معلومات اکٹھی کرتا رہتا تھا۔
"ہوسکتا ہے مگر تم اپنے سر کو انڈر آبزرویشن رکھنے کی بجائے اپنے کام پہ دھیان دو تو زیادہ بہتر ہے۔ مسٹر انسپیکشن آفیسر۔" عائلہ نے اس کی سوچ سے متفق ہوتے اسے نرمی سے منع کیا۔
وہ اس کی کھوجی طبیعت سے واقف تھی۔ بچپن میں ایسا کیوں نہیں؟ ویسا کیوں ہے؟ جیسے سوالات کرکے اسے زچ کردیا کرتا تھا۔ ٹین ایج میں چیزوں کے پوسٹ مارٹم کیا کرتا تھا۔ وہ کوئی ملازمہ رکھ لیتی تو اس کے ناک میں دم کردیتا کہ اس کا بائیو ڈیٹا معلوم کرلیں' کم از کم اس کے گھر کا ایڈریس ہی لے لیں۔

✡ ✡ ✡

وہ کافی ریش ڈرائیونگ کررہا تھا۔ شام چھ بجے اسے ایک فارن کلائنٹ سے ملنا تھا۔ جس کے ساتھ بہت اہم میٹنگ تھی۔ اس میٹنگ کو نبٹا کر اسے بائی روڈ لاہور بھی پہنچنا تھا۔ چھ بجنے میں صرف دس منٹ باقی تھے۔
"او شٹ۔" تیسری دفعہ سگنل ہوجانے پہ اس نے جھنجلا کے ہاتھ اسٹیرنگ پہ دے مارا' سگنل او۔کے ہونے میں چوبیس سیکنڈ باقی تھے۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے دوسری سڑک پہ رواں ٹریفک کو دیکھا۔ اس کی پلٹتی ہوئی نظر شاپنگ سینٹر سے نکلتے دو نفوس پہ جم کے رہ گئی تھی۔ گزرتے برسوں نے اس مسکراتے ہوئے چہرے کی شخصیت پر اثر ضرور ڈالا تھا مگر اس قدر

نہیں کہ وہ پہچان نہ سکتا پھر اپنی چیز تو اپنی ہی ہوتی ہے ہزاروں کے مجمع میں بھی الگ جھلک۔ یہ تو اس کی صدیوں کی کھوئی ہوئی وہ انمول اور قیمتی متاع تھی۔ جو اس کی رگوں میں خون بن کر دوڑتی تھی۔

سبز بتی جل گئی تھی۔ پیچھے کھڑی گاڑیوں کی لمبی قطار مسلسل ہارن بجا رہی تھی۔ اس نے اپنے حواس بحال کرتے گاڑی آگے بڑھادی تھی۔

اگلے روز جب زین رضا کھٹ کھٹ کی آواز سے تیزی سے کی بورڈ پہ انگلیاں چلا رہا تھا۔ عمیر رضا اس کے آفس میں انٹر ہوئے۔ وہ ان کی موجودگی سے حیران سا کھڑا ہوگیا۔ مگر ان کا اگلہ جملہ اس سے بھی زیادہ حیران کن اور غیر متوقع تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ چیئر پہ بیٹھا اسٹڈی ٹیبل پہ دھرے لیمپ کو کبھی جلا اور بجھا رہا تھا۔ آج اس نے زین سے ملاقات کی تھی۔ اسے نیند نہیں آئی تھی۔ اس ملاقات کا اسے تب سے انتظار تھا جب اس نے آذر کے آفس میں پہلی بار اس شخص کو دیکھا اور اس کا نام سنا تھا۔ اسے جو تھوڑا بہت شک تھا وہ اس کے متعلق چھوٹی موٹی معلومات لے کر جاتا رہا تھا۔ اس کے تمام خدشات سچ ثابت ہوگئے تھے مگر وہ ابھی کچھ وقت لینا چاہتا تھا مگر کل عائلہ اور اسے 'عمیر رضا نے شاپنگ سینٹر سے نکلتے دیکھ لیا تھا۔ اور آج اسے اپنے گھر لے آیا تھا۔ راز اور تفصیل وہی تھی جو اسے کئی برسوں سے معلوم ہوچکی تھی۔ عائلہ نے ہمیشہ اس سے سب چھپایا' باپ کے ذکر کو گول مول کر کے ٹال دیا مگر وہ بے خبر نہیں رہا تھا۔ اسے حسن کے ذریعے کب سے آگاہی مل چکی تھی۔ حسن اس کے لیے باپ کی سی شفقت رکھتا تھا وہ سمجھتا تھا کہ ہر بات اور کام کا ایک مناسب وقت ہوتا ہے اور وہ وقت گزر جائے تو پچھتاوے ہی رہ جاتے ہیں اس نے ماں سے مایوس ہو کر حسن ماموں سے رجوع کرلیا تھا۔ وہ سمجھدار ہوتا جا رہا تھا اپنے باپ

کی غیر موجودگی' کون تھا؟ کیا تھا وغیرہ جیسے سوالات بہت فطری تھے۔ اس سے کب تک چھپایا جاسکتا تھا۔ جس نہج پہ عائلہ نے اس کی پرورش کی تھی وہ کوئی سطحی سوچ کا حامل نہیں تھا حسن اس کو اپنے پاس لے گیا اور بہت دھیرج اور پیار سے اسے سب سمجھادیا۔

حقیقت بہت تلخ سہی مگر اس میں برداشت کا مادہ تھا۔ وہ عائلہ' عمیر اور شمعون تینوں کی حقیقت جانتا تھا۔ اب عمیر کے اعتراف کے بعد وہ قطعاً" ان رشتوں سے دور نہیں رہ سکتا تھا مگر مسئلہ عائلہ کا تھا۔ اس کے تاثرات کیا ہوں گے؟ وہ ہر بات سے لاعلم تھی۔

"السلام علیکم ماما!" اس نے بہت ڈرتے ڈرتے پہلا قدم اندر رکھتے ہی سلام کردیا۔ آج اس کا برتھ ڈے تھا عائلہ اسے دو روز سے کہہ رہی تھی کہ وہ چھٹی کرلے ۔مگر وہ بہت ضروری کام کا کہہ کر آفس چلا گیا تھا اور حسب معمول لیٹ ہوگیا تھا۔

"وعلیکم السلام" روکھے سے لہجے میں جواب دے کر اس نے نظروں کا زاویہ بدل لیا۔

"اگر اسی طرح مس بی ہیو کریں گی تو میں کھڑا رہوں گا رات بھر' ایک قدم نہیں ہلاؤں گا۔" ماں کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر وہ مصنوعی نروٹھے پن سے دھمکی دیتا جم کے کھڑا ہوگیا۔

"آجاؤ' یوں مسخرہ پن نہ کرو۔" اس کی حرکت پہ اس کی مسکراہٹ نکل گئی تھی اسے کتنے حربے آتے تھے ماں کو منانے کے۔

"ایم سوری ماما۔" وہ جلدی سے بیگ دوسرے صوفے پہ اچھال کر' ہاتھ میں پکڑا گفٹ احتیاط سے سینٹر ٹیبل پہ دھر تا ان کے قریب آگیا۔

"کہا بھی تھا' چھٹی کرلو۔" اس نے اس کے سر پہ ہلکی سی چپت لگائی۔ وہ اس کے جنم دن کے روز ناراض نہیں ہونا چاہتی تھی

"تو کیا ہوتا آپ آج مجھے نہ ڈانٹیں' آفٹر آل میرا برتھ ڈے ہے۔" وہ بھی شرارت سے اسی کے انداز میں بولا۔

"تم کبھی نہیں سدھروگے' اٹھو اب جلدی سے چینج کرو میں ٹیبل سیٹ کرواتی ہوں اور پھر کیک کاٹتے ہیں۔" وہ دونوں جانے لگے تھے کہ اس کی نظر ٹیبل پہ دھرے گفٹ پر پڑ گئی۔

"زین یہ کس نے دیا ہے؟" اس نے اشارتاً" پوچھا۔

"میرے سر نے' کہہ رہے تھے ان کا بھی ایک ہی بیٹا ہے' جو ان کے پاس نہیں ہے' اس کا بھی آج ہی برتھ ڈے ہے سو انہوں نے یہ گفٹ مجھے دے دیا' میں انکار نہیں کرسکا۔" وہ اتنا بتا کر جلدی سے نکل گیا کہ وہ مزید تفصیل میں نہ پڑ جائے۔ اس کے فریش ہونے تک ٹیبل لگ چکی تھی اور وہ چھری تھامے اس کا انتظار کررہی تھی۔

"ہیپی برتھ ڈے' ہیپی ریٹرن آف دا ڈے۔" اس کے چہرے پہ شفقت اور محبت کے ڈھیروں رنگ تھے۔

"جیتے رہو' ہمیشہ خوش رہو' اللہ تمہیں ہزاروں خوشیاں نصیب کرے۔"

"بس ماما' اتنی ساری دعائیں' کسی اور کے لیے بھی بچا کے رکھ لیں۔" باقی کا کیک پیس منہ میں ڈال کر ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"کوئی اور کون؟ صرف تم ہی میرا واحد رشتہ ہو۔" وہ مسکرا رہی تھی۔

"سچ بتائیں' آپ کے دل سے میرے علاوہ کبھی اور کسی کے لیے دعا نہیں نکلی۔" اچانک اس نے عائلہ کے ہاتھ تھام کر بڑا ذو معنی سا استفسار کیا تھا۔

"کیا مطلب' کس کی بات کررہے ہو؟" اس نے رک رک کر اچنبھے سے پوچھا۔

"کچھ نہیں' میرا گفٹ کہاں ہے' جلدی سے دیں۔" اس نے فوراً" موضوع بدل دیا۔ عائلہ سے غصے کا مظاہرہ کرتے اس کے کندھے کو پکڑ کر پیار سے جھنجوڑا تھا۔

"اتنے بڑے ہوگئے ہو زین مگر بچپنا نہیں گیا۔" اپنا کندھا چھڑوا کر ساڑھی کا ڈھلکا پلو سیدھا کیا۔

"لیکن نہیں۔ پہلے تمہارے سر کا گفٹ کھلے گا" مجھے اس کا بہت تجسس ہورہا ہے۔" وہ ٹیبل کے قریب جاکے رک گئی تھی۔

"ایز یو وش۔" وہ بھی اٹھ کے قریب آگیا۔

اس نے ایک سائیڈ سے رنگین ریپر اتارنا شروع کیا۔ پیکنگ پہ لگا ریڈ ربن بھی کاٹ دیا ذرا کی ذرا نظر مال پہ ڈالی اور ریپر پھاڑ دیا۔ اس میں سفید کلر کی' چھوٹے سے قد کی' فر نما بالوں والی آسٹریلوی بلی تھی۔ یہ بہت ہی خوبصورت سا کھلونا حمزہ کا بہت پسندیدہ تھا۔ جو عمیر اس کی دوسری برتھ ڈے پہ دینے کے لیے لایا تھا۔ اس نے عائلہ کو یہ بڑی سی بلی دکھائی تھی۔ جس پہ دور سے حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔ وہ بیٹری سے چلتی بھی تھی۔ اسے یہ بلی بہت پسند آئی تھی۔

"یہ۔۔۔ یہ۔۔۔" اس کی زبان ہکلا رہی تھی اور ٹانگیں کپکپانے لگی تھیں۔ جس وقت سے وہ بھاگتی رہی تھی۔ وہ گھوم پھر کے اس کے سامنے آگیا تھا۔

"میرے سر عمیر رضا نے دیا ہے' وہ بتارہے تھے کہ ان کا بیٹا۔" وہ ماں کے تاثرات جان لینے کے باوجود بہت پرسکون بتا رہا تھا۔ عمیر رضا کے نام پر اس کے حواس معطل ہوئے تھے اور اس کی پوری بات سننے سے پہلے ہی وہ دھڑام سے زمین بوس ہوگئی۔

☼ ☼ ☼

عائلہ کو ہلکا سا انجائنا کا اٹیک ہوا تھا۔ زین کی جان بھی لبوں پر ہی اٹک گئی تھی۔ ایمرجنسی روم کے باہر کوریڈور کے لمبے چکر لگاتے اس کی ٹانگیں شل ہوگئیں۔ ہونٹ ماں کی سلامتی کی دعائیں مانگتے خشک ہوگئے اور مسلسل اٹھے ہاتھ بھی تھک گئے تھے۔

"مجھے یہ سب نہیں کرنا چاہیے تھا۔" اسے پشیمانی گھیرے ہوئے تھی۔ حسن بھی پہنچ گیا تھا۔ تین دن جان کنی کے عمل سے گزر کر اسے مکمل ہوش آیا تھا۔ ان سب نے شکر ادا کیا۔ حسن نے صدقہ دیا اور وہ ماں کی پٹی سے لگ کے بیٹھ گیا۔ حسن نے اسے سختی سے منع کردیا تھا کہ خود سے کچھ نہیں کہنا' وہ خود ہی پوچھے گی۔ شاید یہ ہی بہتر تھا۔

"ڈاکٹرز نے مزید دو دن رکنے کا کہہ دیا ہے' جبکہ میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کو فوراً گھر لے جاؤں' بلاوجہ ہی لوگ چلے آرہے ہیں' تسلیاں دینے' مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔" وہ سخت اکتایا ہوا تھا۔ ساری فرسٹریشن اوروں پہ نکال رہا تھا۔

"تمہارے آفس سے کوئی نہیں آیا۔" اس نے بہت سرسری سے انداز میں دریافت کیا۔

"وہ۔ میرے سر آئے تھے۔ آپ کے سائیڈ پہ بکے پڑے ہیں' دے گئے تھے' میں نے کہا بھی کہ ماما سے مل کر جائیے گا' کہہ رہے تھے' سونے دو پھر کسی وقت آجاؤں گا۔" وہ بکے کی طرف اشارہ کرکے اندر سے اچھا خاصا گھبرا گیا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں بے شمار دعائیں مانگنا شروع کردی تھیں۔

عائلہ نے سرخ گلاب کا بکے اٹھالیا۔ پھولوں کے اندر سنہری چھوٹا سا کارڈ گرا ہوا تھا وہ باہر نکالا۔ وہ "گیٹ ویل سون" کا کارڈ تھا۔ جس کے نیچے لکھا تھا۔

"صرف تمہارا عمیر رضا۔"

اسے پھر سے اپنے دل کی دھڑکن بند ہوتی محسوس ہوئی۔ یہ نام اس کی ذات ادھیڑ رہا تھا۔ خشک پڑتے گلے سے تھوک نگلا اور کارڈ کہیں پھولوں میں ہی گرادیا۔

زین کھلی کھڑکی سے باہر متوجہ تھا۔ بالکل انجان سا۔

"زین اب تمہارے سر آئیں تو مجھے ان سے ضرور ملوانا' چاہے میں سو رہی ہوں' جگالینا۔"

"جی ماما' میں تو خود آپ لوگوں کو ملوانا چاہتا ہوں۔" وہ پراسرار سا مسکرادیا۔ حسن کا اندازہ ٹھیک تھا۔ اتنے سالوں بعد اچانک شاک لگا تھا۔ جبکہ دوسری بار وہ کافی سنبھل گئی تھی اور مزید وقت لیے بغیر اس حقیقت کا سامنا کرنا چاہتی تھی۔ وہ بہت چوکس ہوکر اپنے آپ کو آنے والے وقت کے لیے تیار کررہی تھی۔

"عمیر رضا اگر لوٹا تھا تو یقیناً" اس کی کوئی پلاننگ ہوگی وہ میرے بیٹے کو پھر سے مجھ سے چھیننے آیا ہے۔" اسی طرح کے نادر و خیالات اس کے ذہن میں آرہے تھے۔ زین کے منہ سے عمیر رضا کا نام سن کر وہ ٹھٹکتی ضرور تھی پھر یہ سوچ کر رد کردیتی کہ اس نام کے کئی اور بھی ہوسکتے ہیں۔ اب اس گفٹ اور گیٹ ویل سون کے کارڈ کو دیکھ کر یقین ہوگیا تھا کہ یہ وہی ہے۔ وہ اپنے اگلے رد عمل کا بالکل نتیجہ نہیں جانتی تھی۔ بس دعا کررہی تھی کہ وہ آنے والا "وہی" نہ ہو۔ جسے وہ سمجھ رہی ہے۔ حالانکہ وہ تیئس سال دعاؤں میں اس کے لیے روئی تھی۔

"ماما کیا آپ سو رہی ہیں؟" اس نے بہت آہستگی سے دریافت کیا تھا۔ اگر سو رہی ہے تو جاگ نہ جائے۔

"جاگ رہی ہوں بیٹا۔" اس نے آنکھوں پہ دھرا بازو ہٹادیا۔

"وہ سر آپ سے ملنے آئے ہیں۔ باہر کوریڈور میں بلواؤں انہیں۔" وہ اندر سے بہت خوفزدہ تھا۔ ماموں اور عمیر رضا کو بہت سمجھایا تھا کہ ابھی مزید رسک نہیں لینا چاہیے ان کی طبیعت تھوڑی اور سنبھل جائے تو ان کا دیدار بھی کروادیں گے مگر وہ دونوں مان کر نہیں دیئے ایسے میں جب کہ وہ خود آنے والا کا انتظار کررہی تھی۔

"آں۔ ہاں۔" اس کی رنگت یکدم متغیر ہوئی تھی۔

"زین حسن کہاں ہے؟" اسے بھی بلاؤ۔" عائلہ کا جی چاہا تھا کہ بیٹے کو کہہ دے۔ تم باہر چلے جاؤ یا پھر یہاں سے کہیں دور۔

"حسن ماموں' سر کو لے آئیں' ماما جاگ رہی ہیں۔" اس نے روم کا دروازہ کھول کر ڈرتے ہوئے انہیں پکارا تھا۔

"آیئے ناں سر۔" اتنے سالوں کی جھجک اس کے بھی آڑے آرہی تھی۔

"ماما یہ میرے سر ہیں عمیر رضا اور۔ سر یہ۔ میری۔" اس نے عمیر کے بعد ماں پر نظر ڈالی عائلہ پھٹی پھٹی آنکھوں' چہرے پہ ٹوٹ پھوٹ کے تاثرات لیے اٹھنے کی کوشش کررہی تھی۔

"تت تم۔ عمیر رضا۔" وہ اپنی ساری توانائی خرچ کرکے صرف اتنا بول پائی تھی اس کی خالی' ویران آنکھیں اس کمزور اور مضمحل وجود پہ ساکت تھیں۔

"ہاں میں عمیر رضا۔ تیئس سال بعد تم سے اپنا سب کچھ واپس لینے آگیا ہوں' جو تم مجھ سے چھین لائی تھیں۔ اور اب تمہارے فرار کی بھی تمام راہیں بند ہوچکی ہیں۔" گزرا وقت اس کی سوچ میں کتنی تبدیلی لایا تھا۔ ایسی گفتگو سے آغاز کرکے اس نے اندازہ لگانا چاہا تھا کیونکہ حسن اور زین کی بہت سی باتیں قیاس آرائیوں سے جڑی ہوئی تھیں۔

"بکواس بند کرو عمیر' میں نے تم سے کچھ نہیں چھینا تھا جو تم نے کسی آسیب کی طرح تیئس سال بعد بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔" وہ یک دم ہسٹریائی انداز میں چلائی تھی۔ کمزور سا وجود جوار بھاٹا بن گیا تھا۔ زین نے اسے سنبھالنے کے لئے آگے بڑھنا چاہا مگر حسن نے مضبوطی سے اس کا بازو دبوچ لیا۔ وہ اس کی ساری فرسٹریشن نکال دینا چاہتا تھا۔

"کیوں آئے ہو تم' کیا لینا دینا بنتا ہے تمہارا میرا' کیوں میرا پیچھا نہیں چھوڑ دیتے' تم مجھ سے میرا بیٹا چھیننے آئے ہو' تاکہ جاکے شمعون کے حوالے کردو' تمہیں اسی نے بھیجا ہے نا' میں اپنا زین نہیں دوں گی تمہیں' میں مرجاؤں گی مگر اپنا بیٹا کسی بھی قیمت پر نہیں دوں گی' وہ میرا ہے صرف میرا' دفع ہوجاؤ تم یہاں سے' دور ہوجاؤ ہماری زندگیوں سے۔" بے اعتباری اور بے یقینی کی گہری کھائی میں گرے اس نے پل بھر کو نہ سوچا کہ حسن اور عمیر کے ہمراہ زین بھی یہاں موجود ہے۔ جو اس کے نزدیک بے خبر تھا۔ زین کا بازو ابھی بھی حسن کی مضبوط گرفت میں تھا۔ اس بت بنے کھڑے بے عزتی کرواتے شخص کو بھی سہارے کی سخت ضرورت تھی۔ اس نے غصہ اور اشتعال میں اپنا ڈرپ والا ہاتھ بیڈ پہ زور سے دے مارا تھا۔ ڈرپ کی سوئی نکلتے ہی ہاتھ خون سے بھرنے لگا تھا۔ وہ ماموں سے بازو چھڑوا کر ماں کی طرف بھاگا۔ اتنے میں نرسیں اور ڈاکٹر شاید اس کا شور سن کر آگئے تھے۔ انہوں نے بمشکل اسے قابو کرکے سکون آور انجکشن لگادیا۔ اب کمرے میں بالکل خاموشی چھاگئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس نے ہوش میں آتے ہی زین کا پوچھا تھا۔ زین کی گردن زیادہ پتلی تھی جو اسے بار بار تاویلیں دے کر بھیج دیا جاتا تھا۔ اب بھی پہلی انٹری اسی کی تھی۔ سال کی باپ پر بے اعتباری اسی کی وجہ سے تھی جسے صرف وہی ختم کرسکتا تھا۔ اب وہ ماں کے بیڈ پہ ایک ٹانگ اوپر کیے اسے ساری صورتحال شروع سے بتا رہا تھا۔ کیونکہ اب ضروری ہوگیا تھا۔

"میں نے جب بھی آپ سے بابا کے متعلق پوچھا آپ ٹال گئیں لیکن کبھی یہ نہیں کہا کہ وہ اس دنیا میں نہیں۔ یا انہوں نے آپ کو چھوڑ دیا ہے۔ ایسے میں میرا تجسس فطری تھا۔ شعور کی دہلیز پہ ہی مجھ پہ اندازہ ہوگیا کہ یہ موضوع آپ کے لیے تکلیف دہ ہے۔ آپ کے دکھ کے مدنظر رکھتے ہوئے پوچھنا چھوڑ دیا' میں جانتا تھا کہ ایک وقت ضرور آئے گا جب میں آپ سے سب پوچھوں گا اور آپ مجھے انکار نہیں کرسکیں گی مگر وہ وقت آپ پر نہیں حسن ماموں پہ آگیا۔ ماموں کے پاس میں گریجویشن کی چھٹیوں میں گیا تھا۔ ان دنوں وہ اپنے گھر کا پینٹ کروا رہے تھے۔ میں نے ان کے ساتھ مل کر اسٹور کا بہت سا سامان باہر نکلوایا تاکہ کسی غریب کو دے دیں' تبھی ان کے ساتھ کام کرواتے ہوئے' پرانے سامان میں سے میرے ہاتھ ایک پرانا البم آگیا جو کہ آپ کی اور بابا کی شادی کا تھا۔" یہاں تک رک کر اس نے عائلہ کو دیکھا جس کی بند پلکیں لرز رہی تھیں۔

"آپ مجھے ایک لفظ تک نہ بتائیں' میں حسن ماموں کے سر پہ سوار ہوگیا' انہوں نے مجھ سے زیادہ اصرار نہیں کروایا۔ ساری سچائی لفظ بہ لفظ بتاڈالی۔ اذیت تھی کہ جس کی کوئی حد نہیں۔ یہ یقین بہت مشکل تھا کہ میں آپ کا سگا بیٹا نہیں' آپ کی نرم آغوش میں پناہ ڈھونڈنے والے اس وجود نے آپ کی کوکھ سے جنم نہیں لیا۔" وہ کسمسا کے رہ گئی۔

زین نے ماں کا ٹھنڈا کپکپاتا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں تھام لیا۔ جیسے وہ انہیں دلاسا دے رہا ہو۔
"میں نے بہت اصرار کیا مگر ماموں نے مجھے پاپا کا پتا نہیں دیا لیکن آپ کا مقام میرے دل میں مزید معتبر ہو گیا۔ میں پوری سچائی سے یہ اعتراف کرتا ہوں کہ جو محبت' خود اعتمادی اور مان آپ نے مجھے سونپا' میری سگی ماں بھی نہیں دے سکتی تھی۔ میں نے کبھی بھی آپ کو چھوڑنے کا نہیں سوچا' سب کچھ جاننے کے بعد بھی نہیں' میری کھوج ہمیشہ عمیر رضا رہا۔ شمعون احمد کبھی نہیں کیونکہ میں جانتا تھا کہ آپ کی دعاؤں میں میرے علاوہ بھی کوئی شامل رہتا ہے اور میں اس دوسرے تک کا سفر آپ کے لیے آپ کی دعاؤں کی قبولیت کے لیے کرنا چاہتا تھا۔ اس گھنی چھاؤں میں واپس پناہ کے لیے' جس سے آپ' میری وجہ سے محروم ہو گئی تھیں۔ میں انہیں سر آذر کے آفس میں دیکھتے ہی پہچان گیا تھا مگر انجان بنا رہا۔" اس نے لمبا سانس خارج کیا۔ جیسے بہت سا بوجھ کم ہو گیا ہو۔
"کچھ بھی تھا ماما اگر پاپا میرے معاملے میں حقیقت پسندی سے کام لے رہے تھے تو آپ بھی محبت کی انتہا پہ جا کھڑی ہوئیں۔ وہ بھی کب مجھے آپ سے یا خود سے جدا کرنا چاہتے تھے۔ بس مقدر نے سب کچھ تلپٹ کر کے ہم سب کے حصے میں جدائی لکھ دی۔ آپ میری فکر کیے بغیر خود کا اور ان کا سوچیں۔ میں اب اس قابل ہو گیا ہوں کہ اپنے اچھے برے کا فیصلہ کر سکوں' میں آپ کو کبھی بھی شرمندہ نہیں ہونے دوں گا۔ آپ کی ممتا اور محبت احسان ہے مجھ پر' اب فیصلہ محبت اور رشتوں کے حق میں ہو گا۔"
عائلہ کو بھی اسی پل لگا تھا کہ وہ واقعی بہت بڑا ہو گیا ہے۔ اس بار فیصلے کا حق اسی کو سونپ دینا چاہیے۔ وہ بھی دیکھنا چاہتی تھی کہ تیئس سالوں کی محنت اور خواری کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ جس اولاد کو اس نے خون محبت دے کر سینچا' اپنا شوہر گھر بار چھوڑا' وہ اس کے ساتھ کہاں تک مخلص ہے۔
"عمیر رضا باہر کھڑے آپ کے منتظر ہیں اپنے گھر کی خوشیوں کے لوٹ آنے اور سب کی زندگیوں کے مکمل ہو جانے کے۔ ہم سب ایک دوسرے کے بغیر ادھورے ہیں' انہوں نے سمیٹنے کی ابتدا کی ہے۔ بہت ہی مان کے ساتھ محبت بھرا ہاتھ بڑھایا ہے' آپ ان کا ہاتھ نہیں جھٹکیں گی ماں' میرے لیے۔ اپنے لیے۔" اس کی آنکھوں میں امید اور نمی تیر رہی تھی۔ وہ سرہلاتے مسکرا دی۔ ایک عورت ہونے کے ناتے مکمل گھر کی خواہش اس کی بھی تھی۔
"تمہیں انہوں نے اپنا وکیل بنا کر بھیجا ہے۔" مسکراہٹ نے بلاوجہ ہی ہونٹوں کا گھیراؤ کر لیا تھا۔
"جی نہیں' حسن ماموں کے مطابق میں امن کا سفیر ہوں۔" اس نے فرضی کالر جھاڑتے گردن اکڑائی۔
"امن کے سفیر صاحب ہم آپ کے سامنے جوابدہ نہیں ہیں' آپ ہمارا مجرم ہمارے سامنے پیش کر دیں' باقی بات چیت انہی سے طے ہو گی۔" وہ بھی اس کے انداز میں بولی۔
"ایسے نہیں میڈم' میں نے ان کے جذبات بغیر کسی ردوبدل کے' آپ تک من وعن پہنچا دیے ہیں' اب جب تک آپ اقرار کا پیغام نہیں پہنچائیں وہ نہیں ملیں گے۔" اس نے بھی فوراً" پینترا بدل لیا۔
"کیسا اقرار؟" وہ حیران ہوئی تھی۔
"اسی محبت کا جو سالوں سے ان کے لیے' اپنے دل میں چھپائے بیٹھی ہیں۔" بہت ہی نارمل اور کھلے انداز میں اپنا مدعا بیان کر دیا۔ وہ ہونقوں کی طرح اسے تک رہی تھی۔
"کیا فضول ہے' میں نہیں کرتی محبت وحبت۔" نگاہیں چراتے صاف جھوٹ بولا تھا۔
"او کے' نہ بتائیں' ویسے ہی حسن ماموں واپس چلے گئے ہیں' کل شام کو لوٹیں گے اور میں بھی بہت تھک گیا ہوں' آج کی رات گھر جا کر آرام کروں گا۔ آپ کے پاس ٹھہریں گے وہ مجرم' جو خود ہی آپ سے سب کچھ اگلوا لیں گے۔" اس نے ماں کو دھمکی دیتے ہوئے ڈرایا۔

"تم واقعی جا رہے ہو۔" وہ اندر سے گھبرا گئی تھی۔
"بڑے دل میں لڈو پھوٹ رہے ہیں نا۔" اس نے شرارت سے اسے چھیڑا۔
"زین۔" اس نے اسے گھرکتے ہوئے مصنوعی ناراضی سے رخ پھیر لیا۔
"میرے پاس آپ کو منانے کا ٹائم بالکل نہیں' یہ کام پاپا کو سونپ کر اندر بھیج رہا ہوں' صبح ناشتا لے کر آؤں گا۔" وہ ایک دم سے جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔
"ٹھیک ہے' بھیج دو اور دھیان سے ڈرائیونگ کرنا' سیدھے گھر جانا۔" اس نے ہدایات جاری کی تھیں۔
"گھر ہی جاؤں گا۔" ماں کو الوداعی بوسہ دیتے وہ مسکرایا۔
"ویسے ماما' کس کو بھیجنا ہے۔؟" چند قدم چل کر وہ مڑا تھا ساتھ ہی ٹانگ بھی کھینچ لی تھی۔
"اپنے پاپا کو۔" وہ پر اعتماد تھی۔
"اب حال دل سنانے کو بے تاب ہیں' مجھے تو ہوا تک نہیں لگنے دی' الٹا نصیحتیں کر دیں۔" وہ جاتے جاتے بھی شرارت سے باز نہیں آیا تھا۔
دل دکھاتا ہے وہ مل کر بھی' مگر آج کی رات
اسی بے درد کو لے آؤ کہ کچھ رات کٹے
عائلہ کی بدگمانی اس کے سینے میں انی کی مانند چبھی تھی۔ اسے افسوس تھا کہ اس کی سوچ آج بھی تیئس سال پہلے والی جگہ پر رکی ہوئی ہے۔ ایک بار وہ اپنی صفائی دے کر اس کی بدگمانی دور کرنے کی کوشش کرنا چاہتا تھا۔ عمیر رضا نے اندر داخل ہو کر دروازے کا ہینڈل گھما دیا تھا۔
عائلہ کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ آنسو سے تر تھا۔ ابھی زین اسے کتنا مان سونپ کر گیا تھا اور اس نے تیئس سال عمیر رضا کے لیے دعائیں مانگی تھیں اب جب وہ سامنے آ گیا تھا تو سب کے سامنے کتنا بے عزت کیا تھا۔ یہ ہی سوچ اسے رلا رہی تھی۔
عمیر کو تکیے کے سہارے' آنکھیں موندے' بھیگے ہارے کو دیکھ کر چھبیس سال قبل کی سہاگ رات یاد

آ گئی تھی۔ تب بھی وہ اسی حالت میں تھی۔ یہی منظر تھا۔ تب سہاگ کے جوڑے میں ملبوس ہار سنگھار کیے ایک نوجوان سی لڑکی تھی۔ اسے یہ بھی یاد آیا تھا کہ تب اس پل اس کے دل میں خواہش ابھری تھی کہ اس کے سارے آنسوؤں کو چن لے، تب اس نے وہ پل گنوا دیا تھا مگر اب۔۔ اس نے اپنی دونوں ہتھیلیوں کو اس کے گالوں پہ رگڑا۔

"آپ۔۔" کسی کا لمس محسوس کر کے اس نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ اٹھنے لگی۔

"لیٹی رہو۔" کندھوں سے پکڑ کر اسے دوبارہ لٹا کر وہ بیڈ پہ ہی بیٹھ گیا۔ کافی دیر چپ چھائی رہی۔ اسے جتنا بولنا تھا بول چکی تھی اب صرف معافی مانگنا تھا جبکہ وہ سر جھکائے الفاظ ترتیب دے رہا تھا۔

"کہنے کو کچھ بھی نہیں ہے، ایک بیوی غلط تھی مگر۔ مگر ماں نہیں۔ اس کی غلطی یہ تھی کہ اس نے اولاد کو۔۔۔ شوہر پر ترجیح دی بہت غصہ تھا مجھے لیکن ۔۔۔ تمہیں شاید یہی کرنا چاہیے تھا۔ جو کچھ بھی ہوا یونہی قسمت میں لکھا تھا، میں تم سے کوئی وضاحت نہیں چاہتا نہ ہی کوئی گلہ شکوہ، کچھ بھی نہیں بس ہاتھ جوڑ۔۔ کے اتنا کہوں گا کہ میرے ساتھ لوٹ چلو، ہمارے گھر، پلیز اور سزا مت دو مجھے۔" اس نے سچ مچ ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔ عائلہ نے تڑپ کر اس کے ہاتھ تھام لیے۔ وہ اعلا ظرفی کا مظاہرہ کر رہا تھا تو وہ کم ظرفی پہ کیسے اترتی۔

"مجھے اور گنہگار نہیں کریں، معافی تو مجھے آپ سے مانگنی ہے۔" وہ بہت شرمندہ تھی۔

"مجھے تمہاری معافی کی ضرورت نہیں، تمہاری ضرورت ہے، چلو گی نا۔"

"ہم۔۔ مگر شمعون۔۔" اس ڈر پہ آ کے وہ ہکلا گئی تھی۔ ان دونوں کی اتنی سالوں کی دوری کا سبب صرف یہی شخص اور اس کا خوف تھا۔

"ہمارے پاس شمعون کا حمزہ نہیں، ہمارا اپنا بیٹا زین ہے۔" وہ اس کے خوف زدہ چہرہ کو دیکھ کر زیر لب مسکرایا تھا۔ وہ سر جھکا گئی۔

"مجھے ایک بار ماریہ نے بتایا تھا کہ آپ کو زین نام بہت پسند تھا اسی لیے میں نے حمزہ کا نام بدل دیا تھا۔"

"زین کو اپنا فیصلہ خود کرنے دو، تم اپنا فیصلہ کرو۔" اس کا انداز بڑا صلح جو تھا فیصلہ ہو چکا تھا۔ اب صرف عمل باقی تھا۔

اس نے نظریں جھکا کر مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ عمیر بہت جذب سے تکے جا رہا تھا۔ اس کی نظروں کے گہرے ارتکاز سے گھبرا کر وہ گلاس ونڈو سے باہر دیکھنے لگی۔

"عمیر ہمارے لڑائی جھگڑے، صلح صفائی سب کچھ رات کو ہی ہوتی ہے۔" اسے اپنے اور اس کے ٹیرس پہ آخری جھگڑے کی رات بھی یاد تھی۔

"آؤ عائلہ اس آخری رات کو الوداع کہہ دیں اس یقین اور عزم کے ساتھ کہ اب ہمارے رشتے میں نہ لڑائی جھگڑے، بدگمانیاں، گلے شکوے اور نہ ہی بے اعتباریاں ہوں گی۔"

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے احتیاط سے چلاتے گلاس ونڈو تک لے آیا۔ شیشے کے اس پار ہر شے اندھیرے کی زد میں تھی۔

عائلہ کی چادر شانوں سے ڈھلک گئی تھی۔ وہ اس کے پیچھے کھڑا چادر کو اس کے کندھوں پہ درست کرتا بہت دھیمے لہجے میں گنگنایا تھا۔

درد کم ہونے لگا آؤ کہ کچھ رات کٹے
غم کی میعاد بڑھا جاؤ کہ کچھ رات کٹے
ہجر میں آہ و بکا رسم کہن ہے لیکن
آج یہ رسم ہی دہراؤ کہ کچھ رات کٹے
یوں تو تم روشنی قلب و نظر ہو لیکن
آج وہ معجزہ دکھلاؤ کہ کچھ رات کٹے
دل دکھاتا ہے وہ مل کر بھی، مگر آج کی رات
اسی بے درد کو لے آؤ کہ کچھ رات کٹے
دم گھٹا جاتا ہے افسردہ دلی سے یارو
کوئی افواہ ہی پھیلاؤ کہ کچھ رات کٹے
چھوڑ آئے ہو سر شام اسے کیوں ناصر
اسے پھر گھر سے بلا لاؤ کہ کچھ رات کٹے

کسک

صبیحہ اقبال

"حال کا مشاہدہ ہو یا ماضی کا سبق اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ علم و ہنر سے آراستہ اقوام ہی قیادتِ عالم کی سزاوار ٹھہرتی ہیں اور فی زمانہ ٹیکنیکل علوم کی افادیت کسی کلام کی محتاج نہیں ہے۔" سیمینار ہال پروفیسر خاور کے جملے کی صداقت پر تالیوں سے گونج اٹھا۔

ایسے میں پچھلی سیٹوں پر بیٹھی صنوبر نے سوچا وہ ضرور اپنا تعلیمی سلسلہ دوبارہ شروع کرے گی اور آئی ٹی کی افادیت کے پیش نظر وہ بھی آئی ٹی میں مہارت حاصل کر کے اپنے دین کی افادیت و حقیقت کو اجاگر کرے گی کالج کے زمانے میں بھی یہ خواہش ہمیشہ اسے دامن گیر رہتی تھی۔

"کیوں نہیں؟ کیوں نہیں۔" حسبِ معمول جب صنوبر نے رات کو طارق کو فون کر کے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو طارق نے مزید تعلیم حاصل کرنے کی بات پر اس کی فوراً" تائید کر دی۔

"واقعی۔" صنوبر کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

"بھلا مجھے کیوں انکار ہو سکتا ہے؟ بندہ تو ویسے ہی ماہی بے آب ہے۔" طارق اپنی بیرون ملک سروس سے واقعی بے زار رہتا تھا۔

"وہ طارق دراصل امی بابا سے کہتے ہوئے مجھے ڈر لگ رہا ہے کہیں منع نہ کر دیں۔" اس نے اپنا خوف شوہر کے آگے رکھ دیا۔

"اگر گھر کا نظام ڈسٹرب نہ ہو تو مجھے یقین ہے انہیں کوئی انکار نہ ہو گا وہ بہو کو بھی بیٹی ہی کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔" طارق اپنے والدین کی عادات سے واقف تھا کہ وہ۔ وقت کی پابندی۔۔۔ کرنے اور کرانے کے عادی ہیں بس۔

"ہاں یہ تو ہے لیکن بندی بھی اپنے مقصد کے حصول کے لیے قربانی دینا جانتی ہے۔" صنوبر نے شوہر کو یاد دلایا کہ شادی میں بہت سی فضول رسومات کو توڑنے کے لیے اس نے اپنی انا کی قربانی دی تھی اور خاندان والوں سے بہت کچھ سنا اور سہا تھا۔ صنوبر حصولِ تعلیم کے لیے بڑی پر عزم تھی یوں وہ خاصی

مصروف ہو گئی — اپنے آرام اور میکے کی محبت و رفاقت کو قربان کر کے اپنی شامیں گھر والوں کی ضروریات کو پورا کرتے اور ان کی خواہشات کا احترام کرتے گزار دیتی کہ حصولِ علم کے لیے اسے یہ سب کچھ گوارہ تھا گوارہ کرنا تھا۔

تسبیح کے گرتے دانوں کے مانند وقت نے اپنا سفر جاری رکھا۔ طارق کا سال میں پندرہ بیس دن کا قیام وطن میں ہوتا اور یہ دن ہوا کے تر و تازہ جھونکوں کے مانند ادھر آئے ادھر گئے محسوس ہوتے۔ پھر وہی صبح و شام گھریلو ذمہ داریاں اور تعلیمی مصروفیات۔

"طارق اب آپ یہیں اپنے دیس میں ہی کوئی دوسری جاب کیوں نہیں ڈھونڈ لیتے؟" طارق کا یوں چلے جانا اسے شاق گزرتا۔ صنوبر طارق کے جانے کے بعد پہلا فون انہی الفاظ کے ساتھ کرتی۔

"مائی ڈیئر! بس تھوڑے قدم جم جائیں کچھ پاکستان کے حالات بہتر ہو جائیں تو کون اپنے گھر اور دیس کو چھوڑ کر غریب الوطنی کی صعوبتیں برداشت کرتا ہے۔" طارق اسے ہمیشہ اچھا وقت آنے کا دلاسا دے کر فون رکھ دیتا۔

شاید اپنی آواز کی نمی کو بھی وہ صنوبر سے چھپانا چاہتا تھا۔ شادی کے چار سال بعد شارق اور پھر جلد ہی شانزہ کے یکے بعد دیگرے دنیا میں آجانے پر اس نے — تعلیمی سلسلے کو خیرباد کہہ دیا۔ اور بچوں کی پرورش ان کی دیکھ بھال ہی صنوبر کی توجہ کا مرکز و محور ہو گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

ساس سسر کی حادثاتی موت نے گھر کو بالکل ویران کر دیا تھا طارق کے واپس جاب پر چلے جانے کے بعد جب تک بچے اسکول سے واپس نہ آجاتے وہ دیوانوں کی طرح گھر میں بولائی بولائی پھرتی۔

"ہیلو خیریت تو ہے۔" طارق صنوبر کے بے وقت فون کی آمد سے ہول ہی تو گیا تھا۔

"وہ طارق مجھے ... مجھے خوف آرہا ہے میں اکیلی ہوں۔" وہ اچھی خاصی سمجھ دار ہونے کے باوجود اس وقت ننھی بچی کی سی حرکت کر رہی تھی۔

"ارے ... تم تو بڑی بہادر ہو تم کیوں تنہائی سے خوفزدہ ہو۔" طارق نے اس کی نفسیاتی کیفیت کو محسوس کر کے اسے خوف سے نکالنا چاہا۔

"سنو ایسا کرو کوئی ہلکی پھلکی مصروفیت اختیار کر لو تم نے اتنا پڑھا ہے اسے دوسروں تک پہنچانے کی ذمہ داری ادا کرو۔" طارق نے صنوبر کو بے ضرر سا مشورہ دیا کہ وہ اس طرح مصروف ہو کر اپنی تنہائیوں کا مداوا کر لے گی۔

"ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں مجھے اپنے لیے مصروفیات ڈھونڈنی ہوں گی۔" صنوبر اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لیے بیرون خانہ ایکٹیوٹی کے لیے یکسو ہو گئی۔ اوکے کہہ کر اس نے فون بند کر دیا تھا۔

تعلیمی قابلیت' آئی ٹی میں مہارت اور وقت تینوں عناصر نے مل کر اسے معاشرے میں ایک منفرد مقام عطا کیا اور جلد ہی اس نے آئی ٹی کے حوالے سے ایک این جی او بنا کر باقاعدہ معاشرے کو علم و ہنر سے بہرہ ور کرنے کی سعی شروع کر دی۔

☆ ☆ ☆

"واامی میرے شرٹ کے بٹن ٹوٹ گئے ہیں۔" کافی دیر سے شارق (اس کا بیٹا) اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا صنوبر نے جھنجلا کر بیٹے سے شرٹ پکڑی اور پھر نیٹ پر مصروف ہو گئی۔

"ممی مجھے دیر ہو رہی ہے۔" اس نے ماں کے شانے ہلائے۔

"تم ایسا کرو دوسری شرٹ پہن لو۔" یہ کہہ کر صنوبر پھر سے ماؤس کو حرکت دینے لگی۔

ناچار شارق نے دوسری شرٹ گھسیٹی اور بنا استری کے ہی پہن کر چلا گیا صنوبر کو اس کا ذرا احساس تک نہ ہوا' سچ ہے۔

احساس موت کو کچل دیتے ہیں آلات

"ممی آج ہمارے اسکول میں پیرنٹس ڈے ہے آپ دس بجے تک ضرور آجائیں۔" شانزہ چلتے چلتے ماں کو تاکید کر کے گئی تھی۔ مگر صنوبر نے جیسے تیسے کھانا بنایا اور انٹرنیٹ پر جو بیٹھی تو سب کچھ بھول گئی اور جب شانزہ نے اسکول سے واپسی پر غصے میں جو ڈور بیل بجائی تو صنوبر کو اپنی حماقت کا احساس ہوا۔

اور اب تو اکثر ہی ایسا ہونے لگا تھا کہ بچے اسے اپنی ضرورت کی طرف متوجہ کر رہے ہوتے لیکن وہ نیٹ پر مصروف ہوتی مسلسل اس رویے نے ماں اور بچوں کے درمیان اچھی خاصی خلیج حائل کر دی تھی لیکن صنوبر کے پاس احساس کا وقت بھی گویا نہ تھا۔

اس مرتبہ جب طارق چھٹیوں پر پاکستان آئے تو اس نے ہمیشہ کی طرح اپنے میکے اور سسرال والوں کی بھرپور دعوت کا اہتمام بھی نہ کیا اور نہ اپنی نند کو تاکید کے ساتھ دو چار دن اپنے گھر رہنے کے لیے مدعو کیا جو پچھلے تمام سالوں میں اس کا معمول رہا تھا۔

"کیا ہوا صنوبر تم نے بے ضرر روایات کو کیوں توڑ ڈالا؟" طارق نے ہلکا سا احتجاج کیا تھا۔

"اب مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ اتنے لوگوں کو سنبھال سکوں۔" صنوبر کا عذر تھا۔

آج طارق بیس سالوں میں پہلی مرتبہ تمام عزیز و اقارب سے ملے بغیر جب واپس پلٹا تو اس کے اندر کچھ بنا آواز کے ٹوٹا ضرور تھا جس نے اس کی آنکھوں کے گوشوں کو نمناک کر دیا۔

☆ ☆ ☆

علم و ہنر کی شمع کو دور تک روشن کرنے کا عزم لے کر اٹھنے والی صنوبر کو احساس ہی نہ رہا کہ ہر مہذب معاشرے کا اپنا ایک فلسفہ حیات ہوتا ہے اور اس کی باندھی حدود و قیود انسان کو ایک بندھے ہوئے گھوڑے کے مانند رکھتی ہے۔ لیکن انٹرنیٹ کی وسعت بڑی بے مہار ہے ساری دنیا انسان کے آگے دنیا کے ہر کونے سے رابطہ کرنا آسان طالبعلموں' بچوں' بوڑھوں' نوجوانوں ہر ایک کو جہاں جانا چاہے ایک کلک پر پہنچا دے۔ گویا ساری دنیا آپ کی انگلیوں کے اشاروں پر کوئی روک ٹوک نہیں۔ بے لگام گھوڑے کی مانند جہاں چاہے جیسے چاہے چرے چگے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ جھوٹ سچ کی بھی کوئی شناخت نہیں چیٹنگ کے دوران عورت مرد بن کر چیٹنگ کر لے یا مرد عورت بن کر' بیٹھے پاکستان میں ہوں اور دعوا دبئی کا کر لیں۔ بچہ بوڑھا بن جائے یا جوان' کنگلا تصوراتی محل کے خواب دکھائے آنکھ سے کانی اپنے قلوپطرہ ہونے کا دعوا کر بیٹھے' جتنا چاہے جھوٹ بول لیا جائے کوئی نصیحت کا سوچ تک نہیں سکتا۔

نیٹ کی انہی خامیوں نے صنوبر کو آہستہ آہستہ اپنے حصار میں لے لیا۔ نیٹ اسٹوڈنٹس کی تعلیمی کامیابیاں اگرچہ صنوبر کے لیے خوشی و طمانیت کا باعث تھیں لیکن ساتھ ہی اسے چیٹنگ کا چسکا لگ چکا تھا۔ وضع و ضع کے خیالات رکھنے والے افراد کے ساتھ نیٹ فرینڈ شپ اگرچہ ابتدا میں اسے مفید محسوس ہوتی اور محظوظ بھی ہوتی۔ لیکن اب موضوعات بدل رہے تھے' علم کے بجائے ذاتی دلچسپیاں اور پسند و ناپسند کے مکالمات شروع ہو گئے تھے۔

"صنوبر! یہ تم ہو جس کا مقصود تعلیم کا فروغ تھا۔" چیٹنگ کرتے ہاتھ اچانک رک گئے ضمیر نے سرگوشی کی تھی۔

"کبھی کبھی تھوڑی تفریح بھی کر لینا چاہیے۔" دل نے دلیل دی۔

"تفریح کے لیے غیر مرد ہی کا انتخاب کیوں؟" دماغ نے ہتھوڑا اٹھا لیا تھا۔ دل' دماغ' ضمیر کی جنگ چھڑ گئی اس نے کمپیوٹر آف کیا اور کچن کی طرف آگئی۔ بچوں کے لیے ان کی فرمائش پر آلو بھرے پراٹھے پکاتے ہوئے اسے طارق کی پسند بھی یاد آگئی تو ندامت کے دو موٹے موٹے آنسو خاموشی سے اس کے دامن میں جذب ہو گئے۔

"مجھے معاف کر دینا طارق۔" بے اختیار ہی صنوبر کہہ گئی صنوبر کو لگا شاید طارق اس کے گناہ سے باخبر ہے۔ اپنے آپ پر بار بار نفرین کرتی صنوبر بچوں کے ساتھ قصداً مصروف رہی۔

"چلو بچو تم تیار ہو جاؤ آج پارک چلتے ہیں۔" صنوبر نے شام کو بچوں کو پارک لے جانے کی پیش کش کر دی۔ وہ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنا چاہ رہی تھی۔

دوسرے دن بھی اس نے بچوں کی فرمائش پر شامی کباب اور بریانی بنانے میں اپنے آپ کو مصروف رکھا۔ لیکن جونہی وہ کمرے کی صفائی کرنے کے دوران cpu کو صاف کرتی ماؤس تک پہنچی بس بے اختیار ہی ماؤس کلک کر گئی کسی نے بالکل درست ہی کہا تھا اسکرین کا نشہ تو سب سے تیز ہے صرف دیکھنے ہی سے ہو جاتا ہے۔

اسے نیٹ نیم سے کئی مرتبہ متوجہ کیا گیا تھا اور اب وہ پھر مصروف تھی نہ چاہتے ہوئے بھی جواب دینے کے لیے تیار۔

"اس میں حرج ہی کیا ہے تھوڑی گپ شپ ہی تو ہے نا۔" اس نے ضمیر کو تھپکی دی۔

"تو پھر بے وفائی کیا ہے؟" دماغ نے سوال کیا۔

"تم کون سا طارق کو چھوڑ کر ذیشان کے ساتھ بھاگی جا رہی ہو۔" دل نے تسلی دی شیطان ہمیشہ گناہ کو بےضرر کر کے ہی پیش کرتا ہے اس وقت بھی یہی حربہ تھا اور ماؤس پر رکی ہوئی انگلیاں کی بورڈ پر اطمینان کے ساتھ حرکت کرنے لگیں۔

کئی مرتبہ دل و دماغ کی جنگ، ضمیر کی خلش چیٹنگ کرتی جذبوں میں گندھی کمزور سی عورت کو خلجان میں گرفتار کر دیتی اور تنہائی کا دریا عبور کرتی صنوبر چاہتی کہ طارق بڑھ کر اسے حصار میں لے لے مگر ادھر طارق کی اپنی مجبوریاں تھیں۔ ادھر ذیشان کے خوب صورت جملے، بے تکیاں "لفاظیاں" ہر لمحے اس کو اپنے حصار میں لیے رکھتے گھر کی ذمہ داریاں بھی بوجھ بن رہی تھیں اور روز رات کو طارق سے فون پر لمبی گفتگو کا دورانیہ بھی بتدریج کم ہوتے ہوتے خانہ پری تک آ گیا لیکن صنوبر کا ذہن اب یہ سوچنے کے قابل ہی کب رہا تھا۔

کافی دیر سے پسند ناپسند پر بات ہو رہی تھی صنوبر کو ذیشان کی پسند ناپسند میں طارق کا عکس نظر آ رہا تھا انہیں بھی تو بالکل یہی چیزیں پسند ہیں بالکل ایک ہی طرح کی سوچ "نہیں نہیں" صنوبر نے ذہن میں کلبلاتے احساس کو ٹھانا چاہا وہ کسی طور طارق سے اپنے رشتے کو ذہن میں تازہ کرنے پر آمادہ نہ تھی۔ وہ قصداً طارق کے خیال سے دامن بچا گئی۔

ذیشان کا عشق سر چڑھ کر بول رہا تھا اور اب بہ نفس نفیس ملنے ملانے کا تقاضا شروع ہو گیا تھا۔ ذیشان کے مسلسل اصرار پر اس کی صبیح پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ عورت کتنی بھی بہادر بن جائے ہے ازلی کمزور۔

"اتنا وقت تو ہم نیٹ پر ساتھ ہوتے ہیں۔" صنوبر نے عذر تراشا۔

"اسکرین کا اپنا نشہ ہے لیکن آمنے سامنے مل بیٹھنے کا اپنا مزا۔" ذیشان ملاقات پر مصر تھا۔

نہ، نہ اور ہاں ہاں کے درمیان چار دن بعد شہر کے ایک مصروف پارک کے مین گیٹ کے دائیں جانب کی چھٹی بینچ مل بیٹھنے کا مقام ٹھہری پہچان کے لیے کپڑوں کے رنگ طے ہوئے اور وقت مقررہ پر آنے کا وعدہ لے کر اگلے چار روز کے لیے چیٹنگ بند۔

☼ ☼ ☼

ذیشان سے ملاقات کی تیاری صنوبر کے لیے خاصا تھکا دینے والا عمل تھا فیشل، مساج، پرمنگ، بلیچنگ، مینی کیور، پیڈی کیور، کپڑوں کا انتخاب، دوسری اشیاء کی خریداری اور ابھی وہ جیولری اور جوتی کی میچنگ کے ساتھ خریداری کر کے تھکی ہاری بازار سے لوٹی تھی اور بڑی شدید خواہش تھی کہ دس منٹ آنکھیں بند کر کے تھکن اتار لے۔

"ٹرن ٹرن ٹرن۔" صنوبر نے جونہی آنکھیں بند کیں لگتا تھا کوئی ڈور بیل پر ہاتھ رکھ کر ہٹانا بھول گیا وہ بادل ناخواستہ اٹھی گیٹ پر پہنچ کر بغیر پوچھے ہی گیٹ کھول کر خوب صلواتیں سنانے کا موڈ تھا کہ نیند اور تھکن سے بوجھل آنکھیں جھپکانا ہی بھول گئی۔

"ارے آپ؟" طارق کو بغیر کسی اطلاع اور بتا

ئے ڈول کے گیٹ پر کھڑے دیکھ کر وہ ہکا بکا تھی۔

"کیا واپس چلا جاؤں؟ اندر آنے کے لیے راستہ تو دو۔" اس نے ہونقوں کی طرح گیٹ کے درمیاں کھڑی صنوبر کو ٹوکا۔ جو ذیشان سے ملاقات کے خواب کے ڈراؤنے انجام کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

"آں ہاں۔" وہ چونکی۔

"وہ آپ کی آمد کی خوشی نے دیوانہ کر دیا ہے۔" صنوبر اب جھوٹ بولنے اور بات بدلنے میں خاصی ماہر ہو گئی تھی۔

"یہ اتنی ساری خریداری خیریت تو ہے؟" طارق نے بیڈ پر پڑے شاپرز پر سرسری سی نظر ڈالی۔

"وہ دو دن بعد میری دوست کی میرج اینی ورسری ہے بس اسی کی تیاری ہے۔" اس نے سفید جھوٹ بولا۔

وہ برابر ادھیڑ بن میں لگی تھی اب کیا ہو گا؟ سوال اس کے ذہن میں ہتھوڑے برسا رہا تھا غائب دماغی اور الجھتے ذہن کے ساتھ وہ بظاہر خوشی اور مسرت کا اظہار کر رہی تھی لیکن جھنجلاہٹ اور بوکھلاہٹ اس کے ہر انداز سے عیاں تھی۔ وہ تو خود طارق ہی نے اس کی مشکل آسان کر دی۔

"سنو صنوبر! میں باس کے ساتھ ایک ضروری میٹنگ میں شرکت کی غرض سے پاکستان آیا ہوں لہٰذا مجھے بہت سے کام نبٹانے ہوں گے، پلیز تھوڑی مہلت دینا اور مائنڈ نہ کرنا میری مصروفیات کو۔" طارق سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

اور مانو صنوبر کی تو دل کی مراد بر آئی تھی وہ شوہر کا سامنا کم سے کم کر رہی تھی شاید انسان کے اندر کا چور اسے ایسے ہی خوفزدہ کیے رکھتا ہے۔ گناہ انسان کو کتنا ڈرپوک بنا دیتا ہے یہ صنوبر کو اس کیفیت میں دیکھ کر بخوبی اندازہ ہو جاتا تھا۔ وہ ذیشان سے نہ ملنے کا کوئی بہانہ بنانا چاہ رہی تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ نیٹ پر موجود نہ تھا۔

بالوں کو ڈائی کر کے طارق کو اہتمام سے تیار ہوتے دیکھ کر صنوبر نے سکھ کا سانس لیا۔

"واپسی کب تک ہو گی؟" صنوبر نے کسی انجانے خدشے کے تحت تسلی چاہی۔

"کچھ کہا نہیں جا سکتا جلدی بھی آ سکتا ہوں اور بہت دیر بھی ہو سکتی ہے یار تمہیں تو پتا ہے میٹنگز میں وقت کی قید نہیں ہوتی۔"

"کاش اندازے سے بھی زیادہ دیر ہو جائے۔" صنوبر نے دل سے دعا مانگی۔

"میری دوست کے ہاں بھی فنکشن ہے چلو دونوں ہی مصروف رہیں گے۔" صنوبر نے اسے یاد دلایا تاکہ دیر سے آنے کی صورت میں کوئی مسئلہ نہ پیدا ہو۔

ادھر طارق نے گیٹ سے قدم باہر نکالے ادھر صنوبر نے پھرتی سے تیاری پکڑی پتا نہیں کیوں وہ طارق کے سامنے تیار نہ ہو سکی تھی اور جب آدھے گھنٹے بعد لائٹ پنک جارجٹ کی ساڑھی کے ساتھ میک اپ میچنگ کی ہلکی پھلکی جیولری میں وہ اپنے کمرے سے برآمد ہوئی تو کسی صورت وہ سولہ سالہ شارق اور تیرہ سالہ شانزہ کی ماں نہیں لگ رہی تھی۔ یوں جیسے وقت اسے چھوئے بغیر گزر گیا ہو۔ خوف و شوق کے احساسات میں گھری دھیرے دھیرے چلتی صنوبر پارک کے گیٹ سے داخل ہو کر چھٹی بینچ کی جانب پہنچ چکی تھی کوئی منہ دوسری طرف کیے فون پر محو گفتگو تھا شاید ذیشان نہیں طارق ... نہیں ذیشان نہیں طارق اس کے دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے۔ وہ جو بھی تھا سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں صنوبر نے وہاں سے واپسی کا سوچا شاید بھرم رہ جائے لیکن قدموں کو تو زمین نے پکڑ لیا تھا من من بھر کے ہوتے قدموں پر وہ کھڑی کب رہ سکی تھی لڑکھڑا کر گر گئی تھی۔

"صنوبر تم۔" طارق کی دل و دماغ کو چیرتی دھاڑ بلند ہوئی تھی لیکن اس کی اس نفرت و حقارت بھری آواز کو سننے کے لیے صنوبر اس دنیا میں رہی ہی کب تھی۔ میڈیکل رپورٹیں دل پر شدید دباؤ کے سبب دل کے پھٹ جانے کو موت کا سبب قرار دے رہی تھیں۔

☼ ☼

ضوباریہ ساحر

مُقبے جاگ

۵
پانچویں اور آخری قسط

یہ کھڑکی مہاراج کی خواب گاہ کی ہے۔" شلندر نے عقب میں نظر آنے والی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ جس سے نائٹ بلب کی مدھم روشنی جھلک رہی تھی۔

"پھر کیا ارادہ ہے؟"

"اب ہمیں اس کھڑکی سے اندر داخل ہونا ہے۔ مگر خیال رہے کوئی آہٹ نہیں پیدا ہونی چاہیے۔"

مکمل ناول

"چلیں آگے بڑھیں۔" ہم سب اکٹھے ہی کھڑکی کی طرف بڑھے۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا کہ اگر ہمیں کسی نے دیکھ لیا یا مہاراج چیخ پڑا' شور مچ گیا تو انجام کیا ہوگا؟

سب سے پہلے شلندر ہی اندر داخل ہوا۔ اس کے بعد مہرجی پھر ڈاکٹر عقیل۔۔۔ وہ اندر پہنچے تو میں نے اپنی بندوق انہیں تھمادی اور خود بھی اچھل کر اندر داخل ہوگیا پھر باری باری پروفیسر' عارب' اختر بھی اندر آگئے۔ اختر نے وہ آہنی کھڑکی بند کی اور پردے کھینچ دیئے۔

اچھی خاصی وسیع وعریض خواب گاہ تھی۔ ہمارے قدموں تلے بڑا دبیز قالین تھا۔ دیواروں پر پردے جھول رہے تھے۔ ایک طرف جہازی سائز کے پلنگ پر مہاراج جی لیٹے نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔ نہ جانے کون سے جذبے' کون سے احساس کے تحت اسے دیکھتے ہی میرا خون کھول اٹھا رگوں میں چنگاریاں سلگ اٹھیں۔

مہرجی فوراً اس کے سرہانے موت کی دیوی بن کر کھڑی ہوگئی۔ شلندر اس کے دائیں طرف اور میں پائینتی کی جانب۔ شلندر نے اشارہ کیا اور ڈاکٹر عقیل نے دیوار پر بٹن پریس کرنا شروع کردیے۔ اچانک ہمارے سروں پر لٹکتا فانوس روشن ہوگیا پوری خواب گاہ میں تیز روشنی ہوگئی۔ خدشہ تھا کہ آنکھ کھلتے ہی ہم لوگوں کو دیکھ کر وہ چیخ پڑے گا مگر ہم نے اسے چیخنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

روشنی کی کرنوں نے اس کے پپوٹوں پر دستک دی تو اس نے کسمساتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ ہم پر نظر پڑتے ہی وہ بوکھلا گیا اس نے ہڑبڑا کر اٹھنے کی کوشش کی۔ مہرجی ایسی ہی صورت حال کے پیش نظر اس کے سر پر کھڑی تھی اس نے عقب سے اس کی گردن دبوچی اور اپنی جانب کھینچ لیا۔ میں اچھل کر پلنگ پر چڑھ گیا مہرجی نے پتا نہیں اس کی گردن کی کون سی رگ دبائی تھی کہ اس کا منہ غار کی طرح کھل گیا مگر اس کے حلق سے چیخ نہ نکل سکی' میں نے برق رفتاری سے بندوق کی نال اس کے کھلے ہوئے منہ میں گھسیڑ دی۔ عارب اور شلندر نے جھپٹ کر اس کے دونوں بازو گرفت میں لے لیے اور میں نے اپنا پاؤں اس کی پنڈلی پر رکھ دیا۔ بس پل بھر میں وہ بری طرح ہمارے شکنجے میں جکڑا جاچکا تھا۔

اس کی آنکھیں حیرت اور دہشت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ چہرے پر خوف اور تکلیف کے آثار منجمد ہو کر رہ گئے۔

"آواز نہیں رام پرشاد۔ اگر تمہاری سانس کی بھی آواز بلند ہوئی تو یاد رکھنا دوسرے سانس سے پہلے تمہاری روح تمہارے اس غلیظ وجود کو دھتکار کر چلی جائے گی۔" مجھے اپنی آواز بڑی نامانوس لگی تھی۔ رام پرشاد نے اثبات میں سرہلانے کی کوشش کی تو میں نے بندوق کی نال اس کے منہ سے نکال لی۔ مہرجی نے فوراً" بائیں ہاتھ سے اس کی زلفیں گرفت میں لے لیں اور دائیں ہاتھ سے خنجر اس کی گردن پر رکھ دیا۔

"اٹھو ہمیں اپنے عجائب خانے کی سیر کراؤ۔" میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"کک۔۔۔ کک۔۔۔ کس کارن؟" اس کی حالت بڑی دگرگوں تھی۔ مہرجی نے خنجر کا دباؤ ذرا سا بڑھا دیا اس کا منہ کھل گیا۔

"کارن جاننے کے چکر میں پڑ کر زندگی گنوا بیٹھوگے۔"

"تت۔۔۔ تم لوگ، تہہ خانے سے کیسے نکلے۔۔۔ بھیم۔۔۔ بھیم سنگھ کہاں تھا؟" جواباً" میں نے بندوق کی نال اس کے سینے میں ماری تو وہ کراہ کر رہ گیا۔

"موت کی نیند سو رہا ہے وہ تہہ خانے میں اور اگر تم نے زیادہ بک بک کی تو مجبوراً" ہم تمہیں بھی سلا دیں گے۔۔۔ اٹھو۔" وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگا تو مہرجی نے اسے چھوڑ دیا۔ اس کے کھڑے ہوتے ہی عارب نے لپک کر اسے عقب سے دبوچا اور خنجر اس کی شہہ رگ پر رکھ دیا۔

"تم لوگ یہ سب ٹھیک نہیں کر رہے۔ یہاں سے زندہ واپس نہیں جاسکوگے۔"

"برخوردار! فی الحال تو تم اپنی خیر مناؤ۔۔۔ چلو عجائب خانے کا راستہ کھولو۔" عارب نے حقارت سے کہا۔ مہاراج بائیں دیوار کے ساتھ موجود تجوری نما الماری کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے ہینڈل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ شلندر اس کی پسلیوں میں خنجر کی نوک چبھوتے ہوئے بولا۔

"رام پرشاد! اتنا ذہن میں رکھنا کہ اگر تم نے کوئی مکاری دکھانے کی کوشش کی تو ہمارے ساتھ جو ہوگا وہ بعد میں ہوگا اس سے پہلے تمہاری آنتیں گلے کا ہار ہو جائیں گی۔" مہاراج نے گھبرائے ہوئے انداز میں شلندر کی طرف دیکھا۔ پھر الماری سے پیچھے ہٹ گیا۔

"وہ۔۔۔ وہ عجائب خانے کا راستہ۔۔۔ س۔۔۔ ساتھ والے ہال سے نیچے جاتا ہے۔"

"ہوں۔۔۔ کافی سمجھدار ہو چلو ادھر چلو۔" مہاراج تیزی سے پلٹ گیا۔ بغلی دیوار کے درمیان میں کافی کشادہ گیٹ نما خلا تھا جس میں لڑیاں جھول رہی تھیں مہاراج اس طرف بڑھ گیا۔

"آجاؤ سب۔۔۔" شلندر کہتے کہتے چونک پڑا میں نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا ایک طرف کونے میں اختر اور ڈاکٹر عقیل فریج کھولے بیٹھے سیب کھا رہے تھے۔ ہمیں اپنی جانب متوجہ پا کر اختر مسکراتے ہوئے بولا۔

"بھوک بہت شدید لگی ہوئی تھی۔"

"آ۔۔۔ آپ لوگ چلیں ہم آرہے ہیں۔" ڈاکٹر عقیل نے جلدی جلدی منہ چلاتے ہوئے کہا۔

"دیوی جی! کیا آپ سیب کھائیں گی؟" اختر نے مہرجی کی طرف دیکھتے ہوئے دانت نکالے۔

"میں تمہاری طرح بے صبری نہیں ہوں۔" اس نے منہ پھیر لیا۔

"رزق سے منہ پھیرنے والے بے صبرے نہیں ناشکرے ہوتے ہیں۔" اختر ہاتھ میں پکڑے سیب کو دیکھنے لگا۔ مہرجی اسے گھور کر خاموش ہو رہی۔

"چلو اٹھو نیدو۔۔۔ ہم یہاں دعوت پر نہیں آئے۔" میں نے کہا۔

"ایک منٹ! اختر نے جلدی سے کہا اور اٹھ کر ایک الماری کی طرف بڑھ گیا۔ الماری کھول کر اس نے مہاراج کی ایک قمیص نکالی اور پہن لی کیونکہ اس کا اوپری دھڑ ابھی تک ننگا تھا۔ وہ دوبارہ فریج کی طرف بڑھ گیا۔

"اب چل پڑو ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔" شلندر نے بے زاری سے کہا۔

"بس ایک منٹ۔" اختر جلدی جلدی سیبوں سے جھولی بھرنے لگا۔

"وقت کا زیاں ہمارے لیے بہت خطرناک ہے۔" پروفیسر گمبھیر لہجے میں بولے۔

"چلیں کام ہوگیا۔" اختر نے سیبوں سے جھولی بھرلی تھی اس نے قریب آکر ایک سیب مجھے پکڑا دیا۔ میں نے ایک نظر مہرجی کی طرف دیکھا۔ بھوک تو سب کو لگ رہی تھی۔ میں نے وہ سیب ان کی طرف بڑھا دیا اس نے شکریہ کہتے ہوئے سیب پکڑ لیا۔ اختر نے ایک سیب شلندر کو اور مجھے ایک اور پکڑا دیا۔

ہم خواب گاہ سے ملحقہ اس ہال نما کمرے میں آگئے مہاراج نے ایک طرف دیوار پر لگی اپنی قد آدم تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

"ادھر سے راستہ جاتا ہے نیچے۔"

"دیکھو سوچ لو؟" شلندر نے اس کے چہرے کے سامنے خنجر لہرایا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں میں سچ کہہ رہا ہوں!"

"تو ٹھیک ہے آگے بڑھو۔" مہاراج تصویر کی طرف بڑھ گیا۔ تصویر کا فریم سونے کا تھا اور فریم کے چاروں کونوں پر سونے کی ایک ایک آنکھ بنی ہوئی تھی جن کی پتلیوں کی جگہ یاقوت سجائے گئے تھے۔ مہاراج نے ایک مخصوص انداز میں ان چاروں یاقوتوں کو گھمایا۔ پھر فریم کو بارڈر سے پکڑ کر کھینچا۔ فریم نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور کسی دروازے کی طرح کھل گیا۔ اندر گہرا اندھیرا تھا مگر فریم کے کچھ مزید کھلتے ہی کسی خودکار نظام کے تحت اندر روشنی پھیل گئی۔

کشادہ سیڑھیاں کہیں گہرائی میں جاتی تھیں۔ ان سیڑھیوں پر انتہائی قیمتی سرخ رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا۔

"چلو آگے بڑھو۔" عارب نے مہاراج کی پیٹھ پر گھونسا مارا اور وہ اندر داخل ہوگیا۔ پھر ہم سب کے اندر داخل ہوتے ہی عارب نے فریم بند کیا اور ساتھ ہی اندر اندھیرا پھیل گیا۔ گھپ اندھیرے میں تیزی سے سیڑھیاں طے کرنے کی مدھم مدھم آواز بلند ہوئی غالباً" مہاراج بھاگ رہا تھا۔ لیکن قالین کی وجہ سے ہلکی دھپ دھپ کی آواز آرہی تھی۔

"کھول دو۔۔۔ فریم، دروازہ کھول دو۔" شلندر کی تیز آواز ابھری اور عارب نے فوراً" دروازہ کھول دیا اندھیرا ایک بار پھر روشنی میں بدل گیا۔ مہاراج آخری زینے پر تھا۔ وہ دائیں طرف کو بھاگا اور نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

"رام پرشاد۔ رک جا ورنہ مارے جاؤگے۔" شلندر چیختا ہوا اس کے پیچھے بھاگا۔ ہم سب بھی اندھا دھند زینے طے کرتے ہوئے نیچے پہنچ گئے۔

یہ تقریباً" بارہ ضرب بارہ کا ایک کمرہ حصہ تھا۔ جس کے دائیں ہاتھ دیوار کی جگہ ایک باریک سا پردہ دکھائی دے رہا تھا پردے کے دونوں کونوں پر چاندی کے قد آدم مجسمے پڑے تھے۔ پردے کی حرکت بتا رہی تھی کہ مہاراج ادھر ہی گیا ہے۔ ہم بھی ایک لمحہ ضائع کیے بغیر پردہ ہٹا کر دوسری طرف پہنچ گئے اور ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔۔۔ ایک جہاں حیرت ہمارے سامنے تھا۔۔۔ ایک تحیر خیز دنیا بکھری پڑی تھی۔ وہ کوئی فسوں نگری تھی جہاں ہم راستہ بھٹک کر پہنچ گئے تھے۔ کچھ ایسی آرائش و زیبائش تھی وہاں کی۔ ایسے ایسے نادر و نایاب اور عجیب و غریب نمونے اور حیرتوں کا سامان وہاں موجود تھا کہ ہم سحر زدہ سے ہو کر رہ گئے۔ ہمارے پاؤں جیسے دبیز قالین میں دھنس کر رہ گئے اور چند ثانیوں کے لیے تو ہم مہاراج اور اپنے آپ تک کو فراموش کر بیٹھے۔

یہ ایک اچھا خاصا وسیع ہال تھا۔ ہمارے سامنے چند قدم کے فاصلے پر چونے کا بنا ہوا گوتم بدھ کا دیو قامت مجسمہ پڑا تھا جو گوتم بدھ کے گیان کے انداز کی عکاسی کرتا تھا۔ اس مجسمے کے ساتھ ہی ایک قطار کی صورت گوتم بدھ کے چند اور مجسمے ایستادہ تھے۔ کانسی، پیتل، چاندی اور سونے کے بنے ہوئے۔ دیواروں میں شیشے لگے ہوئے تھے اور شیشوں کے پیچھے دیواروں میں بنی

ہوئی الماریوں میں ہزارہا نادر نمونے تھے۔ نسوانی مجسمے..... جو مجسمے کم زندہ جاوید عورتیں زیادہ لگتی تھیں۔ استخوانی ڈھانچے۔ قدیم معبدوں میں عبادت کے لیے استعمال ہونے والے ظروف، قدیم وضع کے ہتھیار، دھاتی جوتے۔ قدیم لبادے، مٹی کی کھوپڑیاں، سانتے، ہیروں کے بنے ہوئے چراغ اور شمعدان، بیش قیمت پتھروں کے بنے تاج اور بالائیں۔ زندہ کلبلاتے ہوئے عجیب و غریب ہیئت کے سانپ، جانور۔ ہال کے وسط میں سرخ یا قوتی پتھروں سے بنا فرعون منقورا کا مجسمہ ایستادہ تھا جس کے پہلو میں قلوپطرہ کا برہنہ مجسمہ تھا۔ یونانی، مصری، دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں۔ جانوروں کی کھالیں اور ڈھانچے۔ عدونس، کیوپڈ اور دیوی وینس کے مجسمے، اس کونے سے لے کر سامنے نظر آنے والے دوسرے کونے تک ایک چار فٹ اونچی اور تقریباً" تین فٹ چوڑی دیوار تھی، جس پر پردے لٹک رہے تھے اس دیوار کے اوپر شیشے کے کیس ایک ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ جن میں مختلف تہذیبوں کی نشانیاں محفوظ کی گئی تھیں۔ شیشے کی الماریوں کے اوپر انتہائی نادر قسم کی پینٹنگز آویزاں تھیں۔ بغلی طرف کی پوری دیوار کو ایکوریم کی شکل دی گئی تھی۔ ایکوریم کیا سمندر ہی تھا ایسی انوکھی آبی مخلوقات اس میں نظر آرہی تھیں کہ چند ایک ایسی چیزیں تھیں جو میں نے آج سے پہلے دیکھی ہی نہ تھیں۔ ہال میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر شیشے کے تابوت نما کیس ایستادہ تھا۔ چند میں مورتیاں، استخوانی ڈھانچے اور چند میں انسانی وجود تھے مرد عورتیں برہنہ حالت میں..... غرض کہ وہاں اتنا کچھ تھا کہ جسے بیان کرنا ممکن نہیں۔

یہ سب دیکھ کر ایک ذرا تو ہم اپنی اپنی جگہ مبہوت رہ گئے پھر شلندر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

"رام پرشاد! سامنے آجاؤ یوں چھپنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔" اس نے بلند آواز سے کہا۔ ہم لوگوں کو بھی جیسے اچانک ہوش آگیا اور ہم سب بھی آگے بڑھ گئے۔

"رام پرشاد! بے موت مارے جاؤ گے سامنے آجاؤ۔" شلندر نے ایک بار پھر آواز دی مگر "صدائے برنخاست" کوئی جواب نہ ملا۔ ظاہری بات تھی رام پرشاد سامنے آنے کے لیے تو نہیں چھپا تھا۔ ہم سب ہال میں پھیل گئے مگر شاید رام پرشاد آنکھ مچولی کھیلنا چاہتا تھا۔ سب کی نظریں مہاراج رام پرشاد کی کھوج میں تھیں مگر میری..... میری نظریں مریاقس کے تابوت کی تلاش میں تھیں مگر وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اور میرے اضطراب میں اضافہ ہوا جارہا تھا۔ بقول شلندر کے تابوت عجائب خانے میں ہی موجود تھا اور تابوت کے اوپر وہ سونے کا مجسمہ ایستادہ کیا گیا تھا جس میں مریاقس کا وجود محبوس تھا۔ مگر اس وقت نہ تو تابوت کہیں دکھائی دے رہا تھا اور نہ ہی وہ سونے کا مجسمہ۔

میں پوری توجہ سے اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا مگر حقیقتاً" مجسمہ یا تابوت وہاں موجود نہیں تھا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ جس تابوت کے لیے، جس مجسمے کے لیے میں مصر سے ہندوستان تک آیا تھا، اتنا کھٹ راگ پالا تھا جس کے لیے اتنی جانیں ضائع ہوئی تھیں، ہم سب موت کے منہ میں آئے کھڑے تھے، اسے یہاں ہونا چاہیے تھا مگر وہ یہاں نہیں تھا۔ میرے ذہن میں ہزاروں اندیشے پھنکارنے لگے۔ کہیں مہاراج نے اس کا آگے سودا نہ کردیا ہو..... کہیں کسی کو تحفے میں نہ دے دیا ہو۔ اور..... اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ ہماری وجہ سے مہاراج نے اسے غائب کردیا ہو۔ لیکن بھلا اس جگہ سے زیادہ محفوظ جگہ اور کون سی ہوسکتی تھی۔؟

ہم ساتوں ہال کے دوسرے کونے تک آپہنچے انہیں مہاراج دکھائی نہ دیا اور مجھے تابوت۔

"شلندر صاحب!" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ شلندر کو مخاطب کیا۔

"آپ نے تو کہا تھا کہ تابوت اور مجسمہ یہیں موجود ہے، پھر کہیں دکھائی کیوں نہیں دے رہا۔" شلندر نے ایک ذرا ہال میں نظر دوڑائی پھر گویا ہوا۔

"فدا مہاراج کو دیکھ لیں ابھی معلوم ہوجائے گا۔" ٹھیک اسی وقت داخلی جانب سے ایک چھناکے کی سی آواز بلند ہوئی تو ہم سبھی چونک پڑے۔

مہاراج رام پرشاد ایک طرف مجسموں کی اوٹ سے نکلا تھا اور بے دھیانی میں ایک پیتل کے مجسمے سے ٹکرا گیا تھا اور وہ مجسمہ شیشے کے کیس پر گرا تھا۔ ایک لمحے کو خود مہاراج بھی بوکھلا گیا۔ اس نے پلٹ کر گھبرائے ہوئے انداز میں ہماری طرف دیکھا۔ عارب نے میرے ہاتھ سے بندوق جھپٹ کر اس کی طرف تان لی۔

"مہاراج جی! اپنی جگہ سے ہلنے کی حماقت مت کیجیے گا ورنہ بھیجا اڑا دوں گا۔" مہاراج نے یہی مناسب سمجھا کہ بھیجا اڑوالیا جائے..... وہ بجائے ساکت ہونے کے سیڑھیوں کی سمت بھاگ پڑے ہمارے درمیان فاصلہ اتنا تھا کہ ہم بھاگ کر اسے پکڑ نہیں سکتے تھے۔ مہاراج کمرے والے پردے تک پہنچا تھا کہ کمبخت عارب نے ٹریگر دبادیا۔

دھماکے کی آواز سے کانوں کے پردے جھنجھنا کر رہ گئے۔ درمیان میں ایستادہ ایک تابوت نما شیشے کا کیس چھناکے کی آواز پیدا کرتا ہوا ڈھیر ہوگیا۔ شیشے کے ٹکڑے قالین پر بکھر گئے اور رام پرشاد بھی لڑکھڑا کر گر پڑا۔

"ارے احمق یہ کیا کیا۔" شلندر نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا تو عارب نے پرسکون انداز میں جواب دیا۔

"بھاگتے ہوئے مہاراج کی لاش ہی سہی۔"

"اب یہاں سے فوراً" نکلنے کی کوشش کرو ورنہ ہماری لاشیں بھی نہیں ملیں گی۔" شلندر نے خشک لہجے میں کہا اور سامنے کی طرف دوڑ پڑا۔

"شلندر صاحب! تابوت کدھر ہے؟" میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ پوچھا۔ تو شلندر رک گیا۔

"شکیل صاحب! جان بچی سو لاکھوں پائے۔ پہلے جان بچانے کی کوشش کریں گولی کی آواز پر پورے محل کے سپاہی ابھی یہاں پہنچ جائیں گے۔ زندہ بچ کر نکل گئے تو تابوت کے لیے دوبارہ بھی کوشش کی جاسکتی ہے۔ بھاگیں۔" اور چاروناچار میں بھی دوڑ پڑا۔

"اگر وہ اوپر جاکر دروازہ بند کردیتا تو بھی ہم زندہ نہ بچتے۔" عارب نے دوڑتے ہوئے صفائی دینے کی کوشش کی مگر کسی نے کوئی تبصرہ نہ کیا سب کو اپنی زندگیوں کی فکر لاحق ہوگئی تھی۔ گولی مہاراج کے شولڈر میں لگی تھی اور پار ہوگئی تھی۔ وہ کندھا تھامے کراہ رہا تھا۔ ہم اس کے سر پر پہنچے تو وہ ہمیں وحشت زدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ عارب نے رکتے ہوئے بندوق اس کی طرف سیدھی کی تو شلندر نے اسے دھکا دے دیا۔

"کیا حماقت ہے..... !کچھ عقل سے بھی کام لے لو۔"

"اب ایک دھماکا ہوگیا ہے تو پھر دوسرا بھی سہی کم از کم اس کا تو "کونڈا" ہوجائے۔"

"آگے بڑھو۔" شلندر نے تیز لہجے میں کہا۔ اور ہم دوڑتے ہوئے سیڑھیوں پر چڑھ گئے اور دو دو تین تین زینے پھلانگتے ہوئے اوپر پہنچ گئے۔

خواب گاہ کا دروازہ بری طرح پیٹا جارہا تھا اور باہر رنگ برنگی آوازیں بلند ہورہی تھیں۔ اوپر روشن دان سے صبح صادق کی دودھیا روشنی چھن چھن کر اندر آرہی تھی۔ شلندر برق رفتاری سے دیوار گیر آہنی الماری کی طرف بڑھا۔ اس نے دونوں پٹ کھولے اور بیٹھ کر الماری کے نچلے خانے سے کچھ تلاش کرنے لگا۔ اچانک بائیں باغ والی کھڑکی کو کسی نے دھڑدھڑایا اور ہمارے دل اچھل کر حلق میں آگئے۔ دروازے پر بھی دشمن عقبی کھڑکی پر بھی ہم چوہوں کی طرح خواب گاہ کے چوہے دان میں پھنس کر رہ گئے تھے۔

"شلندر کیا ڈھونڈ رہے ہو؟" ڈاکٹر عقیل نے تیز لہجے میں پوچھا مگر شلندر نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ پاگلوں کی طرح الماری کے خانے میں ہاتھ مار رہا تھا۔ اچانک ایک چھناکے کی آواز آئی اور شیشے کی کرچیاں خوابگاہ میں بکھر گئیں کھڑکی خونخوار چہروں سے بھری ہوئی تھی۔ عارب اور اختر دونوں نے جھٹکے سے

بندوقیں سیدھی کیں مگر فائر صرف عارب نے کیا۔ ایک دھماکا ہوا چند چیخیں بلند ہوئیں اور کھڑکی کا فریم خالی ہوگیا۔ ٹھیک اسی وقت شلندر کے حلق سے ایک مسرت انگیز آواز خارج ہوئی اور اچانک وہ الماری اپنی جگہ چھوڑ گئی۔ اب اس کی جگہ ایک تاریک خلا دکھائی دے رہا تھا۔

"آؤ جلدی... جلدی کرو۔" شلندر نے تیزی سے کہا اور ہم اس خلا میں داخل ہوگئے سب سے آخر میں شلندر اندر آیا۔ بارہ زینوں کے بعد ہموار فرش تھا مگر اندھیرا اتنا زیادہ تھا کہ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

پھر اندھیرے میں ایک ہلکی سی "چیخ" کی آواز ابھری اور اندھیرا روشنی میں بدل گیا۔ الماری از خود میکانکی انداز میں سرکتی ہوئی اپنی جگہ واپس آگئی اور خلا بند ہوگیا۔

ہمارے سامنے ایک طویل سرنگ نما راستہ تھا جس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بلب روشن تھے۔

"آؤ..." شلندر سرنگ میں دوڑ پڑا۔

"اب جتنی جلدی ممکن ہوسکے ہمیں رام پور کی حدود سے نکل جانا چاہیے ورنہ پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔" اس نے دوڑتے ہوئے کہا۔

"تمہیں اس راستے کا علم کیسے ہوا؟" ڈاکٹر عقیل نے پوچھا۔

"مجھے دونوں راستوں کا علم تھا۔ اسی لیے جب رام پرشاد الماری کی طرف بڑھا تھا تو میں نے اسے ٹوک دیا تھا۔"

"صبح کی روشنی پھیل گئی ہے اور خطرہ بھی۔" پروفیسر کی بات پر اختر نے دوڑتے دوڑتے انہیں ایک ذرا گھور کر دیکھا اور پھر نظریں ہٹالیں... بے چارے کے سیب خوابگاہ میں ہی رہ گئے تھے۔

تقریباً" ایک فرلانگ کے بعد سرنگ دائیں ہاتھ مڑ گئی۔

"جلدی... تیز دوڑو!" شلندر نے کہا اور ہم نے حتیٰ الامکان اپنی رفتار تیز کردی ادھر سے تقریباً" ڈیڑھ فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس سرنگ کا اختتام ایک لکڑی کے دروازے پر ہوا۔

دروازہ عام سی نوعیت کا تھا جس میں دو چٹخنیاں لگی ہوئی تھیں۔ شلندر نے جلدی سے آگے بڑھ کر چٹخنیاں ہٹائیں اور ہماری طرف پلٹتے ہوئے بولا۔

"بہت محتاط رہنا ہوگا یقیناً" اس کوٹھی میں بھی مسلح افراد موجود ہوں گے۔" ہم نے اثبات میں سر ہلا دیئے شلندر نے آہستہ سے دروازہ کھول دیا۔ دوسری جانب اندھیرا تھا۔ شلندر ہمیں آگے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے اندھیرے میں داخل ہوگیا۔ ہم نے بھی اس کی تقلید میں قدم بڑھا دیئے۔ گہرا اندھیرا سرنگ میں سے آنے والی روشنی سے مجروح ہورہا تھا۔ ہم صرف ایک دوسرے کے ہیولے ہی دیکھ پا رہے تھے۔ شلندر دائیں طرف کو بڑھا تھا۔ ایک بوجھل سکوت جیسے اندھیرے میں گھلا ہوا تھا۔ اتنا سا دوڑنے سے ہی ہماری سانسیں بری طرح پھول گئی تھیں دل تھا کہ سینے کے اندر اودھم مچائے ہوئے تھا۔

وقتی طور پر ممی اور تابوت کا خیال بھی میرے ذہن سے نکل گیا دماغ میں صرف اتنی سوچ سانس لے رہی تھی کہ مہاراج بری طرح زخمی ہوا ہے اور اب اس کے سپاہی شکاری کتوں کی طرح ہمارے پیچھے دوڑ پڑیں گے ان سے بچنے کے لیے ہمیں جلد سے جلد رام پور کی حدود سے باہر نکلنا تھا۔ اچانک دائیں جانب سے روشنی کا سیلاب امنڈ پڑا اور ہم سب بھی اچھل پڑے۔ شلندر ایک بڑا سا پردہ اٹھائے کھڑا تھا دوسری جانب تیز روشنی تھی اور ایک ہال دکھائی دے رہا تھا جس کے دور نظر آنے والے کونے تک تین قطاروں میں صوفے پڑے دکھائی دے رہے تھے اور غالباً" ہم اسٹیج کے نیچے کھڑے تھے۔

روشنی کے باعث ہم اپنے اطراف کا بخوبی جائزہ لے سکتے تھے۔ ہمارے سروں سے تقریباً" ایک فٹ کی اونچائی پر سنگی چھت تھی۔ عقبی طرف سرنگ کا دروازہ اور دو طرف سنگی دیواریں تھیں جدھر شلندر پردہ اٹھائے کھڑا تھا وہ واحد راستہ تھا جہاں پردے سے دیوار کا کام لیا گیا تھا اور یقینی بات تھی کہ وہ اسٹیج کے سامنے سمت تھی۔

ہم لپک کر شلندر کے قریب پہنچ گئے۔

"یہاں ہال میں کوئی نہیں ہے آجائیں۔" شلندر نے مدھم لہجے میں کہا اور ہم اسٹیج سے نکل کر ہال میں آگئے اچھا خاصا وسیع ہال تھا کم از کم دو ڈھائی سو افراد بہ آسانی وہاں بیٹھ سکتے تھے۔ اسٹیج کے ساتھ ہی ایک دروازہ دکھائی دے رہا تھا شلندر تیزی سے اس کی طرف بڑھ گیا۔

"آجائیں!"

"کچھ آگے کا بھی پتا ہے کہ کدھر کو جانا ہے؟" ڈاکٹر عقیل نے کہا۔

"کچھ پتا نہیں۔ بس آجائیں جدھر قدم لے کر جائیں گے چلے چلیں گے۔"

"دیکھیے گا کہیں در موت کی طرف نہ لے جایئے گا ہمارے دل میں تو ابھی بہت ارمان باقی ہیں۔"

اختر نے دزدیدہ نظروں سے مہرجی کی طرف دیکھا مگر اس کی توجہ دوسری جانب تھی۔

"چنتا نہیں کرو برخوردار! پران کے ساتھ ساتھ ارمان بھی پرواز کر جائیں گے۔" شلندر مسکرایا۔

"اور جوان ارمانوں کے حق دار ہیں ان کا کیا بنے گا؟"

"یہ تم حق داروں سے خود پوچھ لینا۔" شلندر کی بات پر اختر تیزی سے رخ پلٹ کر مہرجی سے مخاطب ہوا۔

"کیوں مہرجی! کیا خیال ہے؟"

"کس بارے میں؟" مہرجی نے بھنویں سکوڑ کر اختر کی طرف دیکھا۔

"ارمانوں کے بارے میں۔"

"شٹ اپ۔"

"مجھے کیوں ڈانٹ رہی ہیں میں تو شلندر صاحب کے کہنے پر پوچھ رہا ہوں۔" اختر نے رونی صورت بناتے ہوئے کہا۔ اس کے انداز میں ایسی بے ساختگی... معصومیت' ایسا حقیقی تاثر تھا کہ بے اختیار ہم سب مسکرا دیے۔ مہرجی نے بھی بڑی مشکلوں سے ہونٹوں پر آنے والی مسکراہٹ کو دبوچا تھا۔

شلندر نے دروازے کے "کی ہول" سے جھانکا اور مسرت انگیز لہجے میں بولا۔

"قسمت کی دیوی ہم پر پوری طرح مہربان ہے۔"

"کیا مولوی صاحب چھواروں سمیت موجود ہیں؟" اختر چہکا۔

"نہ کوئی مولوی ہے نہ چھوہارہ راستہ بالکل صاف ہے اور ہے بھی عقبی سائیڈ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دو ہیوی انجن لینڈ روور گاڑیاں بھی کھڑی ہیں۔"

"سائیوں نے ہمارے لیے تھوڑا کھڑی کر رکھی ہوں گی کہ چابیاں تک اگنیشن میں چھوڑی ہوں کہ سات نواب ہمارے مہاراج کو زخمی کرکے ادھر آئیں گے انہیں فرار ہونے میں کوئی دقت نہ ہو۔" عارب نے کہا۔

"چابیاں ہوں نہ ہوں یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ ویسے بھی ہم سب ایک گاڑی میں با آسانی سما جائیں گے۔" شلندر نے تیز لہجے میں کہا۔

"عقیل تم آگے میرے ساتھ بیٹھو گے اور مہر تم عقبی سمت۔ بندوق سنبھال لو ہوسکتا ہے ضرورت پڑ جائے۔" شلندر پہلے ڈاکٹر عقیل پھر مہرجی سے مخاطب ہوا اور مہرجی نے فوراً" عارب کے ہاتھ سے بندوق لے لی۔ دونالی تھی اور دونوں کارتوس چل چکے تھے میں نے اپنی کمر سے بندھی کارتوس پیٹی اتار کر مہرجی کو تھمادی جو اس نے اپنی نازک سی کمر کے گرد کس لی اور بندوق لوڈ کرلی۔ ہمارے اعصاب اک سنسنی کی کیفیت کا شکار تھے شلندر نے معمولی سا دروازہ کھولا اور باہر جھانکنے لگا۔

"آجاؤ!" اس نے کہا اور ہم سب آگے بڑھ گئے۔ دروازے سے باہر نکلتے ہی ایک طویل برآمدہ آتا تھا جس کا اختتام دائیں ہاتھ کافی دور جا کر ایک دروازے پر ہوتا تھا جبکہ بائیں ہاتھ بھی چند قدم کے فاصلے پر ایک کمرہ دکھائی دے رہا تھا جس کا دروازہ بند تھا۔ برآمدے کے ساتھ ہی آگے دو گاڑیاں کھڑی تھیں جن کی دوسری طرف ایک وسیع گراسی پلاٹ موجود تھا جس کی

حد بندی پھول دار پودوں اور بیلوں سے کی گئی تھی۔ پلاٹ کی دوسری جانب اس عمارت کا احاطہ کرتی ایک بلند فصیل تھی جسے با آسانی پھلانگنا ممکن نہیں تھا اور ویسے بھی اس دیوار تک پہنچنا خطرے سے خالی نہ تھا۔

صبح کا اجالا پوری طرح پھیل چکا تھا مگر ابھی سورج طلوع ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔

"شلندر! میرا خیال ہے کہ ہمیں دیوار پھلانگ کر نکل جانا چاہیے۔ اگر ہم گاڑی استعمال کریں گے تو یہاں موجود لوگوں کو فوراً" علم ہو جائے گا اور ہمارے لیے فرار ہونا بہت مشکل ہو جائے گا اور پھر گیٹ بھی تو بند ہو گا! ہم گاڑی لے کر کدھر سے نکلیں۔" ڈاکٹر عقیل نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"نہیں یہ اور بھی زیادہ خطرناک ثابت ہو گا۔ دیوار تک پہنچنے سے پہلے ہی ہم لوگ نظروں میں آجائیں گے اور پھر دیوار بھی دیکھ لو خاصی بلند ہے.... دیوار پر چڑھنے کا ہمیں موقع نہیں ملے گا اور فرض کر لو کہ اگر ہم لوگ دیکھ لیے جانے کے باوجود دیوار پھاند کر نکل جانے میں کامیاب ہو بھی گئے تو پیدل کہاں تک بھاگ سکیں گے....؟ گاڑی کا یہ ہے کہ ہم لوگ نظروں میں آجانے کے باوجود بھی نکل جائیں گے اور اگر ایک بار ہم رام پور سے نکل گئے پھر ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔"

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ اس عمارت میں ہمارے علاوہ کوئی دوسرا ہو ہی نا!" عارب نے کہا۔

"یہ ممکن نہیں۔" شلندر نے فوراً" تردید کی۔

"تو ٹھیک ہے۔ پھر آگے بڑھو جو ہو گا دیکھا جائے گا۔" پہلے شلندر آگے بڑھا اس نے ایک گاڑی کا بونٹ اٹھایا اور چند تاریں توڑ ڈالیں۔ ہم لوگ دوسری گاڑی کی طرف بڑھ گئے میں' عارب' اختر' پروفیسر اور مہرجی عقبی حصے میں سوار ہو گئے جبکہ شلندر نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور عقیل اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

مہرجی اور اختر چونکہ دونوں مسلح تھے اس لیے وہ عقبی دروازے کے ساتھ والی سیٹوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے اور ہم تینوں آگے کی سیٹوں پر۔ مہرجی پوری طرح چوکنا دکھائی دے رہی تھی۔ وہ عقابی نظروں سے عمارت کے کونے کھدروں کا جائزہ لے رہی تھی جبکہ اختر کی نظریں اس کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں اچانک گاڑی کا انجن غرا اٹھا۔ سنسنی کے کیڑے ہماری رگوں میں کرلانے لگے۔

گاڑی نے ایک خفیف سی جھرجھری لی اور ٹرن لیتی ہوئی عمارت کے دائیں سمت بڑھ گئی۔ انجانے اندیشوں نے ہمارے حلق خشک کر ڈالے تھے۔ گاڑی نے برق رفتاری سے رخ بدلا اور عمارت کی دوسری جانب گھوم گئی اور پھر اچانک ایک دھماکہ ہوا۔ ایک چھناکے کی آواز بلند ہوئی اور ونڈ اسکرین کی کرچیاں اڑ کر عقبی حصے تک بھی آئیں۔ گاڑی بری طرح ڈگمگائی تھی میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ ایک دھماکہ ہوا مگر گولی نہ جانے کدھر گئی تھی.... البتہ گاڑی کی ڈگمگاہٹ اور بڑھ گئی۔

"ہوشیار۔" شلندر حلق کے بل چیخا تھا۔ ٹھیک اسی وقت عقبی طرف سے دو آدمی اندرونی حصے سے نکلتے دکھائی دیئے دونوں کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ ابھی انہوں نے بندوقیں گاڑی کی طرف سیدھی بھی نہ کی تھیں کہ مہرجی نے فائر داغ دیا۔ ان میں سے ایک اچھل کر گرا اور دوسرا بھاگ کر ایک ستون کی اوٹ میں ہو گیا۔

"تم فائر نہیں کرنا۔" اختر کو بندوق سیدھی کرتے دیکھ کر مہرجی چیختے ہوئے بولی اور اختر نے نالی جھکائی۔ اچانک بریک بری طرح چرچرائے' یوں لگا جیسے ابھی گاڑی الٹ جائے گی مگر شلندر مشاق ڈرائیور ثابت ہوا۔ گاڑی دوسری جانب گھوم گئی اور ہم ایک دوسرے سے ٹکرا کر سنبھل گئے۔

برآمدے میں گرا ہوا ایک شخص جلدی سے اٹھا اور ایک طرف فرش پر پڑی بندوق کی جانب بڑھ گیا یہ یقیناً" وہی تھا جس نے سامنے سے فائر کیا تھا اور غالباً" گاڑی کی زد سے بچنے کے لیے اس نے برآمدے میں چھلانگ لگائی تھی مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنی بندوق اٹھا

کر پلٹتا اور ہم پر فائر کرتا مہرجی نے اس کی پیٹھ میں روزن بنا ڈالا اور وہ بے چارہ منہ کے بل ڈھیر ہو گیا۔

"اسے لوڈ کرو۔" مہرجی نے اپنی بندوق اختر کی گود میں ڈالی اور اس کے ہاتھ سے بندوق جھپٹ لی۔ ایک طرف پک اپ ٹائپ کی گاڑی کھڑی تھی جس کے قریب چار مسلح افراد کھڑے تھے اور چند افراد پک اپ میں سے کارٹن نکال رہے تھے۔ وہ سبھی اپنی جگہ ہکابکا کھڑے منہ پھاڑے ہماری گاڑی کی طرف دیکھ رہے تھے یقینی بات تھی کہ معاملہ ان کی سمجھ سے باہر تھا۔ ان کے کچھ سمجھنے سے پہلے ہی مہرجی نے ان پر فائر کر دیا۔ تین چار بھاگ کر ادھر ادھر ہو گئے دو پک اپ کی اوٹ میں ہو گئے جبکہ تین ڈھیر ہو گئے۔ اب یہ خدا بہتر جانے کہ ان تینوں کو کارتوس کے "چھرے" زخمی کر گئے تھے یا وہ محض دوسرے فائر سے بچنے کے لیے لیٹے تھے۔ چند لمحوں کے توقف سے مہرجی نے دوسرا فائر بھی داغ دیا۔ یکے بعد دیگرے دو دھماکے ہوئے۔ ایک تو فائر کا تھا۔ دوسرا پک اپ کے ٹائر برسٹ ہونے کا تھا۔ مہرجی نے بندوق اختر کی گود میں پھینکی اور لوڈڈ بندوق اس کے ہاتھ سے جھپٹ لی۔ اچانک بلند ہونے والی شلندر کی دھاڑ نے ایک لمحے کو تو ہمیں بوکھلا کر رکھ دیا۔ "مہر....!" بیک وقت ہم پانچوں نے اگلی جانب دیکھا۔ میرا دماغ تو بھک سے اڑ گیا۔ کچھ فاصلے پر ایک بڑا سا سلاخ دار گیٹ تھا اور اس گیٹ کے سامنے کھڑا چوکیدار اپنی بندوق ہماری گاڑی کی جانب سیدھی کر رہا تھا۔

لمحے کے ہزارویں حصے میں میں نے اسے دیکھا۔ مہرجی آسمانی بجلی کی طرح ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھی بندوق کی نال میرے سامنے سے فرنٹ کی جانب بڑھی ایک ساتھ دو دھماکے ہوئے۔ گاڑی دو ٹائروں پر اس بری طرح لہرائی کہ میں اپنی سیٹ سے اچھل کر عارب سے جا ٹکرایا اور مہرجی لڑکھڑا کر میرے اوپر ہی آگری۔

یہ اندازہ کرنا محال تھا کہ پہلے گاڑی لہرائی تھی یا فائر ہوئے تھے۔ مہرجی کے فائر نے میرے کانوں کے پردے جھنجھنا کے رکھ دیئے تھے۔ دماغ کے اندر سیٹیاں سی بجنے لگی تھیں۔

"سنبھلو...." شلندر ایک بار پھر چیخا۔ ہم ابھی اٹھ ہی رہے تھے کہ گاڑی ایک دھماکے کی آواز سے گیٹ سے جا ٹکرائی پروفیسر' اختر اور عارب بھی مجھ سے آٹکرائے میرے سر اور کندھے میں شدید چوٹ آئی تھی۔ گاڑی برق رفتاری سے ریورس ہوئی مہرجی اور اختر پھرتی سے پیچھے ہٹے البتہ میں نے نیچے بیٹھے بیٹھے ہی مضبوطی سے سیٹ کو تھام لیا۔ ٹھیک اسی وقت عقبی جانب سے یکے بعد دیگرے چار فائر ہوئے۔ اختر کے حلق سے ایک کراہ خارج ہوئی اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔

"اختر.... تت.... تم ٹھیک تو ہو؟" عارب نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"اختر...." میں اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ پایا۔ میری نظریں اس کے کولہے سے چپک کر رہ گئی تھیں جس سے خون ابل رہا تھا۔ مہرجی نے اندھا دھند عقبی سمت فائر جھونک دیا۔

گاڑی ایک جھٹکے سے رکی۔ پھر بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی سی تیزی سے گیٹ کی جانب دوڑ پڑی۔ مہرجی بندوق لوڈ کر رہی تھی عارب لپک کر اختر کے قریب ہو گیا جس کے چہرے پر شدید تکلیف کے تاثرات رقم تھے۔ گاڑی ایک بار پھر دھماکے کی آواز سے گیٹ سے جا ٹکرائی دھچکا کچھ ایسی شدت کا تھا کہ یوں لگا جیسے آسمان ٹوٹ کر زمین پر آگرا ہو مہرجی کے قدم اکھڑ گئے۔ عارب پشت کے بل گرا تھا اور پروفیسر کے حلق سے بھی ایک بے معنی سی آواز نکل گئی مگر اس دفعہ نہ تو گاڑی ریورس ہوئی اور نہ ہی رکی گیٹ اکھڑ گیا تھا۔ جہاں گیٹ کے راڈ وغیرہ ستونوں میں نصب تھے وہاں سے سیمنٹ اور اینٹیں اکھڑ گئی تھیں۔ تقریباً" بیس قدم تک گاڑی گیٹ کو دھکیلتی ہوئی لے گئی پھر گیٹ ایک طرف گر پڑا اور گاڑی ڈولتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

کچھ اندازہ نہیں تھا کہ ہم رام پور کے کون سے حصے میں ہیں اور آگے کس سمت جانا ہے۔ لیکن شلندر کو یقیناً" اس کا علم تھا اور اب یہ ذمہ داری بھی اس کی

تھی۔

میں سرک کر اختر کے قریب ہو گیا۔ شدت ضبط سے اس کے جبڑے کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں اور تکلیف کی شدت سے اس کا پورا وجود آہستہ آہستہ لرز رہا تھا۔

"اختر تم... تم ٹھیک تو ہو۔" میرا یہ جملہ اضطراری تھا۔ عارب اور مہر جی بھی قریب ہی بیٹھ گئے۔

"شکیل صاحب! لگ... لگتا ہے کہ گو... گولی کولہے کی ہڈی کو تت... توڑ گئی ہے۔" اختر کی آواز کپکپا رہی تھی۔ اس کا نچلا دھڑ خون میں لت پت ہو چکا تھا اور گاڑی کا فرش بھی رنگین ہو رہا تھا۔

"شکیل صاحب! خیریت تو ہے؟" شلندر نے عقب نما آئینے میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ میرے بولنے سے پہلے ہی مہر جی تیز لہجے میں بولی۔

"انکل! اختر کو گولی لگ گئی ہے' خون بھی بہت تیزی سے بہہ رہا ہے گاڑی تیز چلائیں' ہمیں فوراً" کسی ہسپتال تک پہنچنا ہو گا۔" اس کے لہجے میں اضطراب تھا' اندیشے تھے اور چہرے پر شدید فکرمندی اور پریشانی کا نقشہ کھینچ گیا تھا۔ اس کا یہ روپ ہمارے لیے نیا تھا۔

"کیا گھاؤ خطرناک ہے؟" عقیل نے تشویش سے پوچھا۔

"گولی کولہے کے اندر رہ گئی ہے اور غالباً" ہڈی کو توڑ گئی ہے! اگر فوراً" آپریشن نہ کیا گیا تو بارود کا زہر پھیلنا شروع ہو جائے گا۔" میں نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ خون ایک طرف سے بہہ رہا ہے یقینی بات ہے کہ گولی اندر تھی پھر کولہے کو ہاتھ لگانے سے ہی اختر تڑپ اٹھتا تھا جس کا مطلب تھا کہ ہڈی میں فریکچر آیا ہے۔

"شلندر صاحب! کیا یہاں نزدیک کوئی ہاسپٹل نہیں ہے؟" عارب نے شلندر کو مخاطب کیا۔

"نہیں... ! اور ہاسپٹل تک پہنچنے کے لیے ہمیں کم از کم بھی تین گھنٹے چاہئیں۔"

"بہت دیر ہو جائے گی شلندر صاحب! اختر کا خون بہت تیزی سے بہہ رہا ہے۔ اگر بروقت طبی امداد میسر نہ آئی تو اس کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔"

"ان علاقوں میں کوئی ہاسپٹل نہیں ہے چھوٹی سی ایک ڈسپنسری ہے اور وہ بھی راج محل کے قریب اور وہاں سے بھی اسے کوئی خاص فائدہ نہیں ہو گا جبکہ اسے فوری آپریشن کی ضرورت ہے اس کے لیے ہمیں جلد از جلد شہر تک پہنچنا ہو گا اور اس میں ہمیں تین گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے۔"

"انکل! آپ... کچھ کریں نا۔" مہر جی نے بے قراری سے کہا۔

"بیٹا یہاں میں مجبور ہوں کچھ نہیں کر سکتا... بس دعا کر سکتا ہوں' تم لوگ بھی دعا کرو۔" شلندر نے گمبھیر آواز میں کہا۔ مہر جی متفکر نظروں سے اختر کی صورت دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں ایک معصوم بچے کی سی بے چارگی سمٹ آئی تھی۔

"آ... آپ اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہیں؟" اختر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی لیکن مسکراہٹ بھی جیسے اسے بوجھ محسوس ہوئی تھی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے جھلملانے لگے۔

"کیوں کہ... میں بھی انسان ہوں' سینے میں پتھر نہیں رکھتی۔ میرے سینے میں بھی دوسرے انسانوں کی طرح گوشت کا ایک نرم ٹکڑا دھڑکتا ہے۔" مہر جی نے ملائمت سے کہا۔

"چلو... ذہن... سے ایک بب... بوجھ تو ہٹا۔" اختر کے چہرے پر قدرے اطمینان پھیل گیا۔

"کیسا بوجھ...؟"

"یہ... یہی کہ آپ... کے سینے میں بھی دل ہے... ورنہ میں تو اب تک یہی سمجھتا رہا ہوں کہ آ... آپ کے سینے میں دل کی جگہ... پپ... پتھر ہے۔"

"طنز کر رہے ہو مجھ پر۔"

"نن... نہیں میری ایسی مجال کہاں؟ میں تو بس... یونہی اپنا خیال ظاہر کر رہا تھا۔"

اچانک گاڑی کو ایک چھوٹا سا جمپ لگا اور اختر کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ تکلیف ضبط کرنے کی کوشش میں اس کے جبڑے بھینچ گئے۔ آنکھیں ابل پڑیں چہرے اور گردن کی رگیں ابھر آئیں۔ مہر جی سرک کر قدرے اس کے قریب ہو گئی۔

"حوصلہ! حوصلہ کرو اختر مرد ہو تم۔" عارب نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"مر... مردانگی ہوا ہو... گئی ہے عا... عارب بھائی۔" اختر نے مسکرانے کی کوشش کی مگر کراہ کر رہ گیا۔

ڈاکٹر عقیل نے گردن موڑ کر اختر کو دیکھا ان کے چہرے پر گہری تشویش کے سائے تھے۔ یقیناً" انہیں حالات کی نزاکت کا پورا احساس تھا بلکہ انہیں ہی کیا ہم سب کو بخوبی اندازہ تھا کہ صورت حال کیسی سنگین ہے اور اختر کی زندگی موت کے خطرے سے دوچار ہے مگر ہم سب کی مجبوری کا یہ عالم تھا کہ ہم کچھ بھی نہ کر سکتے تھے۔ معذور ہو چکے تھے۔ اختر کی کوئی بھی مدد کرنے سے قاصر تھے اس کا خون مسلسل بہہ رہا تھا گاڑی کا فرش بھی رنگین ہو چکا تھا۔ اس کا نچلا دھڑ اسی کے خون میں تربتر تھا زندگی لمحہ بہ لمحہ اس کے وجود سے بہہ رہی تھی اور اس کی حالت دیکھ کر ہمارے کلیجے کٹ رہے تھے مگر ہم اپنا خوف' اپنے اندیشے اس پر ظاہر کر کے اسے بے حوصلہ نہیں کرنا چاہتے تھے' حالانکہ اس کا حوصلہ سلامت رکھنے کے لیے یہ ایک احمقانہ سی کوشش تھی کیونکہ وہ کوئی بچہ یا کم عقل نوجوان نہیں تھا' سب جانتا تھا اسے اپنی کمزور پوزیشن کا ہم سے زیادہ احساس تھا۔

"ہمت سے کام لو اختر۔" مہر جی نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھا۔

"معمولی گھاؤ ہے کچھ نہیں ہو گا تمہیں۔"

"تو میں کب کہہ رہا ہوں کہ مجھے کچھ ہو گا۔ گھاؤ بھی معمولی ہے مگر کیا کروں آپ جتنا کلیجہ اور ہمت نہیں ہے میرے پاس... لیکن اگر آپ یونہی میرے سینے پر ہاتھ رکھے رکھیں تو میرا کلیجہ پھول کر کافی بڑا ہو جائے گا پھر کچھ پروا نہیں۔" مہر جی نے فوراً" اس کے سینے سے ہاتھ ہٹا لیا اور خاموشی سے اسے گھورنے لگی۔

ہم رام پور کی حدود سے نکل آئے تھے گاڑی برق رفتاری سے دلی شہر کی جانب اڑی جا رہی تھی۔ پہاڑی سلسلہ پیچھے رہ گیا تھا۔

"ویسے دیوی جی! ایک بات کہوں۔" اختر کا لہجہ نشیلا سا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک دم توڑنے لگی تھی۔

"کہو..." مہر جی نے سپاٹ مگر نرم لہجے میں کہا۔

"آپ... غصے میں نہ... زیادہ حسین دکھائی دیتی ہیں۔"

"تم کبھی سدھرو گے بھی؟"

"ہاں جی... میرے... سدھرنے میں بب... بس تھوڑی ہی دیر باقی ہے... آ... آپ ایک بار... مسکرا کر دکھا دیں۔"

"فضول باتوں سے پرہیز کرو تم زخمی ہو اس لیے میرا رویہ ذرا نرم ہے کسی غلط فہمی یا خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔" مہر جی کا لہجہ بدستور نرم تھا۔ اختر نے "آہ" کی جگہ ایک "کراہ" بھری مجھے اسی جواب کی توقع تھی۔

تیرے وعدے پہ جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

اختر نے رک رک کر شعر مکمل کیا۔ اس کی رنگت زرد پڑنے لگی تھی اور ممکنہ نتیجے کے خیال سے ہی میرا دل ڈوبنے لگا۔ عارب الگ اپنی جگہ مضطرب دکھائی دے رہا تھا۔ البتہ پروفیسر ایک طرف اپنے مخصوص انداز میں بیٹھے تھے۔

"اختر! خاموش رہو' زیادہ باتیں نہیں کرو توانائی ضائع ہوتی ہے۔" تفکر میرے لہجے سے مترشح تھا۔

"شکیل صاحب! زبان... ہمیشہ کے لیے خاموش... ہونے والی ہے اس آخری وقت کم از کم میری نہ... زبان پر پہرے تو نہیں بٹھائیں۔" اختر کے لہجے کی مایوسی اور لاچارگی میرا کلیجہ کاٹ گئی۔ اس نے اپنی دھندلاتی نظروں سے مہر جی کی طرف دیکھا۔

"دیوی جی! میں کوئی بڑی فرمائش یا... کوئی ایسی

خواہش نہیں کررہا جسے... پورا کرنے... سے آپ کا کوئی نقصان ہوجائے اے... ایک ہلکی سی مس... مسکراہٹ آپ کے ان خوبصورت یاقوتی ہونٹوں پر رقصاں دیکھنا چاہتا ہوں... آخری سمجھ کر ہی میری... یہ... یہ خواہش پوری کردیں۔"

اختر کے لہجے میں زمانے بھر کی تشنگی در آئی' صدیوں کی تشنگی اور قیامت کی تڑپ تھی اس کے انداز میں۔ مہرجی کے چہرے پر ایک سہما ہوا سارنگ جھلملا کر رہ گیا وہ گہری نظروں سے اختر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

"بکواس نہیں کرو' ایسی باتوں سے بہتر ہے کہ خاموش رہو جب ٹھیک ہوجاؤ گے تب تمہارے مزاج درست کروں گی۔" اس کے لہجے میں غصہ نہیں تھا خفگی یا کرختگی نہیں تھی' بلکہ خوف گزیدہ اندیشے تھے' گھبراہٹ تھی۔ اختر نے بڑی جدوجہد سے ایک ہلکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائی' مضمحل سی ایک نظر مہرجی کے چہرے پر ڈالی اور آنکھیں بند کرلیں۔

مہرجی کی خوفزدہ نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اختر کی رنگت بالکل زرد پڑتی جارہی تھی اور وہ مدھم سانسیں لے رہا تھا اس کے خدوخال میں اگے ہوئے اذیت کے تاثرات جھڑنے لگے تھے۔ خون اب بھی بہہ رہا تھا مگر اب اس کے اخراج کی رفتار دھیمی پڑ گئی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا زخم والا حصہ دبا دیا۔ اختر کے حلق سے ایک مدھم سے کراہ خارج ہوئی چہرے کے تاثرات میں ایک ذرا تناؤ پیدا ہوا پھر اعتدال پر آگئے میں نے زخم والے مقام کو اچھی طرح دبا دیا۔ مجھے خود احساس ہوا کہ خون بہنے کی رفتار مزید کم ہوگئی ہے۔

اختر کے زرد ہوتے چہرے پر تکلیف کے بجائے سکون کے لطیف سائے اترنے لگے تھے۔

عارب پر بھی سکتے کی سی کیفیت طاری تھی وہ یک ٹک اختر کو گھور رہا تھا جس کے سینے کا زیروبم اتنا مدھم پڑچکا تھا کہ بغور دیکھنے سے ہی احساس ہوتا تھا کہ وہ سانس لے رہا ہے۔ اس نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا مگر میں کچھ نہ بولا' میری آنکھیں بھی خاموش تھیں۔ عارب کی کیفیت بھی مجھ سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی۔ وقت کے بنجر ہاتھ پر زرد لمحوں کی بارش ہورہی تھی۔ حقیقت کی شکل بڑی سفاک اور بھیانک تھی ہم سبھی اس سے نظریں چرانے کی کوشش کررہے تھے مگر وہ تو ہمارے اندر کے سناٹوں میں پھیل چکی تھی اور اپنے اندر سے آنکھیں بچاکر' دامن چھڑا کر آج تک کوئی کب مفر کا راستہ تلاش کرپایا ہے؟

گاڑی جس طوفانی رفتار سے زندگی کی سرحدوں کی جانب بڑھ رہی تھی زندگی اس سے بھی زیادہ برق رفتاری سے موت کی سرحدوں کے قریب ہوتی جارہی تھی۔ ہمارے ضبط جواب دینے لگے حقیقت ہماری روحوں کو رگیدے جارہی تھی۔ اختر کی لمحہ بہ لمحہ متغیر ہوتی حالت ہمیں دھاڑیں مارنے پر مجبور کررہی تھی۔ وقت کے پر بھی جیسے کسی ماورائی قوت نے کتر ڈالے تھے۔ ایک ایک لمحہ کچھوے کی طرح رینگ رینگ کر گزر رہا تھا اور ہمارے ذہنوں کو کچوکے لگا رہا تھا۔

گاڑی کی اندرونی فضا میں اختر کے خون کی مہک رچی ہوئی تھی اور ہماری دھڑکنیں اس مہک کے بوجھ کے نیچے جیسے ہر ثانیہ دبی جارہی تھیں' زبان کو گویا اس مہک نے مفلوج کرکے رکھ چھوڑا تھا۔

"اختر!" مہرجی کی آواز نے خاموشی کی چادر پر ناخن طرازی کی مگر اختر بے حس و حرکت پڑا رہا۔ مہرجی نے خوفزدہ نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے تاثرات تائید طلب نہیں بلکہ تردید طلب تھے۔ ہم نے اس کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ وہ دوبارہ اختر کی جانب متوجہ ہوگئی۔

"اختر... اختر بولو... اختر۔" اس نے اختر کو پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ اختر نے آنکھیں کھول دیں اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے مہرجی کی طرف دیکھا ایک غیر محسوس سی مسکراہٹ اس کے خشک ہوتے ہونٹوں پر سرک آئی۔ اس کے لبوں پر جنبش ہوئی۔

"اب کیا ہے! خود ہی تو کہا تھا کہ خاموش ہوجاؤ اب سکون سے سونے تو دیں۔" اس کی آواز بڑی مدھم تھی۔

"نہیں... ! تم بولو' مجھ سے باتیں کرو خاموش مت رہو۔" مہرجی کی آواز کپکپا گئی۔

"میرا بولنا... آپ کو اچھا نہیں لگے گا دیوی... جی!"

"تم بولو... جو بھی کہنا چاہتے ہو کہو میں برا نہیں مناؤں گی مگر... مگر خاموش نہیں رہو۔"

"اب... بولا نہیں جارہا... پیا... پیاس لگ رہی ہے زبان... سا... ساتھ نہیں دے رہی۔ دیوی جی! اگ... اگر میری کوئی بات آپ کو نا... گوار گزری ہو' اب تک تو... تو مجھے معاف کر... دینا۔" اختر نے اٹک اٹک کر جملہ پورا کیا۔ خون کے ضیاع نے اس پر اتنی نقاہت طاری کردی تھی کہ وہ آنکھیں بھی پوری طرح کھول نہیں پارہا تھا۔

"اگر تم نے مجھ سے باتیں نہیں کیں تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

"مجھے پیار محبت کی با... توں کے علاوہ کوئی... بات نہیں آتی۔" اختر خاموش ہوا تو مہرجی بے قراری سے بولی۔

"بس تم بولتے رہو۔" ایک لمحے کو اختر کی آنکھیں پوری طرح وا ہوگئیں۔

"آپ... بہت پیاری لگ رہی ہیں... اس وقت۔"

"بکواس نہیں کرو۔" مہرجی روہانسی ہوکر بولی اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ اختر کی ادھ کھلی آنکھیں بھی بند ہوگئیں۔

"اختر... اختر۔" مہرجی نے ایک بار پھر اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ اس کی پلکیں قدرے اٹھ گئیں عارب ہاتھ سے اس کی پیشانی پر آیا ہوا پسینہ پونچھتے ہوئے بولا۔

"اختر! ہمت نہیں ہارنی بس ہم ہسپتال پہنچنے والے ہیں۔" اس کا لہجہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔

"عا... عارب بھائی! میں آپ سے پہلے پہنچ جاؤں گا۔"

"مایوسی کی باتیں نہیں کرتے۔" عارب نے کہا میں بدستور اختر کا گھاؤ دبائے بیٹھا تھا۔ اختر' عارب کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔

"عا... رب بھائی! یاد ہے آپ نے ایک بار... کہا تھا کہ... مہرجی کو... زیادہ تنگ نہیں کرو ورنہ اس کے ہاتھوں پٹ جاؤ گے! یاد ہے نا؟"

"ہاں! یاد ہے۔"

"اور میں نے بڑے دعوے... سے کہا تھا... کہ... ایسا کبھی نہیں ہوگا... مہرجی کبھی مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھائیں گی۔"

"مجھے یاد ہے۔"

"جانتے ہیں میں نے... یہ دعوا کیوں کیا تھا؟"

"کیوں؟" چند لمحوں کے بعد اختر کے لبوں میں لرزش بیدار ہوئی۔

"اس لیے کہ مجھے... ان کے دل تک رسائی مل گئی تھی مگ... مگر یہ بہت مضبوط اعصاب کی مالک ہیں کہ روز اول سے لے... کر آج... تک انہوں نے مم... محبت کا اقرار نہیں کیا۔" پھر وہ مہرجی سے مخاطب ہوا۔

"کیوں مہر! کیا... کیا ان لمحوں میں بھی تم خاموش رہو گی؟ آ... ج تو اقرار کرلو کہ تم بھی... مجھ سے محبت کر... تی ہو۔" اختر کا یک آپ سے تم پر آگیا۔ مہرجی کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

"مہر! اقرار کرلو... تس... تسلیم کرلو میری... میری تشنگیوں کا مداوا کردو۔ سفید لمحوں کی قید سے نجات... دلا دو مہر! مہ... محبت... دل... اقرار مہ۔" اختر کی آواز ڈوب گئی' پلکیں جھک گئیں ہونٹوں کی لرزش تھم گئی۔ اس پر غشی کی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔

"اختر آنکھیں کھولو... میں... میں سننا چاہتی ہوں مجھ سے باتیں کرو۔" مہرجی کی آنکھوں میں آنسو گرنے لگے۔

"اختر! اختر ہوش کرو۔" عارب بھی تڑپ اٹھا۔

"اختر آنکھیں کھولو۔" عارب مضطرب لہجے میں بول رہا تھا۔ اختر آہستہ سے کسمسایا۔

"میرا... میرا دل ڈوب رہا ہے دم... دم گھٹ رہا

ہے میرا بچہ... پانی... پیتا ہے۔" وہ ڈوبتی ہوئی آواز میں بڑبڑایا۔ مہرجی مضطرب انداز میں گاڑی سے باہر دیکھنے لگی۔ مگر سڑک کے دونوں اطراف بے آب وگیاہ میدان پھیلے ہوئے تھے بس کہیں کوئی اکا دکا جھاڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ دور دور تک پانی کے آثار نہیں تھے۔

"انکل!" وہ مضطرب انداز میں شلندر سے مخاطب ہوئی۔

"اختر کی حالت بگڑتی جارہی ہے پانی... پانی چاہیے اس کے لیے۔"

"یہاں آس پاس تو پانی دستیاب نہیں ہوگا۔ البتہ جہاں کہیں پانی نظر آیا وہاں گاڑی روک دوں گا۔" شلندر کا لہجہ گہری سنجیدگی میں ڈوبا ہوا تھا۔

"شہر اور کتنی دور ہے انکل؟"

"ابھی شہر پہنچتے پہنچتے ہمیں گھنٹہ لگ جائے گا۔"

"گھنٹہ...! اتنی دیر ہوگئی ہے ہمیں نکلے ہوئے اور ابھی گھنٹہ اور لگے گا۔" عارب تیز لہجے میں بولا۔

"انکل گاڑی تیز چلائیں۔ تیز..." مہرجی بے قراری سے بولی حالانکہ گاڑی کی رفتار خطرناک حد تک تیز تھی۔ شلندر کی ایک لمحے کی غفلت ہم لوگوں کو موت کے منہ میں پہنچا سکتی تھی۔

"اختر! آنکھیں کھولو میرے دوست' کوئی بات کرو اختر... اختر!" عارب کی حالت دیدنی تھی۔ مہرجی بھی اسے جھنجوڑ رہی تھی اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ میں نے اختر کی کلائی پکڑلی۔ اس کی نبض بہت دھیمی پڑچکی تھی۔

"اختر! آنکھیں کھولو' پلیز خدا کے لیے آنکھیں کھولو مجھ سے... مجھ سے کوئی بات کرو اختر۔" مہرجی رو رہی تھی اسے جھنجوڑ رہی تھی مگر وہ بے حس وحرکت پڑا تھا۔ اس پر بے ہوشی طاری ہوچکی تھی اور اس کی رنگت بالکل زرد پڑچکی تھی۔

"اگر... اختر کو کچھ ہوگیا تو میں... میں ہندوستان کے نقشے سے رام پور کا وجود مٹا ڈالوں گا۔" عارب وحشت بھرے لہجے میں بولا۔

"بڑے بول نہیں بولا کرتے۔" پروفیسر پہلی دفعہ گویا ہوئے۔

"کچھ کرسکتے ہو تو اس کے لیے دعا کرو۔"

"بس... بس پروفیسر! بہت سن لیں آپ کی بے سروپا باتیں۔ بند کرلیں اپنا پٹارہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں فراموش کر بیٹھوں کہ آپ بزرگ ہیں۔" عارب کا لہجہ سلگ رہا تھا۔ پروفیسر بس اسے نفرت سے گھورتے رہ گئے۔ میں نے عارب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا تو وہ رخ پلٹ کر شلندر سے مخاطب ہوا۔

"شلندر صاحب! اس بیل گاڑی کی رفتار کچھ تیز کرلیں۔"

"عارب! کچھ ہوش سے کام لو۔ اس طرح حواس باختہ ہونے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ گاڑی کی رفتار پہلے ہی خطرناک حد تک تیز ہے۔"

"شکیل صاحب! میں... میں آپ سے کہہ رہا ہوں' بتا رہا ہوں کہ اگر اسے کچھ ہوگیا تو پھر میرا راستہ نہیں روکیے گا میں مہاراج کے چیتھڑے اڑا دوں گا۔"

"کچھ نہیں ہوگا اسے' ہم ابھی ہسپتال تک پہنچ جائیں گے۔" میں نے اسے تسلی دینا چاہی حالانکہ میری اپنی اندرونی حالت نہایت دگرگوں تھی۔

مہرجی سرک کر تھوڑا آگے ہوئی تو میں تھوڑا سائیڈ پر ہوگیا اس نے اختر کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا اور اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

"اختر! آنکھیں کھولو' میری طرف دیکھو کچھ بولو اختر... کوئی بات کرو دیکھو آج میں خود کہہ رہی ہوں کہ بولو' مجھے تنگ کرو۔ ہنسو... مجھے زچ کرو۔ میرے بالوں کا ذکر کرو میرے... میرے ہونٹوں کا ذکر کرو مجھ پر اپنی محبت' اپنے جذبات کا اظہار کرو اختر بولو... کچھ تو بولو! دیکھو میں اعتراف کرتی ہوں کہ پہلی ہی نظر میں تمہاری محبت میں گرفتار ہوگئی تھی... میں تم سے محبت کرتی ہوں اختر تم... تم سن رہے ہونا میں محبت کا اعتراف کررہی ہوں۔ جاہل تھی' کم عقل تھی کہ اپنے اندر پنپنے والے جذبوں کو نہ سمجھ سکی مگر آج... آج سمجھ گئی ہوں' جان گئی ہوں اختر! مجھے تم سے محبت ہے بے انتہا محبت۔"

مہرجی پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوگئی تھی کہ اسے اپنے گردوپیش کی کچھ خبر ہی نہ تھی اسے یہ بھی احساس نہ تھا کہ وہ جس سے مخاطب ہے وہ ہوش وحواس میں نہیں۔ اس کی آنکھوں سے بہنے والے شفاف آنسو اختر کے چہرے پر گر رہے تھے۔ وہ سسک رہی تھی ایک بے خودی کے عالم میں بولے جارہی تھی۔ مگر مجھ میں یا عارب میں اتنی ہمت نہ ہوسکی کہ اسے ٹوک دیتے' احساس دلانے کی کوشش کرتے کہ اختر بے ہوش ہے۔

"اختر! میں اپنے اندر کے چور کو پہچان نہیں پائی تھی اور اس قصور کی تجھے اتنی بڑی سزا نہیں دو' نہ روٹھو مجھ سے' میں تمہاری یہ ناراضی یہ خاموشی برداشت نہیں کرپاؤں گی۔ مسکراؤ اختر مسکرا کر دکھاؤ تمہیں... تمہیں اندازہ نہیں تمہاری مسکراہٹ کتنی خوبصورت ہے۔ زندگی کے تمام رنگ سمٹ آتے ہیں تمہاری ایک مسکراہٹ میں۔ میں زندگی کا دیدار کرنا چاہتی ہوں... ایک بار صرف ایک بار مسکرا دو اختر۔" وہ بولے جارہی تھی اختر کو واسطے دے رہی تھی آنکھیں کھولنے کے لیے التجائیں کررہی تھی اس کی ایک مسکراہٹ کی طلب میں تھی مگر... وہ بے چارہ کیا آنکھیں کھولتا کیا مسکراتا۔ آخر کار مہرجی کا ضبط جواب دے گیا وہ پھوٹ کر رو دی ہماری اپنی آنکھیں بھیگ گئیں۔ کافی دیر یونہی گزر گئی اچانک گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی اور کچھ ہی دیر بعد گاڑی ایک دو جھٹکے کھانے کے بعد رک گئی۔

"کیا ہوا شلندر صاحب؟" میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"پیٹرول ختم ہوگیا۔"

"او نو!" میرے ہونٹ سختی سے بھینچ گئے۔ عارب ایک جھٹکے سے نیچے اترا اور جاکر ٹنکی چیک کرنے لگا۔

"اب... اب کیا ہوگا؟" مہرجی وحشت زدہ انداز میں بڑبڑائی۔ میں خاموشی سے نیچے اتر آیا۔

دور دور تک کسی گاڑی یا آدمی کا وجود دکھائی نہیں دے رہا تھا تاحد نظر ویرانی اور سناٹا تھا اختر کی حالت اتنی نازک تھی کہ ہمارے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھی اور صورت حال بڑی بھیانک شکل اختیار کرگئی تھی... بے چینی اور پریشانی سے مجھے اپنی کنپٹیوں میں درد محسوس ہونے لگا۔ ہم بیچ منجدھار میں بے یارومددگار پھنس کر رہ گئے تھے۔

شلندر اور ڈاکٹر عقیل بھی نیچے اتر آئے دونوں کے چہروں سے پریشانی ہویدا تھی۔

"بہت برا ہوا بڑے نازک وقت پر یہ رکاوٹ کھڑی ہوئی ہے۔" عقیل ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔

"یہاں سے سواری ملنا بھی بہت مشکل ہے گھنٹوں بعد کوئی گاڑی گزرتی ہے۔" شلندر نے متفکرانہ انداز میں کہا۔

"اختر کی حالت بہت خراب ہے! ہر گزرتا لمحہ اسے زندگی سے دور کررہا ہے۔ اگر ہمیں یہاں زیادہ وقت گزرا تو وہ بے ہوشی کے عالم میں ہی دم توڑ دے گا۔"

"تو پھر اب کیا کیا جائے؟"

"تمام صورت حال تم لوگوں کے سامنے ہے ایسے میں بھلا کیا کیا جاسکتا ہے؟"

مہرجی اور پروفیسر بھی گاڑی سے نیچے اتر آئے۔ عارب بھی تلملاتا ہوا ہمارے قریب آگیا۔

"ٹنکی بالکل سوکھی پڑی ہے پیٹرول کا ایک قطرہ بھی نہیں بچا۔"

"اس پیٹرول کو بھی ابھی ختم ہونا تھا۔"

"یہاں رکنے سے بہتر ہے کہ اختر کو کندھے پر ڈال کر آگے کی جانب دوڑ پڑیں۔" عارب نے کہا۔

"شہر یہاں سے پچیس کلو میٹر کے فاصلے پر ہے ہمارے پہنچنے سے پہلے وہ دم توڑ دے گا۔"

"تو یہاں کھڑے رہنے سے کیا وہ جیتا رہ جائے گا۔"

"ارے... وہ دیکھو لگتا ہے گاڑی آرہی ہے۔" بیک وقت ہم سب کی نظریں اٹھ گئیں شہر کی سمت

سے واقع ۔ کوئی گاڑی آتی دکھائی دے رہی تھی میرے وجود میں مسرت کی لہریں دوڑ گئیں۔

"ہاں!یقیناً" گاڑی ہے۔"

"اسے روکنا ہو گا ہر حال میں روکنا ہو گا۔" عارب نے تیز لہجے میں کہا۔

"قریب آنے دو دیکھتے ہیں۔" ہم سب بے چینی سے گاڑی کے قریب آنے کے منتظر تھے۔ ہماری گاڑی بالکل سڑک کے درمیان رکی تھی اور سڑک کے اطراف میں اتنی جگہ نہ تھی کہ آنے والی گزر سکتی سو یقیناً" جب تک ہم اس گاڑی کو ایک طرف نہیں ہٹاتے وہ گاڑی گزر نہیں سکتی۔

عارب اور مہرجی تھوڑا آگے ہو کر اپنی گاڑی کے فرنٹ کے قریب جا رکے۔

آنے والی گاڑی جب بالکل قریب پہنچی تو ہماری مسرت دو چند ہو گئی گاڑی پک اپ ٹائپ لانگ باڈی تھی اور ہم سب باآسانی اس میں سوار ہو سکتے تھے۔ ڈرائیور نے قریب آکر بریک لگائے تو شلندر آگے بڑھ گیا۔

"کیا مسئلہ ہے' بیچ راستے میں گاڑی کاہے کھڑی کر رکھی ہے۔" ڈرائیور نے کھڑکی سے سر باہر نکالتے ہوئے کہا۔ اس کے برابر ایک آدمی بیٹھا تھا عارب پلٹ کر گاڑی کی عقبی طرف آگیا۔

"پیٹرول ختم ہو گیا ہے اگر آپ کے پاس کوئی گیلن وغیرہ ہو تو دے دیں۔" شلندر نے نارمل انداز میں کہا۔ وہ ڈرائیور گیٹ کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔

"ہم ٹنکی فل رکھتے ہیں پھالتو پیٹرول نہیں۔"

"چلیں ٹنکی سے ہی تھوڑا نکال دیں ہم نے شہر پہنچنا ہے۔"

"ارے بھایا کیسے نکال دیویں ہم نے مال اتار کر واپس شہر بھی جانا ہے۔"

اس کی بات مکمل ہوتے ہی شلندر نے ایک جھٹکے سے گیٹ کھولا اور اس کو گریبان سے دبوچ لیا اگلے ہی لمحے وہ چیختا ہوا سڑک کے ایک طرف جا گرا۔ دوسرا آدمی بڑی تیزی سے اپنی سائیڈ کا دروازہ کھول کر نیچے اترا تھا وہ شلندر کی طرف بڑھا مگر راستے ہی میں اسے مہرجی نے جا لیا وہ بھی چیختا ہوا ڈرائیور کے برابر جا گرا۔ ابھی وہ اٹھے ہی تھے کہ عارب بندوق لے کر ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"دیکھو! تم لوگوں سے ہماری کوئی دشمنی نہیں ہم نے ایمرجنسی شہر پہنچنا ہے فوراً" بھاگ لو ورنہ تمہاری لاشوں کو یہاں گدھ نوچیں گے۔"

"پر بھایا ہم نے مال۔۔۔" ڈرائیور نے بولنا چاہا تو عارب نے ٹریگر دبا دیا کارتوس کے چھرے ان کے پیروں کے قریب سے دھول اڑا گئے دونوں اچھل کر پیچھے ہو گئے۔

"مہر! دیکھو گاڑی میں کیا ہے۔" شلندر نے کہا اور مہر عقبی طرف بڑھ گئی۔

"دوسری بار بولے تو سینے میں بارود بھر دوں گا بھاگو۔" شلندر غرایا اور وہ دونوں ایک طرف کو دوڑ پڑے شاید انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ شخص جو کہہ رہا ہے وہی کرے گا۔

"انکل! گتے کے کچھ کارٹن ہیں۔" مہرجی نے عقبی طرف سے کہا اور ہم تیزی سے آگے بڑھ گئے۔

"جلدی کرو نکال کر ایک طرف پھینک دو۔"

تقریباً" پچیس کارٹن تھے بالکل ویسے ہی جیسے ہم اس کوٹھی میں دیکھ چکے تھے جہاں سے فرار ہو کر آئے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد کیبن خالی ہو چکا تھا عارب نے سیٹیں سیدھی کر دیں۔

"اختر کو اٹھا لائیں جلدی کرو۔" عارب اور مہرجی چند ہی لمحوں میں اختر کو اٹھا لائے شلندر نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی عقیل اس کے برابر ہی تھا۔

ہم ایک بار پھر طوفانی رفتار سے شہر کی جانب بڑھ گئے۔ عارب نے عقبی طرف کے دونوں پٹ بند کر دیئے مہرجی اختر کے سینے پر ہاتھ رکھے اس کی دھڑکن کا اندازہ کر رہی تھی' میں نے اختر کی نبض چیک کی حیرت انگیز

اور ناقابل یقین طور پر اس کی نبض پہلے سے بہتر تھی۔ عارب میری صورت کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"نبض بہتر ہو گئی ہے۔"

"موت سے لڑ رہا ہے۔" گاڑی برق رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی ہمارے دل بہت بری طرح دھڑک رہے تھے قلب و ذہن امید و بیم کی کیفیت سے دوچار تھا مہرجی کی حالت دیدنی تھی اس وقت مجھے اس پر بڑا ترس آرہا تھا۔

تقریباً" پندرہ منٹ بعد گاڑی جنرل روڈ پر چڑھ آئی۔ میرے انگلیاں اختر کی نبض پر تھیں یکایک اس کی نبض ایک بار پھر ڈوبنے لگی۔ عارب میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔

"چراغ بجھنے سے پہلے بہت پھڑپھڑاتا ہے۔" اس نے گمبھیر لہجے میں کہا پھر رخ بدل کر شلندر سے مخاطب ہوا۔

"شلندر صاحب! گاڑی فوراً" کسی ہسپتال لے چلیں۔"

"اگر ہم یونہی کسی ہاسپٹل چلے گئے تو بہت مسائل پیدا ہوں گے مہاراج بھی زخمی ہوا ہے۔ ہم لوگ فوراً" دھر لیے جائیں گے البتہ شہر شروع ہوتے ہی ایک پرائیویٹ ہسپتال آتا ہے اس کا مالک "پرکاش دیور" میرا احسان مند ہے سو اس وقت ہم ادھر ہی جا رہے ہیں بنا کسی جھنجھٹ کے اختر کا فوراً" آپریشن ہو جائے گا۔"

"جیسا آپ مناسب جانیں لیکن جس ہسپتال بھی جانا ہے فوراً" چلیں۔"

ہم لوگ ابھی شہری آبادی سے کچھ دور ہی تھے کہ سامنے پولیس کی دو تین گاڑیاں آتی دکھائی دیں اور "زائیں" کی آواز سے ہماری گاڑی کے قریب سے نکل گئیں۔

"بروقت ہم یہاں تک پہنچ آئے ہیں ورنہ بڑے مسائل میں گھر جاتے۔" شلندر نے کہا مگر ہم میں سے کسی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

ڈرائیونگ سیٹ اور عقبی حصے کے درمیان جالی نما دیوار تھی جس کے درمیان سے میں سامنے دیکھ رہا تھا کہ اچانک چونک پڑا۔ دور ہی سڑک پر کھڑی گاڑیوں کی طویل قطار دکھائی دے گئی تھی کچھ باوردی پولیس والے بھی نظر آرہے تھے۔ راستہ بلاک تھا۔

"یہ ایک اور مصیبت پیدا ہو گئی۔" شلندر نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔ "یقیناً" مہاراج پر قاتلانہ حملے کی اطلاع پولیس تک بھی پہنچ چکی ہے۔"

"اب کیا ہو گا؟" عارب پر تشویش انداز میں بولا۔

"انکل! گاڑی روکنے کی بجائے رکاوٹیں اڑا دیں۔ پہلے اختر کو ہاسپٹل تک پہنچا دیں بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔" مہرجی نے کہا۔

"بس تھوڑا سا انتظار۔" شلندر گاڑی آگے لے گیا۔

پولیس والے ایک ایک گاڑی کی تلاشی لے رہے تھے اور ڈرائیور مسافروں سے سوال جواب کر رہے تھے۔ ایک بتیس پینتیس سال کا جوان آفیسر خود گاڑیوں میں جھانک رہا تھا ڈرائیوروں کو گالیاں دے رہا تھا سپاہیوں کو جھاڑیں پلا رہا تھا۔

اچانک شلندر نے گیئر بدلا اور گاڑی قطار سے نکال کر آگے لے گیا۔ ہماری دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اگر کوئی سپاہی عقبی دروازہ کھول کر اندر جھانک لیتا تو ہم بری طرح پھنس جاتے۔ اختر خون میں لت پت بالکل موت کے کنارے تھا۔

گاڑی کو یوں قطار توڑ کر اپنی طرف آتا دیکھ کر سپاہی چونک پڑے تھے۔ کئی ایک نے ہماری گاڑی کی طرف بندوقیں سیدھی کر لیں۔ شلندر نے ان کے قریب جا کر بریک لگائے اور کھڑکی سے سر باہر نکال کر اس پولیس آفیسر سے مخاطب ہوا۔

"انسپکٹر صاحب! پہلے میری گاڑی چیک کر لیں میں ذرا جلدی میں ہوں۔" انسپکٹر کے بگڑے ہوئے تاثرات شلندر کی صورت دیکھتے ہی اعتدال پر آگئے۔ وہ مسکراتا ہوا قریب آگیا۔

"شلندد صاحب آپ! اور سنائیں کیسے ہیں کدھر سے آرہے ہیں؟"

"ابھی تک تو ٹھیک ہی ہیں مگر۔ اب حالات بتا رہے ہیں کہ ٹھیک نہیں رہیں گے۔" شلندد نے معنی خیز انداز میں کہا اور وہ آفیسر قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

"ویسے یہ سب کیا ہے؟ کس سلسلے میں اتنی سخت چیکنگ ہو رہی ہے۔" شلندد کے لہجے میں تعجب تھا۔

"ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ رام پور کے مہاراجہ کو چند افراد نے قتل کرنے کی کوشش کی ہے اور ایک کو شش میں انہوں نے چند افراد کو ہلاک بھی کیا ہے ان مجرموں کا بھی ایک ساتھی زخمی ہوا ہے بس اسی چکر میں بیٹھے بٹھائے سر دردی آن پڑی ہے۔"

"چلیں پھر پہلے میری گاڑی چیک کر لیں ہو سکتا ہے وہ مجرم میں ہی ہوں اور میرا کوئی ساتھی پیچھے زخمی پڑا ہو۔ دراصل ذرا جلدی میں ہوں۔" شلندد نے ہنستے ہوئے کہا۔

"شلندد صاحب! اب آپ ہمیں ذلیل کرنا چاہتے ہیں۔"

"انسپکٹر صاحب! ہم نے کیا کرنا ہے؟" شلندد کے معنی خیز لہجے پر انسپکٹر ایک بار پھر قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

"جائیں آپ!" آفیسر ایک طرف ہٹ گیا اور سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔

"جانے دو انہیں۔"

شلندد نے تھینکس کہتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی اور ہماری جان میں جان آئی۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔ مہرجی اختر کا سر گود میں رکھے بیٹھی تھی اور اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑی حسرت زدہ نظروں سے اس کی زرد صورت کو تک رہی تھی۔ میں رخ بدل کر سامنے کی سمت دیکھنے لگا۔ تقریباً" پانچ منٹ بعد شلندد نے گاڑی ایک عمارت کے کھلے گیٹ کی طرف موڑ دی اور اندھادھند اندر لیتا چلا گیا۔ چند ایک افراد سامنے آئے اور اچھلتے ہوئے ایک طرف ہٹ گئے۔ ایک طرف ایک جہازی سائز بورڈ پر "پرکاش ہسپتال" لکھا نظر آیا تھا۔ شلندد گاڑی میں عمارت کے بالکل سامنے لے گیا۔ گاڑی کے بریک بری طرح چرچرائے تھے اور گاڑی اس بری طرح گھومی تھی کہ اس کا عقبی حصہ عمارت کی طرف گھوم گیا۔ ہم خود لڑھک کر ایک دوسرے سے ٹکرا گئے مگر ہم نے سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی۔ عارب نے جھٹ دروازہ کھول دیا۔ میں نے اور عارب نے اختر کو باہر نکالا پھر میں نے اس کا نیم مردہ وجود بازوؤں پر اٹھایا اور اندرونی جانب دوڑ پڑا۔ شلندد ہم سے پہلے اندر داخل ہو چکا تھا۔

"آپریشن روم چلو تم۔" اس نے پلٹ کر چیختے ہوئے کہا اور ایک طرف کو دوڑ گیا۔ عارب اور مہرجی میرے آگے آگے تھے اور پروفیسر اور عقیل میرے ساتھ' سیڑھیاں چڑھتے ہی دائیں ہاتھ استقبالیہ تھا جہاں ایک نوجوان بیٹھا تھا۔

لوگ منہ پھاڑے ہماری طرف دیکھ رہے تھے گاڑی جس طوفانی انداز میں آکر رکی تھی اس پر سبھی کی توجہ ہماری جانب مبذول ہو گئی تھی ایک ہلچل سی مچ گئی تھی۔ ایک طرف سے دو وارڈ بوائے دوڑتے ہوئے ہمارے قریب پہنچ آئے۔

"آپریشن روم؟" عارب تیز لہجے میں ان سے مخاطب ہوا۔

"یہ۔۔۔ یہ تو پولیس کیس۔۔۔" ان میں سے ایک نے بولنا چاہا تو عارب نے جھپٹ کر اس کی گردن اپنے چوڑے پنجے میں دبوچی اور چیختے ہوئے بولا۔

"آپریشن روم کدھر ہے۔"

"وہ۔۔۔ وہ' اس طرف!" اس نوجوان نے گھٹے گھٹے انداز میں دائیں ہاتھ کی راہداری کی طرف اشارہ کیا اور میں اس طرف دوڑ پڑا۔ عارب اور مہرجی بدستور میرے آگے تھے۔

راستے میں کچھ ڈاکٹر اور کچھ نرسز بھی آئیں وہ پوچھتے رہ گئے۔ "کیا مسئلہ ہے' کیا ہوا ہے؟" مگر ہم بغیر کچھ کہے' رکے آگے بڑھتے گئے ایک جگہ رکتے ہوئے عارب مجھ سے مخاطب ہوا۔

"آجائیں اس طرف۔" وہ دائیں طرف راہداری میں پلٹ گیا۔ میرے قدم بھی رکے نہیں۔ اس طرف بالکل نکڑ پر ایک دروازہ نظر آرہا تھا جس کی پیشانی پر لکھا ہوا تھا "آپریشن روم" اوپر لگا ہوا سرخ بلب روشن تھا۔

عارب نے آگے بڑھ کر لات ماری اور دروازہ چوپٹ کھل گیا۔ ہم پانچوں اندر داخل ہو گئے۔ ڈاکٹر عقیل نے عقب میں دروازہ بند کر دیا تھا۔ ایک طرف پردوں کی اوٹ میں تین ڈاکٹر اور دو نرسیں آپریشن میں مصروف تھے۔ ہمارے یوں اندھر گھس آنے پر وہ بھی چونک پڑے۔

"یہ۔ یہ کیا بے ہودگی ہے' کون ہیں آپ اور۔۔۔ اور آپ اندر کیسے گھس آئے ہیں؟" ایک ڈاکٹر نے ترش لہجے میں کہا۔

"ہم بھی ڈاکٹر ہیں' ایک مریض کو لے کر آئے ہیں اور دروازے سے گھس کر آرہے ہیں۔ کیا آپ کو دکھائی نہیں دیا۔" عارب اس ڈاکٹر سے مخاطب ہوا اور میں نے آگے بڑھ کر اختر کو ایک ٹیبل پر لٹا دیا۔

"کیا بدتمیزی ہے باہر۔۔۔ باہر جائیں آپ یہ کوئی طریقہ ہے؟" ڈاکٹر پردے کی اوٹ سے نکل کر سامنے آیا تو عارب نے اسے کندھے سے پکڑ کر ایک طرف دھکیل دیا۔

"زیادہ بکواس کی ضرورت نہیں۔ کہیں ہم تمہیں بات کرنے کا طریقہ نہ سمجھا دیں۔ ہمارے ساتھی کو گولی لگی ہے اس کا فوری آپریشن کرنا ہے۔۔۔" اچانک دروازہ ایک زور کی آواز سے کھلا اور عارب کی بات درمیان میں ہی رہ گئی۔ آنے والا شلندد تھا اس کے ساتھ دو افراد اور تھے ایک جوان آدمی تھا اور دوسرا ایک خوش پوش ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ ڈاکٹر فوراً" اس آنے والے خوش پوش آدمی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"سر۔۔۔ سر یہ دیکھیں یہ لوگ۔۔۔" نو وارد نے ڈاکٹر کی بات درمیان سے ہی کاٹ دی۔

"مجھے علم ہے یہ لوگ اجنبی نہیں میرے محسن ہیں ان کی پوری پوری مدد کرو۔" آنے والا یقیناً" پرکاش دیو تھا۔

"جی سر۔۔۔" ڈاکٹر قدرے حیران تھا۔ پرکاش اپنے ساتھ آنے والے دوسرے نو وارد سے مخاطب ہوا۔

"سکھ دیو! یہ میرا ذاتی کیس ہے خیال رہے کہ اس بارے میں کوئی خبر ہسپتال سے باہر نہیں جانی چاہیے۔"

"جی بہت بہتر۔"

"ہمیں جراحت کا سامان اور "او پازیٹو" بلڈ کی ضرورت ہے فوری۔" میں نے پرکاش کو مخاطب کیا۔

"انہیں ان کی ضرورت کی ہر چیز مہیا کرو۔" پرکاش ڈاکٹر سے مخاطب ہوا اور وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

"اب اس کی ضرورت نہیں۔" ڈاکٹر عقیل کی آواز پر ہم سبھی چونک پڑے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا وہ اختر کی نبض تھامے کھڑے تھے اور اس کے چہرے پر گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ چند لمحوں کے لیے آپریشن روم میں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ دھڑکنیں ساکت رہ گئیں اور ایک لمحے کو سانسیں جیسے تھم گئیں۔

"ک۔۔۔ کیا مطلب ہے آپ کا؟" میں ہکلایا۔

"بہت لڑا ہے یہ۔۔۔ ہار گیا۔۔۔" ڈاکٹر عقیل نے گمبھیر آواز میں کہا اور اختر کی کلائی چھوڑ دی میں تڑپ کر اختر کے قریب پہنچا۔ میں نے اس کی نبض چیک کی مگر نبض۔۔۔ نبض تو انگلیوں کے نیچے آ ہی نہیں رہی تھی یا۔۔۔ یا شاید انگلیاں نبض کو ڈھونڈ نہیں پا رہی تھیں' میں دیوانوں کی طرح اختر کی کلائی ٹٹولنے لگا مگر نبض ہوتی تو انگلیاں اسے محسوس کرتیں اس کی نبض تو کہیں تاریک پاتالوں میں اتر گئی تھی۔ سرد لمحوں کی گرفت میں آکر منجمد ہو چکی تھی۔

وہ موت سے لڑتے لڑتے زندگی ہار بیٹھا تھا۔ جا چکا تھا ہم سب کو چھوڑ کر' اس کی نبض' دھڑکن' سانس' زندگی کی ہر علامت دم توڑ چکی تھی اور اس کا جسم بالکل مردہ پڑ چکا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے ملک الموت نے اس کی نہیں میری روح قبض کر لی ہو۔ میں اس کی سرد اور زندگی سے خالی کلائی تھامے اپنی جگہ سکتے کی سی کیفیت میں کھڑا رہ گیا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں جیسے سلب

ہو گئی تھیں۔ اچانک عارب آگے بڑھا اور اختر کے سینے پر دباؤ ڈالنے لگا اس پر ایک وحشت سوار ہو گئی تھی کبھی وہ اس کا سینہ دبانے لگتا اور کبھی منہ سے اختر کے منہ میں سانس بھرنے کی کوشش کرتا پر اب بھلا اس سب سے کیا ہونے والا تھا وہ تو بے ہوشی کے عالم میں ہی دم توڑ چکا تھا۔

میں نے بے جان ہاتھوں سے اس کی کلائی چھوڑ دی۔ موت ہم سے زیادہ تیز رفتار نکلی تھی جو اس کی زندگی کا گھونٹ بھر گئی تھی۔ میں نے رخ پھیر لیا مہوجی دو قدم کے فاصلے پر کسی سنگی مجسمے کی طرح بے حس و حرکت کھڑی میری ہی جانب دیکھ رہی تھی۔ مجھے پلٹتا دیکھ کر اس کے ہونٹ لرزے مگر کوئی آواز نہیں نکل سکی۔

"ہار گئے۔ ہار گئے پروفیسر پوری طرح ہار گئے۔ ہمارے ہاتھ کچھ بھی نہ آسکا اور ہم نے اختر جیسا ایک بہترین دوست بھی کھو دیا۔" میری آواز بھرا گئی۔ مہوجی پر طاری سکتہ میرے الفاظ کے سنگریزوں سے ٹوٹ گیا۔ وہ آہستہ قدموں سے اختر کی لاش کی طرف بڑھی اور اس کے تلووں سے پیشانی ٹیکتی ہوئی گھٹنوں کے بل نیچے فرش پر بیٹھ گئی اور پھر اچانک ہی وہ پھٹ پڑی۔

"اختر۔" اس کی ــــــ چیخ سے میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ آپریشن روم کی دیواریں بھی جیسے ایک بار۔ جھرجھری لینے پر مجبور ہو گئیں۔ سبھی اپنی اپنی جگہ ساکت کھڑے تھے۔ ڈاکٹر آپریشن کرنا بھول گئے تھے۔ شلندر فوراً" آگے بڑھ گیا۔

"مہر! بیٹا سنبھالو خود کو اس۔۔۔"

"نہیں انکل! نہیں۔۔۔ میں خود کو کبھی معاف نہیں کرسکوں گی۔۔۔ میں۔۔۔ میں اختر کی گناہ گار ہوں۔ میں نے بہت دل دکھایا تھا اس کا۔۔۔ بہت برا بھلا کہتی رہی ہوں اس کو۔۔۔ یہ میرے منہ سے محبت کے دو بول سننے کی حسرت دل میں لیے چلا گیا اور ' اور جب میں نے۔۔۔ میں نے محبت کا اقرار کیا اس نے سننا پسند نہیں کیا۔ یہ مجھ سے ناراض۔۔۔ مجھ سے ناراض تھا یہ انکل۔۔۔ میں اس کی مجرم ہوں۔ میں نے بہت زیادتی کی ہے اس کے ساتھ۔ بہت تکلیف دی ہے اس کو۔" مہوجی زاروقطار رونے لگی اس کی آنکھوں سے آنسو نہیں جیسے دریا رواں ہو گئے تھے۔ ہم سب کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے پروفیسر جیسے خشک مزاج شخص کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ اختر کا مزاج اس کے عادت و اطوار اس کی شخصیت ہی ایسی تھی کہ اس کے مرنے پر پتھر بھی رو پڑے تھے۔

میرے لیے وہاں کھڑے رہنا مشکل ہو رہا تھا سو میں جلدی سے باہر نکل گیا۔

سانس کی نالی میں جیسے کوئی گولا سا پھنس گیا تھا۔ دم گھٹ رہا تھا یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے چلتے چلتے اچانک سینہ ایک زوردار آواز سے ٹکڑوں میں بٹ جائے گا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہاسپٹل کی عمارت کی عقبی طرف نکل آیا۔ یہاں ایک وسیع زمرد پوش پلاٹ تھا کافی لوگ موجود تھے کچھ گھاس پر لیٹے ہوئے تھے اور کچھ سیمنٹ کے بنچوں پر بیٹھے تھے۔ پلاٹ کا مشرقی کونا قدرے سنسان تھا میں اس طرف بڑھ گیا اور کونے میں پڑے سنگی بنچ پر جا بیٹھا۔

اختر کی موت حالانکہ غیر متوقع نہیں تھی اس کے باوجود اعصاب اس دھچکے سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئے تھے۔ دل و دماغ پر مایوسی اور دکھ کا انتہائی زیادہ بوجھ آپڑا تھا۔ قلب و ذہن کی کیفیت نہایت دگرگوں ہو رہی تھی۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ اختر کی موت کا ذمہ دار میں ہوں۔ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا تھا۔ ممی کا عشق مجھے ہی ہوا تھا اس کے حصول کا جنون مجھ پر ہی طاری ہوا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا ممی چوری ہو جانے پر میں اس قصے پر لعنت ڈال دیتا' ہندوستان کا رخ نہ کرتا تو نہ ہی اختر کا کبھی ادھر آنا ہوتا اور نہ ہی وہ یوں موت کا شکار ہوتا۔ مگر ممی کی تلاش و جستجو کے اشتیاق میں' میں جیسے حواس ہی گنوا بیٹھا تھا۔ اس ممی کے چکر میں پتا نہیں کتنے ہی انسان موت کا شکار ہو گئے تھے اور اب۔۔۔ اب خون کی پیاسی موت نے اختر کی زندگی بھی چھین لی تھی اور اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود اس تابوت یا ممی کا کچھ پتا نہیں تھا۔ راج محل' مہاراج کی خواب گاہ' تہہ خانے میں بنا عجائب خانہ۔۔۔ موت کے حلق تک سے ہو آئے تھے ہم مگر خالی داماں' ممی حاصل کرلینا تو دور ہم اس کی جھلک تک نہ دیکھ پائے تھے۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ اختر تو ہم سب سے منہ موڑ کر چلا گیا' اس سے پہلے کہ کسی اور کو کوئی نقصان پہنچے' میں اس مشن کو یہیں ختم کرکے مصر واپس روانہ ہو جاؤں گا۔ ممی جائے بھاڑ میں! نامعلوم وہ کون سا منحوس لمحہ تھا جب میں نے اہرام دریافت کرنے کا قصد کیا تھا۔ اختر کا سراپا بار بار میری نگاہوں کے سامنے سرک آتا۔ ہنستا مسکراتا' شوخ و شنگ' زندگی کی گدگداہٹوں سے بھرا لہجہ۔ چہرے پر شفق کے رنگ سمیٹے اور۔۔۔ اور پھر اچانک اس کا سرد' زندگی کے رنگوں سے عاری زرد چہرہ میری نگاہوں کے سامنے آجاتا۔

میں کافی دیر کونے میں پڑے اس سنگی بنچ پر بیٹھا خاموشی سے آنسو بہاتا رہا۔ اندر سے سسکتا رہا مگر وہاں سے اٹھ کر آپریشن روم تک جانے کی مجھ میں ہمت نہ ہو سکی۔ روتی آنکھیں' اداس و ملول چہرے اور۔۔۔ اور اختر کی لاش دیکھنے کی میں اپنے اندر طاقت نہیں پا رہا تھا۔ پھر مہوجی کی حالت بھی بڑی دردناک تھی۔ اختر جب تک زندہ تھا مسلسل اسے مجبور کرتا رہا تھا کہ میری محبت کا دم بھر لو مگر وہ نہ جانے کس خیال' کس جذبے کے تحت اسے جھاڑیں پلاتی رہی تھی۔ وہ بے چارہ مہوجی کے منہ سے محبت کے دو جملے سننے کی آرزو دل میں لیے دنیا سے گزر گیا تھا اور اب جبکہ کچھ حاصل نہ تھا مہوجی نے نا صرف اس کی محبت کا قرار کرلیا تھا بلکہ اس کی محبت میں پاگل ہوئی جارہی تھی۔

بہت دیر تک میں وہاں ہزار ہا سوچوں میں غلطاں و پیچاں بیٹھا رہا۔ پھر شلندر کی آواز نے میری سوچوں کے تار بکھیرے۔

"شکیل صاحب۔" میں چونک پڑا' شلندر اور عقیل دونوں میرے عقب میں موجود تھے۔

"شکیل صاحب۔" شلندر گہری سنجیدگی سے دوبارہ گویا ہوا۔

"اختر کی موت کا مجھے بھی انتہائی رنج ہے۔ وہ ایسا جوان تھا ایسی طبیعت اور مزاج کا مالک تھا کہ تھوڑے سے وقت میں ہی میرے دل میں اتر گیا تھا مگر میں اس کی موت پر آپ سے ہمدردی کے الفاظ نہیں کہوں گا کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ رسمی کلمات اور ہمدردی کے لفظوں سے ایسے زخموں کا مداوا نہیں ہوا کرتا اور ویسے بھی میں رسومات کا قائل نہیں ہوں۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ عقیل نے کچھ کہنا چاہا مگر میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کردیا۔

"شکیل صاحب! اختر جتنا آپ۔۔۔"

"کچھ نہیں کہیے عقیل صاحب! شلندر صاحب نے ٹھیک کہا ہے۔ کچھ زخم ایسے ہوتے ہیں کہ جو مرہم لگتے ہی سلگ اٹھتے ہیں۔۔۔ کچھ دکھ ایسے ہوتے ہیں جو دل کے نہاں خانوں میں سینت سینت کر۔

رکھے جاتے ہیں۔ انسان ان غموں پر نہ تو ہمدردی کے لفظوں کے پھاہے پسند کرتا ہے اور نہ ہی ان کی تقسیم۔ براہ کرم میرا یہ غم بانٹنے کی کوشش مت کیجیے گا اور اپنا اپنے تک سنبھال کر رکھیے گا۔ یہ میرا اور اختر کا مسئلہ ہے' ہم دونوں کے درمیان ہی رہے گا۔"

عقیل دوبارہ کچھ نہیں بولا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد شلندر گویا ہوا۔

" اختر کی باڈی میں نے سردخانے میں رکھوادی ہے' بعد میں... کوئی فیصلہ کرلیں گے۔ میرے کچھ آدمی بھی پہنچ آئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں... واپس چلنا چاہیے۔"

"چلیے!" ہم لوگ دوبارہ اسپتال کی اندرونی عمارت میں آ گئے۔ باقی ساتھی پرکاش دیو کے کمرے میں موجود تھے۔ شلندر نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ہم باہر نکل آئے۔ کمپاؤنڈ میں دائیں طرف ایک ڈارک گلاس' ہائی ایس کھڑی تھی' جس کے قریب ہی دو خوش پوش جوان کھڑے سگریٹ پھونک رہے تھے۔ ہمیں اپنی طرف آتا دیکھ کر دونوں نے سگریٹ پھینکے اور مستعد ہو گئے۔

"پریم!" شلندر نے قریب پہنچ کر ایک کو مخاطب کیا۔

"تم وہ پک اپ لے جاؤ اور کسی سنسان سڑک پر چھوڑ دینا' خود ٹیکسی کے ذریعے اس پوائنٹ پر چلے جانا' اور تم خود ہمیں لے کر چلو۔" آخری الفاظ شلندر نے دوسرے جوان سے کہے' وہ جلدی سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف بڑھ گیا اور دوسرا عمارت کے دروازے کے سامنے کھڑی پک اپ کی جانب۔

ہم سب ہائی ایس میں سوار ہو گئے۔ گاڑی بے آواز حرکت میں آئی اور گیٹ سے نکل کر سڑک پر دوڑتی ہوئی دوسری گاڑیوں کے ہجوم میں شامل ہو گئی۔

عارب کے چہرے پر مکمل سکوت تھا اور مہرجی کے چہرے پر ویرانی۔ پروفیسر تو ویسے بھی زیادہ تر گم سم ہی رہتے تھے۔

تقریباً" آدھے گھنٹے بعد شلندر کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ راستے بھر ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ سبھی اپنی اپنی ذات میں گم اداس و ملول خاموش بیٹھے رہے۔

گاڑی رکتے ہی ہم لوگ نیچے اتر آئے۔ سورج مغرب کی جانب جھکنے لگا تھا۔ ہم گزشتہ تین دنوں سے بھوکے پیاسے تھے۔ احساس تو تھا مگر اختر کی موت نے ہماری بھوک' پیاس کی طلب کو وقتی طور پر دبا دیا تھا۔

کوٹھی کے لان میں کرسیوں پر دو آدمی اور ایک پختہ عمر عورت بیٹھی تھی۔ ہم لوگوں کے گاڑی سے اترتے ہی وہ تینوں اپنی جگہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے محسوس کیا کہ عورت پر نظر پڑتے ہی شلندر واضح طور پر چونک پڑا تھا' مگر اس نے فوراً" ہی اپنے تاثرات پر قابو پالیا۔ وہ عورت ہماری جانب بڑھ آئی۔ شلندر کے آگے بڑھتے قدم رک گئے۔

"ایسا... ہے کہ آپ لوگ جاکر آرام کریں پھر..."

اس کا لہجہ بڑا عجیب سا تھا۔

"مہر بیٹا! تم انہیں ان کے کمروں تک پہنچا دو' خود بھی ذرا فریش ہو لو... نہا دھو لو' کچھ آرام کرو۔" وہ کچھ اس انداز میں بات کر رہا تھا جیسے لفظوں کے چناؤ میں دقت ہو رہی ہو۔ مہرجی نے ایک گہری نظر قریب آنے والی عورت پر ڈالی اور خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔ ہم نے بھی قدم آگے بڑھا دیے۔ ہمارے مخصوص کمروں تک وہ ہمارے ساتھ آئی۔ دروازے پر ایک ذرا ٹھٹک کر رکی' پھر وحشت زدہ سی وہیں سے واپس پلٹ گئی۔

عارب اور عقیل دوسرے کمرے میں چلے گئے' میں اور پروفیسر خاموشی سے لیٹ گئے' ہمارے درمیان کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوئی۔ کافی دن کی بے آرامی اور تھکن تھی' طبیعت پر یاسیت اور رنجیدگی طاری تھی۔ جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا اور سر ونی ہو رہا تھا۔ شام تک صورت حال یہی رہی' تقریباً" مغرب کے وقت میں باتھ روم میں گھس گیا اور دیر تک ٹھنڈے پانی کے نیچے کھڑا رہا۔ نہا دھو کر کپڑے تبدیل کرنے کے بعد جب میں باہر نکلا تو اعصاب بڑی حد تک پرسکون ہو گئے تھے۔ مگر ذہن کا بوجھ کم نہیں ہوا

تھا۔ اختر کی تصویر جیسے آنکھ کی پتلیوں میں جم کر رہ گئی تھی۔

شلندر کے اصرار پر ہم سب رات کے کھانے پر اکٹھے ہو گئے' مگر باوجود کوشش کے کوئی بھی ٹھیک طرح سے کھانے پر توجہ نہ دے سکا۔ شلندر بڑے مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ اس نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ اختر کے خیال کی طرف سے ہمارے ذہن ہٹا دے مگر...

کافی بھی ہم سب نے اکٹھے بیٹھ کر پی تھی اور مجھے یقین ہے کہ شلندر نے کافی میں اعصابی و ذہنی سکون کی کوئی دوا ملا دی تھی اور شاید پرسکون نیند کی بھی۔ کیونکہ اس کے بعد ہم زیادہ دیر تک بیٹھ نہیں سکے تھے اور اپنے کمروں میں آتے ہی بے سدھ ہو کر سو گئے اور وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہوا۔ دوسرے دن دوپہر تک ہم لوگ بے خبر سوتے رہے' البتہ جب آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ذہنی و اعصابی طور پر کچھ بہتر پایا۔ البتہ اندر کہیں سینے میں ایک پھانس' ایک چبھن سی موجود تھی۔

ہم لوگ نہا دھو کر فارغ ہوئے ہی تھے کہ وہ عورت آدھمکی' جسے گزشتہ روز لان میں دیکھ کر شلندر چونک پڑا تھا۔

"شلندر صاحب! ناشتے کی ٹیبل پر آپ لوگوں کے منتظر ہیں۔"

"چلیں..." میں اٹھ کھڑا ہوا اور پھر ہم سب اکٹھے ہی ڈائننگ ہال پہنچے۔ شلندر اور مہرجی وہاں پہلے سے موجود تھے۔ شلندر نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ہمیں تعظیم دی' البتہ مہرجی اپنی جگہ لاتعلق سی بیٹھی رہی۔

"طبیعت کیسی ہے آپ لوگوں کی؟" شلندر نے فریش لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔"

"طبیعت تو پہلے بھی ٹھیک ہی تھی۔" شلندر بیٹھ گیا اور وہ عورت بھی۔ ناشتے کے دوران ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ ایک ملازم برتن سمیٹ کر لے گیا اور کافی کے برتن ہمارے سامنے سجا گیا۔

"اب آپ لوگوں نے آئندہ کے لیے کیا سوچا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ آئندہ کیا کرنے کا ارادہ ہے؟" شلندر نے اچانک کہا۔

"واپس..." میں نے کافی کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہم لوگ جلد سے جلد اختر کی باڈی لے کر واپس مصر پہنچنا چاہتے ہیں۔" میرا لہجہ سنجیدگی لیے ہوئے تھا۔

"لگتا ہے آپ لوگوں نے اچانک ہی فیصلہ کرلیا ہے۔"

"ہاں! ایسا ہی سمجھ لیں۔" شلندر کچھ دیر کو خاموش ہو گیا۔

"اور وہ ممی...؟"

"چھوڑیں اس قصے کو شلندر صاحب! میں مزید کسی بھی قسم کے نقصان کا متحمل نہیں ہو سکتا۔" میں نے کافی کی ایک چسکی لی۔

"اب جلد سے جلد میں جاکر اسے مصر کی خاک کے سپرد کرنا چاہتا ہوں' کیونکہ یہ اس مٹی کی امانت ہے اور اس مٹی پر اس بے جان کا حق ہے۔ آپ اگر اس سلسلے میں ہماری مدد کرسکیں تو ہم مشکور ہوں گے۔"

"یہ تو کوئی بڑا مسئلہ نہیں' با آسانی حل ہو جائے گا۔"

"تو بس' پھر جتنی جلدی ہو سکے آپ اس کا بندوبست کردیں۔"

"آپ کب تک واپس جانا چاہتے ہیں۔"

"اگر دن میں بندوبست ہو جائے تو ہم رات کی فلائٹ سے نکل جائیں گے اور اگر آج رات کو ہو جائے تو ہم صبح کی فلائٹ سے نکل جائیں گے۔"

"آپ تو لگتا ہے ہمارے ملک سے بالکل ہی بے زار ہو گئے ہیں۔" شلندر دھیرے سے مسکرایا۔

"یہاں کی فضا میں سے مجھے اختر کے خون کی مہک آتی ہے۔" میں نے آخری گھونٹ لیتے ہوئے کپ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"چند ایک روز تو لگ ہی جائیں گے کیونکہ..."

شلندر کچھ کہتے کہتے رک گیا' پھر مسکراتے ہوئے گویا ہوا۔

"خیر۔ آئیں میرے ساتھ میں نے آپ لوگوں کے لیے ایک تحفہ رکھا ہوا ہے' وہ بھی آپ کے ساتھ ہی جائے گا۔" شلندر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے ایک لمحے کو سوچا' پھر میں نے بھی جگہ چھوڑ دی۔ باقی افراد بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

شلندر ہمیں لے کر اپنے لائبریری نما اسٹڈی روم میں آگیا اور جب میں دروازے سے اندر داخل ہوا تو بے اختیار میرے قدم ٹھٹک کر رک گئے۔ سنسنی کی ایک تیز لہر میری ریڑھ کی ہڈی کو جھنجھوڑ گئی۔

دائیں ہاتھ کے صوفوں کے درمیان کارپٹ پر ایک سیاہ آبنوس کی لکڑی کا بنا تابوت پڑا تھا۔ میں کچھ دیر کے لیے مبہوت کھڑا رہ گیا۔ میری متحیر نظریں اسی تابوت سے چپکی ہوئی تھیں۔ بلاشک و شبہ یہ وہی تابوت تھا جو میں نے اہرام کے اندر سے دریافت کیا تھا۔ "مریاقس" کا تابوت "بیوسا" کی بیٹی مریاقس کا تابوت جس کی تلاش و جستجو میں' میں مصر سے ہندوستان آیا تھا' جس کی وجہ سے یہ تمام کھٹ راگ پھیلا تھا' بیسیوں لوگ ہلاک ہوئے تھے اور۔۔۔ اور اختر بھی موت کا شکار ہو گیا تھا۔ اسی مریاقس کا تابوت تھا یہ۔

میرے ساتھیوں کی حالت بھی مجھ سے کچھ مختلف نہ تھی' جبکہ شلندر کے ہونٹوں پر ایک دلچسپ سی مسکراہٹ تھی۔ مہرجی اور وہ عورت البتہ بے تاثر چہرے لیے کھڑی تھیں۔

میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر تابوت کا ڈھکن الٹا دیا' اندر وہی سنہری مجسمہ محو استراحت تھا۔ خوب صورت تیکھے نقوش کی مالک دوشیزہ کے ہونٹوں پر ایک سحر خیز سی مسکراہٹ تھی۔ سب ہی آگے بڑھ آئے۔ پروفیسر کی آنکھیں چمک اٹھیں' ان کے چہرے پر ہیجان کے تاثرات تھے۔

"تحفہ پسند آیا شکیل صاحب؟" شلندر کی آواز پر میں چونک پڑا۔

"یہ۔۔۔ یہ یہاں تک کیسے پہنچا' کون لایا؟" میں نے حیرت و استعجاب سے کہا۔

"آئیں! میں پوری تفصیل بتاتا ہوں آپ کو۔" شلندر نے کہا اور ہم سب دوبارہ ڈائننگ ہال میں آ گئے۔

"رانی کا ذکر تو آپ نے سنا ہی ہو گا میں نے بتایا تھا کہ وہ راج محل میں ایک ملازمہ کے روپ میں موجود ہے۔۔۔ 'خیرو کی بیوی۔" شلندر نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"ذکر سنا ہے۔" عقیل نے کہا۔

"مجھے بھی یاد ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ خاتون رانی ہی تھی۔ اس لیے کل جب میں نے غیر متوقع طور پر اسے یہاں دیکھا تو چونک پڑا کیونکہ اسے راج محل میں ہونا چاہیے تھا۔ اسی وجہ سے میں نے آپ لوگوں کو آرام کا کہہ دیا تھا اور خود رانی سے اس کی یہاں موجودگی کے متعلق پوچھا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ کتنا بڑا کارنامہ سرانجام دے آئی ہے۔ جو کام ایک پوری فوج نہیں کر سکی تھی وہ کام اس نے تن تنہا کر ڈالا اور کسی کی نظروں میں آئے بغیر' یہ تابوت راج محل سے نکال لائی۔"

"یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟" عقیل نے حیرت و بے یقینی سے کہا۔

"میں بتاتا ہوں کہ یہ کیسے ممکن ہوا! مہاراج رام پرشاد کے بھائی "شام پرشاد" کے متعلق تو میں نے آپ لوگوں کو بریف کیا ہی تھا۔ شرابی اور عیاش قسم کی طبیعت کا مالک۔۔۔۔ وہ رانی کی زلف کا اسیر ہو گیا تھا۔ رانی بھی بڑی ذہین عورت ہے رانی نے آہستہ آہستہ اسے پوری طرح شیشے میں اتار لیا۔ اب رانی موقع کی تلاش میں تھی کہ اسے استعمال کر سکے پھر جس روز ہم لوگ رام پور پہنچے اسی رات رانی کو موقع مل گیا۔ اس روز مہاراج کے کچھ خاص مہمان آئے ہوئے تھے' مہاراج اپنے مہمانوں کے ساتھ راج محل کے عشرت کدے میں پینے پلانے اور رقص و سرود کی محفل میں گم تھا کہ رانی نے شام پرشاد کو جا قابو کیا' اسے اس کام پر راضی کر لیا۔ شام پرشاد فوراً" ہی تیار ہو گیا۔ گاڑی بالکل خوابگاہ کے سامنے لے جائی گئی وہاں موجود پہرے دار شام پرشاد کے حکم پر دوسری طرف چلے گئے راہداری کی لائٹ آف کر دی گئی۔ میرے دو اور آدمی جو ملازموں کے روپ میں وہاں موجود تھے انہوں نے تہہ خانے سے تابوت نکال کر گاڑی تک پہنچانے میں شام پرشاد کی مدد کی دوسری طرف ہم اس کوٹھی میں بے ہوش پڑے تھے اور مہاراج کے سپاہی ہمیں گرفتار کرنے کے لیے نکل چکے تھے اور شام پرشاد اور رانی تابوت لے کر چل پڑے۔ اب بھلا شاہی گاڑی کا راستہ کون روکتا یا یہ دیکھنے کی کوشش کرتا کہ اس کے اندر کیا ہے؟" شلندر تفصیل بتا رہا تھا اس دوران رانی ایک ملازم کے ساتھ واپس آگئی ملازم ٹرالی دھکیلتا ہوا آیا۔ کافی کے برتن اس نے ٹیبل پر رکھے اور خود واپس چلا گیا۔ رانی خاموشی سے بیٹھ گئی۔ شلندر بول رہا تھا۔

"ادھر مہاراج کے سپاہی ہم لوگوں کو اٹھا لائے اور رانی وہاں پہنچ گئی' فی الوقت تو ایک بہت بڑا معرکہ سر ہو گیا تھا لیکن شام پرشاد کسی وقت بھی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا سو رانی نے اسے اسی کوٹھی کے اندر دفن کر دیا۔ شام پرشاد کے ساتھ ہر اندیشہ دفن ہو گیا۔ اب رانی کو ہم لوگوں کے متعلق کوئی علم' کوئی اطلاع نہیں تھی اور خیرو اس وقت راج محل میں موجود تھا۔ سو رانی اسے لے کر یہاں آ پہنچی اور تابوت اسٹڈی روم تک پہنچا دیا گیا۔ یہ تھی تابوت کے یہاں تک پہنچنے کی مکمل تفصیل۔" شلندر نے ایک گہری سانس لی اور کافی کا کپ اٹھا لیا۔

"زبردست۔۔۔۔ حیرت انگیز کتنے آرام سکون سے رانی صاحبہ یہ تابوت یہاں تک لے آئیں' بلا خوف و خطر۔" عقیل تحسین آمیز انداز میں بولا۔ رانی نے صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا۔ جبکہ شلندر بول پڑا۔

"عقیل بن عاص۔۔۔! یہ ایک حسن اتفاق رہا ورنہ ذرا سی بات بھی لیک آؤٹ ہو جاتی تو رانی کی لاش تک کا پتا نہ چلتا کہ کدھر گئی۔"

"ہاں یہ بات تو ہے قدم تو انتہائی خطرناک تھا۔"

"اب ہمیں جلد سے جلد یہاں سے واپس لوٹ جانا چاہیے۔" پروفیسر کی گمبھیر آواز ابھری شاید وہ کچھ اور کہتے کہ عارب خشک لہجے میں بول پڑا۔

"فار گاڈ سیک پروفیسر! مزید کچھ مت کہیے گا۔" پروفیسر نے انتہائی ناگواری سے عارب کو گھورا مگر بولے کچھ نہیں۔

"اس تابوت کو یہاں سے مصر لے کر جانا آسان نہ ہو گا بڑا خطرناک کام ہے اس لیے اس خطرے کا بندوبست کرنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔" شلندر نے کہا۔

"مصر سے یہاں تک بھی تو پہنچا ہے۔"

"مہاراج کے پاس جو ذرائع ہیں وہ ہمارے پاس نہیں ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ کسی قسم کا اندیشہ نہیں رہے اور یہ ممی اور تابوت بغیر کسی جھنجھٹ کے مصر تک پہنچ جائے اور ایسے انتظام میں چند ایک روز تو لگ ہی جائیں گے' مگر۔۔۔" شلندر کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات پھیل گئے۔

"مگر کیا۔۔۔؟" میں نے استفہامیہ انداز میں پوچھا۔

"مگر خطرہ تو پھر بھی باقی رہے گا؟"

"جب ہم اپنے ملک' اپنے گھر تک پہنچ جائیں گے پھر بھلا کیا خطرہ رہ جائے گا؟"

"مہاراج رام پرشاد۔۔۔ جو ایک بار یہ تابوت مصر سے ہندوستان اسمگل کروا سکتا ہے وہ دوسری بار بھی ایسا کر گزرے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ ساتھ ہی آپ لوگوں کو کوئی ناقابل تلافی نقصان پہنچا دے۔"

"اس کی طرف سے آپ بے فکر ہو جائیں۔" میرے بولنے سے قبل عارب بول پڑا اور ہم سب اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔

"کیا مطلب۔۔۔؟"

"آپ تابوت اور ان لوگوں کے جانے کا بندوبست کریں میں یہیں رکوں گا۔ تب تک جب تک مہاراج کی سانسیں اس سے چھین نہیں لیتا۔"

"عارب! پاگلوں والی باتیں مت کرو۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"جو ہونا تھا ہو گیا اب ہمیں مزید کسی مصیبت میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔"

"آپ مت پڑیں کسی مصیبت میں مگر میں ضرور پڑوں گا۔ جب تک میں مہاراج سے اختر کے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب نہیں لوں گا مجھے سکون نہیں ملے گا۔"

"بچوں جیسی باتیں نہیں کرو ختم کرو اس قصے کو۔"

"ختم کرو۔۔۔؟ کیسے ختم کردو' کیا اختر کا خون اتنا ہی ارزاں تھا' کیا اس کی زندگی اتنی ہی بے وقعت تھی' وہ اتنا غیر اہم تھا کہ اس کی موت کو یوں فراموش کردیا جائے؟"

"تو مہاراج کے مرنے سے کیا وہ زندہ ہو جائے گا؟"

"بات کسی کے مرنے یا زندہ ہونے کی نہیں ہے شکیل صاحب! بات حساب کی ہے' ضمیر کے سکون اور بے سکونی کی ہے۔ میں یوں سکون کی زندگی نہیں گزار سکتا۔" عارب نے زہرخند لہجے میں کہا۔

"عارب! اتنا جذباتی مت بنو' ذہن کو ٹھنڈا کرو۔۔۔" عقیل نے اسے سمجھانا چاہا تو وہ تیز لہجے میں بولا۔

"ایک چوسنی اور فیڈر لادیں مجھے' پھر آپ لوگوں کو مجھے سمجھانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔"

"میں کوئی۔۔۔" عقیل نے کچھ کہنا چاہا تو میں نے انہیں ٹوک دیا۔

"عقیل صاحب! چھوڑیں اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔" میں سمجھ گیا تھا کہ اس وقت عارب کی جو ذہنی کیفیت ہے اس میں ہم اسے قائل نہیں کرپائیں گے۔

"شلندر صاحب! آپ انتظامات مکمل کریں جتنی جلدی ہوسکے۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔! میں آج ہی کوشش شروع کردیتا ہوں۔ ابھی مجھے راج محل سے بھی رپورٹ لینی ہے کہ وہاں کی صورت حال کیا ہے۔

آپ لوگ آرام کریں میری غیر موجودگی میں کوئی کام' کوئی ضرورت یا کسی قسم کا بھی مسئلہ ہو تو مہر موجود ہے۔" پھر وہ رانی سے مخاطب ہوا۔

"تم میرے ساتھ آؤ۔" پھر وہ دونوں ڈائننگ ہال سے باہر نکل گئے ان کے جاتے ہی مہرجی بھی اپنی جگہ سے اٹھی اور خاموشی سے دوسرے دروازے میں غائب ہوگئی۔ اتنی دیر میں وہ ایک بار بھی نہ بولی تھی اور نہ ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نظر آئی تھی۔ ہم لوگ بھی اٹھ کر اپنے کمروں میں آگئے۔

یہ تو مجھے معلوم نہ تھا کہ ممی کو واپس لے جانے کے سلسلے میں شلندر کیا کرے گا مگر اتنا یقین ضرور تھا کہ وہ لازمی کوئی نہ کوئی آسان راستہ نکال لے گا۔ اب مجھے انتظار اس بات کا تھا کہ شلندر کب تک انتظامات مکمل کرتا ہے اور کیا انتظامات کرتا ہے۔ شلندر گیا تو چھ روز تک دوبارہ اس کی شکل دکھائی نہ دی۔ نامعلوم وہ کن چکروں میں تھا۔ مہاراج کی طرف سے بھی اندیشہ تھا اوپر سے شلندر کی بے خبری' میں نے مہرجی سے ذکر کیا تو اس نے کہا کہ بے فکر رہیں انکل خیر خیریت سے ہیں اور دو چکر بھی لگا چکے ہیں مگر رات کے وقت ایک رات وہ تابوت لے گئے ہیں۔ ہم سے ملاقات نہ ہونے کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ رات کے اس وقت ہم لوگ سو رہے تھے اور شلندر نے ہمیں ڈسٹرب کرنا مناسب خیال نہیں کیا' دوسرا دونوں بار شلندر کچھ جلدی میں تھا۔ یہ خبر نہیں تھی کہ وہ "مرنافس" کا تابوت کہاں لے گیا ہے۔

مہرجی سے جب بھی سامنا ہوا میں نے اسے سنجیدہ اور خاموش ہی پایا ایک مستقل اداسی نے جیسے اس کی آنکھوں میں ڈیرے ڈال لیے تھے۔

میں نے اور عقیل نے عارب کو بھی سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی مگر اس پر ہماری کس بات کا کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ اس روز بھی ہم لان میں کرسیوں پر بیٹھے تھے اور یہی موضوع زیر بحث تھا کہ کسی گاڑی کے ہارن کی آواز سنائی دی' پھر گیٹ کھلا اور گاڑی اندر آگئی۔ آنے والا شلندر ہی تھا۔ گاڑی میں دو جوان اور بھی تھے۔

شلندر گاڑی سے اترا اور مسکراتا ہوا ہماری جانب ہی آگیا اس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک رول سا بھی تھا۔

"ہیلو ایوری باڈی!" اس نے خوشگوار انداز میں کہا اور ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کہاں گم ہیں آپ شلندر صاحب! اتنے دن ہوگئے شکل تک نہیں دکھائی۔" عقیل نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"بھئی اب آگیا ہوں دیکھ لو جی بھر کے۔"

"تھے کہاں تم؟"

"بس جھنجھٹیں نبٹاتا پھر رہا تھا۔"

"اب نبٹ گئی ہیں؟"

"ہاں! سب کچھ فائنل ہے۔۔۔ آپ لوگ بتائیں' بور ہوتے رہے ہوں گے؟"

"بور کیا ہونا ہے' بس عارب صاحب سے الجھے رہے ہیں۔"

"کیوں؟"

"وہی' خون کا بھوت سوار ہے۔"

"اب اتر جائے گا!" شلندر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟" شلندر نے ہاتھ میں پکڑا ہوا اخبار کا رول سیدھا کیا' وہ دو مختلف اخبار' روزنامہ دہلی اور کرائم ٹائمز کے فرنٹ پیج تھے۔ وہ اس نے درمیان میں پڑی ٹیبل پر بچھا دیے اور ہم سبھی چونک پڑے۔

دونوں پر مہاراج رام پرشاد کی تصویریں چھپی ہوئی تھیں اور جلی سرخیوں میں لکھا ہوا تھا۔

"ریاست رام پور کے مالک مہاراج رام پرشاد کا قتل۔"

اور نیچے مرچ مسالوں کے ساتھ تفصیل درج تھی۔

پولیس کا خیال تھا کہ مہاراج کے قتل کی سازش محل کے اندر ہی تیار ہوئی تھی اور شک مہاراج کے بھائی شام پرشاد پر کیا جارہا تھا کیونکہ مہاراج کے قتل کی صبح سے گزشتہ رات ہی سے شام پرشاد اور ایک ملازمہ گاڑی میں بیٹھ کر کہیں گئے تھے اور تاحال ان کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ پولیس والوں نے شک کی بنا پر راج محل سے چند افراد کو گرفتار کرلیا تھا۔

"یہ تو کمال ہوگیا' ہمارے لیے سارے راستے آسان ہوگئے۔" میں نے خوشگوار حیرت سے کہا۔

"ہاں بالکل! سارے راستے سیدھے ہوگئے ہیں۔ دوسرا شخص شام پرشاد تھا جس کی طرف سے ہمیں کچھ خطرہ ہوسکتا تھا وہ پہلے ہی پرلوک سدھار گیا اب کوئی پریشانی نہیں' اصل معاملے کی تہ تک کوئی پہنچ ہی نہیں سکے گا۔" شلندر نے مطمئن انداز میں کہا۔

"حیرت ہے! یقین نہیں آتا کہ مہاراج جیسا شیطان' اتنی آسانی سے موت کا لقمہ بن گیا۔" عقیل نے حیرت سے کہا۔

"مسٹر عقیل بن عاص۔۔۔ موت کچھ نہیں دیکھتی' پتا نہیں کیسی کیسی ہستیاں بے نشان کرڈالی ہیں اس نے۔ ہاں البتہ ایسے لوگوں کی ایسی اچانک اور غیر متوقع موت سے کچھ دھچکا سا ضرور لگتا ہے اور ایسے ہی احساس ہوتا ہے کہ ایک خدا کی ذات بھی ہے' جس کے سامنے سب کے اختیارات دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔"

"ہاں یہ بات بھی ہے۔"

"عارب صاحب! آپ بتائیں۔۔۔ اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟ اب تو آپ ہمارے ساتھ چل رہے ہیں نا؟" میں نے عارب کو مخاطب کیا۔

"اب یہاں رکنا فضول ہی ہوگا۔" عارب نے ایک گہری سانس لی۔

"شلندر صاحب! آپ بتائیں آپ کے انتظامات کہاں تک پہنچے ہیں؟"

"سب کچھ فائنل ہے' میں نے ایک اسپیشل تابوت بنوایا ہے نیچے مجسمہ ہے اور اوپر اختر کی باڈی' اجازت نامہ بھی لے چکا ہوں یہ خیال رہے کہ قانونی کاغذات میں اختر کی موت ہارٹ اٹیک کے باعث ہوئی ہے۔ تابوت اس وقت گاڑی میں موجود ہے۔ اول تو یہاں یا مصر کے ایئرپورٹ پر چیکنگ ہوگی ہی نہیں اگر ہوئی بھی تو محض خانہ پری کے طور پر کیونکہ اس کے انتظامات بھی میں کرچکا ہوں۔ اس سب کے باوجود مجسمہ میں نے ایک ایسے پلاسٹک بیگ میں پیک کروایا ہے کہ کوئی بھی برقی رو اس بیگ کو کراس نہیں کرسکے گی سو ہر خطرہ ہر خدشہ ختم۔ مجھ سے جو ہوسکا

میں نے ہر ممکن حد تک کرنے کی کوشش کی ہے اگر کوئی کوتاہی ہو گئی ہو تو اعلا ظرفی سے نظر انداز کر دیجیے گا!" شلندر نے انتہائی پر خلوص لہجے میں کہا۔

"شلندر صاحب! یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ہم لوگ تو آپ کے شکر گزار ہیں آپ نے اتنا بھرپور ساتھ دیا ہے ہمارا۔ اپنی' اپنے ساتھیوں کی زندگیاں تک آپ نے داؤ پر لگا ڈالیں۔ ایسی باتیں کر کے ہمیں شرمندہ مت کیجیے۔" میں نے دل سے کہا۔

اس کے بعد ہمارے درمیان کچھ رسمی باتیں ہوئیں۔ عقیل نے شلندر کو اس کے پیشے کا احساس دلا کر معاوضے کی بات کرنا چاہی تو وہ بھڑک اٹھا۔ اس نے عقیل کو اتنا ڈانٹا۔ کہ عقیل کچھ بول ہی نہ سکا۔ میں نے پہلی فلائٹ سے مصر جانے کی خواہش کا اظہار کیا تو شلندر نے مسکراتے ہوئے اپنے کوٹ کی اندرونی جیبوں سے ہمارے پاسپورٹ نکال کر ہمارے سامنے رکھ دیئے اور تابوت لے جانے کا قانونی اجازت نامہ بھی۔ رات بارہ بجے کی فلائٹ تھی۔

حسب معمول رات کا کھانا ہم لوگوں نے اکٹھے ہی کھایا تھا۔ پھر شلندر اور مہرجی ہمیں ایئرپورٹ تک چھوڑنے آئے پتا نہیں کس جذبے' کس خیال کے تحت مہرجی کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ اور جا کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ پھر فلائٹ کی روانگی کا اعلان ہوا تو ہم لوگ بریف کیس سنبھالتے ہوئے شلندر سے رخصت لے کر آگے بڑھ گئے ہمارے چلتے ہی مہرجی دوبارہ شلندر کے قریب آ کھڑی ہوئی۔

یکایک طبیعت پر ایک بوجھل سی یاسیت طاری ہو گئی نہ جانے وہ کون سے عوامل تھے جن کے باعث دل دکھنے لگا تھا۔ جہاز میں سوار ہوتے وقت کلیجہ کٹ رہا تھا مگر میں خود اپنی کیفیت کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ شلندر اور مہرجی آخر وقت تک اپنی اپنی جگہ کھڑے رہے۔

پھر جہاز حرکت میں آیا اور کچھ ہی دیر بعد ہندوستان کی سرزمین سے بلند ہوتا چلا گیا۔

ہم اپنی آمد کی اطلاع پہلے ہی کر چکے تھے سو باسط اور حمید (ڈاکٹرز) دونوں گاڑیاں لے کر پہنچے ہوئے تھے۔ یہ تو علم نہیں کہ تابوت کی چیکنگ ہوئی یا نہیں البتہ ہمیں نہ تو زیادہ دیر انتظار کی زحمت کا شکار ہونا پڑا اور نہ کسی جھنجھٹ کا۔

باسط ویگن لے کر آیا تھا اور حمید میرے والی سبز مرسڈیز۔ تابوت ویگن میں رکھوانے کے بعد ہم لوگ مرسڈیز میں بیٹھے اور گاڑیاں قاہرہ کی پر رونق سڑک پر دوڑ پڑیں۔ دل و دماغ پر ایک سوگواریت طاری تھی۔ ہم سبھی افسردہ اور ملول تھے۔

جب مصر سے ہندوستان روانہ ہوئے تھے اختر مسلسل ہنستا ہنساتا رہا تھا مزے مزے کے چٹکلے سناتا رہا تھا۔ ایک لمحے کو بھی تو اس کی زبان خاموش نہیں ہوئی تھی۔ اس کے پھیپھڑوں میں شاید کوئی ایسی مشین فٹ تھی جو مسلسل قہقہے اچھالتی رہتی تھی۔ لیکن اسے تھکنے نہیں دیتی تھی اور آج۔۔۔ آج ہمارے ساتھ وہ بھی تو واپس آیا تھا مگر کس صورت میں۔۔۔؟

ایک۔۔۔ ایک سرد اکڑی ہوئی لاش کے روپ میں۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں تھی۔ سنگین سناٹے تھے۔۔۔ اس کے ہونٹوں پر قہقہے نہیں موت کے قفل تھے۔۔۔ چمکتی ہوئی آنکھیں بے نور تھیں اور اس کے چہرے پر پھیلی رہنے والی زندگی کی شفق کی جگہ خزاؤں کے عفریت خیمہ زن تھے۔۔۔ وہ ہمارے ساتھ سفر کر رہا تھا مگر ایک لاش کے روپ میں۔

میری آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے ہمارے۔۔۔ ہمارے کیا خود اس بے چارے کے اپنے خواب خیال میں نہیں آیا ہو گا کہ اس کی واپسی اس انداز میں ہو گی۔

ہم اسپتال پہنچے تو جسے' جسے اختر کی موت کا علم ہوا وہی رو دیا۔ ہم نے سب کو یہی کہانی سنائی کہ اس کی موت ہارٹ اٹیک کے باعث ہوئی ہے۔ ہم ہندوستان کیوں گئے تھے اس حقیقت کا علم ہمارے سوا اور کسی کو نہیں تھا۔ اختر کی لاش کو غسل بھی ہم لوگوں نے اپنے ہاتھوں سے دیا اور دوسرے دن دوپہر کے وقت سپرد خاک کر دیا۔ اس کا خمیر مصر ہی کی پراسرار مٹی سے اٹھا

تھا اور آج وہ اسی مٹی کے نیچے جا پہنچا تھا۔

☼ ☼ ☼

تابوت میں نے اپنے بنگلے میں خوابگاہ میں رکھوا کر خوابگاہ کو لاک کر دیا تھا اور خود عقیل کے بنگلے میں سونے لگا۔ پروفیسر دو روز بعد یونیورسٹی چلے گئے تھے اور جاتے جاتے کہہ گئے تھے کہ جب میری ضرورت ہو تو مجھے یاد کر لینا مگر میں اس تابوت اس مجسمے سے کچھ ایسی وحشت محسوس کرنے لگا تھا کہ میں نے اسے صرف نظر انداز ہی نہیں کر دیا بلکہ اپنے بنگلے میں سونا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اس مجسمے' اس ممی کی وجہ سے بہت خون بہا تھا' بہت لوگ قتل ہوئے تھے۔ مہاراج اور اختر بھی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ مجھے خوف محسوس ہوتا تھا جس دن اس مجسمے کو تابوت سے نکالا گیا اس دن بہت بڑی تباہی آئے گی۔

اختر کا غم کچھ ہلکا ہوا تو میں "سیوا" اپنے گھر چلا گیا اور تقریباً" ایک مہینہ وہاں رکا رہا۔ طبیعت بالکل فریش ہو گئی۔ جب میں خود کو ذہنی و روحانی طور پر بالکل ترو تازہ محسوس کرنے لگا تب واپس اسپتال آ گیا۔ زندگی کے شب و روز معمول پر آ گئے اور پھر ایک دن میں نے پروفیسر کو فون کر دیا۔

دوسرے روز صبح ہی صبح پروفیسر آ پہنچے۔ جب میں اپنے بنگلے پر ہی موجود تھا عقیل بھی وہیں تھا جبکہ عارب پروفیسر کو لیے آ پہنچا۔

ہم بیڈ روم میں موجود تھے۔ دائیں ہاتھ صوفے کے ساتھ ہی وہ بھاری بھرکم تابوت پڑا تھا جس میں مجسمہ موجود تھا۔ اندر داخل ہوتے ہوئے پروفیسر کی نظریں اس تابوت پر جم کر رہ گئیں۔ ان کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر اشتیاق کے تاثرات سمٹ آئے۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑا بیگ ایک طرف رکھ دیا۔

"جی شکیل صاحب! کیسے خیر سے یاد کیا تھا مجھے؟" وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"ہاں پروفیسر صاحب! خیر ہی ہے۔ میں اب اس مجسمے سے متعلق اسراروں سے پردہ اٹھانا چاہتا ہوں اور اس کے لیے مجھے آپ کی مدد کی ضرورت تھی۔ آپ کو اپنا ادھورا کام مکمل کرنا ہے۔ مجسمے پر کندہ تحریر کا ترجمہ۔"

"شوق سے' میں تیار ہوں۔" پروفیسر خوشدلی سے بولے۔

"بلکہ مجھے تو شدت سے انتظار تھا اس دن کا۔"

"چلیں پھر اللہ کا نام لے کر اپنے کام کا آغاز کرتے ہیں۔" میں نے کہا اور اٹھ کر تابوت کے قریب پہنچ گیا وہ تینوں بھی میرے قریب آ گئے۔

"تابوت کو الٹانا ہو گا کیونکہ یہ دوسری طرف سے کھلے گا۔" میں نے کہا اور پھر ہم چاروں نے مل کر تابوت کو پلٹ دیا اوپر کا حصہ نیچے اور نیچے والا اوپر ہو گیا۔ اچھا خاصا وزنی تابوت تھا۔

"یہ کھلے گا کیسے؟" عارب نے کہا۔

"شلندر نے کوئی طریقہ کار بتایا تھا۔۔۔ شکیل صاحب کیا آپ کو یاد ہے؟"

"صبر کرو۔۔۔" میں لمبائی کے رخ سے تابوت کا جائزہ لینے لگا۔ تابوت کے ٹاپ سے دو انچ نیچے' تختہ غیر محسوس سے انداز میں تھوڑا جڑا ہوا تھا میں نے وہاں ہاتھ رکھ کر پوری قوت سے دبا دیا۔

"ادھر سے۔۔۔ دوسری طرف اوپر اٹھاؤ۔" میں نے عارب کو مخاطب کیا اور اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر ٹاپ کو کنارے سے پکڑ کر اٹھایا تختہ آرام سے اٹھ آیا۔ اس طرف سے میں نے پکڑا اور وہ تختہ اٹھا کر ایک طرف ڈال دیا۔ اندر وہ پراسرار سنہری مجسمہ موجود تھا جس کی وجہ سے اتنا فساد ہوا تھا۔

"پکڑو ادھر سے' باہر نکالو اس کو۔" میں نے مجسمے کو ٹانگوں کی طرف سے تھاما اور عارب نے سر کی طرف سے۔ مجسمہ کسی لاش کی طرح سرد تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ زیادہ وزنی نہیں ہو گا۔ مگر جب ہم نے اسے اٹھایا تو چودہ طبق روشن ہو گئے یوں لگا جیسے اس میں پارہ بھرا ہوا ہو۔

قریب تھا کہ وہ ہمارے ہاتھوں سے گر جاتا۔ عقیل اور پروفیسر نے جلدی سے آگے بڑھ کر بوجھ بانٹ لیا۔

ہم چاروں نے مشکل سے اسے ایک طرف ایستادہ کیا تھا۔

"بہت زیادہ وزنی ہے یہ تو!" عقیل نے کہا۔

میں گہری نظروں سے مجسمے کا جائزہ لے رہا تھا جس کے سرتاپا باریک باریک نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ آڑے ترچھے تیروں کے نشان۔ مجسمے کی قامت بھی اچھی خاصی تھی۔ میرا قد چھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا تھا جب کہ وہ مجسمہ مجھ سے بھی چند انچ اونچا رہا ہو گا۔

"میخی طرز تحریر ہے۔" پروفیسر بڑبڑائے۔

"آپ وثوق سے کہہ سکتے ہیں؟"

"ہاں! بالکل... یہ تیر' یہ تیروں کا مثلث یہ میخی خطوط کہلاتے ہیں اور یہی وہ چیزیں' وہ علامتیں ہوتی ہیں جن کی مدد سے آثار قدیمہ والے ایسی چیزوں کی قدامت کا اندازہ لگاتے ہیں۔"

"جو بھی ہے پروفیسر! اب یہ آپ کا کام ہے کہ آپ اسے "عربی" میں ڈھالیں تاکہ ہمارے پلّے بھی کچھ پڑ سکے کہ اس مجسمے کے پیچھے کیا کہانی چھپی ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ پروفیسر نے ایک بھرپور نظر سے پورے مجسمے کا جائزہ لیا پھر گویا ہوئے۔

"اس عبارت کے مکمل ترجمے میں مجھے کم از کم چار گھنٹے لگ جائیں گے۔"

"تو بس' آپ اپنا کام شروع کردیں۔"

"میں تیاری کرکے آیا ہوں۔" پروفیسر نے مسکراتے ہوئے کہا اور کچھ فاصلے پر پڑا اپنا بیگ اٹھا کر دوبارہ مجسمے کے قریب آ گئے۔ جبکہ ہم تینوں پیچھے ہٹ کر صوفوں پر بیٹھ گئے۔

"عارب! یار تم جاکر کافی بنالاؤ۔ ایسا کرنا تھرماس بھر لانا ورنہ یوں چار گھنٹے گزارے نہیں جائیں گے۔" میں نے عارب کو مخاطب کیا اور وہ مسکراتا ہوا اٹھ کر باہر نکل گیا۔

پروفیسر اپنے کام میں مگن ہو گئے اور ہم ادھر ادھر کی باتوں میں۔ کچھ دیر بعد عارب کافی کا تھرماس بھر لایا اور کافی کا سلسلہ چل پڑا ایک کپ پروفیسر کو پیش کردیا گیا۔ وہ کاغذ پنسل لیے اپنے کام میں لگے رہے کبھی کبھار قریب رکھی موٹی سی کتاب اٹھا کر اس میں کچھ دیکھنے لگتے پھر دوبارہ مجسمے کی طرف متوجہ ہو جاتے۔

ہم وقت گزاری کے لیے فضول کی باتوں میں الجھے رہے۔ وقفے وقفے سے کافی کے دور چلتے رہے اور تھرماس خالی ہو گیا۔ بے اختیار بار بار میری نظریں گھڑی پر جم جاتیں۔ آخر کار ساڑھے چار گھنٹے کے صبر آزما انتظار کے بعد پروفیسر ایک گہری سانس لیتے ہوئے مجسمے کے قریب سے ہٹ آئے۔

"لو جی! یہ تو فائنل ہو گیا۔ بڑی دلچسپ کہانی ہے۔"

"لائیں دکھائیں ذرا۔" میں نے بے قراری سے ہاتھ پروفیسر کی طرف بڑھایا۔

"ارے اکیلے اکیلے پڑھو گے کیا؟ یہ دو افراد بھی تو بیٹھے ہیں' میں خود پڑھ کر سناتا ہوں۔"

"تو پھر پڑھیں نا!"

"جناب! میرا دماغ پلپلا ہو گیا ہے پہلے ایک کپ کافی پیوں گا تاکہ ذہن کچھ ترو تازہ ہو جائے' ذہنی تھکاوٹ رفع ہو جائے۔" پروفیسر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"پروفیسر! اب آپ تنگ کرنا چاہتے ہیں؟"

"عجیب بات ہے! اس میں تنگ کرنے والی کون سی بات ہے؟ ایک کپ کافی ہی مانگی ہے' میرا معاوضہ سمجھ لیں... ساڑھے چار ہزار سال پرانے راز فاش کرنے جارہا ہوں میں' آپ لوگ شکریہ میں ایک کپ کافی نہیں پلا سکتے؟"

"جاؤ یار عارب بھر لاؤ یہ۔" میں نے تھرماس عارب کی طرف سرکایا اور وہ تھرماس اٹھا کر باہر نکل گیا۔ میری روح میں بے چینیوں کے بھنورے بے دار ہو گئے تھے۔ وجود میں سنسنی کی لہریں مچلنے لگی تھیں۔ ایک پراسرار عہد' ایک تاریخ ہمارے سامنے بے نقاب ہونے والی تھی۔

تقریباً" دس منٹ بعد عارب کی واپسی ہوئی وہ صوفے پر بیٹھ کر کپوں میں کافی انڈیلنے لگا۔ میں نے جلدی سے ایک کپ اٹھا کر پروفیسر کی جانب بڑھا دیا۔

"یہ لیں! اور سنائیں کیا داستان ہے۔" پروفیسر نے کپ اٹھا کر ایک چسکی لی۔ اور کاغذ کھول لیے۔

"سنو...!" انہوں نے چند لمحے توقف کیا پھر دوبارہ گویا ہوئے اور ہم تینوں ہمہ تن گوش ہو گئے۔

"اے مسیحا۔"

اے موت کو شکست دے کر انسان کو دوبارہ زندہ کردینے والے۔

تیری نگاہ مقدس' جسموں کے اندر تک دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ یہ تو ہی ہے۔ کہ تیرے سوا کوئی دوسرا اس تابوت اور مجسمے تک کبھی نہیں پہنچ پائے گا۔

میں تجھے خبر کرتی ہوں کہ یہ مجسمہ محض مجسمہ ہی نہیں ہے۔ بلکہ اس کے اندر ایک زندہ وجود ہے!

میری لخت جگر۔

مریاقس!

وہ سو رہی ہے۔ عذاب جھیل رہی ہے۔ محض انتظار میں...

"سن... کہ پہلے میں تجھے مکمل احوال سے آگاہ کردوں۔"

"میرا نام "نیبوسا" ہے۔ "میں شاہ مصر اخناتون کی محبوبہ ہوں۔" "مریاقس" میری بیٹی ہے' اس کے علاوہ میری ایک بیٹی اور ہے جس کا نام "اناآطو" ہے دونوں بہنیں ایک دوسری پر جان چھڑکتی ہیں۔ میری دونوں بیٹیاں ہی دیوتا کی مہربانی سے بہت خوبصورت ہیں۔

شاہ مصر اخناتون "مریاقس" سے والہانہ اور دیوانہ وار محبت کرتا تھا۔

"مریاقس" سے اسے روحانی لگاؤ تھا۔ اس محبت کو دیکھ کر اخناتون کی بیوی اور اولاد "مریاقس" سے حسد کرنے لگی۔ مجھے اس کا بخوبی اندازہ تھا۔ یہ حسد نفرت کی اس انتہا کو پہنچا کہ انہوں نے "مریاقس" کو مار ڈالنے کا منصوبہ بنایا۔ مگر میری اتنی اوقات نہ تھی کہ ان کی شکایت اخناتون سے کرتی آخر اخناتون کے خون نے ساحروں کی مدد سے "مریاقس" کی روح کو کیل دیا اس کے وجود میں ہی سلا دیا گیا' محبوس کردیا گیا۔

اس کے تمام جسمانی افعال بند کردیے گئے۔ اس کے جسد خاکی پر ایسا طلسمی حصار ڈال دیا گیا کہ اس کی روح جسم سے پرواز نہ کرسکے اور ہمیشہ کے لیے اس کے وجود کے اندر رہائی کے لیے تڑپتی رہے۔ اور اس قید کا عذاب جھیلتی رہے۔ طبی طور پر میری بیٹی مرچکی تھی کہ طب و حکمت جسم سے متعلق ہوتی ہے اور "مریاقس" کے تمام جسمانی افعال منجمد ہو چکے تھے۔ مگر اس کی روح ابھی جسم میں محبوس ہے۔ اگر میں اخناتون سے کہتی تو وہ سمجھتا کہ میں اس کے عزیزوں سے حسد کرتی ہوں اس لیے ایسا الزام لگا رہی ہوں سو وہ میری گردن مروا دیتا اور اس کی چہیتی بیگم اس سے بھی پہلے مجھے کسی طلسم میں بند ہوا دیتی سو میں خاموش ہو رہی۔ اخناتون نے حکم دیا کہ اسے حنوط کرنے کے بعد اس کے ذاتی اہرام میں دفن کیا جائے۔ حنوط کرنے کے لیے پہلے لاش کی کھوپڑی سے بھیجا نکالا جاتا ہے پھر اس کے پہلو میں شگاف کرکے شکم سے آلائشیں نکالی جاتی ہیں پھر وجود میں مسالے بھرے جاتے ہیں اور لاش کو کم از کم ستر دن تک کھارے نمک میں رکھا جاتا ہے۔ اگر وہ مسالے بھرنے کے لیے "مریاقس" کا شکم چاک کرتے تو طلسمی حصار ٹوٹ جاتا اور مریاقس کی روح آزاد ہو جاتی۔ مگر اس سنگدل اور سفاک عورت نے ایسا نہ کرنے دیا۔ "مریاقس" کے ظاہری کھلے اعضا میں مسالا ٹھونس دیا گیا اور محلول میں پٹیاں ڈبو کر اس کے وجود کو لپیٹ دیا گیا گویا حنوط کردیا گیا۔

شاہ مصر کے اہرام میں مریاقس کے تابوت کی جگہ ایک ہیرے جواہرات سے مرصع' خوبصورت خالی تابوت رکھوا دیا گیا اور "مریاقس" کے تابوت کو ایک نہر میں پھنکوا دیا گیا۔ تابوت پر دال اور روغن کی ہلکی ہلکی پالش کردی گئی تھی تاکہ فوراً" نہ ڈوب جائے بلکہ تیرتا ہوا دور کہیں جاکر غرق آب ہو' میں ماں تھی سمجھ رہی تھی کہ بیٹی کی روح کس کرب ناک و دردناک عذاب اور تکلیف کا شکار ہوگی کافی دوری پر سے وہ تابوت میں نے نکلوا لیا۔ گو کہ میرے وسائل محدود تھے کوئی رشتہ نہ سہی مگر شاہ مصر کی منظور نظر تھی! میں

نے ساحروں سے رابطہ کیا اور انہیں کہا کہ میری بیٹی کی روح کو آزادی دلوائیں مگر وہ باوجود کوشش کے ناکام رہے کہ "بندھ" مضبوط تھا۔ انہوں نے کہا ساڑھے چار ہزار سال گزر جانے کے بعد ایک "مسیحا" ان علاقوں میں آئے گا۔ اور اسے اس قید سے آزادی دلوائے گا کہ اس کے سوا اور کوئی ایسا نہ کرپائے گا۔ وہ مسیحا! انسانوں میں نئی زندگیاں اور خوشیاں بانٹتا ہوگا وہ انسانی وجود کو کپڑوں کی طرح کھول کر اندرونی اعضا دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہوگا اور وہی "مریاقس" کا رستہ نفس کھولے گا جو اس کی آزادی کا باعث بنے گا۔ ایک روز شاہ مصر اخناتون کا موڈ بہت اچھا تھا' میں نے مریاقس کی ذات کا واسطہ دے کر ایک فرمائش کی۔

جو اس نے فوراً" مان لی۔ میں نے کہا کہ پلوز (موجودہ شہر فاری کا قدیم نام) اور بلیوس (بلبیس شہر کا قدیم نام) کے وسط میں جو پہاڑی خطہ ہے وہاں زیر زمین میرے لیے ایک اہرام تعمیر کروادے اور اس نے ایسا کردیا۔ جب تعمیر مکمل ہوگئی تو میں نے نیا تابوت بنوایا اور "مریاقس" کا وجود سونے کے مجسمے میں محفوظ کروادیا۔

اگر میں "مریاقس" کا جسم چاک کرواکر حنوط کرواتی تو میرے ساتھ ساتھ میری بیٹی اناآطو بھی موت کا شکار ہوجاتی کیہ اس کا وقت پہلے گزر چکا تھا' سو میں نے ایسے ہی "مریاقس" کو اہرام کے ایک الگ گوشے میں دفن کردیا۔ اناآطو سترہ سال کی تھی کہ شاہ مصر اخناتون کے ایک عزیز دمعتر اطوس نے اناآطو سے شادی کرلی۔ وہ اناآطو سے دو گنا بڑا تھا اس کے باوجود اناآطو اس کے ساتھ خوش تھی مگر اس سفاک عورت سے ان کی خوشیاں دیکھی نہ گئیں اور اس نے اناآطو اور اس کے خاوند دونوں کو زہر کے ذریعے ہلاک کروادیا۔ میرے بھی آخری دن آچکے ہیں کہ کسی وقت بھی مرا چاہتی ہوں' مرنے سے پہلے مجبوراً" مجھے مریاقس کا تابوت دوبارہ کھولنا پڑ رہا ہے کہ میں یہ پیغام تیرے نام' مجسمے پر کندہ کروا رہی ہوں کہ اے مقدس مسیحا!

بعد الموت جسم ایک بستر ایک سرائے ہوتا ہے روح کے لیے کہ وہ اس میں آتی جاتی رہتی ہے مگر میری بیٹی کے لیے یہ عذاب خانہ ہے اسے اس عذاب خانے سے نجات دلا۔ مجسمے کے شکم سے اس کا وجود باہر نکالنے کے لیے تجھے مجسمے کی دل کی جگہ پر دباؤ ڈالنا ہوگا۔ رع دیوتا تیرا حامی ہو۔

فقط

حرا نصیب بیٹی کی حرماں نصیب ماں ییوسا۔

پروفیسر خاموش ہوگئے اور میں سوچوں کے اتھاہ سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔

ایک ایک حرف میرے ذہن میں بری طرح کھٹک رہا تھا اور۔۔۔ اور مجسمے پر کس قدر مستحکم یقین کے ساتھ پیغام درج کیا گیا تھا۔ میرے ذہن میں آندھیوں کے جھکڑ سے چلنے لگے۔

خوابگاہ میں ہم چار افراد موجود تھے مگر موت کی سی خاموشی تھی گہرا۔۔۔ بوجھل سکوت' سبھی ان لفظوں کے زیر اثر تھے۔ مجسمے پر درج تحریر کا تمام مفہوم میری ذات کو حصار میں لے رہا تھا۔ اور مجسمے تک پہنچنے والا شخص بھی تو میں ہی تھا۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا وہ سنہرا مجسمہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ جس کے ہونٹوں پر ایک لافانی مسکراہٹ ثبت تھی اور جس کے اندر مریاقس کی غیر حنوط شدہ ممی تھی۔

میں لاشعوری طور پر اٹھ کر مجسمے کے قریب جا کھڑا ہوا' ہزاروں سال پہلے کے اور آج کے انسانی وجود کے درمیان صرف ایک سونے کی چادر حائل تھی۔ ماضی اور حال ایک دوسرے میں سمٹنے والے تھے' آپس میں مدغم ہونے والے تھے۔

"عارب! پروفیسر!" میرے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ "مریاقس کو اس دھاتی تابوت سے باہر نکالیں۔"

عارب' عقیل اور پروفیسر تینوں آگے بڑھ آئے۔ ہم نے مل کر بااختیار مجسمے کو پشت کے بل نیچے لٹادیا۔

"کھولو اسے عارب۔" میں نے عارب کو مخاطب کیا تو وہ ایک نظر ہماری صورتیں دیکھتا ہوا مجسمے کے قریب بیٹھ گیا۔ چند لمحے کے تذبذب کے بعد اس نے مجسمے کے دل پر ہاتھ رکھے اور دبادیا۔ اور پھر پراسرار طور پر مجسمے کا اوپری حصہ کسی ڈھکن کی طرح بے آواز کھلتا چلا گیا۔

اس کے کھلتے ہی عارب بے اختیار بوکھلا کر پیچھے ہٹ گیا۔ ایک انوکھی اور نئی مہک آزادی نصیب ہوتے ہی فضا میں پھیل گئی۔ مجسمے کے اندر ایک ممی لیٹی ہوئی تھی۔ سر سے پاؤں تک سفید پٹیوں میں ملفوف۔ اس کا پورا وجود ان پٹیوں میں چھپا ہوا تھا۔ جسم کا معمولی سا حصہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ دیر کے لیے کمرے کی فضا میں ایک پراسرار سی خاموشی تیرتی رہی پھر ڈاکٹر عقیل کی آواز ابھری۔

"اب۔۔۔ اب کیا کرنا ہے اس کا؟"

"آپریشن۔۔۔!" مجھے اپنی آواز کچھ اجنبی سی لگی۔

"ممی کا آپریشن؟" ڈاکٹر عقیل کے لہجے میں سوال سے زیادہ حیرت تھی۔

"ہاں۔۔۔! عارب تم اسٹریچر لے آؤ۔" میں نے ڈاکٹر عقیل کو جواب دینے کے بعد عارب کو مخاطب کیا۔ اور وہ خاموشی سے باہر نکل گیا مگر اس نے آنے میں دیر نہیں لگائی۔ اسٹریچر وہ خوابگاہ کے دروازے تک لے آیا تھا۔

"اٹھاؤ اسے۔۔۔ اسٹریچر پر لٹاؤ۔" ڈاکٹر عقیل اور عارب دونوں ہی قدرے ہچکچائے پھر آگے بڑھ کر انہوں نے اس ممی کو ٹانگوں اور کندھوں سے تھام کر اٹھایا اور اسٹریچر پر لٹادیا۔ اوپر ایک سفید چادر ڈال کر اسے مکمل طور پر چھپا دیا گیا۔ پھر ہم اسٹریچر دھکیلتے ہوئے باہر آئے اور اسپتال کی عمارت کی جانب بڑھ گئے۔

سبھی ماتحت تھے' میں خود مختار۔۔۔ تھا سو کوئی پریشانی والی بات نہ تھی آپریشن روم میں پہنچ کر ممی کو ہم نے آپریشن ٹیبل پر لٹادیا اور کرٹن اسٹینڈ کھینچ کر ٹیبل اور دروازے کے درمیان کردیا۔

"شکیل صاحب! آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ آپ کیا کرنے جارہے ہیں؟" عارب نے کہا۔

"کیا تمہیں لگتا ہے کہ میں حواسوں میں نہیں ہوں؟"

"نہیں ایسی بات تو نہیں ہے مگر یہ سب۔۔۔"

عارب نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ہزاروں سال پرانی ممی کا آپریشن۔۔۔ کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔" ڈاکٹر عقیل نے عارب کے خیال کا اظہار کردیا۔ میری اپنی ذہنی حالت ان سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ مگر میں کچھ نہ کچھ کرنا چاہتا تھا۔ مریاقس کی روح کو اس کے جسم کی قید سے آزادی دلوانا چاہتا تھا مگر راستہ مجھے سجھائی نہیں دے رہا تھا جبکہ ساڑھے چار ہزار سال قبل مجسمے پر میرے لیے پورے وثوق کے ساتھ پیغام کندہ کردیا گیا تھا کہ مجھے مریاقس کو اس عذاب سے نجات دلانی ہے۔ اس کی مدد کرنی ہے۔ مگر کیسے۔۔۔؟ اس بارے میں خود مجھے کچھ معلوم نہیں تھا! میں ڈاکٹر تھا اور آجا کر یہی بات میرے ذہن میں آئی تھی کہ مجھے مریاقس کا آپریشن کرنا ہوگا اور دل نے فوراً" ذہن کے اس فیصلے پر مہر تصدیق ثبت کردی تھی اور میں تیار بھی ہوگیا تھا۔

"یہ آج تک کی تاریخ کا سب سے انوکھا اور عجیب وغریب آپریشن ہوگا۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا اور ماسک چڑھالیا۔ پروفیسر نے بھی فوراً" میری تقلید کی۔ چاروناچار عقیل اور عارب نے بھی ماسک چڑھا لیے۔ وہ اس آپریشن کے سلسلے میں خاصے متذبذب دکھائی دے رہے تھے۔

پروفیسر ایک جانب خاموش کھڑے ہوگئے۔ ہم نے دستانے پہنے اور تیز روشنیاں آن کردی گئیں۔ میں نے قینچی کی مدد سے ایک پٹی کاٹی اور پھر ان پٹیوں کو کھولا جانے لگا۔ پٹیوں کو سینے اور جوڑ لگانے کے لیے "تانت" کا دھاگا استعمال کیا گیا تھا۔ مگر سب کچھ انتہائی خستہ ہوچکا تھا۔ تقریباً" بیس منٹ کی محنت کے بعد وہ تمام پٹیاں ایک طرف فرش پر ڈھیر کی صورت پڑی تھیں اور مریاقس کا وجود آپریشن ٹیبل پر پڑا مسیحائی کا منتظر تھا۔ ماضی سے ساڑھے چار ہزار سال کا طویل ترین سفر طے کرکے آج حال میں' لمحہ موجود میں' مریاقس ہماری آنکھوں کے سامنے موجود تھی۔ چوبیس پچیس سال کے دکھائی دینے والے صحت مند

وجود کی حامل ایک ایسی دوشیزہ جو درحقیقت ہزاروں سال عمر کی مالک تھی۔ لیکن اس کا وجود آج بھی جوں کا توں موجود تھا گویا اس نے وقت کے ساتھ سفر کیا ہی نہ ہو' ہزاروں سال وقت کے بہاؤ سے علیحدہ رہ کر گزارے ہوں اور آج یکایک وقت کے بہاؤ سے ابھر کر حال میں ہمارے سامنے جلوہ افروز ہو گئی ہو! مریاقس کے جسمانی نشیب و فراز اور تمام خال وخد بالکل درست اور اپنی موزوں حالت میں تھے۔ البتہ اس کا پورا وجود اپنی اصل رنگت سے محروم دکھائی دے رہا تھا اور اس کی حتمی وجہ وہ محلول آلود پٹیاں تھیں جو آج سے ہزاروں سال پہلے اس کے وجود پر لپیٹی گئی تھیں اور یقیناً" مریاقس کے اجلے وجود کی موجودہ سیاہی مائل بھوری رنگت' کسی نامعلوم محلول میں تر انہی پٹیوں کی ودیعت کردہ تھی۔ رنگت کے علاوہ اس وجود میں اور کوئی غیر معمولی تبدیلی نہ تھی وہ بالکل ایک عام انسانی وجود کی مانند تروتازہ اور زندہ محسوس ہوتا تھا۔ اسے پٹیوں کی گرفت سے نجات دلاتے ہوئے ہم سب پر یہ حیرت انگیز انکشاف بھی ہوا کہ اس وجود میں اب بھی قدرتی نرمی اور اعصا کی مخصوص لچک برقرار تھی۔ حتیٰ کہ جسمانی حرارت بھی موجود تھی' گوکہ وہ حرارت ایک زندہ وجود کے مساوی نہ تھی پھر بھی اس قدر ضرور تھی کہ اسے چھونے والا کوئی فرد اسے لاش نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں نے ایک نظر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا' ان کی سوالیہ نظریں مجھ ہی پر مرکوز تھیں۔

"اسے نہلانا پڑے گا۔"

عارب اور پروفیسر پیچھے ہٹ گئے جب کہ میں ڈاکٹر عقیل کی مدد سے مریاقس کی جلدی صفائی کے لیے مختلف کیمیکلز سے ایک مخصوص لیکوئڈ تیار کرنے میں لگ گیا۔ عقیل اور میں اسے اٹھا کر باتھ روم میں لے گئے۔ مریاقس کے جسم کو باتھ ٹب میں لٹا کر میں نے نل کھول دیا۔ ڈاکٹر عقیل نے ڈس انفیکٹنٹ کی ایک مخصوص مقدار لا کر باتھ ٹب کے پانی میں ملا دی گئی۔

اسے غسل دینے میں ہمیں اچھا خاصا وقت لگا۔ ایک عجیب سی میل جیسے اس کی جلد میں سے پھوٹتی رہی۔ ایک گہرا سیاہی مائل بھورا سا مواد اس کے کانوں اور نتھنوں میں سے بہتا رہا۔ تین' چار بار تو ہمیں باتھ ٹب کا پانی تبدیل کرنا پڑا تھا پھر تقریباً" ڈیڑھ گھنٹے بعد جب میں اور ڈاکٹر عقیل نے اسے لا کر آپریشن ٹیبل پر لٹایا تو ڈاکٹر عارب اور پروفیسر متحیرانہ نظروں سے اسے دیکھتے رہ گئے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے والے اور اب والے وجود میں فرق ہی اتنا واضح تھا۔ مریاقس کی جسمانی رنگت اسی فیصد تک اپنی اصل حالت پر لوٹ آئی تھی۔ اس کی جلد کی ملائمت آج بھی ویسی ہی تھی۔

ہم سب ایک بار پھر آپریشن ٹیبل کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ بظاہر کچھ ہوا تو نہیں تھا پھر بھی میرے احساس نے کہا کہ یکایک تیز روشنی کچھ مدھم سی پڑ گئی ہے۔ مریاقس کے وجود کی موجودہ چمک نے تیز روشنیوں کو چندھیا کر رکھ دیا ہے۔ سبھی حیرت و بے یقینی سے آنکھیں پھاڑے ٹیبل پر بے حس و حرکت پڑے مریاقس کے وجود کو تک رہے تھے اور میں ان کے ساتھ ساتھ اپنی —— حالت کو بھی بخوبی سمجھ رہا تھا۔ ہماری جگہ دنیا کا کوئی بھی انسان ہوتا' کبھی بھی' کسی بھی صورت یہ یقین کرنے کو تیار نہ ہوتا کہ یہ تروتازہ وجود ساڑھے چار ہزار سال پرانا ہے۔ بلکہ یہ کوئی بھی یقین نہ کرتا کہ یہ زندہ نہیں مردہ ہے۔

عقیل اور عارب آنکھوں میں حیرت و بے یقینی کی تمام شدتیں سمیٹے کبھی مریاقس کے بے جان وجود کو دیکھنے لگتے' اور کبھی وہ میری اور پروفیسر کی طرف دیکھتے۔

"یہ... یہ..." فرط حیرت کے عارب جملہ مکمل نہ کر سکا۔ "ناممکن... ناممکن ہے یہ سب۔"

"آنکھوں کے سامنے موجود' روز روشن کی سی اٹل حقیقت سے نظریں تو چرائی جا سکتی ہیں مگر اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔" پروفیسر متانت سے بولے۔

"مگر یہ کیسے ممکن ہے کہ ہزاروں سال گزرنے کے بعد بھی کوئی انسانی وجود... ایسی اپنی اصل حالت پر برقرار ہو۔"

"قدرت کے سب کام نرالے ہیں اور دائرہ قدرت میں کچھ بھی ناممکن نہیں۔"

"یقین نہیں آ رہا۔" ڈاکٹر عقیل خود کلامی کے سے انداز میں بولے۔

"تقویٰ اور ایمان کی کمزوری کی علامت ہے یہ۔ اگر "قادر" اور اس کی قدرت پر کامل یقین ہو تو پھر کسی بھی منظر پر' کسی بھی جلوے کے ظہور پر بے یقینی نہیں ہوتی۔"

میں ٹیبل کی دائیں طرف آ گیا۔ لگتا تھا کہ پروردگار نے کائنات کا تمام حسن' تمام رعنائیاں و دلکشی سانچے میں ڈھال کر مریاقس کا وجود بنا دیا ہو۔ بے شک وہ لافانی حسن خوبصورتی کا شاہکار پیکر تھا۔

میں تمام سوچیں جھٹک کر مریاقس کے وجود کا باریک بینی سے جائزہ لینے لگا۔ جسم کے کھلے حصوں میں مسالے بھرے ہوئے تھے۔ اس کے منہ' ناک اور کانوں میں بری طرح مسالا ٹھنسا ہوا تھا۔ جس کی عجیب ناگوار... ہلکی ہلکی بو نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ مسالا غالباً" سانس کی نالی تک پہنچا ہوا تھا جس کی صفائی کے لیے حلق کا آپریشن ضروری تھا۔ "نشتر دو!" میں نے عارب سے کہا تو وہ الماری کی طرف بڑھ گیا۔ الماری کھول کر اس نے "انسٹرومنٹ کٹ" نکال کر ٹرالی پر رکھی اور ٹرالی دھکیلتا ہوا قریب آ گیا۔ میں نے نشتر لیا اور اللہ کا نام لے کر مریاقس کے حلق پر چلا دیا۔ کھال' گوشت بالکل آسانی سے چیر آ گیا مگر اس کے حلق میں پڑ جانے والے شگاف سے خون کا ایک قطرہ بھی خارج نہیں ہوا البتہ سیاہی مائل بھورے رنگ کا تھوڑا سا مسالا ضرور برآمد ہوا۔ میں سکنگ پائپ کی مدد سے اس کے کانوں اور حلق میں ٹھنسا ہوا مسالا نکالنے لگا۔ پہلے اس کے ناک' کان اور حلق میں جما ہوا مسالا نکالا گیا پھر کیمیکلز کی مدد سے انہیں دھویا گیا۔ "واٹر گن" کی مدد سے پریشر کے ساتھ اینٹی سپٹک کیمیکلز کا استعمال کیا گیا۔ ناک' کان اور گلے کو اچھی طرح دھونے کے بعد میں نے مریاقس کے حلق کے کٹ پر اسٹیچز لگائے اور بینڈیج کر دی۔ مسالا ایک باؤل میں اکٹھا کرنے کے بعد وہ باؤل میں نے ڈاکٹر عقیل کے حوالے کر دیا۔

"اس کو سنبھال لیں' کسی وقت اس کا "ایگزیمن" کریں گے۔"

اب وہ پوری طرح اپنی اصل حالت میں تھی اور مزید کچھ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس آپریشن میں تقریباً" ہمیں ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے' سب کے چہروں پر ایک نظر ڈالی' ڈاکٹر عقیل اور عارب سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے جبکہ پروفیسر بغور مریاقس کے بے حس و حرکت وجود کو۔

اس کی خدوخال' نین نقش اپنے اندر قیامت خیز کشش رکھتے تھے اور وہ سراپا قیامت تھی۔ یا پھر قیامت کی سب سے زیادہ خوبصورت نشانی۔ اس کے چہرے پر تازہ گلاب کی سی نرمی اور شگفتگی تھی۔ یہ میری پوری زندگی کا پہلا اور یقیناً" آخری آپریشن ہو گا بلکہ آج تک کسی ڈاکٹر نے ایسا آپریشن نہ کیا ہو گا نہ ایسے آپریشن کا کہیں سنا ہو گا کہ صدیوں پہلے مر جانے والے کسی شخص کو آپریشن کے ذریعے زندگی کی جانب واپس لائے جانے کی کوشش کی گئی ہو۔

آپریشن کامیابی سے پایہ تکمیل تک پہنچ چکا تھا مگر نتیجہ کوئی نہ تھا۔ بے ہوشی توڑنے والا انجکشن لگایا گیا مگر باڈی نے اسے قبول ہی نہ کیا۔ گیس سنگھائی مگر اسے ہوش نہ آنا تھا سو نہ آیا۔ ہر طرح چیک کر کے دیکھ لیا مگر کوئی امید افزا بات سامنے نہ آئی۔ آکسیجن ماسک چڑھایا گیا کہ مصنوعی گیس دے کر دیکھا جائے شاید نظام تنفس چل پڑے۔ مگر ناکامی ہوئی' کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ آخر ایک آخری حل سمجھ میں آیا کہ شاک مشین سے دل کو شاک دیئے جائیں شاید اسی طرح اس کی "ہارٹ بیٹ" اسٹارٹ ہو جائے۔

آخر مشین سیٹ کی گئی' میں نے شاکنگ پیڈ سنبھالا' وولٹیج ایڈجسٹ کیے اور اللہ کو یاد کر کے پیڈ مریاقس

کے ساکت سینے پر رکھ دیا۔۔۔ مگر اس کے وجود میں کوئی تحریک پیدا نہیں ہوئی۔۔۔ دوسری بار۔۔۔ تیسری بار۔۔۔ چوتھی بار کچھ دیر یونہی گزر گئی مگر کوئی تسلی بخش نتیجہ نہ نکلا آخر میں نے پیڈ ہٹا دیا اور ایک طرف سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اور اپنی حماقت پر غور کرنے لگا۔

میں ایک ڈاکٹر تھا۔ جدید سائنس سے تعلق تھا میرا اور کیسی بے تکی فضول اور احمقانہ حرکتیں کر رہا تھا میں۔ صدیوں پرانی ایک ممی کا آپریشن۔۔۔ اسے ہوش میں لانے کی کوششیں۔۔۔ کیا حماقت تھی۔

"شکیل صاحب! پریشان مت۔۔۔" ڈاکٹر عقیل نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کی بات ادھوری ہی رہ گئی' ایک کرشمہ' ایک انہونی ہوئی تھی۔

آپریشن ٹیبل پر پڑی ہوئی مریاقس کی لاش نے ایک جھٹکا لیا تھا اس۔۔۔ اس کے حلق سے ایک قلق انگیز کراہ خارج ہوئی تھی۔ ساکت سینہ آہستہ آہستہ پھولنے پچکنے لگا تھا۔ ٹیبل پر معلق لائٹیں دفعتاً" معدوم ہو گئیں۔ اس کے جبڑے بھی آہستہ آہستہ حرکت کرنے لگے تھے۔ میں تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور تیزی سے اس کے قریب پہنچ گیا۔ نجانے کس نرم جذبے کے زیر تحت میری آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے اور دھڑکنیں اپنی رفتار سے تجاوز کر گئی تھیں۔

آہستہ آہستہ اس کی بھنویں اور خوبصورت پلکیں لرزنے لگیں سینے کا زیرو بم بڑھتا گیا اور روشنیاں معدوم پڑتی گئیں۔ اور پھر حیرت انگیز طور پر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

آنکھیں کھولتے ہی وہ ہم سب کی صورتیں تکنے لگی اور میں نے فوراً" چہرے سے ماسک ہٹا دیا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں شناسائی نہ تھی۔

چند لمحے تک وہ ہماری صورتیں دیکھتی رہی میں چونکہ اس کے زیادہ نزدیک تھا اس لیے وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ اس کے لب ہلے' ایک مترنم جلترنگ سا گنگنایا' اس کی دھیمی سی آواز ابھری۔ اور ہم سب ایک دوسرے کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

وہ جانے کون سی زبان میں بولی تھی کہ ایک لفظ بھی سمجھ میں نہ آسکا تھا۔ البتہ پروفیسر فاضل بصاری اس کے مزید قریب ہوئے اور ٹوٹے پھوٹے سے انداز میں اٹک اٹک کر انہوں نے مریاقس سے چند نامانوس الفاظ کہے تو وہ پروفیسر کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے دھیمی آواز میں ان سے کچھ کہنے لگی۔ اس کے چہرے پر شدید ترین درد و کرب کے تاثرات پھیلے ہوئے تھے۔ پروفیسر صاحب نے کسی بات پر میری جانب اشارہ کیا تو اس نے میری طرف ایسی عقیدت و محبت سے دیکھ کر کچھ کہا کہ میرا دل حلق میں آدھڑکا۔ وہ دوبارہ پروفیسر کی جانب متوجہ ہو گئی۔

میں نے ایک نظر ڈاکٹر عقیل اور عارب کی سمت دیکھا۔ یقیناً" میری طرح وہ دونوں بھی شدید سنسنی کا شکار تھے۔ جیسے انہیں اپنی اپنی بصارت اور سماعت کی کارکردگی پر شبہ ہو۔

مریاقس میں زندگی کی رمق بے دار ہوتے ہی مریاقس کے پیروں کی رنگت نے مجھے چونکا دیا۔

اس کے پیروں کی رنگت تیزی سے تبدیل ہو رہی تھی۔ جیسے کوئی سایہ انہیں ڈھانپ رہا ہو' یا پیروں میں موجود زندگی کی روشنیاں مدھم پڑ رہی ہوں' بجھتی جا رہی ہوں۔

"پروفیسر! یہ۔۔۔ یہ مریاقس کے پاؤں دیکھیں تو۔ اس کی رنگت کیسے تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔" میری فکرمندانہ آواز پر ڈاکٹر عقیل' عارب اور پروفیسر بھی مریاقس کے پیروں کی جانب متوجہ ہو گئے۔

ڈاکٹر عقیل نے جھکتے ہوئے بغور اس کے پیروں کو دیکھا اور متحیرانہ انداز میں بولے۔

"حیرت انگیز۔۔۔ اس کی کھال تو تیزی سے سوکھتی جا رہی ہے!"

پروفیسر ایک بار پھر مریاقس سے کچھ کہنے لگے اور میری رگوں میں گویا بے چینیاں کلبلانے لگیں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے مریاقس کے پیروں کی سیاہ پڑتی رنگت بڑھتے بڑھتے اس کی رانوں تک پہنچ گئی۔ اس کے پاؤں اور پنڈلیوں کی کھال سوکھتے سوکھتے کسی درخت کی جلی ہوئی چھال کی سی صورت اختیار کر گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے پاؤں کی انگلیاں جھڑنا شروع ہو گئیں۔۔۔ بھربھری مٹی کی طرح۔

"پروفیسر! اس کے پاؤں' انگلیاں۔۔۔" شدت جذبات کے باعث میں اپنا جملہ مکمل نہ کر پایا۔

مریاقس کے چہرے پر شدید کرب کے تاثرات چھائے ہوئے تھے۔ اب وہ خاموش تھی۔ اس کی نظریں میرے ہی چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور مجھے اپنے لیے ان میں بڑی عقیدت اور بڑا احترام نظر آرہا تھا۔ پروفیسر بھی بغور اس کے مٹی میں تبدیل ہوتے پیروں کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے جھپٹ کر بے اختیار اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"مریاقس۔۔۔ مریاقس۔۔۔ یہ تمہارا وجود مٹی کیوں ہوا جا رہا ہے۔۔۔ یہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟" اس کے ہونٹوں پر ایک بوجھل اور زخمی سی مسکراہٹ ابھری' آنکھوں میں محبت و احترام کے طوفان ایک ذرا کسمسائے اور پھر اس کے ہونٹوں سے چند آخری الفاظ خارج ہوئے۔ میرے لیے' میرے نام۔۔۔ صرف میرے لیے!

اس کے پاؤں اور پنڈلیاں مٹی کی صورت اختیار کر چکی تھیں اور باقی کا جسم بھی لمحہ بہ لمحہ بکھرتا جا رہا تھا' مٹی ہوا جا رہا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایسی صورت حال میں مجھے اس کے لیے کیا کرنا چاہیے؟

مریاقس کی آنکھیں چڑھتی جا رہی تھیں۔ میں نے اس کے رخسار تھپتھپائے۔

"مریاقس۔۔۔ مریاقس! آنکھیں کھولو۔" میری آواز پر ایک ذرا اس نے میری جانب دیکھا' ہونٹوں پر دل نواز سی مسکراہٹ سمیٹی اور اس کی گردن میرے ہاتھوں میں ہی ڈھلک گئی اور پھر چند لمحوں بعد میرے ہاتھوں میں اس کے خوبصورت چہرے کی بجائے ایک مشت خاک بچی تھی۔

یک بہ یک روشنیاں تیز ہو گئیں مگر مجھے یوں لگا جیسے میرے اطراف میں اندھیرے پھیل گئے ہوں۔۔۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے۔۔۔! پروفیسر صاحب بتانے لگے کہ ان کی اس سے کیا گفتگو ہوئی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے پروفیسر کہیں بہت دور سے بول رہے ہوں۔

"ہوش میں آتے ہی اس نے دریافت کیا تھا کہ میں کہاں ہوں' آپ لوگ کون ہیں اور یہ کون سے فرعون کا دور حکومت ہے؟ میں بتایا کہ یہ کون سا دور حکومت ہے اور وہ کہاں ہے اور یہ کہ اسے ساڑھے چار ہزار سال بعد زیر زمین دفن اہرام سے نکالا گیا ہے۔ اس نے کہا میں مسلسل عذاب میں مبتلا تھی' میرا محسن کون ہے جس نے مجھے اس عذاب سے نجات دلائی۔ میں نے تمہاری جانب اشارہ کیا تو وہ عقیدت بھرے انداز میں تمہارا شکریہ ادا کرنے لگی پھر کہنے لگی کہ مجھے تازہ ہوا کی ضرورت تھی جو مجھے میسر آرہی ہے اور اسی میں میری نجات ہے۔ میں عالم ارواح میں چلی جاؤں گی اور خاک کا پتلا خاک میں مل جائے گا اور جب تم نے اس کا چہرہ تھام کر اسے مخاطب کیا تو وہ بولی' میرے محسن! تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے مجھے اس خاک کی قید سے آزادی دلائی اور میں تمہاری اس بے قراری کو خوب سمجھ رہی ہوں' تمہاری محبت کا اندازہ ہے مجھے۔ میری زندگی صدیوں پہلے پوری ہو چکی تھی مگر آزادی اب نصیب ہو رہی ہے' میں جا رہی ہوں میں جا رہی ہوں۔" پروفیسر صاحب خاموش ہو گئے آپریشن روم میں گہری بوجھل سوگوار خاموشی پھیل گئی۔

فطرت میں پڑی گرہیں کھل چکی تھیں' رکاوٹیں سرک گئی تھیں اور ان رکاوٹوں کے ہٹتے ہی مریاقس کا وجود فطرت کی گرفت میں آکر اپنی پہچان کھو بیٹھا تھا۔ اپنے فطری انجام کو پہنچ چکا تھا۔

میں نہایت نرمی سے آپریشن ٹیبل پر بکھری ہوئی خاک کو سہلا رہا تھا یوں' جیسے اس خاک میں میری کوئی عزیز ترین شے کھو گئی ہو۔

بعد صدیوں کے جو آئی تھی نظر کے روبرو
دیکھتے ہی دیکھتے وہ لاش مٹی ہو گئی

☆ ☆

شہزادی عباس

بادِ محبت

ناولٹ

"کیا تو پاکستان میں رہائش پذیر ہے؟"
"نہیں۔"
"چین پٹھانوں کا ملک ہے؟"
"ہاں۔"
"پاکستان پر حبشی حکومت قائم ہے؟"
"جی ہاں۔"
"کیا گھڑی اس وقت ساڑھے تیرہ بجا رہی ہے؟"
"نہیں۔"
"تیری شکل بینگن کی سی ہے؟"
"ہاں۔"

"رات ڈھلتے ہی تیرے اندر شیطانی آتما حلول کر جاتی ہے؟"
"ہاں۔"
"اماوس کی ہر رات تو ڈریکولا کا روپ دھار لیتی ہے؟"
"ہاں۔"
"تیرے جیسی ذہین و فطین مخلوق کو انسان کہتے ہیں؟"
"نہیں۔"
"کوڑھ کے مرض نے تجھے آدم بے زار بنا دیا ہے؟"
"اف۔" روانی سے جواب دیتے دیتے وہ پہلی بار رکی۔
"اے لڑکی! ہاں، نہیں کے علاوہ جواب دینے کی اجازت نہیں ہے۔"
"کوڑھ ہو تجھے اور ایسی بدفال منہ سے نکالنے پر زبان جلے تیری۔" جلا بھنا جواب آیا۔
"دیکھ تو نے جذباتی ہو کے سارا گیم خراب کر دیا۔" ہنسی ضبط کر کے آفاق نے اسے وہ "اصول و ضوابط" یاد دلانے کی سعی کی جو وہ گیم کے شروع میں توتے کی طرح اسے پڑھا چکا تھا مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ ماہی کے ضبط کا پیمانہ چھلک پڑا تھا۔

وہ دونوں فرصت سے آ کر لان میں سرما کی نرم گرم دھوپ سینکنے بیٹھے تھے جب آفاق نے اسے "ٹیس نو" گیم کھیلنے کا مشورہ دیا جس میں ہر سوال کا الٹ جواب دینا رول تھا۔ ماہی دوڑ کر اپنے رجسٹر سے صفحہ پھاڑ لائی۔ بیچوں بیچ سیدھا خط کھینچ کر صفحہ دو حصوں میں منقسم کر کے ایک طرح سے مارکس شیٹ ترتیب دی گئی۔

گیم کی شروعات ماہی نے کی اور سوچ سوچ کر جنرل نالج کے سوالات آفاق سے پوچھے اور ساتھ ساتھ مارکنگ بھی کرتی گئی مگر جب اس کی باری آئی تو آفاق نے پہلا سوال "قابل قبول" کرنے کے بعد اس کی ذاتیات پر سوالنامہ تشکیل دے ڈالا تھا۔ جز بز تو وہ بہت ہوئی مگر اسے یہ مقابلہ جیتنا ہی تھا چنانچہ برا منائے بغیر بلا تردد روانی سے جوابات دیتی گئی۔ اور وہ جانتی تھی کہ آفاق کی طرح اس نے جواب دینے میں ایک بھی غلطی نہیں کی۔ مگر انتہا کی بدتمیزی پر تلملا کے اسے بولنا ہی پڑا۔

"بھاڑ میں جائے تو اور تیرا یہ گھسا پٹا گیم۔" ماہی نے کین کی کرسی پر ماری گئی چوکڑی کو سمیٹا اور جانے کے

لیے ٹانگیں زمین پر رکھیں۔

"کہاں جارہی ہے؟ اپنے مارکس تو دیکھتی جا۔" آفاق نے اسے منہ بنا کے واک آؤٹ کا ارادہ کرتے دیکھ کر کہا۔ اس نے آفاق کے ہاتھ میں پکڑا صفحہ کھینچا۔

"صحیح جوابات تین اور غلط جوابات چھ عدد حاصل کل، دس میں سے تین۔"

"کیا؟؟" وہ چیخی۔

"میں نے ہر جواب صحیح دیا ہے۔ چیٹنگ مت کر۔"

"کہاں صحیح دیے ہیں جواب؟ تیری شکل بینگن جیسی ہی ہے، ہر اماوس کی رات تجھ میں شیطانی آتما حلول کرتی ہے اور تو ڈریکولا بن کے راہ گیروں کا خون بھی چوستی ہے۔ تو ان باتوں کے جوابات الٹ یعنی کے "نہیں" میں دینے تھے۔" آفاق نے دانت نکوسے جلتی پر تیل چھڑکا۔

"اور... اور پچھلے دو برس سے تو کوڑھ میں مبتلا ہے، اس کا جواب بھی..." آنکھیں بند کیے سر ہلا ہلا کر اپنی ہی بات پر محظوظ ہوتے آفاق کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے تھے کیوں کہ ماہی دوڑ کر مالی بابا کے ہاتھ سے پانی کا پائپ پکڑ کے اس کا رخ اس کی جانب کر چکی تھی۔

"رک جا... ابھی مزا چکھاتی ہوں۔"

"او... اوماہی... ڈنگر۔" دونوں ہاتھ سامنے کیے پانی سے بچنے کے لیے وہ کرسی سے اٹھ کر بھاگا مگر پانی کی موٹی دھار اسے شرابور کر چکی تھی۔

"نامنجار... جنگلی... اب پتا چلا؟ آئندہ کوڑھ کے مریضوں سے پنگا مت لینا۔" کھی کھی کرتی ماہی نے گزشتہ آدھے گھنٹے سے اپنے ساتھ ہوئی ناانصافی کو دو منٹ میں چکتا کر ڈالا تھا۔

آفاق نے جست لگائی اور اگلے ہی پل پائپ اس کے ہاتھ میں تھا۔

"لے بچو... اب بچ کر دکھا۔" اب کی بار دوڑ لگانے کی باری ماہی کی تھی مگر چھوٹے سے لان میں جان بچانا محال تھا۔

سردی میں یخ پانی سے بھیگے کپکپاتے ہوئے وہ دونوں آگے پیچھے دوڑتے ہوئے قہقہے لگا رہے تھے۔ دو نفوس پر مبنی یہ محفل کشت زعفران بن چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

آسیہ اور زینت کی دوستی بہت پرانی تھی۔ زمانہ طالب علمی سے دونوں ساتھ تھیں، اسکول و کالج ساتھ آنا جانا اور ایک ہی گلی میں گھر ہونے کی بدولت دن میں درجنوں چکر لگانا معمول کی بات تھی۔ اس پختہ دوستی میں دوری اس وقت در آئی جب آسیہ بیاہ کر جہانگیر ہمدانی کے ہمراہ کراچی سدھار گئیں۔ فون پر رابطہ تو رہتا مگر وہ دن میں متعدد بار ملاقات والی بات نہ تھی۔ پھر جب زینت اقبال مسز حمزہ ہوئیں تو گردش ایام نے انہیں بھی مصروفیات میں الجھا کر رکھ دیا۔

سالوں بعد جہانگیر ہمدانی کی پوسٹنگ لاہور ہوئی تو ایک عرصے کی بچھڑی ہوئی سہیلیاں اشکبار آنکھیں لیے یوں تڑپ کر ملیں کہ دیکھنے والوں کے بھی دل پسیج گئے۔ فاصلوں نے دلوں میں دوریاں پیدا نہ کی تھیں۔ زینت نے آسیہ کو اپنے ساتھ رکھنے کی ضد کی مگر آسیہ انکار اس لیے کیے گئیں کہ رکھ رکھاؤ والے جہانگیر ہمدانی کو یہ گوارا نہ ہوتا مگر پھر قسمت کی کرنی ایسی ہوئی کہ زینت کے بالکل ساتھ والا خوبصورت سا گھر برائے فروخت ٹھہرا کیونکہ مکین مسز رخشندہ گھر بیچ کر اپنے شوہر کے پاس مسقط روانہ ہو رہی تھیں۔ صاحب اولاد نہ تھیں کہ کوئی وارث ہوتا چنانچہ معاملات طے کرنے کے بعد گھر خرید لیا گیا۔

جدید فرنیچر سے آراستہ کر کے نئے سرے سے رنگ و روغن کرنے، لان کی کلٹ چھانٹ کر کے نئے پودے لگانے تک آسیہ کو مجبوراً" زینت کے گھر ہی رہنا پڑا۔ آسیہ کے تین بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا فہد ایم بی بی ایس کے پہلے سال میں تھا، منجھلا آفاق ایف ایس سی کرنے کے بعد اب بی ایس سی کا ارادہ رکھتا تھا۔ جبکہ چھوٹا بیٹا جنید ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔

اس کے برعکس زینت کی اکلوتی اولاد ماہین حمزہ میٹرک کی اسٹوڈنٹ تھی۔ نٹ کھٹ اور شریر تھی کچھ یوں بھی اس عمر میں لاابالی پن اور لاپرواہی کا عنصر کچھ زیادہ ہی نمایاں ہوتا ہے مگر ماہین میں ان صفات کے ساتھ ساتھ عجیب و غریب عادات بھی بدرجہ اتم موجود تھیں۔ پل میں تولہ پل میں ماشہ، کوئی دل کو بھاتا تو خوب ہنسی ٹھٹھے لگاتی، موڈ نہ ہوتا تو کوئی لاکھ اچھا سہی اس کا مزاج ساتویں آسمان کی سیریں کرتا رہتا۔ موت نام کو نہ تھی، کسی قدر منہ پھٹ بھی واقع ہوئی تھی۔ مگر حسن میں یکتا اور زینت کا پرتو تھی۔

پہلی بار جب آسیہ زینت سے ملنے آئیں تب آفاق ہی ان کے ہمراہ تھا۔ دو سہیلیوں کی جاں نثار باتوں اور ماضی میں اک دوجے کی فراموشی پر شکوہ شکایتوں کے انبار سے اکتا کر وہ ریموٹ ہاتھ میں تھامے چینل سرچنگ میں محو تھا جب چہکتی ہوئی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

"السلام علیکم آسیہ آنٹی... تو آخر آپ آہی گئیں۔ جنہیں میری مما صبح و شام بلاناغہ اس طرح یاد کرتی ہیں گویا فرض ہو۔" وہ بے تکلفی سے آسیہ اور زینت کے درمیان دھنس کر بیٹھ گئی۔

"میں بھی تمہاری مما کو کبھی نہیں بھولی... زینت ہماری پری تو بہت پیاری ہے بھئی۔" آسیہ نے ہنستے ہوئے اسے ساتھ لگا کر پیار کیا تو اس تعریف پر وہ بے ساختہ خوش ہو گئی۔ وہ غالباً" اسکول سے ہی آرہی تھی۔ سفید یونیفارم میں اونچی سی پونی ٹیل بنائے، دھوپ میں آنے کی وجہ سے سرخ پڑتے گالوں اور خوبصورت تراشیدہ ابھرے ہوئے گلابی لبوں پر مسکراہٹ لیے وہ اسے بہت اچھی لگی۔

"بیٹا یہ آپ کی آسیہ آنٹی کے بیٹے ہیں آفاق... آپ انہیں کمپنی دیں۔" زینت تعارف کروا کر پھر سے باتوں میں مشغول ہو گئیں۔ جبکہ وہ بیگ کندھے سے اتار کر ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس کے سامنے صوفے پر ٹانگ جما کے بیٹھ گئی۔ عموماً" لڑکیوں والی مخصوص شرم و جھجک اس میں ناپید تھی۔ اس کے اعتماد نے آفاق کو متاثر کیا۔

"او... " ہونٹ گول کیے بھنویں اٹھائے وہ سر سے پاؤں تک اس کا تفصیلی جائزہ لینے لگی۔

"تو آپ ہیں آسیہ آنٹی کے فرزند ارجمند۔" یوں کہا گیا گویا اسے اطلاع دی جارہی ہو۔

"جی میں بھی ہوں۔"

"بھی مطلب؟" اس کا چہرہ جیسے سوالیہ نشان بن گیا۔

"مطلب کہ میرے علاوہ دو اور بھی ہیں اور میں دوسرے نمبر پر آتا ہوں۔"

"اچھا تو تم کرتے کیا ہو؟" اگلا سوال کچھ اس طرح پوچھا گیا گویا وہ اس کے پاس نوکری کے لیے آیا ہے۔

"بی ایس سی میں ایڈمیشن لینے والا ہوں۔" حیرت چھپا کے اس نے جواب دیا۔

"عجیب لڑکی ہے۔ تمیز لحاظ کس چڑیا کا نام ہے اسے پتا ہی نہیں۔" وہ منہ میں بڑبڑایا۔

"میری شان میں تو کچھ نہیں کہہ رہے تم؟"

"جی نہیں۔" آپ سے تم پر آنے کی اس برق رفتاری نے حیرانی کے ساتھ ساتھ اسے غصہ بھی دلا دیا۔

"اپنی وے۔۔۔ یہ جو تم نے چنگھاڑتا ہوا پرفیوم لگا رکھا ہے یہ قطعی اچھا نہیں ہے' بلکہ پاس بیٹھنے والے کے دماغ پر بھی اثر کر سکتا ہے۔" ناک چڑھا کے بے نیازی سے کہا اور بیگ اٹھا کے یہ جا وہ جا۔

آفاق نے بے ساختہ اپنے کندھے کے پاس ناک لے جا کر سونگھا۔ گویا "چنگھاڑتے" پرفیوم کی کھوج لگانی چاہی اور پھر ایسی بے سروپا بات پر اپنی بے وقوفی پہ کھسیا کے سر جھٹک دیا۔

☼ ☼ ☼

شروع میں ہوئی بدمزگی وقت کے ساتھ ساتھ زائل ہوتی رہی۔۔۔ طائر وقت اپنی اڑان بھرتا رہا اور آفاق اور ماہی اکثر و بیشتر اکٹھے پائے جانے لگے کیونکہ نیا شہر ہونے کے باعث آفاق کے اتنے دوست نہ تھے اور ماہی بھی ہر کسی سے گھلنے ملنے کی قائل نہ تھی۔ چنانچہ چار سال گزرنے پر دونوں کی دوستی بہت پختہ ہو چکی تھی۔ آفاق ایم ایس سی کے فائنل ایئر میں تھا جبکہ فہد ایم بی بی ایس کے آخری سال میں تھے اور اس کے بعد ہاؤس جاب کا ارادہ رکھتے تھے۔

چار سال گزرنے پر بھی ماہین میں بڑا پن نہ آیا تھا۔ وہی بچکانہ سی باتیں' وہی نٹ کھٹ شرارتیں۔۔۔ آفاق کے ساتھ گھومنے پھرنے کے پروگرام بنتے" زندگی بھرپور طریقے سے گزر رہی تھی۔ راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔

کمرے میں کھڑکی کے آگے پڑے پردوں میں سے روشنی چھن چھن کر کمرے کو روشن کر رہی تھی۔ الارم نے بڑی دیر بول بول کے اب چپ سادھ لی تھی۔ پھر تکیے کے نیچے دھرا موبائل فون چیخ اٹھا۔

"اف۔۔۔ کیا مصیبت ہے۔" زبردستی آنکھیں کھول کر اس نے موبائل اٹھایا۔

"آفاق کالنگ۔۔۔ سونے بھی نہیں دے رہا بے ہودہ۔" اس نے مزید دو تین شاندار گالیاں دے کر فون کا رنگر آف کر کے وائبریٹر آن کیا اور موبائل صوفے پر اچھال کر ایک بار پھر بستر پر ڈھیر ہو گئی۔

صوفے پر پڑے سیل فون کی اسکرین وقفہ وقفہ سے جلتی بجھتی رہی مگر بے خبر ماہی ایک بار پھر نیند کی گہری وادی میں اتر چکی تھی۔

"ماہی۔۔۔" کوئی اتنی زور سے اس کے کان کے پاس دھاڑا تھا کہ وہ ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور اپنے کان پر ہاتھ رکھے ہونے والی سنسناہٹ کو دور کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

"اففف۔۔۔" ایک دم الرٹ ہوتی ماہی اس کی صورت دیکھ کر پھر بستر پر گرنے لگی تو آفاق نے اسے بازو سے کھینچ کر اٹھایا۔

"تجھے ذرا بھی شرم یا وعدے کا پاس لحاظ ہے کہ نہیں؟؟ مروت کبھی تجھے چھو کر بھی گزری ہے؟؟ میں گھنٹے بھر سے فون کر رہا ہوں' کیا کہا تھا تو نے؟ میں پورے گیارہ بجے تیار رہوں گی اور اب ساڑھے بارہ بج رہے ہیں۔" بے تکان بولتے ہوئے آفاق نے اسے پھر جھنجھوڑا۔

"میں تیرا خون پی جاؤں گا سمجھی؟ کمٹمنٹ بھی کسی چڑیا کا نام ہے۔ انتظار کر کر کے میرا خون کھول اٹھا ہے۔" اس نے کھا جانے والی نظریں جماہیوں پر جماہیاں روکتی بے زار سی شکل بنائے ماہی پر ڈالیں۔

"اچھا نا۔۔۔ بہت نیند آ رہی ہے فوقی' بس پانچ منٹ سو لینے دے۔" ملتجیانہ انداز میں کہہ کر اس نے پھر تکیے پر سر رکھنا چاہا۔ لیکن اب کی بار آفاق نے اسے بازو سے کھینچ کر بٹھایا نہیں تھا بلکہ بیڈ سے ہی کھڑا کر دیا تھا۔

"اگر جان پیاری ہے تو پانچ منٹ میں فریش ہو کے نیچے آ جا۔" اس نے اسے واش روم کی طرف دھکیلا۔ چار و ناچار وہ منہ بسورتی اندر گھس گئی۔

آدھے گھنٹے بعد وہ فریش ہو کے کپڑے تبدیل کر کے نیچے آئی تو وہ لاؤنج میں زینت کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا اور وہ اس کے کسی چٹکلے پر زور زور سے ہنس رہی تھیں۔۔۔ وہ منہ بناتی صوفے پر ٹک گئی۔

زینت نے اپنی اکلوتی بیٹی کے دھلے دھلائے چہرے پر نظر ڈالی۔ گلابی صحت مند گالوں والے چہرے پر لانبی پلکوں میں پانی کے قطرے ابھی تک موتیوں کی طرح سجے تھے۔ سیاہ قمیص اور ہلکے فیروزی دوپٹہ' شلوار میں وہ بے حد دلکش لگ رہی تھی۔ نظروں ہی نظروں میں انہوں نے ماہی کی بلائیں لے ڈالیں۔ پلیٹ میں رکھے آخری چکن رول کو کھانے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"چل شپو نکی! یہ بو تھی تو چلتے چلتے بھی بنا لیتا۔"

"میں نے تو ناشتا بھی نہیں کیا ابھی اور خود انڈے نمکو' چکن رول' بسکٹ حلق تک ٹھونسنے کے بعد اب مجھے چائے کا ایک کپ تک پینے نہیں دے گا کیا؟" وہ چلائی۔

"نہ بیٹا۔۔۔ میں تجھے باہر ہی ناشتا کروا دوں گا۔" وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

"بہت ہی کوئی جنگلی' بدتمیز اور۔۔۔" ماہی اس کی شان میں مزید گستاخی کرتی مگر زینت نے اسے بری طرح ڈپٹا۔

"یہ بات کرنے کا کیا انداز ہے ماہی؟ آپ سے بڑے ہیں نا آفاق؟ تو یہ "تو تڑاک" کہاں سے سیکھ لی آپ نے؟؟" بے حد نفیس انداز اور شستہ لب و لہجے میں بات کرنے والی زینت پچھلے چار سالوں سے اپنی بیٹی کے اس بدتمیزانہ لہجے پر حیران تھیں۔

"اوہو مما آپ کو تو پتا ہے' اس کی شکل دیکھ کے میں سارے القاب و آداب فراموش کر بیٹھتی ہوں' میں کیا کروں' ایسے چیزوں کے سامنے میزو جھاڑنے جیسا قبیح فعل مجھ سے تو نہیں ہوتا۔" زینت تاسف سے سر ہلانے لگیں۔

"ہاں تو تجھ سے کون "آپ جناب" کر رہا ہے؟ جیسا بندہ ویسی بات' ہونہہ۔" آفاق کی جانب سے بھی ٹکا تو ڑ جواب آیا۔ اس نوک جھوک میں دونوں گیٹ تک پہنچ گئے تو ماہی کو یاد آیا۔

"رک یار۔۔۔ مما کو تو بتایا ہی نہیں۔ مما آفاق کے ساتھ شاپنگ پر جا رہی ہوں۔" وہ وہیں سے چلائی۔

"میں آنٹی کو بتا چکا ہوں سست عورت۔" وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔

آفاق کے بے حد قریبی دوست کی سالگرہ تھی۔

بہت سوچنے کے بعد بھی اسے گفٹ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ ماہی نے بہت سے نادر مشورے بھی دیے پر وہ فیصلہ نہ کرسکا۔ تو ماہین خود اس کے ساتھ چلنے کا کہہ بیٹھی مگر توقع کے عین مطابق وہ وقت پر دستیاب نہ تھی۔ شاپنگ مال میں گھوم گھوم کے بھی کچھ سمجھ نہ آیا۔ جو ماہین پسند کرتی وہ آفاق مسترد کردیتا اور جو آفاق پسند کرتا وہ ماہی ناک چڑھا کر ریجیکٹ کردیتی آخر کار بے حد قیمتی ریسٹ واچ پر اتفاق ہوا۔

گفٹ خرید کر اس نے ماہی کی ضد پر پزا کھلایا اور آئس کریم کی ڈیمانڈ پر کان لپیٹے گاڑی میں آبیٹھا۔

"تو یقیناً" اس دن پیدا ہوا ہوگا جب کنجوسوں کی تاج پوشی ہورہی تھی۔" وہ بپھری۔

"کوئی انگلی پکڑائے تو اس کے دامن سے نہیں لپٹ جاتے فقیروں کی طرح۔" ماہین کا منہ پھول گیا۔ ماہی کو گیٹ پر اتار کر وہ بھی ساتھ اندر آگیا اور اسے اپنے دوست کی سالگرہ پر ساتھ لے کر جانے کی اجازت لے کر ہی ٹلا اور اسے وقت پر تیار ہونے کی تاکید کرتا چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

"شپو نکی۔۔۔ ارے او شپو نکی۔" سیڑھیوں کے پاس کھڑا وہ چلا رہا تھا۔

"آرہی ہوں۔ آرہی ہوں چلاؤ تو مت۔" شیفون کا دوپٹہ سنبھالتی وہ کمرے سے نکلی۔

بے بی پنک کلر کے خوبصورت گھیردار فراک اور اور چوڑی دار پاجامے پر ہم رنگ دوپٹہ اوڑھے ابھرے ہوئے دلکش ساخت والے لبوں پر گلابی لپ اسٹک لگائے وہ تیار تھی۔ گالوں پر قدرتی لالی بکھری ہوئی تھی۔۔۔ اتنے ہلکے سے میک اپ میں بھی وہ دل میں کھب رہی تھی۔۔۔ معمول کے مطابق سلکی براؤن بالوں کی پونی ٹیل بنائے وہ حسن و سادگی کا نمونہ لگ رہی تھی پھر بھی اس کی تعریف کرنا آفاق کی شان کے خلاف تھا۔

"ایسے بہن جی بن کے جائے گی میرے ساتھ؟"

"میں ایسے بہن جی ہی ٹھیک ہوں مگر تو یہ ٹوپیں پہن کے خود کو "ٹام کروز" کا جڑواں بھائی سمجھ بیٹھا ہے شاید۔" بے نیازی سے جوابی کارروائی کی گئی۔

"اچھا مما ہم جلدی آجائیں گے۔" زینت کے تنبیہہ کرنے سے قبل ہی ماہین نے کہا اور دونوں باہر آگئے۔

وہ کافی دیر سے پارٹی میں پہنچے تھے۔ بنگلہ بہت شاندار تھا اور وسیع و عریض لان اس سے بھی بڑھ کر حسین۔۔۔ نت نئے پودوں پھولوں کے درمیان ہی پارٹی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ رنگ و بو کا سیلاب سا تھا مگر صرف نوجوان نسل پر مبنی۔۔۔ دوست احباب ہی اکٹھے ہوئے تھے۔ الٹرا ماڈرن لڑکیاں اور سریلے نسوانی قہقہے ماحول میں رنگین پھلجھڑیاں سی چھوڑ رہے تھے۔

"اے شپو نکی! دوستوں میں میری بہت عزت ہے اس لیے شرافت کا مظاہرہ ہونا چاہیے۔" دوستوں کی طرف بڑھتے ہوئے آفاق نے سرگوشی میں تنبیہہ کی جسے ماہی نے خاطر میں نہ لاتے ہوئے ناک پر سے مکھی کی طرح اڑا لیا۔

آفاق پانچ لڑکوں کے گروپ میں۔ راجہ اندر بنے بیٹھے خوبرو سے شخص کی طرف بڑھا۔

"ہیپی برتھ ڈے جگر۔" گلے لگتے ہوئے اس نے وش کیا۔

"تھینکس یار۔۔۔ مگر تم آج بھی ہمیشہ کی طرح لیٹ ہو۔" حارث نے شکوہ کیا۔

"ارے میں تو جلدی آجاتا مگر یہ ماہی۔۔۔" اس نے مڑ کر دیکھا ماہی تھوڑا فاصلے پر رخ موڑے اس طرف دیکھ رہی تھی جہاں سے اشتہا انگیز خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔

"ماہی جی! ادھر آجائیں پلیز۔" بڑے ادب سے اس نے آواز دی۔

"اف! ایک تو تو ہر وقت سوکنوں کی طرح مجھ پر مسلط رہتا ہے۔" کچھ دیر قبل پڑھائی گئی "ادب کی پٹی" ماہی بالکل فراموش کرچکی تھی۔ بولتے بولتے وہ اس کے برابر آئی تو حارث نے دلچسپی سے اس کے انداز

تخاطب اور گلابی چہرے کو دیکھا۔

"مس از ماہین حمزہ اور ماہی یہ ہے "برتھ ڈے بوائے" حارث شیرازی۔" آفاق نے تعارف کروایا۔

"ہیلو۔" حارث نے ہاتھ آگے بڑھایا جسے ۔۔۔ دیکھ کے بالکل ڈرامائی انداز میں ماہی نے دونوں بازو سینے پر باندھ کر شریر مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"وعلیکم السلام حارث۔۔۔ مینی مینی ہیپی ریٹرنز آف دی ڈے۔"

"تھینکس اے لاٹ میم۔" اس کے انداز پر برا منائے بغیر حارث کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

آفاق نے وقتاً" فوقتاً" چھ لڑکوں کے گروپ سے تعارف کروایا جنہوں نے نہایت شرافت کے ساتھ اسے "السلام علیکم" کہہ کر اپنی عزت بچائی تھی۔ کیک کاٹا گیا تحفوں اور مختلف ڈشز کے تبادلوں کے بعد آفاق اپنے گروپ کے ساتھ ہی بیٹھا تھا ماہی بھی وہیں ٹک گئی۔ وہ حیدر کے ساتھ باتوں میں محو تھا جب طرح طرح کے منہ بناتی ماہی نے اس کی آستین کھینچ کے اپنی جانب متوجہ کیا۔

"پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں فوقی بد تمیز! اس لیے ساتھ لائے تھے مجھے۔" اس نے غصیلی سرگوشی کی۔

"صبر اور حوصلے سے کام لے شپو نکی! ابھی "روٹی" کھل جاتی ہے۔" مسکراہٹ دبا کے اس نے تسلی دی۔ حارث سمیت باقی گروپ نے ان دونوں کو کھسر پھسر کرکے قہقہے لگاتے دیکھا۔

"کس بات پر ہنسا جارہا ہے بھئی۔۔۔ بتا دیں تو کچھ ہم بھی ہنس لیں۔" حارث نے خوش اخلاقی سے کہا۔

"نہیں نہیں انسانوں کے سننے کی بات نہیں ہے۔" ماہی کے پر مزاح انداز میں کہنے پر سب ہنس پڑے۔ اس سے پہلے کہ حارث کچھ اور کہتا ماہی نے آفاق کو بازو سے پکڑ کے اٹھایا کیونکہ کھانا سائیڈ ٹیبلز پر لگا دیا گیا تھا۔ اس نے چکن شاشلک اپنے ساتھ ساتھ آفاق کی پلیٹ میں بھی ڈالی۔

"سن۔۔۔ تیرا وہ فرنگی دوست بڑی دیر سے مجھے تاڑ رہا ہے یہ نہ ہو کہ میں کسٹرڈ سے بھری ٹرے اس کے سر پر الٹ دوں۔" آفاق نے مڑ کر دیکھا' کچھ فاصلے پر بیٹھا حارث واقعی اسی طرف دیکھ رہا تھا۔

حارث کے سرخ و سپید چہرے اور غیر ملکی شباہت اور شاہانہ مزاج پر فرنگی کا لقب سن کر اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"وہ تجھے نہیں تیرے سامنے کھڑی سارہ یزدانی کو دیکھ رہا ہے خوش فہم عورت۔" کہتے ہوئے آفاق نے اس کی پونی کھینچی جو اپنی پلیٹ صاف کرنے میں بری طرح منہمک ہوچکی تھی۔

"یا اللہ رحم کر میرے مالک۔۔۔ اٹھالے اس وحشی کو دنیا سے۔" پلیٹ پٹخ کر اس نے اپنی خراب ہوئی پونی کو ٹھیک کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی تو بینڈ کھینچ کر پونی کھول دی۔ سلکی بال شانوں پر بکھر آئے جنہیں ہاتھوں سے سنوارتی وہ آفاق کے ساتھ سٹنگ ایریا کی طرف آئی۔

"اچھا حارث ہم چلتے ہیں کافی ٹائم ہوگیا اور بے حد معذرت دوستو کہ آج میں تم لوگوں کو ٹائم نہ دے سکا کیونکہ یہ آدم خور بھوتنی میرے ساتھ تھی۔" سب نے مسکرا کر بے نیازی سے ادھر ادھر نظریں دوڑاتیں ماہی کو دیکھا۔ سب سے باری باری ہاتھ ملا کر جب وہ حارث سے ملانے لگا تو ماہی اس کے کان پر جھکی۔

"یہ فرنگی اتنا ہونق کیوں لگ رہا ہے فوقی؟؟" شرارت بھری سرگوشی پر ہاتھ ملاتے ملاتے آفاق کا قہقہہ چھوٹ گیا۔ دونوں یونہی ہنستے ہوئے چھیڑ چھاڑ کرتے واپس آگئے۔۔۔ ایک بہت اچھا دن بیت گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

زینت اور آسیہ نے سالوں ایک دوسرے سے دوری کی کسریوں پوری کی کہ دن میں تو درجنوں بار ملتی ہی تھیں مگر ساتھ ہی یہ روایت بھی ڈالی کہ ہر ویک اینڈ ناشتا یا لنچ اکٹھے ہوتا۔۔۔ یا تو زینت اہتمام کرلیتیں یا کبھی آسیہ اصرار کرکے انہیں اپنے ہاں مدعو کرلیتیں۔۔۔ بے حد خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا جاتا اور

www.Paksociety.com

یوں ایک بھرپور ویک اینڈ اختتام پذیر ہوتا۔ مزید آسانی کے لیے دونوں گھروں کے لان کے درمیان والی دیوار میں دروازہ نکال لیا گیا۔ تاکہ آمدورفت میں آسانی رہے۔

اس سنڈے سب آسیہ کی طرف مدعو تھے۔ بلایا تو ناشتے کے وقت تھا مگر زینت کی لاڈلی صاحبزادی کی نیند پوری ہوتے ہوتے دوپہر ہو چکی تھی۔

ٹی وی لاؤنج میں جہانگیر اور حمزہ کرنٹ افیئر پروگرام دیکھتے ہوئے بین الاقوامی سیاست پر بحث کر رہے تھے فہد بھی انہیں جوائن کر چکا تھا۔ جبکہ زینت اور آسیہ سر جوڑے مسز دلاور کی صاحبزادی کی شادی خانہ آبادی پر جانے کی منصوبہ بندی کر رہی تھیں۔ آسیہ دقتاً "فوقتاً" اٹھ کر کچن کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ خانساماں کو بھی ہدایات کرتی جاتیں۔

"ارے بھئی ہماری چڑیا نہیں دکھ رہی۔" بحث سے فراغت پاتے ہی حمزہ کو بیٹی کی یاد ستانے لگی۔

"ابھی پھر سے جگا کر آئی ہوں اگر ہدایت پر عمل کر چکی ہوئیں تو فریش ہو کر آ رہی ہوں گی۔ آپ کی صاحبزادی۔" زینت کو ماہی کے دن چڑھے تک سونے سے بہت الجھن ہوتی تھی۔ مگر ماہی تو گھوڑے گدھے، خچر سبھی کچھ بیچ کر گہری نیند سوتی تھی۔

"باادب باملاحظہ ہوشیار ـــ ملکہ پاکستان جناب ماہین حمزہ عرف شپو نکی پدھار رہی ہیں۔" سیڑھیوں سے اترتے آفاق نے اندر داخل ہوتی ماہین کو سب سے پہلے دیکھا تھا اور تان لگا کر خالص درباری انداز میں حاضرین کو اس کی آمد کے متعلق آگاہ کیا۔ جہانگیر اور حمزہ سمیت سب مسکرا اٹھے۔

"السلام علیکم آسیہ آنٹی، جہانگیر انکل، فہد بھائی اور مما پاپا۔" اس نے ایک سلام میں فرداً "فرداً" سب پر سلامتی بھیج دی۔

"ارے لڑکی تمہیں میں دکھائی نہیں دیتا جس نے تمہاری شان میں اس قدر پرجوش استقبالیہ کلمات پیش کیے ہیں؟" آفاق نے خفگی سے کہا۔

"تمہارے اس نامکمل استقبالیہ انداز سے ہم خوش نہیں ہوئے۔ آخر میں بھونپو تو بجاتے۔" ماہین نے منہ چڑھا کر اسے چڑایا۔

"تیرے بجانے سے قبل ہی آپ کا بھونپو بج چکا تھا چنانچہ میں نے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی عالی جاہ۔" آفاق کب حساب رکھنے والوں میں سے تھا۔

"اچھا بس بس۔ اب محاذ نہ کھول لینا تم دونوں۔" زینت نے ہنستے ہوئے دونوں کو چپ کروانے کے لیے دخل اندازی کی۔

"آ جائیں سب کھانا لگ چکا ہے۔" آسیہ نے آ کر اطلاع دی تو سب ڈائننگ ٹیبل پر پہنچ گئے۔

"آہا۔ گولا کباب، چپلی کباب، نہاری اور ٹرائفل، میری فیورٹ ڈشز۔"

"حوصلہ میری بچی حوصلہ۔ ندیدے پن میں تو تو نے سب کو مات کر دیا ہے، تجھے چپلی کباب نہیں چپل پڑنے چاہئیں۔" نہاری سے بھرپور انصاف کا آغاز کرتے آفاق نے پھر اسے سلگایا۔

"جہانگیر انکل دیکھیں اسے۔" وہ ٹھنکی۔

"آفاق میری پیاری بیٹی کو تنگ نہ کرو یار۔ کھانے دو اسے۔" وہ ہنسے۔

"ہاں کھلا کھلا کر کپا بنا دیں اسے، پھر شادی بھی نہیں ہو گی کہیں۔" آفاق نے تنگ کرنا کم نہیں کیا۔

"میری چندا کہیں نہیں جائے گی بس۔" ساتھ بیٹھی آسیہ نے اسے اپنے ساتھ لگا کر ماتھا چوما۔

یہ خیال جب سے ان کے دل میں آیا تھا تب سے جڑ پکڑ کر خواہش کا روپ دھار چکا تھا۔ اسی رات انہوں نے جہانگیر سے بات کی، انہیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ بیٹی کی خوشی انہوں نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ اب ماہین کی موہنی صورت دیکھ کر ان کی ممتا پھر سے عود آئی۔ جہانگیر خوش تھے۔ فہد کو بلایا گیا۔ آسیہ نے بڑی سہولت سے اپنی خواہش اس کے سامنے رکھی۔

"ماہین۔؟"

"تو مما، ماہین تو بہت چھوٹی ہے۔" فہد تعجب سے اپنی شفیق سی ماں کو دیکھے گیا جو بڑے مان کے ساتھ

اسے اپنے دل کی بات سے آگاہ کر کے اب جواب کی منتظر تھیں۔

"اس سال اس کا گریجویشن مکمل ہو جائے گا فہد چھوٹی کہاں ہے؟" انہوں نے رسان سے کہا۔

"آپ صحیح کہہ رہی ہیں ماما، لیکن ماہین بہت بچکانہ عادات کی مالک ہے، وہ اچھی لڑکی ہے مگر میں نے کبھی ایسا سوچا بھی نہیں۔ میں شریک حیات کے طور پر کسی سنجیدہ لڑکی کو چننا چاہتا ہوں، جبکہ ماہی بہت امیچور ہے۔" فہد کی بات پر آسیہ نے خاموش ـــ بیٹھے جہانگیر پر نظر ڈالی۔

"آپ آفاق سے کیوں نہیں کر دیتیں؟ ان کی آپس میں بہت بنتی ہے اور آفاق بھی اسی جیسی عادات کا مالک ہے، آئی ایم شیور وہ ایک دوسرے کے لیے اچھا میچ ہیں۔"

"لیکن آفاق کی تو ابھی اسٹڈیز۔" آسیہ متذبذب ہوئیں۔

"او ہو مما جانی آپ نے کون سا ابھی شادی کر دینی ہے، منگنی کر دیجیے، جب تک وہ اپنی اسٹڈیز مکمل کر لیں شادی بھی تب ہی کر دیجیے گا۔" اس نے مسکراتے ہوئے جیسے مسئلے کا حل پیش کیا۔

آسیہ قدرے پرسوچ انداز میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیں تو وہ ان کا ماتھا چوم کر شب بخیر کہنے کے بعد اپنے کمرے میں چلا گیا۔

آسیہ کی سوچ تانا بانا بنتی رہی، انہیں آفاق سے بات کرنے کے لیے فائنل ایئر کے امتحانات تک انتظار کرنا تھا۔

☼ ☼ ☼

سر نعیم کی کلاس سے فارغ ہو کر چار افراد پر مشتمل یہ ٹولہ گراؤنڈ میں آلتی پالتی مارے نوٹس بنانے میں مصروف تھا۔ سارا سال بے شک سنجیدگی سے پڑھیں یا نہ پڑھیں، مگر امتحانات کی تیاری زور و شور سے ہوتی تھی۔ اب بھی فائنل امتحانات کے بھوت نے انہیں سنجیدگی اور لگن سے تیاری پر مجبور کر دیا تھا۔ حسن اور حیدر، سر رمضان کے دیے گئے نوٹس کو کاپی کروانے چل دیے، کتاب پر نظر دوڑاتا آفاق دقتاً "فوقتاً" اہم نکات نوٹ بک میں درج کرتا جاتا، تب ہی حارث نے اچانک پوچھا۔

"آفاق تمہاری وہ کزن کیسی ہے؟"

"کزن۔؟" اس نے لکھتے لکھتے ہاتھ روک کر غائب دماغی سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہی جو تمہارے ساتھ میری برتھ ڈے پارٹی پر آئی تھی، ماہین نام تھا شاید۔"

"او اچھا شپو نکی۔ وہ کزن نہیں فیملی فرینڈ ہے، ہاں وہ ٹھیک بلکہ ہٹی کٹی ہے۔"

"شپو نکی؟ یہ کیا ہے؟"

"یہ اس کا نک نیم ہے، جو خالصتاً "میں نے رکھا ہے۔" آفاق ہنسا۔

"کیونکہ یہ نام اسے بڑا سوٹ کرتا ہے۔"

"خدا کا خوف کرو یار اتنی معصوم سی تو ہے۔" حارث کی نظروں میں اس کا گلابی سراپا گھوم گیا۔

"شکل سے معصوم تو وہ بہت ہے اور اسی کا فائدہ اٹھاتی ہے، لیکن کبھی تم اسے مجھ سے لڑتے دیکھ لو تو الامان الاحفیظ۔ کانوں کو ہاتھ لگاؤ۔ یوں پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑتی ہے کہ جان بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔" دھیمی ہنسی کے ساتھ اس نے بتایا۔

"لیکن اس میں ایک بہت بڑی خوبی بھی ہے، آج کل کے ماڈرن دور میں جہاں جھوٹ اور منافقت قدم قدم پر بکھری ہوئی ہے، وہاں ایسی خالص اور سچی لڑکی نایاب ہے۔ بہت اچھی ہے ماہی۔" چمکتی نظریں دور سبزے پر جمائے وہ بول رہا تھا۔ حارث کو گمان ہوا جیسے وہ چشم تصور سے یونہی جھلائی ماہی کو ہی دیکھ رہا ہو گا۔

"آفت کی پرکالہ ہے، شیطان کی خالہ ہے، تمہیں اس کی ظاہری معصومیت بھائی ہے، اگر کبھی شرارتیں کرتے دیکھ لو تو سر پر پاؤں رکھ کے بھاگو۔" آفاق کی آنکھوں میں گزشتہ اتوار کو ہوئی واردات گھوم گئی۔ ماہی اسے جگانے بارہا آ چکی تھی، مگر وہ بھی اپنے نام کا ایک تھا اٹھ کر نہ دیا۔ تو جھنجلائی ہوئی ماہی نے اس کے

بے سدھ سونے کا خوب فائدہ اٹھایا اور چنگھاڑتی سرخ لپ اسٹک سے اس کے دونوں گالوں پر گول گول سرخ دائرے بنادیے اور کسی ہندو بیاہتا عورت کی طرح ماتھے پر سندور کی کمی کو پورا کرنے کے لیے بھی لپ اسٹک مانگ میں بھر کر چپکے سے فرار ہوگئی۔ دوپہر کے قریب آسیہ نے آکر اطلاع دی کہ فواد ملنے آیا ہے۔ آفاق نے کروٹ لیے لیے ہی کہا۔

"جی اچھا بس آیا مما۔"

"آفاق بہت ہوگیا' فواد پچھلے آدھے گھنٹے سے انتظار کررہا ہے' تم نہیں اٹھ رہے تو میں اسے منع کردیتی ہوں۔" کہہ کے آسیہ مڑ گئیں' جبکہ دھمکی خاصی کارگر ثابت ہوئی اور آفاق کمبل ایک طرف پھینک کر سیدھا گیٹ پر پہنچا۔ ماہی لان میں بیٹھی جنید کے ساتھ لڈو کھیل رہی تھی' اسے دیکھ کے ہاتھ ہلایا' مگر وہ نظرانداز کرتا باہر چلا گیا۔

پہلے تو فواد حیرت سے اسے دیکھتا رہا' پھر یک دم ہنستے ہنستے دہرا ہوگیا اور اس کے چہرے کی طرف اشارہ کیا۔ آفاق نے منہ پر ہاتھ پھیرا تو سرخ رنگ لگ گیا۔

"اف خدا.... ماہی کی بچی میں تیرا قیمہ کروں گا۔" کہتا ہوا وہ فواد کو بعد میں ملنے کا کہہ کر اندر بھاگا' مگر توقع کے عین مطابق ماہی گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھی اور پھر وہ پورا دن اس کے سامنے غلطی سے بھی نہیں آئی۔ اس کی حرکت یاد کرکے آفاق کھلکھلا کے ہنسا۔

"کیا ہوا؟" حارث نے پوچھا تو آفاق نے اس کی شرارت سنا ڈالی' وہ بھی ہنسنے لگا۔

"بس ایسی ہی ہے' سنجیدہ ہونا تو اس لڑکی نے سیکھا ہی نہیں۔ تمہیں پتا ہے حارث' چار سالوں میں ہم نے بہت سی صبحیں' شامیں' ان گنت لمحے ایک ساتھ گزارے ہیں' ایک دوسرے کے ساتھ بہت سی باتیں شیئر کی ہیں' ایک دوسرے کے ہوتے ہوئے ہمیں کسی اور دوست کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔" آفاق کو دیکھتے ہوئے حارث کو پھر لگا کہ وہ بولتے بولتے ایک بار پھر اس کے پاس جا پہنچا تھا۔

"کیا تمہیں اس سے محبت ہے۔" بہت اچانک حارث نے پوچھا۔

"محبت؟" آفاق بڑی حیرت سے کچھ لمحے ناسمجھی سے اسے دیکھتا رہا۔

"تم اس سے محبت کرتے ہو؟" حارث نے اپنا سوال دہرایا تو یک دم وہ زور سے ہنس پڑا۔

"محبت کہاں سے آگئی یار۔ وہ میری بہت اچھی دوست ہے اور کیا یہ ضروری ہے کہ جس سے اچھی دوستی ہو اس سے محبت بھی ہوجائے؟" اس نے پوری صداقت سے کہا۔

"میرا ذاتی خیال ہے کہ لڑکی' لڑکے کی دوستی محض دوستی نہیں رہتی۔ اگر کوئی لڑکی آپ کو سمجھتی ہے آپ کی اچھی دوست ہے تو یقیناً" وہ آپ کے لیے بہت خاص ہے اور آپ اس میں انٹرسٹڈ ہوتے ہو۔"

"میں محبت جیسی خرافات پر یقین ہی نہیں رکھتا میرے بھائی۔ ہم بس اچھے دوست ہیں اور کچھ نہیں' ویسے بھی وہ لڑکی نہیں شرارہ ہے ---- جو بھی ہاتھ لگائے جل کر بھسم ہونے کے لیے تیار رہے۔" آفاق کی بات پر وہ دونوں قہقہہ لگا کر ہنس پڑے اور حیدر سے اپنے اپنے نوٹس لینے لگے۔

☼ ☼ ☼

کئی دنوں سے دونوں کا آمنا سامنا نہ ہو پایا تھا۔ امتحانات سر پر تھے اور آفاق کو سر کھجانے کی بھی فرصت نہ تھی۔ صبح کا یونیورسٹی گیا وہ کمبائن اسٹڈی کرکے رات گئے تک گھر لوٹتا اور ویک اینڈ پر بھی کمرہ مقفل کیے پڑھتا رہتا۔ خدا' خدا کرکے امتحانات ٹلے تو آفاق کی شکل دیکھنا نصیب ہوئی۔ آخری پیپر کے اگلے روز وہ خوب سو' سو کر تھک گیا تو فریش ہوکے ٹی وی لاؤنج میں آسیہ کے پاس آبیٹھا۔

"مما جانی کیا کررہی ہیں؟"

"کچھ نہیں' تمہاری نائلہ پھوپھو کو فون کرنے کے خیال سے بیٹھی ہوں' صالحہ کی شادی طے کردی ہے نا انہوں نے۔" آسیہ نے نند کی بیٹی کا ذکر کیا۔

"اچھا بعد میں نبٹاتے گا اپنی رشتہ داریاں۔" وہ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔

"کیسے ہوئے میرے چاند کے پیپرز۔" آسیہ محبت پاش نظروں سے اپنے وجیہہ سپوت کو دیکھے گئیں۔

"ایک دم زبردست' بولے تو کمال۔" آفاق کے انداز پر وہ ہنسیں۔

"یہ شیپو نکی نظر نہیں آرہی مما' گھر میں بڑا سکون ہورہا ہے۔" اس نے چھیڑا۔

"ماہی کے بھی تو پیپرز تھے نا' اس کے بعد کتنی بار آکر تمہارا پوچھ چکی ہے' کبھی تم گھر پر نہ ہوتے تو کبھی پڑھ رہے ہوتے۔"

"شکر ہے اسی بہانے ہمارے گھر میں شانتی تو اتری۔" اس کی بات پر آسیہ نے ہلکے سے چپت لگائی۔

"مت تنگ کیا کرو آفاق' اسی کے دم سے تو ہمارے گھر میں رونق لگی رہتی ہے' میں تمہارے امتحانات ختم ہونے کی منتظر تھی بیٹا' تاکہ پھر باقاعدہ جاکر اس رونق کو ہمیشہ کے لیے مانگ لوں۔"

"کیا مانگ لوں؟" آفاق ریموٹ پکڑے ٹی وی آن کرچکا تھا۔

"ماہین کو تمہارے لیے مانگ لوں آفاق' سچ کہوں تو مجھ سے ذرا بھی انتظار نہیں ہورہا۔" وہ مسکرائیں۔

"کیا ہوگیا ہے سب کو' ماہین اور میں.... ؟ مما وی آر جسٹ فرینڈز اینڈ نتھنگ مور۔" استعجاب سے پر لہجہ میں وہ بولا۔

"تو کیا یہ اچھا نہیں کہ دوستی رشتہ داری میں بدل جائے؟ تعلق زیادہ مضبوط اور پائیدار ہوجائے؟" آسیہ نے پوچھا۔

"پلیز مما میں ابھی بالکل بھی اسٹیبلش نہیں ہوں۔ آپ جانتی ہیں میں نے ایم فل کے لیے یو کے جانا ہے' ویزا ملتے ہی میں فرحان ماموں کے پاس چلا جاؤں گا' آپ مجھے کس جھنجھٹ میں ڈال رہی ہیں؟" وہ ناراضی سے بولا۔

"آفاق میں اور تمہارے پاپا ابھی صرف منگنی کا سوچ رہے ہیں۔ شادی تب کریں گے جب تم واپس آجاؤ گے' ماہین بہت اچھی لڑکی ہے۔" آسیہ کے لہجے میں عجیب سی بے بسی پھیل گئی۔

"آئی نو مما وہ بہت اچھی ہے اور مجھ سے بھی اچھا شریک حیات ڈیزرو کرتی ہے۔ آپ کیوں اسے سالوں انتظار کی سولی پر لٹکانا چاہتی ہیں؟ اور اگر میں نے کبھی اسے دوسری نظر سے دیکھا ہوتا تب بات اور تھی' مگر اب تو بالکل نہیں۔"

وہ جھنجلایا ہوا فیصلہ کن انداز میں کہہ کر اٹھ کے چلا گیا۔ اور آسیہ حیرت کی تصویر بنے چپ بالکل ساکت تھیں' کتنی حسرت تھی انہیں ماہین کو اپنے گھر کے آنگن میں چلتا پھرتا دیکھنے کی' مگر تقدیر جانے کیا سوچے بیٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

آسیہ کی بات کو آفاق نے اسی روز فراموش کردیا تھا۔ ایسی کسی بات کا اثر وہ اپنی دوستی پر نہیں پڑنے دینا چاہتا تھا۔

وہ دونوں اب بھی ایک دوسرے کے لیے ویسے ہی لازم و ملزوم تھے۔ اگر آفاق کا کوئی پلان ماہی کے بنا ادھورا ہوتا تو ماہی کی بھی کوئی منصوبہ بندی آفاق کے بنا بے سود سی لگتی۔ گہری دوستی کے اس رشتے کو آسیہ نے مضبوط بندھن میں باندھنے کی سعی تو بھرپور کی' مگر کامیاب نہ ہوسکیں۔ انہوں نے بارہا اسے سمجھانے کی کوشش بھی کی' مگر آفاق کا ایک ہی موقف تھا کہ شادی کرکے وہ ماہی جیسی دوست کو گنوانا نہیں چاہتا۔

"شادی تو رشتے کو اور مضبوطی عطا کردے گی آفاق۔" آسیہ کہتیں۔

"لیکن بیوی اور دوست میں بہت فرق ہوتا ہے مما' یہ سب کہنے کی باتیں ہیں' حالات بدلتے ہیں تو انسان اس سے قبل ہی بدل جاتے ہیں' اس لیے آپ یہ ضد چھوڑدیں اور مجھے میری بیسٹ فرینڈ سے علیحدہ مت کریں پلیز۔" آفاق اپنے موقف پر جیسے ڈھٹائی کی حد تک اڑا تھا۔ ورنہ آسیہ کی آنکھوں میں ڈیرے ڈالتی حسرت کو دیکھ کر ہی اپنے فیصلے پر نظرثانی کرلیتا۔

پھر یوں ہوا کہ آفاق کا ویزا لگ گیا اور اس نے خاموشی سے یو کے جانے کی تیاریاں شروع کردیں، مگر ماہین کو دانستہ اس سے لاعلم رکھا گیا ورنہ وہ پورا گھر سر پر اٹھالیتی۔ بالا ہی بالا سب معاملات طے ہوگئے۔

روانگی سے کچھ گھنٹوں قبل وہ زینت سے ملنے آیا۔ اس کے یوں جانے پر وہ آبدیدہ ہوگئیں۔

"ارے زینت آنٹی روئیں مت پلیز، میرا دل گھبراتا ہے، صبح چار بجے کی فلائٹ ہے اور ممانے ابھی سے رو رو کے جان ہلکان کر رکھی ہے، آپ جاکر ذرا انہیں چپ کروائیں اور سمجھائیں کہ تھوڑے عرصے کی تو بات ہے بس مجھے خوشی خوشی وداع کریں۔"

زینت نے اس کا ماتھا چوم کر سلامتی و کامیابی کی دعائیں رختِ سفر کے طور پر اس کے ساتھ کردیں۔

"ماہی کدھر ہے؟"

"اپنے کمرے میں ہوگی بیٹا، جاؤ مل لو، تمہارے جانے کی خبر سن کے پتا نہیں کیا کرے گی، تمہارے کہنے پر ہی ابھی تک اسے بے خبر رکھا ہے۔"

"جی میں مل آتا ہوں اور پلیز آنٹی اگر اس نے خبر سن کر کوئی گلدان میرے سر میں دے مارا تو میرے چیخنے پر بروقت مدد کے لیے ضرور آپہنچیے گا۔" آفاق کی بات پر وہ ہنسیں۔

سیڑھیاں پھلانگتا وہ اوپر آگیا۔ دروازے پر پہنچ کر دستک دینے لگا، پھر کچھ سوچ کر ارادہ ملتوی کرکے آہستہ سے ہینڈل گھما کے اندر داخل ہوگیا۔ ماہین کھڑکی کھولے پاس رکھی کرسی پر یوں نیم دراز تھی کہ اس کی پشت دروازے کی جانب تھی۔ دبے قدموں چلتا ہوا وہ اس کی پشت پر آکر رکا۔

ماہی کھڑکی سے نظر آتے چاند کو دیکھتے ہوئے انگلی ہوا میں بلند کیے چاند کے گرد حاشیے بنانے میں مصروف تھی، کبھی ہاتھ سے مٹا کر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ کر کچھ اور بنانے لگتی۔

"بھاؤ۔" کرسی کو دھکا سا لگا کر وہ دھاڑا اور اپنے مشغلے میں بری طرح غرق ماہی زمین بوس ہوتے ہوتے بچی۔

"خوفی۔ بدتمیز اگر میں گر جاتی تو تیرا کچومر کرکے بھرتا بنادیتی۔" حسبِ معمول اس نے آفاق کے لتے لینے شروع کیے۔

"بس بس بس۔ آج نہیں۔" آفاق نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید قصیدہ خوانی سے روکا۔

"کیوں آج تو گھوڑی چڑھنے والا ہے۔" ناک چڑھا کر وہ پھر پرانے مشغلے میں مصروف ہونے لگی۔

"گھوڑی نہیں ایروپلین چڑھنے والا ہوں شیونکی ڈائن ——— دعائیں دے کے مجھے ہواؤں کے سپرد کر۔" ماہی اس کی بے تکی باتوں سے واقف تھی، چنانچہ سنی ان سنی کرکے بیٹھی رہی۔

"یہ تیرے لیے۔" آفاق نے جیب سے ماہی کی فیورٹ چاکلیٹ نکالی، جسے اس نے ساری مصروفیت فوری ترک کرکے جھپٹا۔

"واہ۔ بڑا دل کیا ہے آج تو شیخوں نے۔" وہ بے صبری سے ریپر اتارنے لگی۔

"ہاں میں نے سوچا تو بھی کیا یاد کرے گی، کون سخی تیرا دوست ہوا کرتا تھا۔ ویسے تو کر کیا رہی تھی؟" وہ کشن کھینچ کر اس کے پاس ہی کارپٹ پر نیچے بیٹھ گیا۔

"میں سوچ رہی تھی کہ اگر چاند چوکور ہوتا تو کیسا لگتا یا تکون ہوتا تو؟؟"

"اچھا لگتا، بالکل ویسے ہی جیسے ماہین بی بی کے سر پر تین سینگ ہوتے تو دور دور سے سیاح اس عجوبہ کو دیکھنے کے لیے دوڑے آتے، حمزہ انکل کی تو چاندی ہوجاتی۔"

"اچھا تو تیری شکل ہونق تو پہلے ہی ہے تو اگر ایک عدد لمبی دم تیرے ساتھ لگی ہوتی تو بندر ہونے کی تمام شرائط پر پورا اترتا۔" ترکی بہ ترکی جواب آیا تو آفاق قہقہہ لگا کر ہنس پڑا اور بغور اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔

"ایسے کیا دیکھ رہا ہے نندیے۔ ایک بائٹ بھی نہیں دوں گی، سمجھا؟" وہ چاکلیٹ ایک طرف کرکے کھانے لگی گویا اچانک ہونے والے حملے پر پیش بندی کی ہو۔

"دیکھ رہا ہوں کہ میں اس شیونکی کو بہت مس کروں گا۔"

"اپنے مرنے کے بعد؟" انگلی پر لگی چاکلیٹ کو صاف کرتے ہوئے قدرے مزاحیہ انداز میں پوچھنے لگی۔

"نہیں یو کے جانے کے بعد۔ فرحان ماموں کے پاس جارہا ہوں، صبح چار بجے کی فلائٹ ہے۔" چاکلیٹ میں بری طرح منہمک وہ ——— رکی، اسے دیکھا اور پھر مگن ہوگئی۔

"تجھ سے ملنے آیا تھا بس۔ پھر پتا نہیں کب تیری صورت دیکھنی نصیب ہو۔" بڑی سی بائٹ لیتے ہوئے اس کی خودساختہ جذباتی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"ہاں مجھے پتا ہے وہاں کے صدر نے بطور خاص تجھے دعوت نامہ بھیجا ہے کہ بھیا آکر ہمارے ملک کو بھی تھوڑی رونق بخشو۔" اس کا انداز ابھی بھی لاابالی ہی تھا۔

"ماہی میں سچ میں جارہا ہوں۔ اپنا خیال رکھنا۔" گہری سنجیدگی میں کہے گئے جملے اور اٹھ کر جاتے آفاق نے ایک لمحہ کے لیے اسے سٹپٹایا۔ لیکن وہ اس کے خطرناک مذاق سہتی آئی تھی تو ہنستے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں تجھے بہت مس کروں گا ماہی۔" دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کے ماہی کی جانب پشت کیے ہی اس نے کہا۔ ماہی ایک بار پھر زور سے ہنسی۔

اس سے پہلے کہ آفاق باہر نکل جاتا اس نے ہنستے ہنستے اس کی آستین پکڑ کر کھینچی۔ وہ پلٹا، ماہی کے نین کٹورے پانیوں سے لبالب بھرے تھے، مگر ہنستے ہوئے بھیگی آواز میں اس نے کہا۔

"بس کر نا فوقی۔ اتنا گھٹیا مذاق اچھی بات نہیں۔" آفاق لب بھینچے اسے دیکھے گیا۔

"اچھا لے۔ یہ آدھی چاکلیٹ تو لے لے، مگر بس ختم کر یہ بکواس مذاق۔" آفاق نے ہاتھ بڑھا کر چاکلیٹ پکڑنے کی بجائے جیب سے ائیر ٹکٹ نکال کے اس کی آنکھوں کے سامنے کیا اور چند لمحوں بعد واپس رکھ لیا۔

"تو۔ واقعی جارہا ہے؟" مسکراہٹ غائب ہوتی، گویا صبح کے چہرے پر یک دم کسی نے رات کی چادر ڈال دی ہو۔ نین کٹورے چھلک پڑے تھے۔ آفاق نے ہاتھ بڑھا کر اس کے آنسو پونچھے۔

"شیونکی چپ ہوجا یار۔ میرا دل ڈوبتا ہے تیرے رونے سے۔" یک دم ماہی اس کے ساتھ لگی بچوں کی طرح بلکنے لگی۔

"ارے۔ ایک، دو سال کی تو بات ہے، میں آجاؤں گا اور ہم پھر ایسے ہی مل کر شرارتیں کیا کریں گے۔" اس کے گرد بازو پھیلا کر اس نے بہلانے کی کوشش کی۔

ماہی نے اس کی آستین مٹھی میں بھینچ رکھی تھی۔ رونے کی رفتار میں شدت آتی جارہی تھی۔ اس نے آستین چھڑوانے کی کوشش کی تو ماہی نے اور مضبوطی سے پکڑلی۔ بہت سے لمحے یوں ہی سرک گئے۔ ساکت کھڑے آفاق نے روتی بلکتی ماہی کو زبردستی خود سے الگ کیا اور تیزی سے دروازہ پار کرکے سیڑھیاں اتر گیا۔ وہ دروازے میں ہی بیٹھی روئے گئی، پھر خیال آنے پر اس کے پیچھے گئی، مگر وہ گاڑی میں فہد کے ساتھ بیٹھ چکا تھا۔ حمزہ، زینت سمیت سب گیٹ پر جمع اسے اللہ حافظ کہہ رہے تھے۔ ائیرپورٹ پر جانے سے آفاق نے منع کردیا تھا کہ اس رونے دھونے سے اس کی جان جارہی تھی۔ دعاؤں کے ساتھ رخصت ہوا، آسیہ کے گلے لگی ماہین بہت دیر بلکتی رہی وہ کسی کے سمجھانے میں نہیں آرہی تھی، پھر خود ہی چپ چاپ کمرے میں جاکر بند ہوگئی۔

☼ ☼ ☼

جاڑے کے موسم میں اندر باہر دور، دور تک اجاڑپن سا پھیلا نظر آتا ہے، یوں لگتا ہے زندگی جامد ہوگئی ہو اور جینے والے ایک محدود سے دائرے میں سکڑے سمٹے وقت کاٹ رہے ہوں۔ ایک ہفتے سے سورج نہیں نکلا تھا۔ تین دن مسلسل برستے مینہ نے سردی کی شدت میں یک دم اضافہ کردیا تھا۔

لیکن یوں لگتا تھا کہ اس سردی نے صرف بیرونی ماحول کو ہی اپنی لپیٹ میں نہیں لیا بلکہ ماہین کے

اندر بھی خاموشی ــــ سرائیت کر گئی تھی۔ دروازہ مقفل کیے وہ سارا دن سوئی رہتی اور پھر تمام رات کھڑکی کے پٹ وا کیے نیم تاریک لان کو اوس میں بھیگتا دیکھتی رہتی۔

زینت سمجھتی تھیں کہ آفاق سے اس کی چار سالہ دوستی ہی اتنی گہری تھی کہ اس کے جانے سے جو خلا آگیا تھا وہ اسے بھر نہیں پا رہی تھی۔ انہوں نے ماہی کو دیگر ایکٹیویٹیز میں انوالو کرنا چاہا۔ تاکہ وہ آفاق کی کمی اتنی محسوس کرنا کم کر دے۔ ان کی بہت کوششوں سے ہی ماہی بیکنگ کلاسز لینے لگی اور ویک اینڈز پر سیکھی گئی نئی نئی تراکیب کے کیک ڈونٹس پیسٹریز کھلا کھلا کر سب سے داد وصول کرتی۔ زینت کے ساتھ ساتھ آسیہ نے بھی سکون کا سانس بھرا تھا کہ ماہی نارمل ہو گئی تھی۔ لیکن وہ پہلے والی بات نہ تھی۔۔۔۔ دونوں گھروں میں ہر وقت ہنگامہ بپا رکھنے والے دو شیطانوں میں سے ایک نہیں تھا تو دوسرا بھی دم سادھ کے بیٹھ گیا۔

یو کے جانے کے فوراً بعد خیرت سے پہنچ جانے کی اطلاع کے بعد آفاق کا کوئی فون نہیں آیا تھا۔ ہاں البتہ فرحان ماما فون کر کے آسیہ کو اس کی خیریت سے آگاہ کرتے رہتے۔ فرحان ماما وہاں ایک شاپنگ مال میں فلور مینیجر کے طور پر کام کر رہے تھے۔ وہیں شادی تو کی مگر انگریز کی بیوی زیادہ عرصہ گھر نہ بسا سکی۔ طلاق کے بعد سے وہ وہیں اکیلے رہ رہے تھے۔ آسیہ نے بارہا انہیں پاکستان آنے کا کہا مگر وہ ٹالتے رہے۔ آفاق کے جانے سے انہیں بھی کمپنی مل گئی تھی۔ ابتدا میں اسے وہاں ایڈجسٹ ہونے میں بہت دقت ہوئی۔ مغربی ماحول، اجنبی لوگ، اجنبی سی جگہیں۔۔۔ مگر پھر یونیورسٹی میں ایڈمیشن کے بعد پڑھائی میں مصروف ہو کے اس نے ان چیزوں کو محسوس کرنا چھوڑ دیا اور عادی ہو تا گیا۔

آسیہ سے مختصر بات کرتا۔ پیچھے سے ماہی کہتی ہی رہ جاتی کہ میری بات کروائیں، مگر آفاق ایک دو منٹ کے بعد ہی اللہ حافظ کہہ دیتا۔ وہ اس سے دانستہ بات نہیں کر رہا تھا۔ وہ مشکل سے خود کو ایڈجسٹ کر پایا تھا۔ سب سے بات کر کے وہ ہوم سکنس کا شکار ہونا شروع ہو جاتا۔ گھنٹوں اداس پھرتا۔ ماہی کی بہت یاد ستاتی، مگر وہ اس سے فون پر بات نہ کر پاتا۔ شاید اس لیے کہ ضبط اسی صورت ممکن تھا۔

دنوں پہ دن بیتتے رہے۔ پھر جاتی سردیوں کی ایک شام آسیہ نے آکر زینت کو ایک رشتے کے متعلق بتایا۔ ماہی کچن میں تازہ تازہ سیکھا فروٹ ڈیزرٹ بنا رہی تھی۔

"زینت وہ آفاق کا دوست ہے نا حارث؟ جس کی سالگرہ پر ماہی، آفاق کے ساتھ گئی تھی، اس کی والدہ کا فون آیا تھا۔ لڑکا بہت اچھا ہے، ماہی کو پسند بھی کرتا ہے، وہ لوگ آنا چاہ رہے ہیں باقاعدہ رشتہ مانگنے کے لیے۔"

آسیہ کی بات پر زینت سوچ میں پڑ گئیں۔

"مگر آسیہ۔۔۔ ماہین ابھی بہت ناسمجھ ہے۔" زینت متذبذب تھیں۔

"پہلے کی نسبت اب ہماری بیٹی بہت میچور ہو گئی ہے، طبیعت میں ٹھہراؤ آگیا ہے اس کے، آفاق کے ساتھ تو بچی بنی رہتی تھی، میری بڑی خواہش تھی کہ ماہی میرے گھر کو ہی روشن کرے۔ مگر۔۔۔" آسیہ کے لہجے میں گہری اداسی تھی۔ زینت خاموش۔ نظریں ان پر ڈال کر رہ گئیں کہ ان کے بھی دل میں جانے کب سے یہ سوچ پل رہی تھی۔۔۔ خاموشی کا یہ وقفہ آسیہ نے ہی توڑا۔

"بس اللہ پاک ماہی کو بہت خیال رکھنے والا شوہر دے، وہ خوش رہے اپنے گھر میں، تم کہو تو حارث کے گھر والوں کو بلا لیں؟"

"ٹھیک ہے ایک بار مل لینے میں کوئی حرج نہیں، میں حمزہ سے بات کرتی ہوں، وہ بھی چھان بین کر والیں لڑکے کے متعلق۔" ہر ماں کی طرح زینت بھی متفکر سی تھیں کہ معاملہ نازو نعم سے پلی بیٹی کا تھا۔

پھر لڑکا ہر طرح سے سب کو پسند آیا۔ اور ان کے گھر والوں کی شرافت بھی بہت بھائی۔۔۔ لڑکا ایم ایس سی کے بعد اپنے والد کے بزنس کو ہی دیکھ رہا تھا۔ خوب صورت و خوب سیرت کم گو سا حارث، زینت کو اپنی بیٹی

کے لیے بہت مناسب لگا، ماہین سے پوچھا گیا۔ اس کا دل تو سادہ سلیٹ کی مانند تھا۔ چنانچہ اس نے والدین کی مرضی پہ فیصلہ چھوڑ دیا۔

پھر معاملات خود بخود طے ہو گئے اور ایک پر بہار شام میں ماہین کے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں حارث کے نام کی انگوٹھی پہنا دی گئی۔ اسی رات آفاق کا فون آیا تو آسیہ نے خوب ڈپٹا۔

"کہاں تھے تم آفاق، کتنے دنوں سے ہم تم سے بات کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن تم گھر پر ملتے ہی نہیں، کہاں رہتے ہو سارا دن؟" وہ ناراض سی تھیں۔

"او ہو مما ناراض کیوں ہو رہی ہیں، آپ کا بیٹا آوارہ گرد تھوڑی ہے کہ بے مقصد پھرتا رہے۔ پہلے ایک یونیورسٹی میں اسٹڈی ٹور تھا، پھر کچھ ضروری اسائنمنٹس میں بزی رہا، اس لیے آپ سے بات نہ ہو سکی۔" اس نے وضاحت دی۔

"سب ٹھیک ہے گھر پہ۔"

"ہاں سب ٹھیک ہے۔ تمہیں بتانا تھا کہ ماہی کی منگنی کر دی ہے۔ بس یہی خوش خبری سنانے کے لیے فون کرنا چاہ رہی تھی۔" انہوں نے خوشی سے اطلاع دی۔ ان کی اداسی ماہی کے اتنا اچھا رشتہ ہو جانے پر خود بخود دور ہو گئی تھی۔

"کیا کہہ رہی ہیں مما؟ ریئلی؟"

"ہاں بیٹا۔۔۔ آج شام کو ہی تو فنکشن تھا، ابھی کچھ دیر پہلے تو فارغ ہوئے ہیں۔"

"کس کے ساتھ مما؟" سنجیدگی سے پوچھا۔

"حارث سے۔۔۔ وہ تمہارا یونیورسٹی فرینڈ تھا نا۔۔۔ ان کی والدہ خود رشتہ لے کر آئی ہیں کہ ان کے بیٹے کو ماہین کی سادگی بہت بھائی ہے۔۔۔ بہت ہی اچھے لوگ ہیں میری تو دلی دعا ہے کہ ہماری بیٹی خوش رہے وہاں۔" آسیہ مگن سی بولے جا رہی تھیں۔

"واٹ؟ حارث سے؟" تعجب سے پر سوال تھا۔

"کیوں بیٹا۔۔۔ وہ اچھا لڑکا تو ہے نا، بظاہر تو شریف لوگ ہیں۔" آسیہ ایک دم پریشان سی ہو گئیں۔

"ہاں ہاں مما لڑکا بہت اچھا ہے اور فیملی بھی۔۔۔ حیرت ہے حارث نے کبھی بتایا نہیں کہ ماہین اسے پسند ہے۔" آفاق نے خود کو سنبھال کر آسیہ کو تسلی دی۔

"اچھا پھر بات ہو گی ماما۔۔۔ اللہ حافظ۔" عجلت میں فون کاٹ کر وہ ماہین کا موبائل نمبر پش کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

گلابی اور فان کلر کے خوب صورت بھاری کام دار فراک کو سنبھالے چینج کرنے کی غرض سے وہ ڈریسنگ روم کی طرف جا رہی تھی کہ موبائل کی بپ بجی، جھنجلا کر وہ پلٹی۔

میک اپ اور بھاری جیولری سے اسے الجھن ہو رہی تھی۔ وہ جلد از جلد منہ دھو کے سادہ لباس پہننا چاہ رہی تھی۔ مگر یہ فون۔۔۔ بیل مسلسل ہو رہی تھی۔ اسکرین پر روشن۔۔ عجیب سا نمبر دیکھتے ہوئے اس نے یس کا بٹن دبا کر فون کان سے لگایا، اس کے بولنے سے قبل ہی مانوس آواز سماعت سے ٹکرائی۔

"ہیلو۔۔۔ ہیلو۔۔۔ ماہی۔۔۔ کب سے فون کر رہا ہوں اٹھاتے ہوئے تیرے ہاتھ ٹوٹتے ہیں کیا؟"

"آفاق۔۔۔؟"

"نہیں میرا بھوت۔۔۔ یہ کیا گل کھلا رہی ہے تو میرے پیچھے؟" پرانے لب و لہجے میں اس نے چھیڑا۔

"تو۔۔۔ تو بس دفع ہو جا۔ اتنے دنوں سے فون کرنے کی زحمت نہیں ہوئی اور اب آ کے دماغ کھانے بیٹھ گیا ہے۔" وہ سخت خفا ہوئی۔

"میں بند کر رہی ہوں فون، مجھے تیری منحوس آواز سننے کا کوئی شوق ہے نہ بات کرنے کا۔" وہ دھاڑی۔

"اوئے۔۔۔ اوئے یار بات تو سن، فون بند نہ کر، بندہ اتنی دور سے فون کر رہا ہے کچھ تو خیال کر۔" وہ منمنایا۔

"ارے یار مصروفیت ہی اتنی تھی۔ تجھے پتا ہے نا کسی نئے ماحول میں ایڈجسٹ ہونا مجھے کتنا مشکل لگتا ہے تو بس یار اسی میں بزی رہا۔ آئی ایم سوری، خفا مت ہو۔" وہ چاہتے ہوئے بھی اس سے منگنی کا نہیں پوچھ پا رہا تھا۔

"اور تو نے اتنا بڑا فیصلہ مجھ سے پوچھے بنا ہی

کرلیا۔"

"کہاں پوچھتی میں؟ خلا میں نمبر ملاتی یا گمنام پتے پر تار بھیج کے اطلاع کرتی؟"

"کیسے بھی کرتی۔ پوچھتی نہیں بتاتی تو سہی۔۔۔" اس کا انداز شکوہ کن تھا۔

"خیر۔۔۔ اتنی بڑی تبدیلی آئی ہوگی زندگی میں۔۔۔ کسی کے نام کی انگوٹھی ہاتھ میں پہن کے اترا رہی ہوگی تو تو۔" وہ ہنسا تو اپنی ہی ہنسی کا کھوکھلا پن اسے بری طرح محسوس ہوا' ماہی چپ رہی۔

"مما بتا رہی تھیں کہ منگنی بڑی دھوم دھام سے ہوئی ہے' بہت خوب صورت لگ رہی تھی تو۔" سوچے بنا وہ بس بولے جارہا تھا۔

"اچھا ہے حارث بہت۔۔۔ بقول ماں جی کے چاند سورج کی جوڑی لگ رہی تھی۔" وہ ایک بار پھر ہنسا' مگر اس بار وحشت میں گھر کے اس نے ہنسی روک لی۔

"او شیپو تکی۔" یک دم اسے احساس ہوا' وہ بڑی دیر سے اکیلے ہی بولے جارہا تھا۔

"سن رہی ہوں۔" باوجود کوشش کے وہ اپنے لہجے کو بھیگنے سے نہ بچا پائی۔ اپنے مہندی لگے مخروطی انگلیوں والے ہاتھ کو پھیلا کر اس میں سجی نازک سی ڈائمنڈ رنگ دیکھتے ہوئے اسے اب احساس ہوا تھا کہ وہ جیسے پرائی ہوگئی ہے۔۔۔ کسی کے نام کی انگوٹھی اسے اس کی امانت بنا چکی تھی۔۔۔ اسے اب تک کی زندگی کو خیرباد کہہ کے اب اپنے ہونے والے شریکِ سفر کے لائف اسٹائل کو اپنانا تھا۔ خود کو اک نئے ڈھب پر زندگی گزارنے کے لیے تیار کرنا تھا۔

"تو۔۔۔ خوش ہے نا ماہی؟"

"خوش۔۔۔ ہاں میں بہت خوش ہوں۔۔۔ بہت۔" بے ربط سا جواب آیا تھا۔

"وہ فرنگی تیرے ساتھ کھڑا خوب جچے گا۔" اسے چھیڑنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ پھیکی سی ہنسی ہنسا۔ ہنسنا کتنا مشکل کام تھا اسے آج اندازہ ہوا۔ لندن کی خنک فضا نے اس کے ہاتھ کو سن کردیا تھا۔ ایک دم دحشت زدہ سا ہو کے بنا کچھ کہے فون کریڈل پر رکھ کر وہ ٹیلی فون بوتھ سے باہر آگیا۔

"کیا ہورہا ہے مجھے؟" اس نے خود کلامی کی۔

"آج نہیں تو کل اسے بیاہنا ہی تھا۔ حارث تو میرا اچھا دوست بھی ہے۔ یقیناً" وہ اچھا میچ ہے ماہی کے لیے۔ پھر۔۔۔ پھر کیا چیز مجھے جی بھر کے خوش ہونے نہیں دے رہی؟ شاید اس کے پرائے ہوجانے کا خیال۔" اندر بڑھتی آوازوں کو دبا کے اس نے سر جھٹکا۔ آسمان کی جانب منہ کرکے سرد ہوا اپنے پھیپھڑوں میں بھری اور آگے بڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼

گلاس ونڈو پوری کھلی ہوئی تھی اور وہاں کھڑی ماہین زور و شور سے برستی بارش کو یک ٹک دیکھ رہی تھی۔ اسے بارش بہت مسحور کن لگتی' مگر صرف دور سے۔۔۔ برسات میں بھیگنا اسے قطعی ناپسند تھا کہ ٹپاٹپ برستی بوندوں کو خود پہ گرنے دیا جائے' جیسے بے جان مٹی کو بھگو رہی ہو۔ اس سے اس کی جان جاتی تھی۔ بارش کے آثار دیکھ کے وہ فٹ سے آسیہ کے پاس جا پہنچتی۔ ایسے موسم میں اسے ان کے ہاتھ کے چکن پکوڑے بہت پسند تھے۔ کچن میں ان کے پاس ہی اسٹول پر چڑھ کر بیٹھ جاتی اور لان میں کھلنے والی کھڑکی سے بارش دیکھتے ہوئے پکوڑوں' سموسوں سے بھرپور انصاف کرتی۔

"ابے چٹوری۔۔۔ ادھر چھپ کے اناج سے معدہ بھرنے کو بارش انجوائے کرنا نہیں کہتے۔ ذرا کھلے میدان میں چل کے برسات سے لطف اندوز ہوں۔" آفاق اسے زچ کرنے کی خاطر کہتا۔

"نہ۔۔۔ نہ۔۔۔ مجھے تو معاف ہی رکھو۔" ماہی ایسے موقعوں پر حتی الامکان لہجے میں بدتمیزی کے عنصر کو نہ آنے دیتی۔

"اٹھ شاباش۔۔۔ چل لان میں باسکٹ بال کھیلیں۔" وہ جیسے شیطانی مسکراہٹ چسپاں کیے اس کی جانب بڑھتا اور ماہی "بچاؤ بچاؤ" کی پکار کرتی' چیختی ہوئی باہر بھاگتی۔ تو آفاق اس کے پیچھے ہی لپکتا۔ یہاں آسیہ کی ڈانٹ ڈپٹ بھی کچھ خاطر خواہ اثر نہ کرتی اور وہ اسے کھینچ کے لان میں لے جاتا۔ اور بال اس کی جانب اچھال کے گیم کے آغاز کا اشارہ کرتا جو کہ راہ فرار نہ پاکر اسے کرنا ہی پڑتا۔

شروع میں اسے الجھن رہتی' مگر پھر بارش میں کھیلنے کا مزا آنے لگتا۔

"کیا وقت تھا نا۔" اس نے حسرت بھری خود کلامی کی۔ سر تھوڑا باہر نکال کے وہ آسیہ آنٹی کے لان کو دیکھنے گئی۔ گویا اب بھی وہاں باسکٹ بال کھیلا جارہا ہو۔ بارش کی بوچھاڑ نے اس کے چہرے' گردن اور دوپٹے کو گیلا کردیا تھا۔ اس باسکٹ بال میچ میں ہمیشہ آفاق جیت جایا کرتا تھا۔ اپنے لانبے قد کا فائدہ اٹھا کر وہ گول پہ گول کرتا جاتا اور ماہی بال کو اپنے قبضے میں کرنے کے لیے اس کے پیچھے دوڑ' دوڑ کر ہلکان ہو' ہو کر جب تھک جاتی تو احتجاجاً" گیم چھوڑ کے اندر جانے کا اعلان کرتی' تب آفاق شان بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بال اس کی جانب لڑھکا دیتا اور پھر نئے سرے سے اسے ہلکان کرنا شروع کردیتا۔

چشمِ تصور سے تیز بارش میں بھیگتے' ہنستے کھیلتے وجودوں کو دیکھتے ہوئے وہ ہولے سے ہنسی اور پیچھے ہٹ کر گلاس ونڈو بند کردی۔ اس کی یاد نے بہت زور سے ماہی کا دل مسلا تھا۔

مجھے ٹھنڈک راس نہیں آتی
مجھے بارش سے خوف آتا ہے
پر جس دن سے معلوم ہوا
یہ موسم تم کو بھاتا ہے
اب جب بھی ساون آتا ہے
بارش میں بھیگتی رہتی ہوں
قطروں میں تم ہی کو ڈھونڈتی ہوں
بوندوں سے تمہارا پوچھتی ہوں
میں ایسی محبت کرتی ہوں
تم کیسی محبت کرتے ہو؟

بوندیں اب ایک تواتر سے شفاف گلاس سے ٹکراتیں اور پھسل کر نیچے گر جاتیں۔۔۔ وہ بھی اسی طرح آنسو جھپک جھپک کر اپنے دل پر گرا رہی تھی۔

باہر سرمئی سی بھیگی فضا جیسے اس کے اندر اتر گئی تھی۔ شاید بارش میں تیزی آئی تھی اور شیشے پر ٹپاٹپ گرتی بوندوں میں روانی کے ساتھ ساتھ اک ساز سا چھڑ گیا تھا۔ بارش جلترنگ سی بجا رہی تھی۔ ماحول یک دم بدلا تھا اور اس کے اندر ڈیرہ ڈالتی اداسی بھک سے اڑ گئی تھی۔

وہ مسکراتے ہوئے گرتے پھسلتے پھسل کر گرتے پانی کے دلچسپ منظر میں کھو گئی۔۔۔ جلترنگ کا ساز اسے بہلا رہا تھا۔ قطرہ در قطرہ جال سا شفاف شیشے پر لمحہ بھر کے لیے ابھرتا اور پھیل جاتا۔۔۔ محویت سے وہ گرتی پھسلتی بوندوں سے بننے والی آڑی ترچھی لائنوں' خاکوں کو دیکھتے ہوئے چونکی' دھندلا سا چہرہ بن رہا تھا۔

وہی نقش' وہی وجاہت' وہ شرارتی آنکھیں' مسکراتے ہونٹ' ستواں ناک اور بہت ساری اپنائیت۔۔۔ اس کی نظر جیسے کسی جادو کے زور سے اس شبیہہ پر جم سی گئی۔

"آفاق۔۔۔" ہونٹوں نے بے آواز سی جنبش کی تھی۔ مسحور سی وہ اس کی جانب کھنچتی چلی جارہی تھی۔ بے خودی سی۔۔۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے اس کے چہرے کو چھوا۔ کسی طلسم نے اسے جیسے پتھر کا کردیا تھا۔

اک انجانے سے احساس میں گھر کر اس کے ماتھے پر ہمیشہ کی طرح بکھرے بالوں کو سمیٹنے کے لیے اس نے دوسرا ہاتھ بڑھایا۔

"ماہین بی بی حارث صاحب آئے بیٹھے ہیں۔"

ماہین جیسے کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی اور پلٹ کر دیکھا۔

"باجی آسیہ نے آپ کو بلانے کے لیے بھیجا ہے۔"

بلا کی وحشت زدہ آنکھیں دیکھ کے زبیدہ ڈر گئی اور پیغام پہنچا کر جلدی سے واپس پلٹ گئی۔

اس نے برق رفتاری سے مڑ کر کھڑکی پر دیکھا۔۔۔ وہاں کچھ نہ تھا۔ کچھ دیر وہ بے یقینی کے عالم میں کھڑی رہی' پھر آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ یخ شیشے پر دھر کر یوں ٹٹولنے لگی جیسے وہ شبیہہ پھر سے برآمد کرلے گی' مگر وہاں کچھ ہوتا تو سامنے آتا۔ طلسم ٹوٹ گیا تھا۔

وہ بے بس سی زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ اس کا وجود موم بن کر پگھل رہا تھا۔ آنسو تیزی سے اس کے گالوں سے پھسل کر گلے میں جذب ہورہے تھے۔ دونوں ہاتھ کی انگلیاں آنکھوں پر رکھ کر وہ نفی میں سر ہلانے لگی' گویا ابھی ابھی خود پر آشکار ہوئی حقیقت کو جھٹلا رہی ہو۔

ہر انسان کی زندگی میں اور اک کا اک ایسا لمحہ ضرور آتا ہے۔ ماہین حمزہ کی زندگی میں وہ لمحہ آکر ٹھہر چکا تھا۔ یہ انکشاف بے رحمی سے اس وقت ہوا تھا جب وہ اس کے متعلق سوچنے کی بھی حق دار نہ تھی۔

''آفاق۔'' اپنی کیفیت کو کوئی بھی نام دیے بنا وہ بس اسے پکارے گئی۔ گھٹنوں میں چہرہ چھپائے زار زار روتے ہوئے اسے جانے کتنا وقت بیت گیا تھا۔

تھک کے اٹھ کر وہ واش روم میں گھس گئی اور جلتی آنکھوں پر پانی کے چھینٹے مارنے لگی۔ آئینہ میں اپنے آپ کو دیکھا' آنکھیں لال انگارہ ہورہی تھیں۔ چہرے پر دھرے ہاتھ کی انگلی میں ڈائمنڈ رنگ کی جگمگاہٹ نے اسے جیسے ہولناک حقیقی دنیا میں لا کھڑا کیا تھا۔

''حارث صاحب آئے بیٹھے ہیں۔'' زبیدہ کی بہت دیر پہلے کہی گئی بات اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تو تھی' مگر دماغ تک رسائی اب حاصل کرپائی تھی۔

اس نے گہری سانس بھر کر خود کو اس کیفیت سے نکالنے کی کوشش کی اور چہرہ پونچھ کر باہر آئی' وارڈروب سے سوٹ نکال کر پہنا اور بالوں میں برش کرکے نیچے آگئی۔ ڈرائنگ روم میں صوفہ پر براجمان حارث کی نگاہیں دروازے سے داخل ہوتی ماہین پر پڑیں۔

''السلام علیکم۔'' سنجیدگی سے سلام کرکے وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ منگنی کے بعد یہ ان دونوں کا پہلا آمنا سامنا تھا۔ زینت اپنے اکلوتے داماد کے خوب ناز اٹھارہی تھیں۔ بیکری آئٹمز سے بھری ٹرالی سامنے رکھی تھی۔

''ماہی بیٹا سرو کریں' ابھی تک حارث نے کچھ نہیں کھایا۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے ماہی سے کہا جو مشینی انداز میں اٹھ کر انہیں سرو کرنے لگی۔

''آنٹی وہ دراصل میں ماہین کو ڈنر پر لے جانا چاہ رہا تھا۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو۔'' حارث نے متانت سے زینت کے سامنے اپنا مدعا رکھا۔

''ہاں ہاں بیٹا کیوں نہیں۔'' وہ ماہی کو دیکھ کے مسکرائیں۔

''مما بہت بارش ہورہی ہے' ہم کیسے جاسکتے ہیں۔'' زینت کی رضامندی دیکھ کے دبی زبان میں اس نے بہانہ گھڑا۔

''رات تک تو بارش رک جائے گی ماہین اور ویسے بھی ہم نے پیدل تھوڑی جانا ہے۔'' حارث کے پرمزاح انداز میں کہنے پر۔۔۔ ناچار اسے سر اثبات میں ہلانا پڑا۔

شام تک وہ اپنے دل اور ضمیر کی جنگ سے تھک گئی تھی۔ ضمیر سبقت لے گیا تھا۔ اسے اب کسی اور کے بارے میں سوچنا تک نہیں چاہیے' اس کے والدین نے مرضی پوچھ کے ہامی بھری تھی تو اب ذہنی خلفشار سے چھٹکارے کا ایک ہی حل ہے کہ دل کی آواز پر کان دھرنا بند کرکے بندھے ہوئے رشتے کو ہی نبھایا جائے۔ رات کو وقت پر وہ تیار تھی۔ حارث نے گیٹ پر ہارن دیا تو وہ مما کو بتا کر گاڑی میں آبیٹھی۔ سلام و دعا اور حال احوال دریافت کرنے کے بعد حارث نے اس کے میک اپ سے بے نیاز صبیح چہرے کو ستائشی انداز میں دیکھا۔

''اچھی لگ رہی ہیں۔ یہ لیمن کلر آپ پر خوب جچ رہا ہے۔''

''شکریہ۔'' وہ ہولے سے مسکائی۔ اپنی شام والی کیفیت پر وہ بہت حد تک قابو پاچکی تھی۔ ڈنر کے لیے آواری میں ٹیبل پہلے سے بک تھی۔ کھانا ماہین کی پسند سے آرڈر کیا گیا اور سرونگ کے دوران حارث نے اس سے بہت سی باتیں کرڈالیں۔

بچپن سے جوانی تک۔۔۔ اپنے شوق سے لے کے کام اور دیگر مصروفیات پر۔۔۔ جن میں سے کچھ ماہین نے بڑے دھیان سے سنیں کچھ بالکل غائب دماغی

سے۔

''پتا ہے ماہین آپ مجھے اتنی اچھی کب لگی تھیں؟'' ماہی نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''جب آپ آفاق کے ساتھ میری برتھ ڈے پارٹی میں آئی تھیں۔'' ماہی کے تصور میں وہ رات چھم سے اجاگر ہوئی۔

''بے حد باتونی شریر اور معصوم لگیں آپ مجھے' آفاق کے ساتھ بہت شرارتیں کررہی تھیں آپ۔'' پچھلے ایک گھنٹے میں پوری گفتگو کے دوران وہ پہلی بار کھل کر مسکرائی۔ حارث نے بغور اس کی دلفریب مسکراہٹ کو دیکھا اور وجہ سمجھ کر اس کے ماتھے پر کچھ بل نمودار ہوئے۔ مگر سر جھٹک کر اسے اپنا وہم قرار دیتے ہوئے وہ پھر ہم کلام ہوا۔

''کیا مصروفیات رہتی ہیں دن بھر؟'' معمول کے سوال پوچھ کر وہ اسے اپنی گفتگو میں شامل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

''بیکنگ' کوکنگ' فلاور ڈیکوریشن' مما سے باتیں۔۔۔ بس۔'' اس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

''کتنی فرینڈز ہیں آپ کی؟''

''کوئی نہیں' بس آفاق تھا۔'' جواب حارث کی توقع کے خلاف تھا۔ بہت سوچ کر اس نے یہ سوال پوچھا تھا' کیونکہ لڑکیاں اس موضوع پر بولنا شروع ہوں تو چپ بمشکل ہوتی ہیں۔

''اچھا۔۔۔ وہ تو نہیں ہے اب۔۔۔ پھر تو آپ خود کو بالکل تنہا محسوس کرتی ہوں گی' دوستوں کی ضرورت تو انسان کو تاعمر رہتی ہے۔'' ماہی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ حارث نے ایک بار پھر سنجیدہ ہوجانے والی ماہین کو دیکھتے ہوئے قدرے خوش گوار انداز میں کہتے ہوئے ہاتھ سامنے پھیلایا۔

''ہم ایک مقدس رشتے میں بندھنے والے ہیں' تو چلیں دوست بننے سے شروعات کرتے ہیں' میں بھی آفاق جیسا ہی ہوں اور اس سے اچھا دوست ثابت ہوں گا' آزمائش شرط ہے۔'' وہ متبسم لہجے میں گویا ہوا۔

ماہی نے وال پینٹنگ سے نگاہ ہٹا کے ایک نظر اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر ڈالی اور پھر دوبارہ سامنے کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہ جمائے ہوئے جیسے خود کلامی کی۔

''آفاق جیسا۔۔۔ آفاق جیسا تو کوئی بھی نہیں ہوسکتا۔۔۔ کوئی بھی نہیں۔'' اب کی بار حارث نے اپنے ماتھے پر پڑنے والی تیوروں کو سمیٹنے کی کوشش نہیں کی۔ ماہی کا ایک جملہ اسے بہت کچھ سمجھا گیا تھا۔ بہت سا وقت خاموشی سے سرک گیا۔

بل ادا کرنے کے بعد وہ دونوں چپ چاپ باہر آگئے۔ راستہ بھی یوں ہی کٹا اور گھر کے دروازے پر ماہی کو اتارتے ہی حارث نے گاڑی تیزی سے آگے بڑھادی۔

☆ ☆ ☆

عمر رواں میں بعض ایام ایسے بھی آتے ہیں جب انسان کو وقت کے رک جانے کا گمان سا ہوتا ہے۔ لیکن بھلا وقت بھی کبھی تھما ہے' لمحوں کی بارش تواتر سے جاری رہتی ہے' کبھی نہ تھمنے والی' کبھی نہ وقفہ لینے والی۔

ماہین سے بات کرنے کے بعد اگلے دو روز ایسے ہی تھے جب آفاق چپ چاپ کمرہ مقفل کیے پڑا رہا۔ کچھ عجیب ہی وحشت تھی' اضطراب اسے کسی طور سکون نہ لینے دے رہا تھا۔

فرحان ماموں سے خرابی طبیعت کا بہانہ کرکے کسی سے بھی ملنے سے انکار کردیا تھا۔ موبائل آف کرکے سارا دن خاموشی سے بیٹھا وہ ماضی کی گرد میں دھندلانے والے ایک چہرے کو بے حد واضح طور پر سامنے آتے دیکھ کے متحیر ہوتا رہا۔ بھولا تو وہ اسے بھی نہ تھا' مگر اب تو وہ یوں اس کے حواسوں پر چھاگئی تھی کہ اسے کچھ بجھائی نہ دے رہا تھا۔

''حارث بہت اچھا لڑکا ہے' ماہی خوش رہے گی اس کے ساتھ۔'' چوبیس گھنٹوں میں بارہا دی جانے والی تسلی وہ ایک بار پھر خود کو دیتا' ایک ساتھ لگائے گئے قہقہوں کی گونج اسے مضطرب کردیتی اور وہ بے بس سا

ہو کر پھر اٹھ بیٹھتا۔

"شاید ماہی کے پرائے ہو جانے کے خیال سے مجھے بے چینی رہنے لگی ہے۔" وہ سر ہلاتا ہوا دوبارہ لیٹ جاتا۔ رفتہ رفتہ پھر سب معمول پر آتا گیا۔ اس نے آنے والے امتحانات کی تیاری میں خود کو اس قدر مصروف کرلیا کہ سوچنے کی فرصت ہی نہ ملتی۔

اس آخری گفتگو کے بعد آفاق نے ایک بار بھی پاکستان فون نہیں کیا تھا۔ وجہ اسے خود بھی پتا نہ تھی۔ فرحان ماموں نے اسے کئی بار تاکید کی کہ پاکستان فون کرلے۔ آسیہ بہت یاد کررہی ہے مگر وہ یاد دہانی پر اثبات میں سر ہلانے کے باوجود رابطہ نہ کرپاتا۔ جانے کس سے فرار کا یہ راستہ اس نے ڈھونڈا تھا۔

آفاق وہاں بہت مشکل سے ایڈجسٹ ہوا تھا۔ غیر ملکی متضاد سرد سا موسم، سرد سے لہجے۔ یونیورسٹی فیلوز سے صرف ہیلو ہائے تک ہی جان پہچان تھی۔ البتہ ایڈورڈ سے اچھی خاصی دوستی ہوگئی تھی۔ برطانوی نژاد جان ایڈورڈ دبلا پتلا، خوش مزاج، محنتی لڑکا تھا۔ پڑھائی سے فراغت کے بعد اور ویک اینڈز پر دونوں اکثر اکٹھے ہی پائے جاتے۔ امتحانات کی تیاری کے لیے کمبائن اسٹڈی ایڈورڈ کے فلیٹ پر ہی ہورہی تھی۔ آفاق کتابوں اور چند ضروری چیزوں کے ساتھ اسی کے اپارٹمنٹ میں رہائش پذیر رہا۔

"لنچ میں کیا لوگے آفاق۔" مخصوص لب و لہجہ میں ایڈورڈ نے کچن سے پکار کر پوچھا۔

"جو بھی ہے لے آؤ جان۔" چند لمحوں بعد وہ چکن سینڈوچز لیے اس کے سامنے تھا۔

"میری مما بہت اچھے سینڈوچ بناتی ہیں۔" آفاق نے مسکراتے اسے بتایا۔

"واؤ۔ اور کیا اچھا بناتی ہیں؟" ایڈورڈ نے دلچسپی لی۔

"مجھے تو سبھی کچھ اچھا لگتا ہے، لیکن ماہی کہتی ہے ان کے ہاتھ کے بنے چکن پکوڑے بے حد لذیذ ہوتے ہیں۔"

"ماہی کون ہے؟" ایڈورڈ سے وہ اکثر گھر والوں کا ذکر کرتا رہتا تھا مگر ماہی کا پہلی بار کررہا تھا۔

"ماہی۔ فیملی فرینڈ ہے۔" مختصراً بتا کر وہ چپ ہوگیا۔ ایڈورڈ نے یکایک بدلتے اس کے لہجے کو صاف محسوس کیا۔

"از شی یور بیسٹ فرینڈ؟"

"ہاں۔ وہ میری سب سے اچھی دوست ہے، مجھ سے چھوٹی ہے، لیکن ہم نے کبھی آپ جناب سے بات نہیں کی۔ تمہیں پتا ہے میں اسے کیا کہتا ہوں؟ شپو نکی۔" بتا کے وہ خود ہی ہنسا تو ایڈورڈ نے حیرانی سے دہرایا۔

"شپ شپو نکی؟" بمشکل لفظ ادا کرپایا تھا۔

"ہاہاہا۔ ہاں بس یہی نک رکھا ہوا ہے میں نے اس کا۔" بہت دن بعد وہ یوں ہنسا تھا۔ ایڈورڈ کے منہ سے اس کا نام بے حد مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔

"اچھا تو وہ تمہیں کیا کہتی ہے؟" ایڈورڈ پورے دھیان سے اسے سن رہا تھا۔

"مجھے؟ میرے بہت سے نام رکھتے ہوئے ہیں، مثلاً" فوقی بدتمیز، فوقی جنگلی، فوقی جاہل۔" بتاتے ہوئے وہ ایک بار پھر ہنسا تو ایڈورڈ بھی کھلکھلا اٹھا۔

"جب میں آیا تب بہت روئی تھی وہ۔ بہت۔"

"وہ تمہیں بہت یاد آتی ہے کیا؟"

"پتا نہیں۔" کہہ کر وہ چپ سا ہوگیا۔ ایڈورڈ انتظار میں تھا کہ وہ کچھ کہے اور اس نے کہا بھی۔

"اس کی منگنی ہوگئی ایڈورڈ۔ مام بتارہی تھیں، اگلے سال شادی کردیں گے۔" بتا کر وہ پھر چپ ہوگیا۔

"تو تم اس کے لیے اداس ہو؟"

"اداس۔ ہاں۔ نہیں۔ بس ٹھیک ہے کیا اداس ہوں گا اتنی دور بیٹھ کے۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنسا۔ ایڈورڈ نے دیکھا اس کے ہاتھ میں پکڑا سینڈوچ ویسے کا ویسا تھا۔ ماہی کے ذکر پر وہ کھانا بھول گیا تھا۔

"کھانا تو کھاؤ۔"

"اوہ سوری۔" خجالت مٹانے کے لیے اس نے جلدی جلدی دو، تین لقمے لے لیے خود کو مگن ظاہر کرنے لگا، لیکن اس کے عجیب سے رویے سے ایڈورڈ الجھ گیا تھا۔

"آفاق کیا تمہیں اس سے محبت ہے؟" سوال پر آفاق کے حلق سے نوالہ نگلنا مشکل ہوگیا۔ اسے نگلنے کے لیے اس نے جلدی سے پاس پڑا پانی کا گلاس لبوں سے لگایا۔

"محبت کرتے ہو نا اس سے؟" اب کی بار سوال نے جیسے تصدیقی پیراہن اوڑھ لیا تھا۔ پانی پیتے پیتے اسے زبردست اچھو لگا۔ کھانستے کھانستے اس کی آنکھوں میں پانی آگیا۔

"آرام سے پیو آفاق۔" ایڈورڈ کو لگا اس نے کوئی بہت بڑی بات کردی ہے۔ آفاق باقی سینڈوچ پلیٹ میں رکھ کے اٹھ کھڑا ہوا اور خاموشی سے باہر نکل آیا۔

ایڈورڈ وہ دوسرا شخص تھا جس نے اس سے یہ بات پوچھی تھی اور پہلے کی طرح وہ اب کی بار پر زور نفی کیوں نہیں کرسکا۔ خاموش کیوں رہا؟ کس لیے لب بستہ ہوگیا وہ؟

سوچتے سوچتے وہ شل پیروں کے ساتھ سڑکیں ناپتا رہا۔ رات گئے واپس لوٹا تو اس کا بکھرا حلیہ دیکھ کے ایڈورڈ کو افسوس ہونے لگا کہ اس نے ایسی بات کیوں کہی اس۔ اس دن کے بعد ان کے مابین اس پر بات نہیں ہوئی۔

☆ ☆ ☆

امتحانات اچھے ہوگئے۔ جان ایڈورڈ کے انکل کی جانب سے ان دونوں کو ایک اچھی جاب آفر تھی۔ اور آفاق بھی اس پر سنجیدگی سے غور کررہا تھا۔ رزلٹ آنے سے قبل ہی اتنی اچھی جاب ملنا خوش قسمتی کی بات تھی۔

سرد ہوا کی وجہ سے خنکی بڑھی ہوئی لگ رہی تھی۔ دونوں کافی شاپ میں بیٹھے اسی جاب کو ڈسکس کررہے تھے۔

پھر کافی کے گلاس لیے دونوں باہر آگئے۔ شام کا ملگجا سا اجالا اب اندھیرے میں ڈھل رہا تھا۔ روشنیاں جل چکی تھیں، مختلف بازار، شاپز، اسٹورز، بڑے بڑے سائن بورڈز جگمگا رہے تھے۔

سڑک پر خوب چہل پہل تھی۔ باتیں کرتے ہوئے وہ کافی پی رہے تھے جب ایڈورڈ کا سیل بجا تو وہ ایک طرف ہو کر فون سننے لگا۔

آفاق نے ایک نظر اس پر ڈالی اور کافی کا آخری گھونٹ بھر کر ڈسپوزیبل گلاس ڈور ڈسٹ بن میں ڈالا اور اس کا انتظار کرنے لگا۔ فون طویل ہوگیا تھا۔ وہ مڑ کر پھر اسے دیکھنے کے لیے پیچھے ہوا تو سائیڈ سے گزرتے ہوئے وجود کا شانہ اس سے ٹکرایا، وہ سنبھل کر ایک طرف ہوا۔ ٹکرانے والا وجود نسوانی تھا۔ مگر وہ اس کی جانب دیکھے بنا آگے بڑھ گئی۔

لڑکی نے ہلکی گلابی ہائی نیک پر سیاہ رنگ کا لانگ کوٹ پہن رکھا تھا۔ براؤن سلکی بالوں کی اونچی سی پونی ٹیل جھلاتی وہ آگے جارہی تھی۔

وہ جیسے کسی ٹرانس میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ لڑکی کی رفتار بہت تیز تھی، شاید اسے کہیں پہنچنے کی بہت جلدی تھی۔ چنانچہ وہ کافی آگے جاچکی تھی۔ آفاق ہجوم میں جگہ بنا تا لوگوں کو ہٹاتا ہوا اس تک پہنچنے کی کوشش کرتا رہا۔

"ماہی۔" وہ پکارا۔

"ماہی۔" یہ پکار پہلے سے زیادہ بلند تھی۔ تیز تیز چلنے کے باعث اس کی سانس بے ترتیب ہورہی تھی۔ اردگرد سے گزرتے لوگوں نے اس کی طرف دیکھا، مگر اسے جیسے کسی کی پروا نہیں تھی۔

چند لمحوں بعد وہ اس تک پہنچ چکا تھا۔ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کے اسے روکنے کی کوشش کی۔

اجنبی لڑکی نے مڑ کر خوبرو سے لڑکے کو حیرت سے دیکھا۔

"اوہ سوری۔ آئی ایم سوری۔" خجالت آمیز انداز میں لفظ ٹکڑوں کی صورت میں اس کے منہ سے ادا ہوئے۔

"اٹس اوکے۔" وہ مسکراتے ہوئے پلٹی اور آگے بڑھ گئی۔ اس کا سانس اب بھی دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا کر رہا تھا میں؟" اس نے باآواز بلند خود کلامی کی۔

"اف۔۔۔" سر دونوں ہاتھوں میں گرا کر وہیں فٹ پاتھ پر ہی بیٹھ گیا۔۔۔ کسی جذبے کی شدت سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"ماہی۔۔۔ یہاں کیسے ہو سکتی ہے، پھر میں یوں کیوں؟" اسے لگا وہ اپنے حواس کھو بیٹھا ہے۔

پورے سال میں ایسا پہلی بار ہوا تھا جس میں اس کی شعوری کوشش کا ایک فیصد بھی دخل نہ تھا۔ شرمندگی کے جوہڑ میں جیسے وہ گردن تک دھنس چکا تھا۔

"شاید اس لڑکی میں ماہی کی بہت شباہت تھی اس لیے۔۔۔ اس لیے میں۔۔۔" وہ رکا۔

"اس لیے میں دیوانہ وار اس کے پیچھے بھاگا آیا؟" سوال خود سے تھا اور جواب اس کے اندر کہیں کسی گہرائی میں گڑا تھا۔ سردی میں کافی دیر بیٹھے رہنے سے اس کا چہرہ سن سا ہو رہا تھا۔۔۔ تو یہ پسینہ کیسا۔ اس نے دایاں ہاتھ ماتھے پر لے جا کر نمودار ہونے والے ننھے ننھے قطروں کو چھو کر دیکھا۔

"آفاق۔۔۔ کہاں چلے گئے تھے، میں کب سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔" ایڈورڈ جانے کہاں کہاں ڈھونڈ چکنے کے بعد اب وہاں آیا تھا۔ چپ چاپ متوحش بیٹھے آفاق نے غائب دماغی سے اسے دیکھا اور اٹھ کے اس کے ساتھ چلنے لگا۔

اسے گھر چھوڑ کر ایڈورڈ چلا گیا۔ بستر پر گرتے ہی ایک خیال اسے اپنے گھیرے میں لینے لگا اور ہمیشہ کی طرح اب کی بار اس نے ان بے ربط خیالوں کو جھٹکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

اس بار اس نے اس جذبے کو پوری طرح خود میں پھیل جانے دیا، جسے وہ کھرچ کھرچ کے دل سے مٹانے کی جدوجہد میں تھا۔

"وہ اس کے پرائے ہو جانے کا خیال نہیں جو مجھے تڑپا رہا ہے۔۔۔ مجھ سے بچھڑنے کا خیال ہے۔" پہلی بار اس نے اعتراف کیا تھا۔

اس نے محبت کے سحر کو کاٹنے کی سعی بند کر دی تھی۔ جیسے مکڑی کے جال میں پھنسنے والا شکار پہلے پھڑپھڑا کر خود کو آزاد کروانے کی بھرپور جدوجہد کرتا ہے، مگر پھر تھک ہار کر بے بس سا خود کو جالے میں جکڑا دیکھتا رہتا ہے۔ آفاق پر بھی محبت کا جال پھیلتا جا رہا تھا اور وہ ساکت نظروں سے بیٹھا مسکراتا خود کو اس سحر آفریں جذبے کے تانے بانے میں لپٹتا دیکھتا جا رہا تھا۔

کروٹ لے کر اس نے سائیڈ لیمپ بجھا دیا۔ اس کا دل پانی بن کر بہہ رہا تھا۔ اور قطرے آنکھوں سے ٹپک کر تکیہ میں جذب ہو رہے تھے۔

وہ ایک مرد تھا، مگر محبت کی آنچ اسے بھی پگھلا رہی تھی۔

"وہ اب۔۔۔ حارث کی امانت ہے، پھر اب کیوں یہ سب ہو رہا ہے۔ میں اب کیوں اس کے عشق میں بھیگ رہا ہوں۔۔۔ کیوں؟"

جب ماما نے کہا تو میں نے ٹھکرا دیا۔۔۔ میں سمجھ ہی نہیں پایا۔" اس نے انگوٹھے سے اپنی دکھتی کنپٹیاں دبائیں۔

"کیا مجھے اس کی سزا مل رہی ہے؟"

"ہاں۔۔۔ شاید۔۔۔" اس نے پھر کروٹ بدلی۔

قسمت کبھی انسان کے در پر آکر دروازہ کھٹکھٹاتی رہتی ہے، مگر وہ اس کی آواز سن کے بھی نظر انداز کر دیتا ہے، عطا کی جانے والی شے پر ناشکری کرتا ہے اور پھر پچھتاوا اس کا مقدر بن جاتا ہے۔

اسے لگا جیسے اس نے متاعِ حیات کو اپنے ہاتھوں سے مٹھی بھر بھر کر بانٹ دیا ہو اور اب تہی دست سا بیٹھا اپنا آپ لٹ جانے کا سوگ منا رہا ہو۔

☆ ☆ ☆

اگلی صبح بڑی عجیب سی تھی۔ بے کل، بے رنگ سی، اس ٹھنڈی ٹھار سرد و سپاٹ فضا سے اس کا دل اوب گیا۔ آج اسے ایڈورڈ کے ساتھ انٹرویو کے لیے جانا تھا۔ انٹرویو تو محض رسمی سا تھا، جاب کنفرم تھی، مگر اس پر۔۔۔ کسلمندی چھائی ہوئی تھی۔ عرصے بعد اس نے فون اٹھا کر گھر کا نمبر پش کیا۔ تیسری بیل پر فون ریسیو کر لیا گیا۔

"ہیلو۔"

"السلام علیکم پاپا۔" آواز پہچان کر اس نے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام بیٹا۔۔۔ تو آخر تمہیں گھر کا خیال آ ہی گیا۔" جہانگیر نے ہلکے پھلکے طنز سے کہا تو وہ ہنس دیا۔

"خیال تو رہتا ہی ہے پاپا، بس وہ ایگزامز میں بزی تھا۔ اس لیے فون نہیں کر سکا۔" اس نے گھڑی گھڑائی وضاحت دی۔

"ہماری تو خیر ہے بیٹا جی، لیکن تمہاری ماں سخت خفا ہے تم سے، لو بات کرو۔"

"کیسی بھی کیا مصروفیت تھی آفاق کہ چند منٹ کے لیے ماں کو فون تک نہ کر سکے؟" چھوٹتے ہی وہ شکوہ کناں ہوئیں۔

"آئی ایم سوری مما۔۔۔ مجھے پتا ہے میری پیاری سی ماں جی نے مجھے بہت مس کیا ہو گا۔" آفاق نے بات میں خوشگواریت لانے کی کوشش کی۔

"امتحانات کیسے ہوئے تمہارے؟"

"جی ماما پیپرز اچھے ہو گئے، ایک دوست کے انکل کی طرف سے اچھی جاب آفر بھی ہے، میں آج انٹرویو کے لیے جاؤں گا۔" اس کی بات پر آسیہ چپ سی ہو گئیں۔

"وہیں رہنے کا ارادہ ہے۔"

"مما۔۔۔ واپس آکر کیا کروں گا اب۔" ٹوٹے ہوئے لہجہ میں وہ بولا۔

"اب؟ کیوں اب کیا ہو گیا ہے؟" آسیہ متفکر سی ہوئیں۔

"مطلب اب وہاں نوکریاں کون سا آرام سے مل جاتی ہیں مما۔۔۔ جوتے چٹخانے سے بہتر ہے کہ میں یہیں جاب کر لوں۔" اس نے بات سنبھالی۔

"نوکری تو مل ہی جاتی آفاق۔" وہ دل گیر لہجے میں بولیں۔

"مجھے بھول تو نہیں جائیں گی ماما۔" اس نے جان بوجھ کر چھیڑا۔

"اولاد کو کون بھولتا ہے بیٹا۔" آفاق کو ان کا لہجہ بہت سوگوار سا لگا۔

"ماما کیا بات ہے۔۔۔ کوئی پریشانی ہے؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" آسیہ کے انداز پر وہ پریشان ہوا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔۔۔ ماہین کی منگنی ٹوٹ گئی ہے۔"

"واٹ؟ کیا کہہ رہی ہیں ماما۔۔۔ کیوں۔۔۔ کیسے ٹوٹ گئی؟" خبر اس کے لیے شاک ہی تھی۔

"ہاں بس۔۔۔ پتا نہیں کیا ہوا۔۔۔ حارث کا کہنا ہے کہ ماہین سے اس کی ذہنی مطابقت نہیں ہو سکتی۔" آفاق پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

"پتا نہیں اس معصوم سی بچی کے نصیبوں میں اتنا ٹھکرانا کیوں لکھا ہے۔" آسیہ کی آواز رندھ گئی، آفاق چپ چاپ سنے گیا۔

"اللہ بہتر کرے گا ماما، آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں۔" انہیں تسلی دے کر اس نے فون بند کر دیا۔ کچھ لمحے سوچنے کے بعد وہ ایک بار پھر نمبر ڈائل کر رہا تھا۔

"ہیلو حارث کیسے ہو؟" اتنے عرصے میں یہ اس کی جانے والی پہلی کال تھی۔

"ارے واہ آج تو بڑے بڑے لوگ کال کر رہے ہیں۔" حارث اس کی آواز سن کر چہکا۔

"تم نے ماہین سے منگنی کیوں توڑ دی؟" پہلا سوال کیا گیا۔

"اچھا تو میرا گریبان پکڑنے کے لیے فون کیا ہے؟" حارث نے پر مزاح انداز میں کہا، مگر آفاق نے کوئی جواب نہ دیا۔

"منگنی کی اس لیے تھی کیونکہ وہ بہت اچھی لگی تھی، مجھے اور ختم اس لیے کی کیونکہ۔۔۔" اس نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔

"کیونکہ۔۔۔؟" آفاق کی بے تابی حد سے سوا تھی۔

"کیونکہ اس کے دل، آنکھوں، باتوں، مسکراہٹوں، ظاہر و باطن پر تم نقش ہو۔"

"واٹ؟" آفاق کے گمان میں بھی ایسا جواب نہیں

تھا۔

"ہاں... میں اس سے صرف ایک بار ملا ہوں اور اس ایک ملاقات میں ہی اس کے چہرے پر بہت آسانی سے پڑھ چکا ہوں۔ اس کی آنکھیں تمہارے ذکر پر روشن ہو جاتی ہیں' اس کے لب تمہارے نام پر مسکرا اٹھتے ہیں تو خود بتاؤ آفاق' میں کیسے منگنی قائم رکھ سکتا تھا؟" آفاق کے تنے ہوئے اعصاب کی رسیاں جیسے یک دم ڈھیلی پڑ گئیں۔ فون کان پر لگائے لگائے اس نے صوفہ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ حارث بول رہا تھا۔

"مجھے اس سے کوئی طوفانی قسم کی محبت نہیں تھی۔ بس اس کا شوخ و چنچل روپ بہت بھایا تھا۔ لیکن تم یقین کرو وہ اس ماہی سے بالکل مختلف ہو گئی ہے' جس سے میں اپنی برتھ ڈے پارٹی میں ملا تھا' اسے دیکھ کے یوں لگا ہے جیسے روح کو جسم سے علیحدہ کرنے کے بعد کسی تابوت میں رکھ چھوڑا ہو۔ اسے تمہاری ہی ضرورت ہے آفاق... صرف تمہاری۔"

"تھینکس حارث... تھینکس اے لاٹ یار۔" اس کی آواز و لہجے سے گہری ممنونیت جھلک رہی تھی۔

"ارے تھینکس کی ضرورت نہیں جگر' ایک طرح سے اچھا ہی ہوا جو ہوا' ورنہ سارہ یزدانی کیا کرتی جو میرے عشق میں گوڈے گوڈے ڈوب چکی ہے۔"

"او رئیلی؟"

"ہاں ہاں... اب تو میں گھوڑی چڑھنے کی تیاریاں بھی کر رہا ہوں۔" اس کی بات پر آفاق نے قہقہہ لگایا اور اللہ حافظ کہہ کے فون بند کر دیا۔ اس کے دل پر سے جیسے منوں وزنی سل سرک گئی تھی۔ سامنے دیوار پر لگی وال کلاک کے نیچے کیلنڈر پر نگاہ دوڑائی۔

"آٹھ اپریل۔" ماہین کی سالگرہ آنے پر پورے پانچ دن باقی تھے۔ مسکراتے ہوئے وہ اٹھا اور اپنے کمرے کی طرف چل پڑا' اسے ابھی سامان بھی پیک کرنا تھا۔

☼ ☼ ☼

ائیرپورٹ سے باہر نکل کر اس نے پاکستان کی فضا میں ایک طویل سانس لیا۔ وہاں اپنے پیاروں کو ریسیو کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی موجود تھا۔ کچھ سالوں بعد وطن واپس پلٹنے پر اشکبار تھے اور کچھ کی آنکھیں سراپا انتظار بنی اندر سے برآمد ہونے والے مسافروں کے چہروں کو ٹٹولتیں اور مایوس ہو کر پھر اندر دیکھنے لگتیں۔ کافی رات ہو رہی تھی' ساڑھے گیارہ کا عمل ہو گا' مگر ائیرپورٹ کی گہما گہمی میں کمی ہونے کی بجائے بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

بیگ گھسیٹتے ہوئے وہ باہر آیا' فضا میں خاص ٹھنڈک نہ تھی۔ بلکہ خوشگوار سی نرم نرم ہوا اسے تھپکیاں دے رہی تھی۔ اسے لینے کے لیے کوئی نہ آیا تھا' کیونکہ اس نے فرحان ماموں کو اپنے ساتھ ملا کر یہ سرپرائز تیار کیا تھا۔ چلتے ہوئے وہ باہر پہنچ گیا۔ کچھ خالی ٹیکسیوں میں سے دو تین ڈرائیور حضرات اس کی جانب لپکے۔ پیسے طے کرنے کے بعد وہ ان میں سے ایک ٹیکسی میں آبیٹھا اور ڈرائیور کو پتا سمجھایا۔ سبک روی سے چلتی ٹیکسی مختلف سڑکوں سے ہوتی ہوئی جانے پہچانے راستوں پر محو سفر تھی۔

خالی سڑکوں پر کچھ کچھ فاصلے پر لگی زرد سی روشنیاں اسے بہت اچھی لگ رہی تھیں اور اسے تو سبھی کچھ اچھا لگ رہا تھا' ایک عرصے بعد اپنے لوگوں' اپنے ملک واپس پلٹنے پر اس کے جذبات کی سطح مرتعش سی تھی' یہ کوئی اتنا عرصہ تو نہ تھا' مگر اس کے لیے بہت تھا جو کبھی کچھ دنوں کے لیے شہر سے باہر بھی نہ گیا تھا۔ کھڑکی سے آتی تیز ہوا کو روکنے کے لیے اس نے ہاتھ بڑھا کر شیشے چڑھا دیے اور سیٹ کی پشت کے ساتھ سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ ڈرائیور نے ایک بیکری کے سامنے گاڑی روک کے اسے اطلاع دی۔ یہ ہدایت بھی آفاق نے ہی اسے دی تھی۔

بیکری سے اس نے ماہی کی پسند کا بلیک فارسٹ کیک اور ڈھیر ساری چاکلیٹس' کینڈلز وغیرہ خریدیں۔

"بس ماہی تھوڑی دیر اور... پھر تیری سالگرہ اکٹھے منائیں گے۔" اپنی سرگوشی پر وہ خود ہی مسکرایا اور گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ بارہ بجنے میں کچھ ہی منٹ باقی تھے۔ لیکن وہ مطمئن تھا۔ وہ لیٹ ضرور ہو گیا تھا' مگر اتنا بھی نہیں۔

تقریباً" آدھے گھنٹے بعد ڈرائیور نے اسے مطلوبہ پتے پر پہنچنے کی اطلاع دی تو آنکھیں کھول کر اس نے اپنے گھر کے سیاہ گیٹ کو دیکھا۔ اتر کے سامان نکال کر پیسے ڈرائیور کو تھمائے اور ڈور بیل بجا دی۔ چوکیدار نے چھوٹی کھڑکی سے جھانکا۔

"ارے چھوٹے صاحب آپ؟" خوشی اس کے چہرے سے ہویدا تھی۔ سلام جھاڑ کر دروازہ کھولا۔ آفاق اس کے اشتیاق کو دیکھتے ہوئے مسکرایا اور حال احوال پوچھ کے اندر کی طرف بڑھ گیا۔ گلزار خان کے لیے بھی اس کی آمد سرپرائز بن چکی تھی۔

دروازہ کھول کے اندر داخل ہوا تو سامنے ٹی وی لاؤنج کے صوفے پر نیم دراز جنید ٹی وی دیکھنے میں محو ملا۔ کھٹکے پر مڑا تو مسرت و استعجاب سے چیختا ہوا اس سے لپٹ گیا۔

شور پر آسیہ اور جہانگیر کے ساتھ ساتھ فہد بھی اپنے کمرے سے برآمد ہوئے اور ناقابل یقین منظر پایا۔ آسیہ کتنی ہی دیر آفاق کو گلے لگائے کھڑی روتی رہیں۔ بہت شکوے شکایتیں ہوئیں۔ اس کے کان کھینچے گئے۔ پھر سب کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھا' لیکن دو چار لقمے لے کے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ آسیہ نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

"ماہی کی برتھ ڈے ہے ماما۔" اس نے مسکراتے ہوئے یاد دلایا تو آسیہ کو اپنی یادداشت پر افسوس ہوا۔

"کتنے شوق سے مناتی تھی اپنی سالگرہ۔ اب تو کملا کر رہ گئی ہے میری معصوم سی گڑیا۔ دیکھو اس نے کسی سے سالگرہ کا ذکر تک نہیں کیا۔" آسیہ رنجیدہ ہو گئیں۔

"او مائی ڈیر ماما! ابھی تو سالگرہ شروع ہوئی ہے' ہم کل ہی ایک شاندار پارٹی کا اہتمام کریں گے۔" آسیہ کے گرد بازو حمائل کر کے آفاق نے کہا تو جہانگیر نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

آفاق نے کیک والا شاپر پکڑا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"صبح چلے جانا آفاق... سفر سے تھک گئے ہو گے۔" آسیہ بولیں۔

"نہیں ماما... میں اب مزید دیر نہیں کرنا چاہتا۔" اس کے لہجے میں ایسا کچھ تھا کہ آسیہ مطمئن سی ہو کے مسکرا دیں اور اثبات میں سر ہلا کر گویا جانے کی اجازت دی۔

آفاق لان کی طرف کا دروازہ کھول کر دوسری جانب آ گیا۔ لان کی لائٹس جانے کیوں بند تھیں' مگر چاندنی اتنی تھی کہ وہ باآسانی راستہ دیکھ سکتا تھا۔

آگے بڑھتے ہوئے اس نے ماہی کے کمرے کی سائیڈ کھڑکی پر نگاہ ڈالی۔ اندر مکمل اندھیرا تھا' شاید وہ سو چکی تھی۔ یہی سوچتا ہوا وہ گھوم کر سامنے کی طرف پہنچا تو کمرے کے ٹیرس میں اسے ہیولہ سا دکھائی دیا۔ وہ حیرت سے بغور دیکھے گیا۔

"اتنی رات تک تو ماہی نہیں جاگ پاتی تھی' وہ تو مردوں سے شرط باندھ کر سونے والوں میں سے تھی۔" دبے قدموں چلتا ہوا وہ قریب ہو کر ٹیرس کے شیڈ کے نیچے کی طرف کھڑا ہو گیا اور اسے دیکھنے لگا۔

ماہی پورے چاند کو اتنی محویت سے تک رہی تھی کہ اسے لان سے گزر کے شیڈ تک آتے سائے نے بھی متوجہ نہ کیا۔ جانے کس مشغلے میں غرق تھی۔

وہ دائیں ہاتھ سے فضا میں انگلی بلند کرتی اور چاند پر ٹکا کر کچھ آڑی ترچھی لائنیں کھینچتی پھر مٹا دیتی۔ آفاق نے اس کی شہادت کی انگلی کی حرکت دیکھتے ہوئے سمجھنے کی کوشش کی اور سمجھ کر اسے حیرت کا خوشگوار جھٹکا لگا۔ وہ انگریزی کے چار حرف وقفے وقفے سے لکھ رہی تھی۔ وہ اس کا نام لکھ رہی تھی۔

وہیں دیوار کے ساتھ کھڑا... وہ محبت کی بارش میں بھیگنے لگا۔ چاندنی میں کھڑے وجود کو آنکھوں میں سمونے لگا۔

شاید اسے نیند آ رہی تھی یا وہ مشغلے سے تھک گئی تھی کہ اس نے ہاتھ گرا لیے اور پلٹی۔ آفاق کی محویت

ٹوٹی اور وہ سرعت سے بالکونی کے نیچے ہو گیا۔ اس کی رگ شرارت پھڑکی تھی۔ اندھیرے میں ہو کے اس نے گلے سے کچھ عجیب و غریب سی غیر انسانی آوازیں نکالیں۔ جاتے جاتے ماہی ساکت ہوئی اور تیزی سے پلٹ کر نیچے دیکھا۔ شیڈ کے نیچے کھڑا آفاق چاندنی میں اس کے سائے کو جھکا دیکھ سکتا تھا۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر اس نے اپنی ہنسی روکی' وہ اسے ڈرانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ بہادری کی آڑ میں وہ چڑیا جتنا دل لیے پھرتی تھی۔ اکثر وہ اکٹھے فلم دیکھنے بیٹھتے تو وہ لڑ مرنے کو تیار ہوتی تھی' مگر ہارر مووی نہیں لگانے دیتی تھی۔ تو آفاق اس کی بزدلی پر دل کھول کر قہقہے لگاتا۔

"ڈرپوک شپونکی۔" ایسے موقعوں پر دھڑلے سے یہ خطاب وہ سب کے سامنے دیتا پھرتا' مگر بات بات پر ہنستے ہیے اکڑنے والی ماہی اس لقب پر چپ سادھے رکھتی تھی' کیونکہ یہ حقیقت تھی۔

آفاق نے اس کے سائے کو پیچھے ہٹتے دیکھا اور باہر آگیا۔ وہ کمرے میں جا چکی تھی۔ اصولاً" تو اسے سیڑھیوں سے جانا چاہیے تھا۔ مگر اس کا شیطانی دماغ اب اسے بھرپور ستانے کے موڈ میں تھا۔

شیڈ کی ایک دراز میں پاؤں ٹکا کر ایک ہی جست میں وہ اوپر تھا۔ ٹیرس پر ہمیشہ کی طرح کین کی دو کرسیاں اور ٹیبل رکھی تھی۔ وہی پودوں کے گملے تھے' سب کچھ ویسا ہی تھا۔ اسے لگا یوں کے میں گزارے وہ ماہ و سال بھک سے کہیں اڑ گئے تھے۔

دبے قدموں سرکتا ہوا وہ دیوار کی طرف آگیا' ہاتھ میں پکڑا شاپر زمین پر رکھا اور موبائل کے ساتھ ساتھ لیزر لائٹ جیب سے نکال کے ہاتھ میں پکڑ لی۔ ابھی کچھ ہفتے پہلے ہی اس نے نیو ہارر ٹیونز ڈاؤن لوڈ کی تھیں۔ ان کے استعمال کا نادر موقع 'اور کب ملتا۔' چنانچہ موبائل آن کر کے پہلی ٹون پلے کی۔

گھنگھروؤں کی پراسرار سی جھنکار سن کے بیڈ پر لیٹی ماہی جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ آواز بہت مدھم تھی' مگر آ رہی تھی۔ اس کا دل دھڑ دھڑانے لگا' جیسے سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر آجائے گا۔ اس نے ٹیرس کی جانب دیکھا۔ آواز آنا بند ہو گئی تھی' مگر اس کا اطمینان رخصت ہو چکا تھا۔

ڈرتے ڈرتے وہ پھر لیٹ گئی اور سر تک چادر تان لی۔ یکلخت اسے دروازہ کھلنے کی چرچراہٹ سنائی دی۔ اس کے منہ سے گھٹی گھٹی سی چیخ برآمد ہوئی۔ چادر سے تھوڑا سا منہ نکال کر بالکونی کو دیکھا۔ دروازہ بند تھا۔ اب کی بار ہمت کر کے وہ اٹھی اور آہستہ آہستہ چلتی گلاس ڈور تک آئی' باہر کوئی نہ تھا۔

وہ واپس آکر بیڈ پر بیٹھی ہی تھی کہ دو سرخ انگارہ سی آنکھیں اسے اندر جھانکتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

آفاق کی جیب میں پڑی لیزر لائٹ بھی خاص کار آمد ثابت ہوئی تھی۔ ماہی کا خوف سے برا حال تھا۔

قریب تھا کہ وہ چیخنے لگتی اور سب کو اکٹھا کر لیتی۔ لائٹ اب غائب ہو چکی تھی۔ آیۃ الکرسی کا ورد کرتی وہ ٹیبل تک آئی اور کانچ کا لمبوترہ سا گلدان مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ گویا ہتھیاروں سے لیس ہو کے ایک بار پھر وہ دروازے تک گئی۔ اور لرزتی انگلیوں سے چٹخنی گرا کر ایک جھٹکے سے دروازہ دھکیل کر کھول دیا۔ دیوار کے ساتھ لگا آفاق برق رفتاری سے اس کے سامنے آگیا۔

"بھاؤ۔" خوف کے مارے ہاتھ سے گلدان چھوٹ کے کارپٹ پر جا گرا اور لرزتی کانپتی ماہی دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپے شدومد سے چیخ رہی تھی۔ آفاق نے فوری طور پر اس کے منہ پہ سختی سے ہاتھ جما کے چیخوں کو روکا۔

"شپونکی ڈائن مروائے گی کیا۔" ہنسی کے بھونچال میں رک کر وہ بولا۔

"فوقی بدتمیز اگر میں ہارٹ اٹیک سے مر جاتی تو بھی قبر سے آکر تیرا کچومر کر کے بھرتا بنا دیتی۔" ماہی نے معمول کے انداز میں اپنا من پسند جملہ بولا۔ یک دم خوف کے زائل ہو جانے پر اس نے آفاق پر گھونسوں کی بارش کر دی' جسے وہ دونوں ہاتھ سامنے کر کے روکنے کی کوشش کرنے لگا۔

"ڈرپوک شپونکی۔" اس نے چڑایا تو کھسیا کر ماہی خود بھی زور سے ہنس پڑی اور ایک زور کا گھونسا اسے رسید کیا۔

"فوقی بدتمیز' فوقی جنگلی' فوقی بے ہودہ۔" تابڑ توڑ حملے کرتے ہوئے وہ نان اسٹاپ بولتے بولتے جھٹکے سے رکی۔ جیسے وہ اب ہوش میں آئی تھی۔

"فوقی۔۔۔ آفاق۔۔۔" دم سادھے وہ آنکھیں پھاڑے سامنے کھڑے وجود کو یوں دیکھنے لگی جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔

"گدھے کو ہمیشہ تاخیر سے سمجھ آتی ہے۔" اس کے دم بخود سے ہو جانے پر اس نے بمشکل اپنی ہنسی ہونٹوں میں دبا کے کہا۔

"تو۔۔۔ تو دفع ہو جا یہاں سے' اب کیا لینے آیا ہے؟" دماغ نے جیسے برق رفتاری سے صورت حال اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ یک دم اسے آفاق کی بے اعتنائی اور اس سے اپنی ناراضی یاد آگئی تھی۔

دھکا دے کر اس نے گلاس ڈور بند کرنے کی کوشش کی۔

"مے شپونکی۔۔۔ یوں کرے گی تو میں پلٹ جاؤں گا اور کبھی واپس آؤں گا بھی نہیں۔" کہہ کے وہ مڑا۔ وہ جانتا تھا گلاس ڈور بند کرتے کرتے ہاتھ رک گئے ہوں گے اور ایسا ہی ہوا تھا۔ بہت خاموشی پر اس نے مڑ کر دیکھا۔ دروازے کے پاس کھڑی وہ بالکل ساکت تھی۔ ہاں بس اس کی آنکھیں بول رہی تھیں۔ آنکھیں چھلک رہی تھیں۔

جیسے شبنم کے قطرے ہلکی سی چوٹ پر ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔ آفاق چلتا ہوا اس کے سامنے آیا اور دونوں کان پکڑ کے قدرے جھک کے بولا۔

"معاف نہیں کرے گی مجھے؟" بھیگے چہرے کو دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا تو وہ اس کے کندھے سے لگی اس بچے کی طرح بلکنے لگی' جسے اس کا پسندیدہ کھلونا کھو گیا ہو۔

اس نے جی بھر کے رونے دیا' بہت دیر بعد وہ سنبھلی تو اس نے آنسو پونچھتے ہوئے اسے چڑایا۔

فرحین اظفر

"جا اپنی سڑی ہوئی شکل دھو کے آ۔" حربہ کارگر رہا وہ اپنی صورت پر بات برداشت نہیں کرتی تھی۔

"میری فکر چھوڑ اپنی کر۔ وہاں کے پانی نے تیرے نسواری رنگ کو مزید نکھار کے تارکول جیسا کردیا ہے۔" سوں سوں کرتے ہوئے دوپٹے سے منہ صاف کرتے کرتے بھی اس نے حساب بے باق کردیا تو آفاق ہنس پڑا۔ وہ واش روم کی طرف چل پڑی۔

کچھ منٹوں بعد باہر آئی تو ٹیرس میں زرد سی روشنی ہو رہی تھی۔ متجسس سی ہو کے وہ باہر نکلی۔ میز پر کیک رکھا تھا اور اطراف میں موم بتیاں روشن تھیں۔ یہ حیرت کا دوسرا جھٹکا تھا۔

جلتی شمعیں، روشن چہرے
کامنی لڑیاں، نازک سہرے
نرگس، بیلا، موتیا، لالہ
جوہی چمپا اور بنفشہ!
ہر کوئی یاں شاد ہے نا
آج تمہاری سالگرہ ہے
دیکھو ہم کو یاد ہے نا!

کہتے ہوئے وہ اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"ارے۔" ماہی کو آفاق نے حیران کردیا تھا۔ اسے یاد تک نہ تھا۔

"شیمپو تکی کی بزتھ ڈے وہ خود بھول سکتی ہے، مگر فوقی نہیں۔" آفاق نے ڈائیلاگ جھاڑا۔ موم بتیوں کی روشنی میں اس کا دھلا دھلایا گلابی چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ آفاق یک ٹک اسے دیکھے گیا۔ بوجھل سی خاموشی دو دلوں کو ایک ہی لے پر دھڑکا رہی تھی، جانے کیوں۔

"بہت اچھی دوستی محبت کے لیے پائیدان کا کام دیتی ہے، مجھے سمجھنے میں بہت تاخیر ہوئی۔" بہت آہستگی سے وہ بولا۔

"پرخلوص و بے ریا رشتے پر سیڑھی در سیڑھی چڑھتے ہوئے ہم کب محبت کے گوہر کو پا لیتے ہیں، ہم جان ہی نہیں پاتے۔" نظر جھکا کے اس نے جیسے اعتراف کیا۔ اس کے جملوں پر ماہی منہ کھولے اس کی جانب دیکھنے لگی، جیسے بات سمجھنے کے لیے بری طرح سر پیٹ رہی ہو۔

"اس محبت کا بار تنہا اٹھائے اٹھائے میں شل ہو گیا ہوں۔" ماہی نے ذرا کی ذرا اس کے وجیہہ چہرے پر نظر ڈالی جو شدت جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔

ہم لبوں سے کہہ نہ پائے ان سے حال دل کبھی
اور وہ سمجھے نہیں یہ خامشی کیا چیز ہے

بہت دیر سے خاموش بیٹھی ماہی کے لب دھیرے سے ہلے۔

"یہ بار محبت اگر تنہا اٹھا رہے ہوتے تو ان رتجگوں کا حصہ میں کبھی نہ بنتی۔" اظہار ہو رہا تھا۔ محبت کا سحر دونوں کو اپنی اوڑھنی میں چھپائے مخمور کیے دے رہا تھا۔

موم بتیوں پر پھونک مار کر اس نے چھری سے پیس کاٹا اور آفاق کے سامنے کیا جو اس کے خوب صورت سے جوابی اعتراف پر مسکرائے چلا جا رہا تھا۔

آفاق نے تھوڑا سا کیک کھایا اور وہی پیس پکڑ کے ماہی کو کھلانے لگا، لیکن اس کے اندر بسے شیطان نے پھر ایک زور کی انگڑائی لی اور اس نے کیک کھلاتے کھلاتے پورا ٹکڑا اس کے منہ پر مل دیا اور اٹھ کر اندر بھاگا۔ کچھ لمحے تو ماہی سمجھ ہی نہ پائی کہ ہوا کیا ہے۔

"پہلے مجھے شک تھا، اب تو یقین ہو گیا ہے، میری سالگرہ کا دن ہی تیری موت کا دن ہو گا فوقی بدتمیز۔" اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے وہ کمرے میں داخل ہوئی جو بے تحاشا ہنستے ہوئے اچھل کر بیڈ پر پھر بیڈ سے صوفے پر اور پھر وہاں سے ٹیرس تک دوڑ لگا رہا تھا۔ اسے جان بچانا ناممکن سا لگ رہا تھا، مگر اب جان بچانے کا خواہش مند ہی کون تھا۔ دو نفوس پر مبنی محفل ایک بار پھر کشت زعفران بن گئی تھی۔ شمعیں صرف ان کے دل میں روشن نہیں تھیں، بلکہ پوری فضا میں چراغاں ہو رہا تھا۔

☼ ☼

اس کی مانگ کی مانند سونی اجڑی شام افق سے اس پار کا سفر تھکے ماندے قدموں سے طے کر رہی تھی۔

ویران آنکھوں کے سرخ ڈورے ہجر کی سرخی میں مدغم تھے۔ سونی کلائیوں سے پھوٹی ٹوٹے کانچ کی سی یادیں ہجر کا نوحہ سنا رہی تھیں۔

"صوفیہ! اری او صوفیہ۔"

جانے کب سے اماں آخری سیڑھی کے پاس کمر پر ہاتھ رکھے جھکی کھڑی تھیں ان سے اب سیدھا کھڑے ہو کر چلا نہیں جاتا تھا۔ بلکہ چلنا تو دور کی بات' ان کا دھان پان وجود تو دن بہ دن لاچاری کی تصویر بنتا جا رہا تھا۔

"ہیں کیا؟" اس کی دماغی رو ایسی ہو چکی تھی۔ جیسے ڈار سے بچھڑی کونج' یہاں سے وہاں سمت کے تعین میں ڈولتی' چکراتی۔

"دونوں وقت مل رہے ہیں۔ نیچے آجا۔" انہوں نے بلاوجہ ہی کچھ کہنے کا ارادہ موخر کر کے بات بھی سمیٹی۔ اور مڑتے مڑتے ضعیف آنکھوں سے بہہ نکلنے والا آخری بے بس آنسو بھی۔

سیڑھیوں کے ساتھ بنی سیمنٹ کی دیوار پر نم ہتھیلی جما کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی اسے لاغر ٹانگوں کے اوپر اپنے جسم کا بوجھ اٹھا کر چلنا بے حد دشوار معلوم ہوتا تھا۔ بمشکل گہری سانس بھر کے اس نے بے جان وجود کو کپکپاتے پیروں کے سہارے کھڑا کیا۔ اسی پل شام کی گنجلک سرمئی فضا گولیوں کی سفاک تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔

اماں وضو کر کے اندر کمرے میں سوئے بچوں تک نہیں پہنچی تھیں کہ گرتے پڑتے' صحن کی سیڑھیوں کی جانب واپس دوڑیں۔

"صوفیہ۔ ارے کب سے کہہ رہی ہوں کدھر ہے تو۔ نیچے مر آ کے۔" اماں کی کانپتی آواز لحہ بھر میں بھرا گئی۔ وجود آخری سیڑھیوں کے قریب ڈول گیا۔ صوفیہ بے دم ہو کر واپس ڈھے چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

چولہے پر چڑھی تام چینی کی دیگچی میں خوشبوئیں اڑاتی دودھ پتی جوش مار رہی تھی۔ گوری کلائیوں میں پھنسی ہری ہری کانچ کی چوڑیاں' ہر بار پیڑے کی گولائی برابر کرتے ہوئے خوشی سے ناچ اٹھتیں۔ اس کے گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ کسی نوخیز کلی کی چٹکن کی طرح سجی تھی۔

سال کا کوئی بھی دن ہو' موسم کی کوئی سی بھی شام' بہار کی خوشبو میں لٹاتی یا سردیوں کی دم سادھے گہری کی سبک خرام۔ خزاں کی زرد اوڑھنی میں خاموشی کی بکل مارے۔ اس کا سنگھار ہر شام مکمل ہوتا۔

مسکان شام کے تازہ اخبار کی طرح اپنے سرتاج کی شکل دیکھتے ہی دھڑ سے لبوں کے کناروں پر آگرتی۔ آنکھوں میں لپکتی اور سرخوشی جسم کے انگ انگ سے پھوٹ پڑتی۔ لمبی چوٹی میں پڑے نیچے تلے بل۔ نین کٹوروں میں کاجل کی دھار سجائے۔ اس کی سنگی سہیلی سنہری شام جونہی دہلیز پر ٹھہرا دھوپ کا زعفرانی پردہ اٹھا کر اس کے آنگن میں سر ڈالتی۔ وہ نرم پیروں میں چپل اڑستی اٹھ کر رسوئی کی سمت چل دیتی اور عین اس وقت جب وہ چائے کی پیالیاں برابر کر کے باہر نکلتی۔ بیرونی دروازے کی مخصوص دستک اور اس کے دل کی کلی کھل جاتی۔

"امی! ابو کہہ رہے ہیں۔ چائے لے آئیں۔" سوچوں کی روانی بہت نرمی سے رکاوٹ کی زد میں آئی تھی۔

"کہنا امی کہہ رہی ہیں۔ جی اچھا۔"

ملکی حالات کس نہج پر جا رہے تھے۔ کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔

گھنٹوں لائٹ کی عدم دستیابی اور اسی کے کارن خالی غراتے نلکے سارا دن حسرت زدہ نگاہوں سے اسے تکتے۔ کبھی جو خوش قسمتی سے سارا دن پانی آجاتا تو گھر میں جیسے عید کا سماں ہوتا۔

اس وقت بھی وہ سر شام مغرب کے جھٹپٹے سے پہلے کھانا پکا کر فارغ ہو جانا چاہتی تھی۔ کیونکہ اب سننے میں آیا تھا کہ وقت بے وقت گیس کی لوڈشیڈنگ بھی حکمرانوں کی کمال مہربانی سے متوسط اور نچلے طبقے کی آبادی کا رخ کرنے والی تھی۔

یوں بھی پچھلے کچھ دنوں سے جہاں دو وقت ملنے کا سمے' اللہ اکبر کی صداؤں کے ساتھ سر اٹھاتا وہیں پوری کالونی کو گہرا اندھیرا اپنے سیاہ پروں سے ڈھانپ لیتا۔

"خدا کی مار ہو۔ مغرب کا وقت ہے۔ اذانیں ہو رہی ہیں اور ایسے وقت میں گھر اندھیرے پڑے ہیں۔"

اماں اپنے خیالات کا برملا اظہار کرتیں اور وہ دل و جان سے متفق ہونے کے باوجود مسکراتے لب سمیٹے بس چپ چاپ اپنے کام تندہی سے انجام دیتی رہتی۔

آخری روٹی چنگیر میں لپیٹ کر اس نے چائے کپوں میں انڈیلی اور اندر کمرے میں بچوں کے ساتھ ساتھ ننھی منی شرارتیں کرتے ساجد کے سامنے لا دھری۔

"میں آپ سے..."

اس نے کوئی بات کرنے کی خاطر تمہید کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ ساجد نے اسے چپ کروا دیا۔

"شی... ی... ی۔" اس کی نظریں ٹی وی پر جمی تھیں۔ ماتھے پر تفکر کی گہری شکنیں اور ارتکاز کا یہ عالم تھا کہ کتنی ہی دیر گزری۔ اس کے ہونٹوں پر جمی انگشت شہادت ابھی تک لبوں کے وسط میں ٹھہری ہوئی تھی۔

تب اس نے نگاہیں گھمائیں ایک طائرانہ جائزے سے اندازہ ہوا کہ کھیلتے کودتے بچے بھی سہم کر ایک کونے میں بیٹھے تھے۔

"شہر کے مختلف علاقوں میں نامعلوم شرپسندوں کی فائرنگ سے تین افراد جاں بحق اور متعدد زخمی۔"

"ہائے ربا۔" اس کا دل پھڑ پھڑا سا گیا۔

"ہم آپ کو لیے جا رہے ہیں مقتول کے لواحقین کے پاس جو..." ٹی وی پر نظر ڈالتے ہی اسے بھی اسی سکتے نے جکڑ لیا۔ جو وقت بے وقت ساجد پر ٹی وی دیکھتے حملہ آور ہو جاتا تھا۔

بین کرتی عورتیں' روتے ہوئے بچے... ایدھی کی چھاپ لگی سفید چادروں کے پیچھے چھپے خونی بے جان بدن یکے بعد دیگرے کراچی کے سب سے بڑے سرکاری ہسپتالوں کی ایمرجنسی میں' ایمرجنسی سے اتر کر مردے خانے تک کا سفر کرتے ہوئے۔ اپنے ساتھ ہوئی زیادتی' ناانصافی کا بذات خود منہ بولتا مگر خاموش ثبوت۔

"خدا کی مار ہو ان ظالموں پر۔ میرے کلیجے کا ٹکڑا نوچ لے گئے۔ خدا غارت کرے۔" گریبان پیٹتی' سر کے بال نوچتی عورت کی پھٹی ہوئی آواز نے جیسے اس کا سکتہ توڑ ڈالا۔

"ساجد!" اس نے تڑپ کر اسے پکارا وہ ایک دم چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

وہ جو کہنا چاہتی تھی کہ اس کے نرم خو چہرے پر چھائی سنجیدگی دیکھ کر بول نہ سکی۔ اس نے کپ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔ مگر اسکرین بدستور شور مچا رہی تھی۔

"سول ہسپتال میں مشتعل افراد کی توڑ پھوڑ سے دو ڈاکٹرز زخمی اور پیرامیڈیکل اسٹاف پر تشدد۔"

اگلی خبر کی پٹی بجی بنی نیوز کاسٹر کے لبوں تک رسائی پا گئی تھی۔

"بند کر دیں نا کیوں گھر آ کے ہر وقت خبریں لگائے رکھتے ہیں۔"

"تو اور کیا لگاؤں۔" وہ ایک چینل سے دوسرے پر منتقل ہو گیا۔ صوفیہ کا دل بجھ سا گیا۔

اسے دو طرح کے غم ایک ساتھ لاحق ہوئے ایک دم ہی۔

ہمارے وطن کو کن لوگوں کے ہاتھوں میں کن لوگوں نے کھلونا بنا ڈالا۔ نہ کسی کی جان حفاظت میں رہی۔ نہ عزت نہ مال دوسرا شکوہ سراسر ذاتی نوعیت کا تھا۔

نجی نیوز چینلز کی بھرمار نے عوام کو لمحہ لمحہ بالخصوص بری سے بری خبر سے آگاہ کرنے کا جو بیڑہ اٹھایا تھا۔ اس میں اس جیسی گھریلو عورت کے ارمان بڑی بے دردی سے کچلے گئے تھے۔

اب آفس اور کاروبار سے گھر لوٹتے، تھکے ہارے مردوں کی تھکن بڑھنے اور گھٹنے اور اترنے کا ذریعہ یہی خبر رساں چینل بن گئے تھے۔

"میری طرف تو نظر اٹھا کر دیکھنے کا بھی وقت نہیں ہے ان کے پاس۔" دور خاموش بیٹھے بچے اب توجہ حاصل کرنے کے لیے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"صوفیہ۔" اسی دم اماں نے کمرے کی دہلیز پر آکر اسے پکارا۔

"نماز نہیں پڑھنی تو نے آج۔"

اس نے ایک گہری سانس لے کر جان سے عزیز جیون ساتھی کو دیکھا۔ وہ چائے کا کپ خالی کر کے پرے کھسکا چکا تھا۔ اس نے کپ اٹھالیا۔

اب کی بار چوڑیوں کی کھنکناہٹ میں خوشی کی چہکار کے بجائے ناقدری کا احتجاج تھا۔ مگر مقابل کے پاس غور و فکر کے لیے موضوعات اور بھی تھے۔ اس نے ایک جلی کٹی نظر میک اپ کے بوجھ تلے دبی نیوز کاسٹر پر ڈالی اور سر پر آنچل ڈالتی اٹھ گئی۔

"چلو تھوڑی دیر چھت پر چلیں۔" اس کا مخاطب بچے تھے۔

"ہاں ہاں لے جاؤ۔ ابھی پانچ منٹ میں لائٹ چلی جائے گی۔ یہ لوگ کوئی کام کی بات سننے نہیں دیتے۔" ساجد کو اس کا دھیان آیا بھی تو کب۔

"قتل و غارت، چوری، اغوا اور ڈکیتی کی خبروں میں بھلا ساجد کے کام کی کون سی بات تھی۔" وہ خفا خفا سی دیر تک سوچتی رہی۔

✡ ✡ ✡

روزانہ دو گھنٹے کی کوفت اٹھوانے والی بجلی، آج روٹھی محبوبہ کی طرح انتظار کروا کروا کر چار گھنٹے میں واپس لوٹی تھی۔

اس نے کمال پھرتی سے موٹر چلا کر پانی چڑھایا۔ پھر گرمی سے پسیجتے، بلکتے گھبراتے بچوں کو شہڑ شہڑ بوچھاڑ سے نہلا دھلا کر شانت کر دیا۔ پنکھے کی ٹھنڈی ہوا سے دونوں بچے شانت ہو کر سو گئے۔

"امی، ابو سے کہیے گا میرے لیے جھنڈا اور فورٹین اگست کے کپڑے ضرور لے آئیں۔" اس کے لبوں پر کئی دنوں سے یہی فرمائش تھی۔ یوم آزادی میں دن بھی تھوڑے رہ گئے تھے۔ مگر ہائے غریبوں کی مجبوریاں۔

جن گھروں میں گوشت صرف مہینے کی ابتدائی تاریخوں میں ایک آدھ بار اپنی شکل دکھاتا ہو اور کمیٹی نکلنے پر بچے انتہائی ارمانوں سے مزار قائد کی سیر کو جاتے ہوں۔ جہاں پہلی کو ملنے والی مزدوری، پانچ کو ٹاٹا بائے بائے کرتی ہاتھ جھلاتی نکل جاتی ہو۔ وہاں کسی دن کے لیے خاص رنگ اور انداز کے کپڑوں کی فرمائش۔

صوفیہ بے اختیار دل مسوس کر رہ گئی۔

"ہاں ہاں، ضرور کہہ دوں گی۔" ممتا کی ماری اپنے بچے کو تسلی دینے سے نہیں چوکتی تھی۔ اماں مصلے پر بیٹھے بیٹھے مسکراتی ہوئی تسبیح کے دانے گراتی گئیں۔

اسی دم کسی نے دروازہ زور سے دھڑدھڑایا۔

"اللہ خیر!" وہ ایک دم چونکی سی ہو گئی۔ ساجد کو گھر آنے میں دیر سویر اکثر ہی ہونے لگی تھی۔ مالکان اجرت سے زیادہ کام لینے کو باعث فخر سمجھتے تھے اور محکوم رعایا ازل سے مجبور تھی۔

مگر یہ اس کے دستک دینے کا انداز نہیں تھا اور اماں نیت باندھ چکی تھیں۔ مجبوراً وہ اٹھ کر دروازے تک آئی۔

"کون!" بلا ارادہ سر پر آنچل لیا۔

"میں ہوں باجی، اعجاز، اجو۔" ایک کرختگی جھلکاتی آواز جسے کسی سرکاری اسکول کے بگڑے ہوئے بچے کی طرح زبردستی اخلاقیات کی چھترول کر کے سدھارنے کی کوشش میں نرم اور باادب بنایا گیا تھا۔

چہرے پر دوپٹے کی نقاب ڈال کر اس نے ذرا کی ذرا ایک پٹ وا کیا۔

"سلام باجی۔ میں ادھر ہی ہوتا ہوں آپ کے محلے میں۔" وہ منہ سے کچھ نہیں بولی۔ البتہ آنکھوں میں تحریر واضح تھی..... "تو؟"

"پارٹی کے لیے چندہ دے دیں۔" وہ متذبذب

ہوئی۔

انسان صدقہ خیرات دے تو کوئی فائدہ بھی ہو۔ مگر سامنے والے اس دس کے نوٹ کے عوض بھی کئی طرح کے فوائد پہنچانے کا دعوے دار بنا کھڑا تھا۔

وہ دس کے نوٹ کے ہمراہ واپس پلٹی۔

گو دل تو نہیں چاہتا تھا مگر ساجد کی خاص تاکید تھی۔ ان مشکوک تنظیم زدہ لونڈے لپاڑوں کے زیادہ منہ لگنے کی ضرورت نہیں۔

"شکریہ باجی میں یہیں محلے میں ہوتا ہوں۔ آنا جانا لگا رہتا ہے۔ کبھی کسی کام کی ضرورت ہو تو مجھے پکار لیجیے گا۔ اجو کہتے ہیں مجھے۔"

لمبا ڈیل ڈول اور آنکھوں سے جھلکتی سفاکی اس مہربان صفت بات سے میل نہیں کھا رہی تھی۔

"اچھا' شکریہ۔" اس نے مختصرا" بول کر جان چھڑانی چاہی۔

"نہیں نہیں شکریہ کیسا ہم تو ہیں ہی عوام کے نمائندے۔ ہمارا کام ہی آپ کی خدمت ہے ہماری پارٹی کے منشور میں سب سے اہم بات ہی یہی ہے کہ ....."

وہ آنے والے کچھ سیکنڈ زپارٹی بازی کا اشتہار بنا رہا۔ پھر' پھرتی سے بائیں ہاتھ میں پکڑے پلاسٹک کے تھیلے سے کاغذوں کا ایک پلندہ برآمد کیا۔

"یہ لیں۔ اسے پڑھ کر فوری فیصلہ کیجیے گا۔ دیکھیں ہم کسی سے جھوٹ نہیں بولتے' نہ کوئی کھوکھلے دعوے' نہ جھوٹے وعدے۔ حالات دیکھیں کس قدر خراب ہیں۔ الیکشن بس ہوئے کہ ہوئے اور ہمیں اب آپ سے کیا چاہیے۔ کچھ بھی نہیں صرف ایک ووٹ آپ کو پتا ہے ایک ووٹ کتنا قیمتی ہوتا ہے۔ صحیح حق دار کو اگر ....."

وہ اس کی چرب زبانی کی قائل بھی ہوئی اور اکتائی بھی وہ اب ایک پمفلٹ نما کاغذ اس کی طرف بڑھائے کھڑا تھا۔

مضبوط کلائیاں لیکن میل سے اٹی ہوئی۔ گندگی بھرے بڑھے ہوئے ناخن' کلائی سے ذرا اوپر۔ پارٹی کے جھنڈے کا بینڈ لپٹا تھا اور چوڑی ہتھیلی میں دبا عوام کے خوابوں کا خریدار کوئی نیا تاجر اور اس کی وضع کردہ حکمت عملی کا پروانہ۔

"نہیں مجھے اس کی ضرورت نہیں۔" ایک تو اس کی لسوڑے کی سی خصلت اور اپنی پارٹی کی جی جان سے اس قدر تعریفیں۔ وہ جی بھر کے بے زار ہوئی۔

"کوئی بات نہیں باجی۔ اچھا اب اگلے مہینے آؤں گا چندہ لینے آپ کو کسی بھی قسم کی ضرورت پڑے بندہ حاضر ہے۔ چھوٹا بھائی سمجھ کر کہہ دیجیے گا۔"

وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا جھکا۔ اس نے داڑھی اور بالوں کو کھچڑی کی طرح رکھ چھوڑا تھا۔

نوٹ کرتے کی داہنی جیب میں اڑس کر اس نے کھچاک سے رسید پھاڑی بالکل کسی ماہر معالج کی طرح اور اس کی طرف بڑھا کر برابر والا دروازہ بجاتے آگے بڑھ گیا۔

صوفیہ نے ایک گہری سانس لے کر دروازہ بند کرنے سے پہلے خالی سنسان گلی میں ایک مایوسانہ نظر ڈالی۔ دوسرے سرے تک کوئی ذی نفس موجود نہ تھا۔

دروازے کے کواڑ بھیڑتے' اس کے چھبیلے دلہناپے پر اوس آگری۔ ساجد کو آج بھی آنے میں دیر ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

گہرے سرمئی آسمان پر دور کہیں کہیں ستاروں کی جھلملاہٹ تھی۔ موسم ابر آلود نہیں تھا اور آسمان صاف ہونے کے باوجود ہوا بڑی رکی رکی سی تھی۔ فضا میں ایک نامحسوس سی سوگواریت اور تپش تھی۔

اور کیوں نہ ہو۔ اس پاک مٹی کے کتنے ہی بیٹوں کا لہو اس زمین پر ناحق بہایا جا رہا ہے۔ کتنی مائیں' بہنیں' بیویاں' بیٹیاں اپنے سہاروں سے' اپنے پیاروں سے محروم کر دی گئیں۔ فضا میں ان کی آہ و بکا سے تپش نہ ہو گی تو اور کیا ہو گا۔ ماحول پر چھائی سوگواریت بال کھولے بین کرتی ہے۔ کتنے بچے یتیم ہو گئے۔ کتنے گھروں کا چولہا بجھ گیا مگر کسی کو اس سے کیا۔

کونے میں بچھی چارپائی پر سکڑی سمٹی اماں نے کروٹ لی اور سال خوردہ چارپائی کی کراہ نکل کر فضا کو مرتعش کر گئی۔

دور کہیں سے کسی جھینگر کے بولنے کی آواز مستقل ہی خاموشی کے ساتھ راز و نیاز کرتی اس کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔

اس نے خود پر تانا ہوا جارجٹ کا باریک دوپٹہ بے زاری سے گولا بنائے سرہانے کی طرف پھینک دیا اور کروٹ بدل کر ساجد کو دیکھا۔

"ابھی تک جاگ رہے ہو جی۔ خیریت۔" لمحہ بھر سے بھی کم وقت لگا تھا ساری بے زاری ہوا ہونے میں اس نے پھرتی سے اس کی جانب کھسک کر اپنے اور اس کے درمیان موجود چند بالشت کے فاصلے کو مٹانا چاہا۔

"اوں ہوں۔ اماں لیٹی ہیں۔" وہ اتنی ہی سرعت سے پرے ہو گیا۔

"تو کیا ہے۔ اماں ہیں کوئی؟ جن تو نہیں جو کھا جائیں گی۔ ویسے بھی ان کا منہ اس طرف ہے۔" وہ خفا سی ہو کر دور ہو گئی۔

"اچھا سنو!" چند لمحوں بعد ہی خفگی ختم ہو گئی۔

"آج چودہ اگست کے لیے جھنڈے اور نئے کپڑوں کا کہہ رہا تھا۔ اسے لا دو نا بے چارا بڑے دن سے فرمائش کر رہا ہے۔" وہ ممتا بھرے مان سے اسے دیکھنے لگی۔

"کل لا دوں گا۔" گہری سانس کے ساتھ اس کے لبوں سے وا الفاظ نکلے۔

"ہیں سچی۔" وہ خوشی کے مارے ایک دم سیدھی ہوئی۔ پھر اتنی ہی تیزی سے پٹاخ کے ساتھ اپنی پنڈلی پر ایک ہاتھ مارا۔

"توبہ ہے۔ اس قدر مچھر ہیں۔ جس کی کوئی حد نہیں ہاں تو کیا کہہ رہے تھے تم..... کل لا دو گے نا۔"

"کیوں یقین نہیں آ رہا۔" ساجد نے ایک محبت بھری مسکراہٹ اس پر نچھاور کی اور اسے بازو سے تھام کر خود پر اوڑھ لیا۔

"تو پھر میرے لیے کانچ کی چوڑیاں بھی لے آنا۔" فرمائشی لسٹ نہال ہوتے ہی طول پکڑنے لگی۔

"اور کچھ۔"

"اونہہ' ہوں۔" وہ اس کے گریبان پر چمکتے بٹنوں سے کھیلنے لگی۔

"لائیٹ آ گئی ہے۔ نیچے چلیں۔"

ساجد نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ سرہلاتی بچوں کی جانب بڑھی۔ پھر رک گئی۔

"بچوں کو رہنے دے۔" ساجد نے اس کی کلائی تھام رکھی تھی۔

حبس زدہ فضا میں کوئی چمکتا پون کا جھونکا آ کر دبے پاؤں اس کی زلفیں بکھرا گیا۔ ساجد کے چوڑے شانوں پر نظریں جمائے وہ چودھویں کی دلہن کی مانند سہج سہج کر سیڑھیاں اتر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

صبح سورج کی ---- کرنیں اس کے بالوں کی نمی جذب کر رہی تھیں۔ گھی میں تر تراتے پراٹھے کی خوشبو سے اس کا اپنا دل بھی للچانے لگا تھا۔

"شہر جاؤ گے آج۔" اس نے بے انتہا محبت سے ایک نوالہ بنا کر اپنے ہاتھ سے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

کراچی کے مضافات اور نیم پختہ آبادیوں کے باسی آج بھی صدر اور ٹاور کو شہر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جو کراچی کے مصروف ترین کاروباری علاقے ہیں۔

"ہوں۔"

"اس کے لیے جھنڈیاں اور کپڑے....." اس نے پرسوچ انداز میں بات ادھوری چھوڑی۔

"لے آؤں گا۔" چائے کے کپ کی آخری چسکی پر حتمی فیصلہ ہوا اور وہ اٹھ گیا۔ صوفیہ دیر تک دروازے میں کھڑی اسے لمحہ بہ لمحہ دور جاتا دیکھتی رہی۔

جہاں سے وہ موڑ مڑ کر اس کے خیالوں تک آباد رہ جاتا تھا۔ وہیں سے واپسی کی گھڑیوں کی گنتی شروع ہوتی تھی۔

نظریں دیوار گیر گھڑی کی چھوٹی والی نہیں بڑی بھی نہیں۔ سیکنڈ کی ہردم متحرک رہنے والی ' لحہ لحہ جدائی کے لمحات مختصر ہونے کی نوید دینے والی سوئی پر ٹھہر کتی رہتیں۔ کتنی عجیب بات تھی کہ یہ گھڑی دن رات ایک ہی سیل سے زندہ رہتی تھی۔ مگر اس کے دل کے کھلنے اور مجسم امید لمحوں میں اس کی رفتار بالکل الٹ پلٹ ہوتی رہتی تھی۔ کبھی لگتا گھڑی تو چل رہی ہے۔ پر گھڑیاں رک گئی ہیں۔ چلتی ہی نہیں۔

فرقت و قربت کا یہ کھیل روز بلا ناغہ کھیلا جاتا۔ انتظار کی لذت۔ دھڑکوں کا پل صراط اور اندیشوں کی اذیت روزانہ کے سورج کے ساتھ ہی طلوع ہوتے اور شام ڈھلے ساجد کی آمد کے ساتھ ہی دل کے مغربی کونے میں غروب ہو جاتے۔

سارا دن ہاتھ کا پنکھا جھلاتے ' کبھی موم بتی کی لڑکھڑاتی لو کی طرح جلتے چولہے کے بھڑک اٹھنے کا انتظار کرتے ' موٹر چلا چلا کر ' سانپ کی طرح پھنکاریں مارتے خالی وال کو مایوسانہ نظروں سے تکتے گزرتا تھا۔ مو روز کا معمول ' معمول ہی رہا اور معمول سے ہٹ کر اگر کوئی بات ہوئی تو وہ ساجد کے معمول میں تاخیر کی تھی۔

اس کا دوران خون ہر گزرتے لمحے ' قدم بہ قدم اوپر کی طرف گامزن رہا۔ اس نے بلاوجہ بچوں کے دو تھپڑ رسید کیے۔ اماں نے مرغی کی طرح سہمے ہوئے وجودوں کو اپنے پروں میں سمیٹ لیا۔ وہ اس کی بے چینی سے واقف خود بھی اسی بے کلی کا شکار تھیں۔ نہ کوئی خیر نہ کوئی خبر۔

گھر میں صرف ایک سیل فون بیلنس یا کریڈٹ کے بوجھ سے آزاد ' صرف سبز رنگ کا بٹن دبا کر اگلی طرف والے کی بات سننے کے فرائض انجام دیتا تھا۔ سو اس وقت ہنگامی صورت حال میں حکومتی عہدیداران کی طرح سٹی گم کیے پڑا تھا۔

بیرونی دروازہ ' صحن ' پھر برآمدہ ' پھر کمرہ پھر دو قدم کا آنگن اور سب سے پچھواڑے سے باورچی خانے تک اس کے قدموں نے کتنی بار لانگ مارچ کر ڈالی۔

مسلسل ہلتے لبوں پر قرآنی آیتیں اور اپنے سرتاج کی سلامتی کی دعائیں اور آنکھوں میں خوف کی پرچھائیں۔

شاہ خاور کی سرخی بڑھتے اندھیرے سے ہار مان کر ستاروں کو جلا بخشتی کہیں دور کھو گئی ٹمٹماتی روشنی میں ماہ امید کی کوئی جھلک باقی نہ رہی۔

اس نے ایسی سہمی بچی کی طرح دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ جس کی ماں بھری دوپہر میں لو کے تھپیڑوں سے بچنے کی خاطر گھر سے باہر نکلنے پر قدغن لگا رکھی ہو اور وہ حکم کی خلاف ورزی سے پہلے ماں کی نیند کی گہرائی کا اندازہ کرنے کمرے کے دروازے تک آئی ہو۔

دور تک سنسان گلی میں سناٹا کسی چوکنے چوکیدار کی طرح چوکس کھڑا تھا۔

دروازہ بھیڑ کر برآمدے کے ستون تک واپس آتے آتے ' ضبط اپنا دامن چھڑا کر عیار دوستوں کی مانند بھاگ نکلا۔

اک شفاف قطرے کا پلکوں سے رخسار تک کا سفر بہت اذیت ناک تھا۔ جانے کیوں اس لمحے چشم تصور ساجد کے بجائے ان نیوز چینلز سے آباد تھا۔ جس پر دن رات کی تفریق کے بغیر ہولناک نشریات اور دل دکھاتے مناظر رواں رہتے تھے۔

"یا اللہ ..... اللہ ...... ساجد گھر آ جائے ..... خیریت کے ساتھ۔" دعا کے لبوں سے آزاد ہونے اور قبولیت کی سند پانے میں لمحہ بھر کا وقفہ تھا۔ شاید کہ سلطنت دل میں سر نہواڑے آس کی دیوی ایک مخصوص دستک پر ہڑبڑا کر اٹھی۔ اڑتے ہوئے جا کر کواڑ وا کر دیے۔

اور وہ مانوس ' مہربان چہرہ دیکھتے ہی پھر سے آباد ہو گئی۔ جی اٹھی لیکن آج خوشی کے اظہار پر چند لمحوں پہلے کی تکلیف غالب تھی۔ وہ ساری دنیا سے بوجھل ہو کر اس فراخ سینے میں چھپ جانا چاہتی تھی۔ دنیا بھر سے بڑھ کے عزیز ' مضبوط بازوؤں میں سما جانا چاہتی تھی۔

"ارے ارے ' کیا ہوا ' خیریت تو ہے ' کیا بات ہے۔" وہ نرمی سے اس کا سر تھپکتے ہوئے پوچھنے لگا۔

وہ بنا کچھ بولے بس روئے گئی۔ پھر بڑی مشکل سے الگ ہو کر آنسو صاف کیے۔

"جب ' جب تک گھر نہیں آ جاتے۔ دل پریشان ہی رہتا ہے۔" روکتے روکتے بھی اس کی آواز بھرا گئی اور اس وقت ایک عجیب بات ہوئی۔ ہمیشہ کی طرح آج وہ اسے ہنس کر ٹال نہیں سکا۔ نہ جواباً کوئی میٹھا جملہ اس کے لبوں سے نکلا۔

وہ واپس بازو کے گھیرے میں صوفیہ کے نازک وجود کو خود سے لگائے اندر بڑھ گیا۔ تفکر کے جال سے اٹی پیشانی اور عجیب سے حزن کی لپیٹ میں اس کے اٹھتے گرتے قدم بار بار ایک واقعے کی یاد دلا رہے تھے۔

ایک تازہ ترین دلسوز واقعہ ' جو ابھی کچھ دیر پہلے واپسی کے سفر میں اس کے ساتھ تو نہیں البتہ اس کے سامنے ضرور پیش آیا تھا۔ اماں بچوں کے ساتھ لیٹے لیٹے سو چکی تھیں۔ وہ اٹھتی بھی فجر میں تھیں اور گو کہ وہ خود بہت جذباتی قسم کا مرد نہیں تھا مگر پھر بھی اس وقت نہ جانے کیوں اماں کے پہلو سے جڑ کر سوتی اپنی تین سالہ معصوم بیٹی کو چومنے لگا۔ نگاہوں میں بار بار فلش لائٹ کی طرح جھماکے مارتے مناظر پھر سے تازہ ہو رہے تھے۔

اس کی نگاہوں کے سامنے سنگدلی کا مظاہرہ کرتے تین رائفل بردار ' انسان ہی تھے اور شاید مسلمان بھی۔ لیکن درندگی اور حیوانیت کا منہ بولتا ثبوت جنہوں نے اس کے سامنے دندناتے ہوئے بس کے اندر گھس کر بے رحمی سے سامنے بیٹھے شخص کو گریبان سے گھسیٹ لیا تھا۔

اس کی گود میں موجود معصوم اونگھتی ہوئی بچی ایک جھٹکے سے کسی بے جان کھلونے کی مانند زمین پر جا گری تھی اور تکلیف سے زیادہ حاوی ہو جانے والے خوف کے زیر اثر بری طرح رونے لگی تھی۔

ساتھ بیٹھی عورت کی چیخ و پکار ' التجائیں۔ بس میں موجود ہر بے بس شخص کا کلیجہ یقیناً شق کر گئی ہوں گی۔ لیکن ان بے رحموں کو اس سے کوئی علاقہ نہ تھا۔

جس کا سہارا عمر بھر کے ساتھی ' کم سن بچوں کا باپ کسی ضعیف و ناتواں باپ کا بیٹا اور سب سے بڑھ کر ایک ——— معصوم انسان وہ موت کے سوداگر گھسیٹے لیے جا رہے تھے۔

"خدا کا واسطہ ' ان معصوم جانوں پر تو رحم کھاؤ۔ ارے کوئی تو روکو۔ کوئی بچاؤ۔ خدا کے واسطے تمہیں رسول کا واسطہ۔"

وہ بائیں بازو سے چمٹی اس وقت تک آہ و بکا کرتی رہی جب تک دوسری طرف موجود سفاک شخص نے رائفل کے دستے کی زوردار ضرب سے اسے خاموش نہ کروا دیا نہتے اور بے بس انسان کے چہرے پر موت کے خون آشام سایوں نے ایک پتھریلی کیفیت پیدا کر دی تھی۔

وہ بس چپ تھا ' بالکل چپ۔ ایک افراتفری مچی ایک ہڑبونگ ہوئی ———

——— دم سادھے بھری ہوئی بس کے باقی مسافر جن میں وہ خود بھی شامل تھا۔ بشمول ڈرائیور اور کنڈکٹر کے۔ فقط چند لمحوں پر محیط کھیل تھا۔

بس سے اترتے ہی وہ لوگ انجان منزلوں کی جانب رواں ہو گئے اور بس میں جیسے موت کا نوحہ اتر آیا۔ بس کے لوہے سے بنے گرم ترین فرش پر ایک بچی اوندھے منہ پڑی ابھی تک رو رہی تھی۔

خدا جانے اپنی قسمت پر ' یتیمی پر یا ماں کی بیوگی پر جو ابھی طاری نہیں ہوئی تھی۔ لیکن ہو جانے کا یقین بن چکی تھی۔

ساجد پر تب ہی سے تھکن اور نیند کے غلبے کے بجائے ایک اعصاب شکن کیفیت نے اپنے پر پھیلا رکھے تھے۔ نامعلوم شخص کی جگہ ' خود اپنی موجودگی کا رونگٹے کھڑے کر دینے والا خیال نیند اڑانے اور رب کے حضور ہزار نفل شکرانہ ادا کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اسے بے وقت غسل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ اس رات ' ٹھنڈا یخ پانی ٹب بھر بھر کے اس وقت تک خود پر انڈیلتا رہا جب تک صوفیہ نے دروازہ کھٹکھٹا کر پانی کی ٹنکی خالی ہو جانے کی خبر نہ سنا دی۔

اک آگ تھی جو سینے میں جل اٹھی تھی۔ اس کی نم آنکھیں بار بار بھٹک کر زخمی پرندے کی مانند اپنی بیٹی کا چہرہ چھو کر پلٹتیں۔ اور پلٹتے ہی اس کی جگہ وہ گرم فرش پر منہ کے بل گری' روتی ہوئی بچی لے لیتی۔

صوفیہ نے اس کی غیر معمولی سنجیدگی' خاموشی اور معمول سے ہٹ کر سرگرمیوں کو محسوس کر کے استفسار تو کیا تھا مگر وہ اسے بتا کر کیا کرتا سوائے اور ہراساں کرنے کے۔

بس یوں ہوا کہ اس سے ڈھنگ سے کھانا نہیں کھایا گیا۔

دو لقمے زہر مار کر کے جو ٹی وی کے آگے بیٹھا تو آدھی رات گزر گئی اسے' اٹھنے کا خیال تک نہیں آیا۔ نظریں چمکتے اسکرین پر بھٹک رہی تھیں تو سوچیں' اسی بس کے ساتھ محو سفر تھیں۔ جو مردوں سے بھری ہوئی تھی۔ لیکن ________ آگ اگلتے اسلحے کے سامنے بے بس تھی۔

☆ ☆ ☆

"ابو میرا جھنڈا... میرے کپڑے۔"

انس اپنی شفاف زمانے کی ریاکاری سے نابلد آنکھیں اس پر جمائے پوچھ رہا تھا مگر سنتا کون ساجد تو وہاں ہوتے ہوئے بھی غیر حاضر ہی تھا۔ اماں نے بھی نوٹ کیا اور صوفیہ نے بھی۔

"کیا بات ہے بجو!" اماں کے لہجے میں ممتا سے لبریز محبت بھری پکار تھی۔ وہ بغیر چونکے ناشتا ٹونگتا رہا۔

آج نہ اس کے ہاتھ گھڑی کی سوئیوں کی گول گول رفتار کا ساتھ دے پا رہے تھے۔ نہ آنکھیں اپنے محور و مرکز کے گرد منڈلا رہی تھیں۔

صوفیہ کے دل میں تفکرات کے جال کے درمیان کہیں بہت معمولی سا قلق بھی پھنسا پھنسا سا تھا۔ لیکن اسے گم سم دیکھ کر پریشان تو بہر حال وہ بھی تھی۔

ساجد نے ایک نیچی' اچٹتی' احتیاط بھری نگاہ باورچی خانے میں کھٹ پٹ کرتے وجود کے سپرد کر کے کل والا واقعہ اماں کے گوش گزار کر دیا۔

حالانکہ وہ خود بھی — گھر میں موجود ان بے ضرر خواتین کو ہراساں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جو نہ کسی لینے میں تھیں نہ دینے میں۔ جیسے وہ عورت تھی۔ جو کل اپنے سر کے سائیں کی سلامتی کے لیے اس کا بازو جکڑ کے سامنے کھڑے مسخ صورتوں سے اس کی زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی۔ اماں بھی ہول گئیں' سہم گئیں۔

"ہائے میرے اللہ!" اس درجے بربریت نے ان کے رونگٹے کھڑے کر دیے۔

"تو تو کیوں نکل پڑ رہا ہے آج۔ سیدھے چپ چاپ سے گھر بیٹھ۔" اپنے تئیں انہوں نے ساجد کی سلامتی کے لیے حفاظتی احکامات جاری کیے تھے۔ مگر' ساجد ان کے بھولپن پر ہنس دیا۔ ایک تلخ بے بس و بے کس ہنسی۔

"گھر کون بیٹھ سکتا ہے اماں۔ صرف اپنے پیٹ کی بھوک نہیں۔ فقط اپنا تن برہنہ نہیں۔ صرف اپنی آنکھوں میں خواب نہیں۔ یہاں اور بھی ذی نفس ہیں۔ کئی اور ذی روح — ہیں زندگانی کے ساتھ۔

اپنے پیٹ کے ساتھ کتنے ہی اور جڑے ہیں۔ کہیں پانچ' کہیں چھ تو کہیں سات سات ان کی بھوک مثالی ہے۔ اپنے تن سے جڑے دوسرے تن ہیں۔ انہیں ڈھانپنے کے لیے اپنی آنکھیں بجھ بھی جائیں تو ان نومولود' نونہال آنکھوں کا کیا کریں۔ جن کے خواب ان کے حسن کی طرح تھوڑے ہیں' کچے ہیں چھوٹے اور معصوم ہیں۔

"ابو میرے لیے جھنڈا لائیں گے نا۔" اس نے کھینچ کر اپنے لخت جگر کو بازوؤں میں بھر لیا۔

دل میں خوشی کی انوکھی لہر نے کل والی پژمردگی کا سیاہ لبادہ چاک کر کے قدم باہر نکالا۔

"ضرور لا دوں گا۔" اس نے ایک شفیق باپ کا وعدہ لیا۔

اپنے بیٹے کی روشن پیشانی پر مہر محبت ثبت کی اور ناشتے کی ٹرے اٹھا کر رسوئی کی دہلیز پر آن ٹھہرا۔

"اماں منع کر رہی ہیں۔ تو کیا ضرورت ہے جانے کی۔" ساجد ایک نچلے درجے کا نجی ملازم تھا۔ یوں ذرا

ذرا سے ہنگاموں پر دفتری چھٹی (ابھی بھی یہ ہنگامے ذرا ذرا سے حاشیے میں مقید تھے) اس کے افسران کے نزدیک محض کام چوری کا بہانہ تھی۔ یا ہڈ حرامی کا مشغلہ۔

وہ مجبور تھا اور یہ بات صوفیہ بھی جانتی تھی۔

پھر بھی خفا خفا سی رخ موڑ کر رات کو گندی رہ جانے والی سلور کی پتیلی ——— رگڑتی رہی۔

مسلسل خاموشی پر اس نے مڑ کر دیکھا اور دھک سے رہ گئی۔

ساجد وہاں نہیں تھا۔

"سی... ی... ی۔"

وہ حیرت آمیز' دکھ کے حصار سے نکل کر چونکی۔ شہادت کی انگلی میں جونے کا باریک مشکل سے دکھائی پڑنے والا تار نرم کھال کے اندر تک اتر گیا تھا۔

اب جب تک واپس نہیں نکلا اس نے دکھن ہی دینی تھی۔ وہ پلکیں جھپک جھپک کر ہاتھ دھوتی انگلی کو ہاتھوں میں دبا کر بیٹھی رہی۔

☆ ☆ ☆

شہر کی مشہور مارکیٹ میں معمول سے بھی کہیں کم چہل پہل تھی۔

روز مرہ کی افراتفری اور ہنگامہ مفقود تھا۔ کتنے ہی دوکاندار بیٹھے مکھیاں مارتے نظر آئے۔ جس وقت اس نے اپنے روٹ کی بس سے نیچے قدم رکھا تو ارادہ تھا سامنے دوکان میں لٹکتے جھنڈے کو خرید کر واپسی کی راہ پکڑ لے گا۔

کل پرسوں سے روشنیوں کے شہر کے سبھی گلی کوچے عجیب سے خوف کی لپیٹ میں تھے۔ جگہ جگہ فائرنگ اور اغوا کی وارداتوں نے زندگی اجیرن اور جینا عذاب کر رکھا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کس کے نصیب کی گولی کس سمت سے آن لگے۔ سب اپنی جان گویا ہتھیلی پر لیے پھر رہے تھے۔

اسے بازار میں بھی یہی ہراس چوکڑی مار کے بیٹھا ملا اور دہشت اور ہیبت سنگی سہیلیوں کی طرح ہاتھوں میں ہاتھ دیے کد کڑے لگاتی دکھائی دیں۔

اسے صوفیہ کے ساتھ ہی منی کی ننھی منی کلائیاں یاد آ گئیں۔ وہ لائچ میں ذرا اور آگے بڑھ گیا۔ ایک خالی پڑے اسٹال پر رنگ برنگے کانچ' چوڑیوں کے نازک اور دیدہ زیب ڈیزائن میں ڈھلے مایوس اور منتظر نظروں سے اپنے خریداروں کی راہ تک رہے تھے۔ اس نے قوس و قزح کی ست رنگی چوڑیوں کا ایک سیٹ پسند کر کے ہتھیلی میں بھریں' بائیں ہاتھ میں موجود شاپر میں انس کے سبز ہلالی پرچم اور سبز اور سفید رنگ کی نیکر اور بشرٹ تھی۔ وہ شہر بھر میں امن و امان کی مخدوش صورت حال کے سبب آنا تو نہیں چاہتا تھا مگر اولاد کی محبت نے مجبور کر دیا۔

وہ ایک محبت بھری مسکان سے نظر بھر کے ان چوڑیوں اور چشم تصور سے اپنی معصوم بیٹی کے چہرے کو دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر مہلت نہ ملی کسی عجیب سے احساس نے سر اٹھایا۔

اس کی کمر سے کوئی نوکیلی چیز لگائے کھڑا تھا۔

"چپ چاپ' آجاؤ۔" ایک سفاک آواز' کانوں میں سرگوشی کی صورت اترتے ہوئے خوف کے کئی دروازے کھول گئی۔ کسی نے سرد مہری سے اس کی کلائی جکڑ لی۔

ہراس میں لپٹی ایک سرد لہر نے ریڑھ کی ہڈی میں جنم لیا اور یک بارگی پورے وجود میں سرائیت کر گئی۔ بائیں ہاتھ میں تھما ہوا شاپر اس کی نم ہتھیلی سے پھسلنے لگا۔

وہ یوں آرام اور اطمینان سے اسے ساتھ لیے چلے جا رہے تھے۔ گویا تین چار جگری دوست اکٹھے خریداری کی نیت سے مارکیٹ آئے تھے۔ کمر سے لگی پستول کی نال کی چبھن اس وقت شاید پل صراط پر قدم قدم کٹتے تلوؤں سے زیادہ تکلیف دہ محسوس ہو رہی تھی۔ اسے لگا اس کے چہرے پر بھی وہی پتھریلی کیفیت ہے جو کل ہی اس نے کسی چہرے پر دیکھی تھی۔

سفید رنگ کی گاڑی میں کسی نے اسے دھکیلا۔ وہ کسی بے جان کھلونے کی مانند سیٹ پر گر گیا۔ گھر پر

اس کا بیٹا اس کا منتظر تھا۔ جس کے کپڑوں کے شاپر اور ننھی بچی کی رنگ برنگی چوڑیاں جھپٹ کر گاڑی سے باہر پھینک دی گئیں اور گاڑی وہاں سے سرکنے لگی۔

اس نے بے جان آنکھوں سے زمین پر پڑے اپنی ناقدری پر نالاں اور اپنی محبت پر خفا اس شاپر کو دیکھا اور آس پاس بکھرے رنگین کانچ کو پھر لحہ بہ لحہ منظر اس کی آنکھوں سے دور ہوتا چلا گیا۔ اسے اپنے وجود پر اس انجان شخص کا گمان ہو رہا تھا جسے اس نے بس میں بے چارگی سے وحشیوں کے ساتھ جاتے دیکھا تھا۔

سامنے اور دائیں بائیں بیٹھے انسانوں اور مسلمانوں کے دل میں کیا تھا۔ یہ شاید خدا کے ساتھ ساتھ خود اسے بھی معلوم تھا۔

کھچڑی بالوں اور بے ترتیب بڑی ہوئی داڑھی والا' سامنے بیٹھا نوجوان' جس کی آنکھوں میں بھی سفاکی کی تحریر کو صاف پڑھ سکتا تھا۔ جانے کیوں اسے مانوس سا لگا۔ اس کی کلائی سے ذرا اوپر متعلقہ پارٹی کے جھنڈے کا بینڈ بندھا ہوا تھا۔ ساجد کے افسوس اور پچھتاووں کی یقیناً" آج کوئی قدغن نہ تھی۔ یہ وہی تنظیم تھی۔ جسے پچھلے کئی سال سے اس نے اپنے نام نہاد حقوق کی بحالی کے لیے لگاتار ووٹ ڈالے تھے اور آج یہی......

وہ جھک کر سیٹ کے نیچے سے کچھ نکال رہا تھا۔

"آلہ قتل یا جسمانی تشدد کے لیے کوئی اوزار......"

"آج کی صبح میرے گھر میں میری آخری صبح تھی۔ میں اب کبھی اپنے بچوں کی شکل نہیں دیکھ پاؤں گا اور ......اور......"

اندھیروں میں ڈوبنے سے قبل جو آخری خیال اس کے ذہن میں آیا۔

"صوفیہ مجھ سے ناراض تھی۔ ماں نے گھر سے نکلنے سے روکا تھا۔"

☼ ☼ ☼

وہ کب سے رسوئی میں گھسی کوئی نہ کوئی کام بکھرائے بیٹھی تھی۔ ایک کے بعد ایک' آج سے پہلے گویا اسے یاد ہی نہ آیا تھا کہ گھر میں کچن نام کی بھی کوئی جگہ ہے جو اس کی توجہ کی منتظر ہے۔ حالانکہ وہ ہر مہینے تفصیلی صفائی کرتی تھی اور ماہانہ صفائی کا یہ عمل پچھلے ہفتے دہرایا گیا تھا۔

سب سے اوپر والے سلیب پر رکھے کنستروں پر گرد کی معمولی سی تہ تھی۔ ہر سلیب پر سلیقے سے بچھا ہوا اخبار بھی ابھی لال بیگوں کے شر سے محفوظ تھا۔ مکڑیوں نے اپنے گھروندوں کی بنیاد ڈالی ہی تھی کہ صوفیہ نے کمال بے رحمی سے اس کے شیرازے بکھیر دیے۔ اس کے بے قرار دل کو ایک ہی سودا لگا تھا۔

"ساجد ناراض ہو کے گھر سے نکل گیا۔ ہائے میں کتنی کم قسمت ہوں کہ آج اسے نکلتے وقت دیکھ بھی نہ سکی۔"

اور اس وقت جب وہ چولہے کی ناب کو گیلے کپڑے سے الویں رگڑے جا رہی تھی۔ گویا اس پر کیا ہوا سیاہ روغن آج تو سفید ہو ہی جائے گا۔ تب دہلیز پر کسی کے قدم رکے اس نے ٹھٹک کر دیکھا۔

اماں خاموش سی کھڑی اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ وہ ایک گہری مایوس سانس گرم فضا کے سپرد کر کے گزشتہ سے پیوستہ ہو گئی۔

"کب تک گھسی رہے گی لائٹ چلی گئی ہے۔" وہ رخ موڑے چپ چپ کام میں جتی تھی۔

"چل اب آجا۔ بچے بے زار بیٹھے ہیں۔ ان کا بھی دل بہلے۔" اماں کی بوڑھی آنکھیں اس کی خفگی کے ہر رنگ سے مانوس تھیں۔ جبھی اطمینان سے واپس مڑ گئیں۔ جانتی تھیں۔ ان کی بات میں چھپی محبت بھری پچکار کو وہ ان کی سگی اولاد سے بڑھ کر سمجھ لیتی ہے۔

وہ چند لمحے سامنے دیوار کو گھورتی رہی۔ پھر بے حد آہستگی سے پلٹ کر' رسوئی کی بے آباد دہلیز کو دیکھا۔ صبح اسی دروازے کے فریم میں کوئی وجود آباد تھا اور اس نے ان لمحوں سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ اب دید کو ترسی آنکھیں کرلا رہی تھیں اور دل صبح سے اب۔

تھوڑی دیر پہلے تک شاید اس واہمے کے حصار میں تھا کہ وہ جب پلٹے گی۔ یہ دہلیز اسی مہربان وجود سے آباد ملے گی۔

مگر کہاں ابھی تو اس کی واپسی کا وقت ہی نہیں ہوا تھا۔

ایک سہاگن کے سینے میں ارمان بھرے دل نے انگڑائی لی اور وہ فوراً" ہی سب کام جھام چھوڑ کر نل کی موٹی دھار کے نیچے اپنے ہاتھ رگڑنے لگی۔

"اگر جو ساجد آج وقت سے پہلے آجاتا اور میرے یہ گندے کالے ہاتھ دیکھ لیتا تو......" کسی شرارتی سوچ نے پلکیں جھپکائیں۔ وہ سر جھٹک کر تیزی سے لبوں پر مچل اٹھنے والی مسکراہٹ دباتی کمرے میں آکر اماں کے تھکے تھکے وجود کو دیکھنے لگی۔

بچے ایک طرف بیٹھے لڈو کھیل رہے تھے۔ ابھی ٹھیک سے کھیلنا نہیں آتا تھا۔ پھر بھی۔

"اللہ کرے آج ساجد جلدی گھر آجائے۔"

دل سے اٹھی ایک دعا نے سرگوشی کی صورت لبوں تک کا سفر کیا۔ پھر اماں کو دیکھا۔

"پتا نہیں۔ آج صبح جب سے ٹی وی دیکھا ہے۔ دل بیٹھا جا رہا ہے۔" ان کی گدلی آنکھیں نم سی تھیں۔ وہ دھک سے رہ گئی۔

"کیوں اماں! ایسا کیا ہو گیا۔"

"پورے شہر سے جگہ جگہ جوانوں کی بوری بند لاشیں مل رہی ہیں۔ خدا جانے کیا ہو گیا میرے وطن کے لوگوں کو ______ اللہ مارے کون لوگ ہیں سکون آرام کے دشمن' دل نہیں ہیں سینوں میں۔" اماں کی آواز بھرا گئی۔ وہ حیرت زدہ سی منہ کھولے انہیں دیکھتی رہی۔

شہر میں امن و امان کی صورت حال تو اب اکثر ہی بنتی بگڑتی رہتی تھی۔ مختلف زبانیں بولنے والے' مختلف قومیت کے لوگوں میں تصادم اور جانی نقصان نے معمول کی سی شکل اختیار کر کے حساس دلوں کو لہو کے گھونٹ پینے پر مجبور کر دیا تھا۔ اعلا حکام انتظامیہ

اور حکومت بے حسی کی چادر اوڑھے اونگھ رہی تھی۔ کوئی دادرسی کرنے والا نہیں۔ کوئی زخم پر مرہم رکھنے کو تیار نہیں۔

سب دوسروں سے چھین لینے پر مصر تھے۔ قناعت اور مقدر کے سبق کے منکر۔۔۔ یہ بات یکسر بھول کر کہ آخر میں صرف چند گز لٹھا ہی ملے گا اور آٹھ فٹ زمین جہاں منوں مٹی تلے دب کر 'فانی دنیا پیچھے کہیں بہت دور رہ جائے گی۔ وہ بیٹھے بیٹھے کئی جہانوں کی سیر کر آئی تھی۔ لیکن۔۔۔

اب تو یہ بدامنی اور انتشار لہو کو گرمانے اور سنسنی پھیلانے والی خبریں عادت ہی بنتی جا رہی ہیں۔

"پھر اماں۔۔۔" اس نے پھر تاسف سے پلٹ کر انہیں دیکھا۔

"کتنے معصوم بچے یتیم کر دیے دنوں کے اندر اندر۔ کتنی ماؤں کی کوکھ اجاڑ دی اور کتنی سہاگنوں کے دوپٹے سفید کر دیے۔ اللہ کی مار ہو بدبختوں پر۔"

وہ دکھ اور افسوس کے ملے جلے رنگوں کے ساتھ انہیں اپنے جھریوں بھرے چہرے پر بہتا نمکین پانی صاف کرتی دیکھتی رہی۔

انہیں یوں روتا دیکھ کر اس کا اپنا دل بھی بھر بھر آ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

اور قدرت نے اس کی زندگی میں وہ سیاہ تاریک دن بھی رقم کر دیا تھا۔ جس کا اندیشہ تھا نہ امید' نہ خواب نہ خیال۔

انتظار کے مختصر ہو جانے کی دعا مانگتے لب خاموش ہو گئے۔ تمام انتظار سمٹتے سمٹتے آنکھوں میں آن بیٹھا۔ آنسو بہتے بہتے انجانے خوف کے حصار میں سکڑ کر خشک ہو گئے۔ نہ وہ شام آئی نہ وہ وصل نہ وہ مہربان چہرہ ہی پلٹ کر پھر آ سکا۔

ہاں اگر آیا تو ساجد کی فیکٹری کا مالک اور اس کی گاڑی کے پیچھے پیچھے ایمبولینس جس کے اوپر لگی سرخ گول گول گھومتی بتی' جو لب مرگ وجود میں کسی سانس کے باقی رہ جانے کے مژدہ جاں فزا سناتی رہتی ہے۔ جس کے شور سے امید و بیم کے درمیان ڈولتے لوگوں کو نئی دھڑکن ملتی رہتی ہے۔ اس وقت وہ زندگی کی علامت 'خاموش' بجھی پڑی تھی۔

یہ وہ وقت تھا۔ جس کا لاکھ جھٹلانے پر بھی دل کے کسی کونے میں یقین' اپنی پوری نحوست کے ساتھ اتر چکا تھا۔

"ہائے میں مر گئی۔" "اماں۔۔۔" سینے پر دوہتڑ مار کر الٹے پیروں' چیختی ہوئی گھر کے اندر بھاگی۔

ایمبولینس دیکھ کر دروازے پر آ جانے والی عورتوں نے ان کے قدموں میں رل جانے والا دوپٹہ اٹھا کر ان کے پیچھے راہ لی۔

ایک چھبیس سالہ جوان عورت جو دو معصوم بچوں کی ماں تھی اور جسے ابھی ابھی بیوگی کے نوحہ سنایا گیا تھا۔ اندر سیلابی ریلے کی طرح امڈ آنے والی عورتوں اور ان کے پیچھے ان سب سے پیچھے اسٹریچر پر اندر آتے ' زندگی کے ہر احساس سے عاری خاموش وجود کو دیکھ کر تیورائی اور پورے قد سے زمین پر آ رہی۔

☆ ☆ ☆

اور اس آنگن میں دوبارہ پھر کبھی شام اپنے جوبن پر نہیں آئی نہ بہار نے اپنے رنگین آنچل لہرائے۔ بین گونگے ہو گئے۔ ماتمی راتیں 'اماوس کی سیاہی لے کر یکے بعد دیگرے گزرتی چلی گئیں وہی آنگن تھا۔ وہی رسوئی اور وہی دو ننھی معصوم جانیں باپ کے انتظار میں 'خواب سجاتی آنکھوں کی جوت مانند پڑ گئی۔

جواں سال بیٹے کو سر تک چادر اوڑھے ابدی نیند سوتے دیکھ کر ماں کے وجود سے زندگی کی بچی کھچی رمق بھی جاتی رہی اور اب یہ حال ہے کہ۔۔۔

وہ اور اس جیسے کتنے ہی گھر میں جہاں صوفیہ جیسی جواں سال بیوائیں زندگی کے باقی ماندہ دنوں کو بوجھ کی طرح ڈھو رہی ہیں۔

کتنے ہی بچے جو لاڈ سے باپ کے کندھوں پر جھولتے تھے۔ اب دوسروں کے آگے دو وقت کی روٹی کے لیے' کبھی ان کے جوتے پالش کرتے ہیں' کبھی سیاہی سے اٹے ہوئے یا میلے کچیلے کپڑوں سے پونچھتے گاڑیوں کے آگے پیچھے اوپر نیچے ناچتے ہیں اور دن کے اختتام پر چند سو کی دیہاڑی پکڑے ہوئے اپنے استاد کے تھڈے بھی کھاتے ہیں۔

کچھ ننھے بے قصور ہاتھ ایسے بھی ہیں۔ جو کبھی کتابیں تھامے اسکول جایا کرتے تھے۔ اب اخبار تھامے سگنل پر بے تحاشا ٹریفک سے بے خوف اخبار بیچتے پھرتے ہیں۔ پڑھنے کی چیز وہ اب بھی بیچتے ہیں۔ مگر اس پر لکھی زبان سے نابلد ہیں۔ پڑھ کر کریں گے بھی کیا؟ کیا ہے ان اخباروں میں؟

ان ہی کے جیسے کچھ اور مستقبل کے معماروں کے یتیم ہو جانے کی دکھی داستانیں یا پھر بااثر اور بارسوخ شخصیات کے بل بوتے پر ناچتی عوام اور انتظامیہ کی کہانیاں۔

☆ ☆ ☆

دروازہ اپنے مخصوص انداز میں دھڑدھڑایا جا رہا تھا۔ کبھی دستک پر دوڑ کر جانے والی صوفیہ اب جیسے گونگے بہروں کی مانند دستکیں سن کر بیٹھی رہتی تھی۔ جانتی تو تھی۔ اس کی زندگی میں زندگی کی طرح دھڑکنے والے کو کبھی نہیں آنا۔

"دھڑدھڑدھڑ۔" جانے کون مستقل مزاج تھا۔

وہ گہری سانس لے کر باہر نکلی اور دروازے پر کھڑے شخص کو دیکھ کر اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

"ارے کیا ہوا باجی۔ پہچانا نہیں میں وہی ہوں اچھو۔"

کھچڑی بالوں اور بے ترتیب بڑھے ہوئی داڑھی کے ساتھ وہ بالکل پہچانا ہی نہیں گیا۔ اپنے بے حد پیلے دانتوں اور پان کھائے ہونٹوں کی نمائش کرتے ہوئے اس نے خود ہی اپنا تعارف کروایا۔

چہرے پر دوپٹے کی نقاب لے کر اس نے مٹھی میں دبے دس روپے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بے ساختہ ہی پوچھ لیا۔

"یہ حلیہ کیا بنا لیا ہے۔"

"جی باجی بس۔" وہ ہنس دیا۔

"پارٹی کے کام دھندوں میں یہ سب چلتا ہے۔ حلیہ بدلنا پڑتا ہے۔ ویسے بھی پچھلے دنوں بہت کام تھا تو بال کٹوانے کا موقع ہی نہیں ملا۔"

اس نے ہاتھ بڑھا کر نوٹ پکڑا تو صوفیہ نے دیکھا۔ اس نے تنظیم کے جھنڈے کے رنگوں کا کپڑا کلائی پر لپیٹ رکھا تھا۔

کراچی کے علاقے۔۔۔ نامعلوم افراد کی فائرنگ۔۔۔ بے گناہ شخص ہلاک۔ نیند سے دور ہے۔ دل ارمانوں سے خالی۔ امید بے رنگ۔۔۔

سونی کلائیاں پھر آباد نہ ہوں گی' اجڑی ہوئی مانگیں اب کبھی نہیں سنوریں گی۔ خوشی کے استعارے نیل گگن سے اس دھرتی پر شاید کبھی نہ اتریں گے۔

وہ روز ساجد کی طرح دل لگا کر خبریں دیکھتی ہے۔ اسے لگتا ہے کسی دن' اسے کسی خبر میں اس کی بچھڑی ہوئی زندگی کی نوید مل جائے گی۔ پھر رات دھیرے دھیرے سسکتے ہوئے سرکنے لگتی ہے۔

"ساجد!"

کسی کی یاد آنسو بن کر بیوہ آنکھوں کی دہلیز پر آن رکتی ہے۔ اور وہ وہیں ٹی وی کے سامنے آڑی ترچھی لیٹ کر آنکھیں بند کر لیتی ہے۔

اب نہیں ہوتیں دعائیں مستجاب
اب کسی ابجد سے زندان ستم کھلتے نہیں

☆ ☆

فوزیہ یاسمین

دستِ کوزہ گر

زوبیہ کو اپنے گھر میں اپنی خالہ شائستہ کی روح نظر آتی ہے۔ لیکن وہ اس سے بات نہیں کرتی' جبکہ زوبیہ ان سے بات کرنے کے لیے بے چین ہے۔ اس کی ملاقات رخسار سے ہوتی ہے۔ جو کالج میں اس کے ساتھ پڑھتی ہے اور روحوں سے بات کرنے کا دعوا بھی کرتی ہے۔ زوبیہ اسے رات کے دو بجے اپنے گھر کی چھت پر لے جاتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس کی خالہ کی روح کو بلائے۔۔۔ وہ روح کو بلانے کی کوشش کرتی ہے۔

رومیلہ' سنبل اور نمل کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل جاتا ہے۔ اور اسی خوشی میں نمل ان دونوں کو لنچ کی دعوت دیتی ہے۔۔۔ اس آفر پر دونوں حیران رہ جاتی ہیں۔ جبکہ دوسری طرف خرم' ذکی سے شرط ہارنے کے بعد اس کی عجیب وغریب شرط کو قبول کر لیتا ہے' اور انہیں لنچ کے لیے کہہ دیتا ہے۔

زوبیہ اپنی خالہ سے بات کرنے کے بعد بہت مطمئن ہوتی ہے جبکہ رخسار اس کے بے وقوف بن جانے پر خوش ہے۔ وہ دونوں واپس جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھتی ہیں کہ اچانک لائٹ چلی جاتی ہے؟ اور کوئی رخسار کو اندھیرے میں زخمی کر دیتا ہے۔

۲۳

تیئسویں قسط

رومیلہ کے حنا سے سجے ہاتھوں میں اگر چوڑیوں کے ساتھ گھڑی ہوتی تو وہ اب تک دس بار دیکھ چکی ہوتی اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وقت بڑی سست روی سے گزر رہا ہے یا اس کو گاڑی میں بٹھا کر لانے والے گھر پہنچنے کے بعد اسے اتارنا ہی بھول گئے ہیں۔

اس کے اردگرد بالکل جامد سناٹا چھایا تھا کہ اسے اپنے دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

آخر جب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو اس نے اپنا جھکا سر اوپر کرتے ہوئے گود تک آتی چادر کا کنارا ذرا سا اونچا کیا اور گاڑی کے شیشوں سے دور تک پھیلے سناٹے کو دیکھ کر گویا اپنی چادر کو پورا ہی الٹ دیا۔

یہ یقین ہوتے ہی کہ وہ مکمل طور پر تنہا ہے اس نے آرام دہ حالت میں اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے پشت کو پوری طرح سے گاڑی کی سیٹ سے لگا لیا۔

گردن کو دائیں بائیں موڑتے ہوئے اور کندھوں کو اوپر سے نیچے کی طرف گھماتے ہوئے اس نے گھنٹوں سے ایک ہی انداز میں بیٹھے ہونے کے باعث اپنے اکڑے ہوئے پٹھوں کو خاصا سکون پہنچایا تھا۔ مگر اس دوران جیسے جیسے وہ اپنے اردگرد سے آشنا ہو رہی تھی ویسے اس کا ذہنی سکون ہوا ہوتا جا رہا تھا۔

وہ ایک بہت ہی خوب صورت بنگلے کے سامنے بنے پورچ میں کھڑی گاڑی میں بیٹھی تھی۔

پورچ کی تمام اور بنگلے کی بیشتر لائٹیں جلی ہوئی تھیں جس کی روشنی میں بخوبی ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کے آس پاس تو کیا دور دور تک کوئی آدم زاد موجود نہیں ہے۔

جب سے اس کی شادی طے ہوئی تھی تب سے اس کے ساتھ عجیب و غریب صورت حال درپیش رہی تھی جو کچھ بھی ہو رہا ہے بڑے ہی غیر مطمئن انداز میں اور بالکل اچانک ہو رہا تھا۔

لیکن آج تو جیسے پانی سر سے اوپر ہو گیا تھا بھلا ایسا بھی کہیں ہوتا ہے کہ دلہن کو گھر لانے کے بعد اسے اندر کمرے تک لے جانے کی بجائے باہر گاڑی میں ہی اکیلا چھوڑ دیا جائے۔

اسے اپنی سخت بے عزتی محسوس ہو رہی تھی اس کے اندازے کے مطابق اسے یہاں انتظار کرتے ہوئے آدھا گھنٹہ یا پچیس منٹ تو ہو ہی گئے تھے۔ وہ ان سب کی اس درجہ بدتمیزی اور بداخلاقی پر پیچ و تاب کھاتی ایک جھٹکے سے دروازہ کھولتی گاڑی سے اتر آئی اور اپنے پیچھے جب اس نے پوری قوت سے دروازہ بند کیا تو اس دروازے سے بھی زیادہ وہ زوردار آواز سن کر بری طرح ڈر گئی۔

"کون ...؟ کون ہے بے؟" آواز بہت بھاری اور مردانہ تھی رومیلہ نے گھبرا کر آواز کی سمت دیکھا۔

گیٹ کے پاس ایک چھوٹا سا کمرہ بنا تھا جہاں چوکیدار بیٹھا تھا گیٹ اور کمرہ اس سے خاصے فاصلے پر تھا اسی لیے چوکیدار کو کمرے سے نکل کر گاڑی تک آنے میں تھوڑا سا ٹائم لگا تھا۔

لمبا چوڑا' بڑی بڑی خطرناک مونچھوں والا چوکیدار کمر پر بڑی سی گن لٹکائے رومیلہ کے سامنے آکھڑا ہوا اور خونخوار نظروں سے اسے گھورنے لگا۔

"کون ہو تم اور اندر کیسے آئیں؟" اس کی نظروں میں رومیلہ کے لیے اتنے شک و شبہات تھے کہ رومیلہ خوامخواہ مجرمانہ کیفیت کا شکار ہوتے ہوئے ہکلانے لگی۔

"م ... م ... میں۔" رومیلہ سے ابھی بولا بھی نہیں گیا تھا کہ اس نے کندھے پر رکھی گن رومیلہ کے سامنے کرتے ہوئے بڑے جارحانہ انداز میں کہا۔

"سیدھی طرح بتا اس گاڑی میں چھپی کیا کر رہی تھی ورنہ ..." جس طرح اس نے ورنہ کے آگے جملہ ادھورا چھوڑا تھا اس پر رومیلہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے وہ ایک دم ہراساں ہو کر بولی۔

"میں ... میں ... میں چھپی ہوئی نہیں تھی ... میں' میں تو ان کے ساتھ آئی ہوں۔" اس نے گھر کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے جلدی جلدی کہا۔

"کن کے ساتھ؟" وہ ابھی بھی غرا کر بولا۔

"یہ ... یہ جو اس گھر میں رہتے ہیں۔" رومیلہ کو محض چند دفعہ کا سنا نام بالکل یاد ہی نہیں آرہا تھا جس پر وہ خود گواہوں کی موجودگی میں تین بار قبول ہے کہہ چکی تھی۔

"کون رہتا ہے اس گھر میں؟" وہ دھاڑا تو رومیلہ بری طرح روہانسی ہو گئی اور کچھ بول ہی نہ سکی۔

"نام معلوم نہیں ہے اور پھر بھی بولتی ہے ساتھ آئی ہے' ارے وہ تو کب کے اندر جا چکے تو کیا تب سے گاڑی میں بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھی۔" چوکیدار نے گن کی نوک اس کے کندھے میں پیوست کرتے ہوئے اسے پیچھے کی طرف دھکا دیا تو وہ دو چار قدم لڑکھڑا گئی جس کے باعث چوڑیوں کی کھنک سے بے اختیار جلترنگ سا بج اٹھا۔

اس نے ایک بڑی سی چادر اوڑھ رکھی تھی اس لیے اس کا دلہن والا روپ چوکیدار نہیں دیکھ سکا تھا مگر اس کا چہرہ کھلا تھا جس پر فل میک اپ کے ساتھ ٹیکا اور نتھ اسے دلہن کی طرح بہت زیادہ تیار لڑکی ثابت کر رہے تھے۔

آدھی رات کو سجے سنورے روپ کے ساتھ وہ کسی کے گھر میں چوری چھپے گھس آئی تھی یہ سب دیکھتے ہوئے چوکیدار کا رویہ اس کے ساتھ بالکل مناسب اور حق بجانب تھا۔

مگر رومیلہ کے لیے اس صورت حال کو برداشت کرنا بڑا ذلت آمیز تھا چوکیدار کے اس بری طرح جھڑکنے اور دھتکارنے پر رومیلہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے بمشکل خود کو بکھرنے سے بچاتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"آپ ... آپ گھر میں سے کسی کو بلوا کر پوچھ لیں۔ میں ان لوگوں کے ساتھ آئی ہوں وہ لوگ خود مجھے لے کر آئے ہیں۔ میں ... میں الیان کی بیوی ہوں۔" جیسے کوئی بجلی چمکتی ہے ویسے ہی رومیلہ کو بالکل اچانک الیان کا نام یاد آگیا تو وہ تیزی سے کہہ گئی۔

البتہ کہنے کے بعد اس کے اپنے احساسات عجیب سے ہو گئے اپنے لیے بیوی کا لفظ استعمال کرنا اسے بڑا مصنوعی سا لگا تھا جیسے اس نے اپنی جان چھڑانے کے لیے جھوٹ بول دیا ہو۔

اس کے ساتھ ساتھ مقابل کے تاثرات بھی کچھ اس کے جیسے ہی تھے اس نے بڑے بگڑے ہوئے انداز میں اس کے الفاظ دہرائے تھے۔

"الیان صاحب کی بیوی۔" اس کا لب و لہجہ رومیلہ کو شرمندہ کر گیا بھلا بیوی بھی ایسی ہوتی ہے کیا جسے رخصت کے بعد گھر میں لے جانے کی بجائے گاڑی میں ہی چھوڑ دیا جائے۔

اس سے پہلے کہ چوکیدار مزید کچھ کہہ کر اس کی خجالت میں اضافہ کرتا رومیلہ بڑی انکساری کے ساتھ جلدی سے بولی۔

"میرا ... میرا یقین کرو۔ چاہو تو گھر میں سے کسی کو بلا کر تصدیق کر لو۔ میں جھوٹ نہیں بول رہی آج ہی میری الیان کے ساتھ شادی ہوئی ہے۔" رومیلہ کی بھرائی ہوئی آواز میں آنسوؤں کی نمی صاف محسوس کی جا سکتی تھی پھر بھی چوکیدار کا دل ذرا نہیں پسیجا البتہ وہ سوچ میں ضرور پڑ گیا۔

اس نے خود اسے الیان کے گاڑی سے اترتے دیکھا تھا اس کا حلیہ بھی اس کے نئی نویلی دلہن ہونے کا پتا دے رہا تھا کہیں وہ واقعی سچ ہی نہ کہہ رہی ہو۔ یا اگر جھوٹ بھی بول رہی تھی تو بھی جس طرح وہ گھر میں گھس آئی تھی وہ سب اسے مالکوں کو بتانا تو ضروری تھا تاکہ وہ بتا سکیں کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔

وہ کچھ لمحے اسے مشکوک نظروں سے گھورتا رہا پھر اپنے مخصوص غرائے ہوئے لہجے میں دھمکی دیتے ہوئے کہنے لگا۔

"خبردار جو کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی چل گیٹ کی طرف چل" چوکیدار کے کمرے میں انٹرکام لگا تھا وہ اسے کمرے کے باہر کھڑا کر کے اندر الیان یا کسی اور سے بات کرنا چاہتا تھا اسی لیے گن کو ہلاتے ہوئے اسے چلنے کا اشارہ کرنے لگا۔

لیکن رومیلہ اس کے اشارے پر سمجھی کہ وہ اسے گیٹ سے باہر نکالنے کے لیے لے جانا چاہتا ہے تو بے ساختہ اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

"میرا یقین کرو میں جھوٹ نہیں بول رہی۔" وہ مزید اس کے سامنے گڑگڑانے لگی مگر آواز ساتھ چھوڑ گئی تو اسے خاموش ہونا پڑا۔

چوکیدار کو بے وقت کی راگنی سخت ناگوار گزری تو ڈپٹ کر بولا۔

"اوئے خاموش ہو جاؤ۔ جو بولا ہے وہ کرو۔" رومیلہ اس کی دھاڑ پر خوفزدہ ہو کر بغیر سوچے سمجھے آگے بڑھ گئی۔

اس نے قدم گیٹ کی جانب بڑھاتے ہوئے ایک بار پھر اسے یقین دلانا چاہا مگر گلے میں آنسوؤں کا گولا سا بندھا تھا وہ کچھ کہہ ہی نہ سکی لیکن جب چوکیدار نے گیٹ کھولنے کی بجائے اپنے کمرے میں قدم رکھا تو جیسے رومیلہ کی جان ہی نکل گئی۔

اک پل میں اس نے جانے کیا کچھ سوچ لیا خوف کی ایک سنسناتی شدید لہر اس کی ایڑھی سے لے کر سر کے بالوں تک میں دوڑ گئی۔

اس نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے دانت پر دانت جما کر پوری قوت سے چلانا چاہا تھا کہ چوکیدار کو انٹرکام اٹھا کر بٹن دباتا دیکھ کر اس کے تنے ہوئے اعصاب یکدم ڈھیلے پڑ گئے اسے لگا ایک ہی پل میں اس نے طویل مسافت طے کر لی ہو موت اور زندگی کا عمل کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے اس سے صرف وہی واقف ہوتا ہے۔ جو اس سے گزرا ہو مگر رومیلہ کو لگا تھا وہ اس تجربے سے آج ہی گزری ہے جیسے مرنے کے بعد اسے دوبارہ اٹھایا گیا ہو۔

اس نے بے اختیار آنکھیں بند کرتے ہوئے گہرا سانس کھینچا مگر یہ سکون اس خیال کے آتے ہی دوبارہ درہم برہم ہو گیا کہ جانے چوکیدار کے تصدیق کرنے پر وہ لوگ اندر سے کیا جواب دیں گے۔

ان کے سابقہ رویے کو دھیان میں رکھتے ہوئے رومیلہ کو ان سے کوئی خاص اچھی امید نہیں تھی کیا عجب اگر وہ اسے باہر ہی بھول کر سونے بھی لیٹ گئے ہوں۔

چوکیدار ریسیور کان سے لگائے کسی کے انٹرکام اٹھانے کا انتظار کر رہا تھا اور رومیلہ جانچتی نظروں سے اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی جیسے اس کے تاثرات سے ـــــ دوسری طرف سے دینے والے جواب کا اندازہ لگانا چاہ رہی ہو ساتھ ہی اس کے ذہن میں ایک سوال بڑی شدت سے ابھر رہا تھا۔

"اگر انہیں یہی رویہ روا رکھنا تھا تو ان لوگوں کو اسے بہو بنا کر گھر لانے کی ضرورت ہی کیا تھی ؟"

✡ ✡ ✡

الیان کے دل و دماغ میں ایک طوفان برپا تھا اسے لگ رہا تھا غم و غصے سے اس کے دماغ کی شریانیں پھٹ جائیں گی اپنے مجرم کو پہچان لینے کے باوجود وہ آگے بڑھ کر اس کا گریبان نہیں پکڑ سکتا تھا۔

اس کی چھوٹی بہن ' اس کے گھر کی عزت ' اس کے والدین کی آنکھوں کا تارہ اور ان سب کے دل کا قرار اس ذلیل اور خبیث انسان کے چنگل میں پھنسی ہوئی تھی جانے اس شخص نے بریرہ کے ساتھ کیا سلوک کیا ہو گا اور سلوک کی بات تو بعد کی تھی وہ اگر اسے فائیو اسٹار ہوٹل میں بھی رکھ لیتا تب بھی وہ جس ذہنی اذیت اور جذباتی دباؤ سے گزر رہی تھی یا اس کے گھر والے جس طرح پل پل پل صراط سے گزر رہے تھے اس کے سامنے ابرار کا ہر رویہ

پیچ تھا۔

اور اتنی تکلیف دینے والا شخص اس کے سامنے کھڑا تھا اور الیان چپ چاپ نا صرف وہاں سے واپس آگیا بلکہ اس کی بہن کو اپنی بیوی بنا کر بھی لے آیا۔

اپنی بے بسی پر اسے خود اپنے آپ سے نفرت ہو رہی تھی دل تو چاہ رہا تھا بھری محفل میں ابرار کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے اس کا خود پر سے ضبط ختم ہونے لگا تو اس نے جلدی مچا کر فوراً "رخصتی عمل میں لائی اور آندھی طوفان کی طرح گاڑی چلاتا گھر آگیا۔

گاڑی کو پورچ میں روکتے ہی وہ اپنی جانب کا دروازہ کھول کر اتر گیا۔ ریاض غفار اور شگفتہ غفار نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا اور پھر چادر میں پوشیدہ سر جھکائے رومیلہ پر ایک نظر ڈال کر وہ دونوں بھی گاڑی سے اتر کر الیان کے پیچھے بڑھ گئے۔

وہ ان کے اندر داخل ہونے تک اپنے کمرے میں پہنچ چکا تھا اور موبائل جیب سے نکال کر کسی کو فون کرنے کے ارادہ کر رہا تھا جب ان دونوں کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"آپ دونوں یہاں کیا کر رہے ہیں؟ اور وہ لڑکی کہاں ہے؟" جس ذہنی خلفشار سے وہ گزر رہا تھا اسے مد نظر رکھتے ہوئے ان دونوں نے ہی اس کے لہجے میں گھلی تلخی کو نظر انداز کر دیا بلکہ ریاض غفار تو بڑے شفقت بھرے لہجے میں کہنے لگے۔

"وہ گاڑی میں ہی بیٹھی ہے تم اتنی تیزی سے گاڑی سے اتر کر یہاں آئے ہو کہ ہم دونوں گھبرا ہی گئے۔"

"آں..... ہاں وہ مجھے ایک فون کرنا ہے آپ جائیں جا کر اس لڑکی کو گھر کے اندر لے کر آئیں بلکہ اس نے کھانا بھی نہیں کھایا ہے سرداراں (ملازمہ) سے کہیں اسے کچھ کھانے کے لیے دے دے اور بریرہ کے کوئی کپڑے بھی نکال کر دے دیں۔"

"وہ سب تو ہو جائے گا بیٹے لیکن پہلے یہ تو بتاؤ تم فون کسے کر رہے ہو؟" شگفتہ غفار کو تو اس وقت ہوا سے ہلتے پتوں سے بھی خوف آ رہا تھا ایسے میں الیان کا غیر معمولی رویہ بھلا انہیں کیوں نہ دہلاتا۔

"کیا مطلب کسے فون کر رہا ہوں۔ ممی بریرہ کڈنیپ ہوئی ہے کوئی مذاق تو نہیں ہے نا میں کچھ تو پتا کروں گا ایسے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تو نہیں بیٹھ سکتا۔" الیان بری طرح تپ گیا تو شگفتہ غفار مزید دہل کر بولیں۔

"لیکن اب تو وہ بریرہ کو چھوڑ دیں گے نا اب تو ہم نے ان کی بات مان لی ہے یا اب وہ کوئی نیا مطالبہ کر رہے ہیں کیا؟ جو تم خود سے بریرہ کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"اف ممی کیا ہو گیا ہے آپ کو اتنی بڑی بات ان کی ہم نے مان لی ہے اب اور کوئی مطالبہ وہ لوگ کیوں کریں گے ڈیڈی پلیز سمجھائیں نا ممی کو اور جائیں جا کر اس لڑکی کو دیکھیں۔ آپ دونوں کو یاد ہے نا اس کڈنیپر کی دھمکی کہ اس لڑکی کو بالکل بہو کی طرح گھر لا کر رکھنا ہے۔ پہلے ہی ہم نے وہاں فنکشن میں بڑی بد اخلاقی کا مظاہرہ کیا ہے کہیں وہ ہمارے کسی رویے کو بنیاد بنا کر بریرہ کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ ابھی بریرہ اس کے قبضے میں ہے ہمیں ہر حال میں اس کی بات ماننی ہے۔" الیان کا لہجہ اب بھی جھنجلایا ہوا تھا ریاض غفار سمجھ گئے وہ ان دونوں کو یہاں سے ہٹانا چاہ رہا ہے مگر وہ خود یہاں سے جانا نہیں چاہ رہے تھے البتہ شگفتہ غفار کو منظر سے غائب کرنے کے لیے رسانیت سے کہنے لگے۔

"الیان ٹھیک کہہ رہا ہے آپ سرداراں کے ساتھ جا کر اس لڑکی کو گیسٹ روم میں ٹھہرا دیں بریرہ ان شاء اللہ تعالیٰ اب جلدی گھر آجائے گی۔"

"سرداراں تو نہیں ہے اس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی تو وہ اپنی جگہ اپنی بھانجی کو چھوڑ کر آج شام ہی اپنی بیٹی کے گھر چلی گئی ہے۔"

"تو اس کی بھانجی کو لے کر جائیں اور اسے کچھ کھانے پینے کے لیے دیں۔" الیان بری طرح زچ ہو کر سخت برہمی سے بولا تو وہ کچھ خائف ہو کر ریاض غفار کو دیکھنے لگیں۔

"بیگم آپ ابھی جائیں میں کہہ رہا ہوں نا بریرہ گھر آجائے گی ان شاء اللہ تعالیٰ پلیز ابھی آپ چلی جائیں۔" ریاض غفار کے بار بار کہنے پر وہ بھی سمجھ گئیں کہ وہ دونوں ان کے سامنے کوئی بات نہیں کریں گے وہ ایک خفا سی نظر ان پر ڈال کر کمرے سے نکل گئیں مگر باہر رومیلہ کے پاس جانے کی بجائے وہ الیان کے کمرے کی کھڑکی کے پاس آکھڑی ہوئیں جہاں سے اندر ہونے والی گفتگو آرام سے سنی جا سکتی تھی تبھی انہوں نے ریاض غفار کی آواز واضح طور پر سنی۔

"کیا ہوا الیان! تم نے گاڑی میں یہ کیوں کہا تھا کہ ابھی خاموش رہیں آپ کو گھر جا کر ایک بات بتانی ہے۔" الیان ان کے پوچھنے پر کچھ دیر انہیں دیکھتا رہا پھر ایک ایک لفظ ایسے بولا جیسے لوہے کے چنے چبا رہا ہو۔

"میں نے بریرہ کے کڈنیپر کو پہچان لیا ہے وہ وہاں شادی میں موجود تھا۔"

"ک۔ کون؟ کون تھا وہ۔" ریاض غفار کے ساتھ ساتھ باہر کھڑی شگفتہ غفار بھی چونک اٹھیں۔

"دلہن کا بھائی ابرار۔" الیان کے لہجے میں چٹانوں جیسی سختی تھی ریاض غفار اچنبھے سے بولے۔

"کیا کہہ رہے ہو تم؟ کیا۔۔۔ کیا تمہیں یقین ہے؟"

"میرے یقین کی ابرار نے تصدیق بھی کر دی ہے۔" الیان سرد لہجے میں بولا۔

"واٹ؟ تم نے اس موضوع پر اس سے بات بھی کر لی کیا تمہیں اندازہ نہیں اسے طیش دلانا بریرہ کے لیے کس قدر خطرناک ثابت ہو سکتا ہے اگر تم سمجھ بھی گئے تھے تو بھی تمہیں انجان بن جانا چاہیے تھا اب اگر اس نے انتقاماً" بریرہ کو کوئی تکلیف پہنچانی چاہی تو۔۔۔ تو۔" ریاض غفار کی سوئی ایک جگہ آکر اٹک گئی تو الیان سنجیدگی سے کہنے لگا۔

"میں بے اختیار ہو گیا تھا بعد میں مجھے بھی احساس ہو گیا تھا تبھی میرے لیے وہاں ٹھہرنا مشکل ہو گیا لیکن یہ سب ممی کو پتا نہیں چلنا چاہیے ابھی تک تو ہمیں صرف اندازہ تھا کہ سب اس لڑکی کے گھر والے کر رہے ہوں گے لیکن اب تو یقین ہو گیا ہے ایسے میں ممی کے لیے اپنے جذبات پر قابو رکھنا سخت دشوار ہے۔ وہ اس لڑکی کو کچھ بھی الٹا سیدھا کہہ دیں گی جس کا خمیازہ ہماری آئندہ کی پوری نسل کو بھرنا پڑے گا' خدانا خواستہ ایک بار بریرہ کا کردار زبان عام پر آگیا پھر ہمارے پاس رہ ہی کیا جائے گا۔ یہ ساری شان و شوکت یہ تمام دولت و امارت سب اس کے دامن کے داغ کو نہیں دھو.....۔" الیان کی بات ابھی پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ دروازے کو زوردار آواز کے ساتھ کھولتی شگفتہ غفار کمرے میں داخل ہو گئیں اور دھاڑ کر بولیں۔

"ہاں اس کے دامن پر لگے داغ کو اب کوئی نہیں دھو سکتا۔ اس لیے ہم سب خاموش ہو کر بیٹھ جائیں اور اس غلاظت کے ڈھیر کو اپنے گھر کی بہو بنا کر رکھ لیں۔ میں اسے کھانا کھلاؤں اسے اپنی بیٹی کے کپڑے نکال کر دے دوں اسے کسی مہمان خصوصی کی طرح گیسٹ روم میں آرام کے لیے لے جاؤں۔" الیان اور ریاض غفار انہیں دیکھ کر چند لمحوں کے لیے ہکا بکا رہ گئے فوری طور پر ان کی سمجھ میں نہیں آیا وہ انہیں کیسے روکیں اور کیسے ان کے اندر سے پھوٹ کر نکلتے لاوے کو ٹھنڈا کریں۔

ان کا یہ شدید رد عمل اپنی جگہ درست تھا بلکہ الیان ان سے ایسے ہی رویے کی توقع کر رہا تھا تبھی وہ ان کے سامنے بات نہیں کرنا چاہ رہا تھا وہ بے اختیار ریاض غفار کو دیکھنے لگا جو خود مدد طلب نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے

تو آخر الیان کو ہی آگے بڑھنا پڑا۔

"ممی۔ ممی آپ پلیز ریلیکس ہو۔۔۔۔"

"ریلیکس؟ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے الیان۔ میرے اندر آگ لگی ہوئی ہے میرا دل چاہ رہا ہے میں باہر گاڑی میں بیٹھی اس لڑکی کو گولی ماردوں اور۔۔۔ اور تم کہہ رہے ہو میں ریلیکس ہو جاؤں۔" ان کی آواز غم و غصے کی زیادتی سے پھٹ گئی تھی الیان کے لیے انہیں قابو کرنا مشکل تھا چنانچہ ریاض غفار نے بھی میدان میں آتے ہوئے کہا۔

"آگ صرف تمہارے اندر نہیں لگی ہوئی بلکہ یہاں ہم سب ہی جل رہے ہیں لیکن یہ وقت اپنے احساسات کے بارے میں سوچنے کا نہیں ہے بریرہ ابھی تک اس شخص کے پاس قید ہے اس کے رحم و کرم پر ہے۔ لہٰذا باہر گاڑی میں بیٹھی لڑکی سے چاہے جتنی بھی نفرت محسوس ہو' چاہے اس پر جتنا بھی غصہ آئے اس کا اظہار کرنا سراسر حماقت ہے' ہماری بریرہ کی بہتری کے لیے ہمیں اس بلیک میلر کی ہدایت پر جبراً" عمل کرنا ہوگا۔"

"کب تک؟" شگفتہ غفار نے سخت چڑے ہوئے مگر بڑے ٹھوس لہجے میں پوچھا تو کچھ دیر تو ریاض غفار انہیں دیکھتے رہے پھر بڑے نڈھال سے انداز میں گویا ہوئے۔

"شاید ساری زندگی۔" اس سے پہلے کہ شگفتہ غفار کچھ کہتیں الیان تیزی سے بولا۔

"ہرگز نہیں! ساری زندگی ہم اس گھٹیا شخص کے ہاتھوں بلیک میل نہیں ہو سکتے۔"

"تو پھر کیا کرو گے تم۔" ریاض غفار کے لہجے میں حیرت تھی۔

"وہ تو مجھے بھی نہیں پتا مگر یہ تو طے ہے کہ میں اس لڑکی کو ساری زندگی کے لیے گھر نہیں لایا یہ صرف ایک مجبوری کا رشتہ ہے، جو بہت جلد ٹوٹ جائے گا۔" الیان حتمی لہجے میں بولا تو شگفتہ غفار مزید تپ گئیں۔

"اب رہنے دو یہ خیالی' بے سروپا باتیں۔ تم اس رشتے کو کبھی نہیں توڑ سکو گے ساری زندگی ہم اس منحوس کو اس ڈر سے برداشت کرتے رہیں گے کہ کہیں اس کا بھائی بریرہ کے اغوا کے راز کو فاش نہ کردے۔" شگفتہ غفار کی بات کسی زناٹے دار تھپڑ کی طرح الیان کو لگی تھی اس کا پورا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

ریاض غفار نے بڑی ناگواری سے شگفتہ غفار کو دیکھا جو ان دونوں کے تاثرات پڑھتے ہوئے تنک کر بولیں۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں دیکھ لینا ایسا ہی ہوگا۔"

"تو تم بتادو اس مسئلے کا کوئی بہتر حل' اگر تمہارے پاس ہے تو۔" ریاض غفار بھنا کر بولے تو فوری طور پر شگفتہ غفار کچھ کہہ نہ سکیں اور انہیں چند پل خاموش دیکھ کر ریاض غفار برہمی سے بولے۔

"جب کوئی مدد نہیں کر سکتیں تو مسائل بڑھانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ الیان تم کسے فون کرنے والے تھے۔" ریاض غفار' الیان کی طرف پلٹتے ہوئے بولے جو ابھی تک اس کیفیت سے باہر نہیں نکل سکا تھا جو شگفتہ غفار کے جملے کو سننے کے بعد ہوئی تھی۔

"بتاؤ نا الیان! یہ وقت فضول باتوں پر کڑھنے کا نہیں ہے اس وقت صرف بریرہ کے بارے میں سوچنا ہے۔" ریاض غفار اسے بدستور شگفتہ غفار کو دیکھتا دیکھ کر رسانیت سے بولے۔

الیان۔۔۔ گہرا سانس کھینچتے ہوئے کہنے لگا۔

"ابرار سے بات کرنے کے لیے اوپر آیا تھا کہ ابھی اور اسی وقت بریرہ کو واپس کردو۔ وہ خود تو پتا نہیں کب فون کرے گا میں اس کے فون کا انتظار نہیں کر سکتا۔"

"ہاں فوراً" فون کرو اسے ابھی اور اسی وقت' پتا نہیں میری بچی کس حال میں ہوگی جانے اس کے دل پر کیا بیت رہی ہوگی۔" شگفتہ غفار تڑپ کر بولیں۔

"ممی آپ باہر جائیں پھر میں بات کروں گا۔" الیان نے انہیں دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

"کیوں' کیوں میرے سامنے کیوں نہیں۔" وہ مچل اٹھیں۔

"ممی آپ کیوں یہ بار بار بھول جاتی ہیں بریرہ ابھی تک اس کے پاس ہے میں نہیں چاہتا پیچھے سے آپ کے کوئی غلط الفاظ اس کے کانوں میں پڑیں اور وہ اس کا انتقام بریرہ کو نشانہ ستم بنا کرلے۔" الیان زچ ہوا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہو کیا تمہیں میرے دل کی حالت کا اندازہ نہیں۔ میرا ایک ایک پل انگاروں پر گزر رہا ہے میرا دل پھٹا جا رہا ہے میری آنکھیں اسے دیکھنے کے لیے بے چین ہیں میری بانہیں اسے خود میں سمیٹ لینے کے لیے بے تاب ہیں اور تم کہہ رہے ہو میں باہر جاؤں گی تو تم بات کرو گے۔

ارے تم فون ملاؤ اور مجھے دو۔ میں بات کروں گی اس ذلیل انسان سے اور اس سے پوچھوں گی کیسا انسان ہے وہ خود ایک جوان لڑکی کا بھائی ہے اور دوسرے کی بیٹی کو اغوا کرتے ہوئے ذرا خوف خدا نہ ہوا۔"

"فار گاڈ سیک شگفتہ! یہ وقت جذباتی ہونے کا نہیں ہے الیان ٹھیک کہہ رہا ہے تم باہر چلی جاؤ نہیں تو الیان تم دوسرے کمرے میں جاکر بات کرلو۔" ریاض غفار' شگفتہ غفار کا رونا دھونا شروع ہوتا دیکھ کر چپ گئے اور ان کا یہ لب و لہجہ دیکھ کر شگفتہ غفار زارو قطار رونے لگیں اور پہلی بار الیان ان کے احساسات کی پروا کیے بغیر ان کے پاس سے گزرتا کمرے سے نکل گیا۔

اس وقت اس کے سر پر خون سوار تھا اس کا مجرم اس کے اتنے قریب کھڑا تھا کہ وہ ہاتھ بڑھا کر اس کا گلا دبا سکتا تھا پھر بھی وہ کچھ نہ کرسکا اور محض اس کی شکل دیکھ کر آگیا۔

شگفتہ غفار اس کے اس انداز پر بلک اٹھیں وہ تڑپ کر اس کے پیچھے بڑھی تھیں کہ ریاض غفار نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کرلینا چاہا۔

تو وہ ان پر بری طرح چیخ پڑیں انہوں نے پہلے ہی زندگی بھر اپنی چلائی تھی وہ کوئی خودسر قسم کی عورت نہیں تھیں مگر ریاض غفار سارے معاملات ان کے حوالے کرکے خود کاروباری زندگی میں مصروف ہو گئے تھے چنانچہ شگفتہ غفار سارے فیصلے خود ہی کرنے لگیں اور جب ان کے فیصلوں کے نتائج بھی بہترین نکلنے لگے تو انہوں نے بالکل ہی ریاض غفار سے مشورہ کرنا چھوڑ دیا۔

لہٰذا اس وقت ریاض غفار کا اس طرح انہیں روکنا انہیں خود پر ریاض غفار کا حاوی ہونے کی کوشش کرنا لگا تھا جو وہ بالکل برداشت نہیں کرسکیں اور ان ہی پر بگڑنے لگیں۔

ریاض غفار نے بھی مطلق پروا نہ کی وہ چاہتے تھے الیان سکون سے ابرار سے بات کرلے بلکہ انہوں نے جان بوجھ کر ان کے چلانے کے دوران دو چار باتیں ایسی کہہ دیں کہ وہ مزید بھڑ اٹھیں اور انہیں احساس ہی نہیں ہوا کہ ریاض غفار انہیں زیادہ سے زیادہ یہاں روکے رکھنے کے لیے اس طرح طیش دلا رہے ہیں۔

دوسری طرف الیان نے اس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھایا تھا وہ اسٹڈی روم میں پہنچ کر دروازہ اندر سے بند کرلیا۔

مگر اس کے یہ سارے اقدامات بے کار گئے تھے کیونکہ ابرار اس کا فون اٹھا ہی نہیں رہا تھا۔

اس پر شدید قسم کی جھنجلاہٹ سوار ہو گئی دل تو چاہ رہا تھا ابھی اس کے گھر پہنچ جائے مگر بریرہ اس کے قبضے میں تھی وہ بھلا ایسا کوئی کام کیسے کر سکتا تھا جس سے ابرار کے اشتعال میں اضافہ ہو جاتا اور پھر اس کے ستم کا نشانہ بریرہ کو بننا پڑتا۔

کئی دفعہ کی کوشش کے بعد بھی جب ابرار نے فون اٹینڈ نہیں کیا تو الیان دروازہ کھول کر باہر آگیا۔

شگفتہ غفار' ریاض غفار پر گرج برس کر الیان کی تلاش میں کمرے سے باہر آگئی تھیں مگر ابھی کسی کمرے کا تعین نہیں کر سکی تھیں لہٰذا کمروں کے سامنے بنے لیونگ روم میں کھڑی بین کر رہی تھیں۔

"الیان تو جوان ہے گرم خون ہے۔ اسے تھوڑی پتا ہے اسے ابرار سے کس طرح بات کرنی چاہیے جبکہ میں

زیادہ مناسب طریقے سے بات کرلوں گی۔ میں اپنی بچی کے لیے اس کے پاؤں تک پکڑنے کے لیے تیار ہوں۔ اب تو ہم نے اس کی بات مان لی ہے اب تو اسے بریرہ کو فوراً" چھوڑ دینا چاہیے بھلا اب اس کے پاس بریرہ کو اپنے پاس رکھنے کا کیا جواز بنتا ہے۔" شگفتہ غفار مزید کچھ کہنا چاہتی تھیں کہ الیان پر نظر پڑتے ہی وہ اس کے نزدیک چلی آئیں۔

"کیا ہوا؟ کیا کہا ابرار نے؟ کب چھوڑ رہا ہے وہ بریرہ کو؟" ان کے لہجے میں سارے جہاں کی بے چینی و بے قراری نمایاں تھی الیان صرف بے بسی سے انہیں دیکھ کر رہ گیا۔

ریاض غفار اپنی جگہ سے آگے نہیں بڑھے تھے مگر وہ بھی پوری طرح ہمہ تن گوش تھے۔

"وہ۔۔۔ فون نہیں اٹھا رہا۔" الیان نے نظریں چراتے ہوئے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"کیوں؟ کیوں نہیں اٹھا رہا اب اور کیا چاہیے اسے جو وہ بریرہ کو اپنے پاس رکھے ہوئے ہے۔" شگفتہ غفار بری طرح بھڑک اٹھیں۔

"شگفتہ۔۔۔ شگفتہ! ریلیکس ہو جاؤ۔ چھوڑ دے گا وہ بریرہ کو لیکن ان سب کاموں میں کچھ وقت تو لگے گا نا۔" ریاض غفار خود بھی اس جواب سے مایوس ہوئے تھے پھر بھی انہوں نے آگے بڑھ کر رسانیت سے کہنے کی کوشش کی اس سے پہلے کہ شگفتہ غفار ان کی بات کے جواب میں کچھ کہتیں لیونگ روم کی دیوار جو ان کے کمرے کی بھی بالائی دیوار تھی پر نصب انٹر کام بج اٹھا۔

ان تینوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر ریاض غفار جو اس انٹر کام کے سب سے قریب کھڑے تھے آگے بڑھے اور ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

دوسری طرف چوکیدار کی آواز اور بات سن کر وہ لمحہ بھر کے لیے سٹپٹا گئے پھر الیان کو دیکھتے ہوئے تیزی سے بولے۔

"وہ۔۔۔ وہ لڑکی ٹھیک کہہ رہی ہے وہ ہمارے ساتھ آئی ہے تم اسے اندر بھیج دو۔" یہ کہہ کر انہوں نے ریسیور رکھ دیا۔

"کیا ہوا؟" الیان نے وہی پوچھا جس کی ریاض غفار کو امید تھی۔

کب سے تو وہ کہہ رہا تھا اس لڑکی کو اندر لے آئیں مگر شگفتہ غفار کے حواس ٹھکانے پر ہی نہیں تھے اب اگر الیان یہ سنتا کہ چوکیدار اسے چور سمجھ رہا تھا اور جانے اس کے ساتھ اب تک کس طرح پیش آ رہا تھا تو الیان جو پہلے ہی بری طرح سے جھنجلایا ہوا ہے بالکل ہی آپے سے باہر ہو جاتا۔

چنانچہ انہوں نے حتی الامکان اپنے لہجے کو سرسری بناتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔

"کچھ نہیں۔ بس وہ لڑکی۔۔۔ کیا نام ہے اس لڑکی کا جسے ابھی لے کر آئے ہیں۔۔۔"

"رومیلہ نام ہے اس کا۔ لیکن ہوا کیا ہے؟" الیان چڑ کر بولا۔

"ارے کچھ نہیں ہوا وہ باہر کھڑی تھی تو چوکیدار پوچھ رہا تھا کہ کون ہے اور کس کے ساتھ آئی ہے وغیرہ۔ میں نے کہہ دیا ہمارے ساتھ آئی ہے اسے اندر بھیج دو۔" کوشش تو انہوں نے بہت کی معاملے کی نزاکت کو چھپانے کی۔ مگر الیان کوئی بے وقوف نہیں تھا وہ غصے سے شگفتہ غفار کی طرف پلٹا۔

"آپ ابھی تک اسے اندر لے کر ہی نہیں آئیں آخر آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آ رہا کہ وہ اس کٹڑھ کی بہن ہے جس کے رحم و کرم پر بریرہ ہے اگر اس نے اپنے بھائی سے ہمارے رویے کی شکایت کر دی تو وہ بریرہ کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہے۔" الیان روانی میں کہہ تو گیا مگر شگفتہ غفار کے چہرے کی رنگت زرد ہوتی دیکھ کر اسے خود بھی اپنے الفاظ کی سختی کا احساس ہو گیا تبھی رسانیت سے کہنے کی کوشش کرنے لگا۔

"آپ پلیز خود جا کر اسے باہر سے لے آئیں۔" شگفتہ غفار الیان کو نرم پڑتا دیکھ کر اور بھی جذباتی ہو گئیں ان کی پلکیں بھیگنے لگیں تو وہ باہر کی طرف بڑھ گئیں۔

گیٹ تک جانے سے پہلے انہوں نے سرداراں کی بھانجی کو انٹر کام کر کے اس کے کوارٹر سے بلوایا اور اس کے ساتھ جب وہ باہر پہنچیں تو رومیلہ کو گیٹ کے پاس بنی خوب صورت سی کیاری کے پاس کھڑا پایا۔

اس کے روہانسے چہرے پر نظر پڑتے ہی شگفتہ غفار کی رفتار میں ذرا سی کمی آ گئی ایک پل کو ہی سہی انہیں یہ احساس ہوا تھا کہ اس لڑکی کی آج شادی ہوئی ہے اپنے گھر بار کو چھوڑ کر آ گئی ہے اسے کیسا لگ رہا ہو گا اتنے غیر روایتی انداز میں رخصت ہو کر بالکل انجان لوگوں کی بیچ آنا وہ بھی اس طرح کہ اسے لانے والے اسے گیٹ پر ہی بھول گئے۔

مگر یہ کیفیت ان پر زیادہ دیر حاوی نہ رہ سکی کیونکہ اگلے ہی پل ان کی آنکھوں کے سامنے بریرہ کا چہرہ نمودار ہو گیا تو رومیلہ کہیں پس منظر میں چلی گئی۔

ان کی پھولی سی معصوم بچی جو بہت جلد ان کے آنگن کو چھوڑ کر جانے والی تھی جانے اس وقت کن حالات سے گزر رہی تھی۔

پتا نہیں وہ کن لوگوں کے بیچ ہو گی جانے وہ اس کے ساتھ کس طرح پیش آ رہے ہوں گے کیا بیت رہی ہو گی اس کے دل پر یہی سب سوچتے ہوئے ان کے قدم من من بھر کے ہو گئے وہ اس سے کافی فاصلے پر رک کر عجیب نفرت بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔

اب تک وہ اپنی پریشانیوں میں رومیلہ پر غور نہیں کر سکی تھیں اسے اسٹیج پر بیٹھا دیکھ کر بھی انہیں اس کے چہرے اور شخصیت کا جائزہ لینے کا خیال نہیں آیا تھا۔

وہاں ہوٹل میں وہ اس کے پاس اسٹیج پر جا ہی نہیں سکیں کچھ وہ ذہنی انتشار میں مبتلا تھیں اور کچھ انہیں ابرار کی بیوی نے ایسے گھیر رکھا تھا کہ وہ رومیلہ کو قریب سے دیکھ ہی نہیں سکیں۔

انہیں اس بات کا کوئی پچھتاوا نہیں تھا کیونکہ اب جبکہ وہ ان کے روبرو آ گئی تھی تب بھی انہیں اسے دیکھنے یا اس سے بات کرنے کی کوئی خواہش نہیں ہو رہی تھی بلکہ انہیں اس کے وجود سے ایک کراہیت محسوس ہو رہی تھی اگر بریرہ کا خیال نہ ہوتا تو وہ ابھی اور اسی وقت اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیتیں۔

لیکن بریرہ کی خاطر وہ اپنی شدید خواہش کو دبانے پر مجبور ہو گئیں اور خود کو زبردستی گھسیٹ کر اس کے نزدیک آ گئیں۔

رومیلہ ان پر نظر پڑتے ہی سنبھل کر اپنی جگہ سے غیر ارادی طور پر ایک قدم آگے آ گئی اسے امید تھی اب وہ اس کے قریب آ کر وضاحت پیش کریں گی کہ وہ کیوں اسے اس طرح یہاں چھوڑ گئیں۔

مگر اس وقت اسے شدید حیرت ہوئی جب انہوں نے ایک نظر غلط بھی اس پر ڈالنی گوارہ نہ کی بلکہ اپنے ساتھ کھڑی ملازمہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگیں۔

"اسے گیسٹ روم میں لے جاؤ اور جو کچھ یہ مانگے اسے دے دینا۔" شگفتہ غفار یہ کہہ کر واپس پلٹ گئیں انہیں خیال بھی نہیں آیا کہ ان کے ساتھ ان کی ملازمہ کی بھانجی کھڑی ہے۔

رومیلہ ششدر سی انہیں دیکھے گئی ان کا رویہ اس کے لیے ناقابل یقین تھا اس پر ان کا فرمان کہ "اسے گیسٹ روم میں لے جاؤ۔"

اسے بری طرح الجھا گیا تھا بھلا اسے گیسٹ روم میں لے جانے کی کیا ضرورت تھی اسے تو الیان کے کمرے میں جانا چاہیے تھا کیا یہ الیان کی والدہ کا فیصلہ تھا یا یہ الیان کی مرضی تھی۔

جب وہ اسے اپنے کمرے تک میں جگہ نہیں دے سکتا تو اپنی زندگی میں کیا مقام دے گا۔
رومیلہ جانے کتنی دیر کھڑی یہی سب سوچتی رہتی کہ ملازمہ کے تیسری بار۔
"چلیں بی بی۔" کہنے پر اس کے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔
جیسا کہ باہر سے ہی اندازہ ہو رہا تھا گھر بہت بڑا بہت خوب صورت اور جدید آسائشات سے مزین تھا لیکن شاید اس کے اپنے گھر کی طرح یہاں پر بھی رہنے والوں کی تعداد۔۔۔ کم تھی۔
گیسٹ روم تک آنے میں اسے گھر میں کوئی بھی نظر نہیں آیا وہ بس میکانکی انداز میں ملازمہ کے پیچھے چلتی ایک کمرے میں داخل ہو گئی جہاں دو ڈور کی ایک الماری ایک کوئین سائز بیڈ اور ایک ٹیبل اور کرسی رکھی تھی مجموعی طور پر کمرہ بڑا کشادہ اور صاف ستھرا سا تھا مگر ایک ہی نظر میں وہ یہ ظاہر کر دیتا تھا کہ یہ بالکل خالی کمرہ ہے اور یہاں کسی کی رہائش نہیں ہے۔
"آپ کے کھانے کے لیے کچھ لاؤں بی بی جی۔" ملازمہ نے اندر داخل ہو کر الماری کا ایک پٹ کھولا اور اس میں سے ایک کمبل نکال کر بستر پر پھیلاتے ہوئے پوچھنے لگی۔
رومیلہ کو کچھ کھانے کی خواہش نہیں ہو رہی تھی چنانچہ اس نے سر نفی میں ہلا دیا اور ملازمہ کو کسی قسم کی کوئی تاکید نہیں کی گئی تھی لہٰذا وہ بغیر اصرار کیے کمرے سے نکلنے لگی تو رومیلہ کو اسے روکنا پڑا۔
"ایک منٹ سنو۔ مجھے ایک جوڑا دے دو مجھے کپڑے بدلنے ہیں۔"
"جوڑا۔" وہ کچھ پریشانی سے رومیلہ کی شکل دیکھنے لگی۔
"ہاں کیوں کیا ہوا کیا یہاں کوئی ایسی لڑکی یا عورت نہیں جس کے کپڑے میں پہن سکوں میں کل صبح اپنے گھر سے کپڑے منگوا لوں گی تو اسے واپس کر دوں گی۔" رومیلہ نے وضاحت کی۔
"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ چھوٹی بی بی کے کپڑے آپ کو آرام سے آجائیں گے مگر چھوٹی بی بی تو دو دن سے نظر ہی نہیں آرہیں اور بڑی بی بی جی تو اپنے کمرے میں چلی گئی ہیں۔
وہ پہلے ہی بڑے غصے میں لگ رہی ہیں میں ان سے کپڑے مانگنے کمرے میں جاؤں گی تو وہ مجھے ڈانٹ ہی نہ دیں۔
اصل میں، میں تو یہاں نئی ہوں میری تو خالہ یہاں کام کرتی ہیں وہ ہوتیں تو مسئلہ نہیں تھا لیکن۔۔۔۔" اس نے مکمل طور پر اپنی بے بسی ظاہر کر دی تو رومیلہ کچھ دیر ساکت نظروں سے اسے دیکھتے رہنے کے بعد گہرا سانس کھینچتے ہوئے بولی۔
"ایسا کرو بس ایک گلاس پانی لا دو۔ یہ دروازہ باتھ روم کا ہے نا۔ کیا یہاں چپل ہوں گے۔" رومیلہ نے کمرے کے ایک کونے میں بنے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"مجھے معلوم نہیں۔ میں دیکھ لیتی ہوں ورنہ چپل تو شاید میں کہیں نا کہیں سے لا سکتی ہوں۔" اس نے کہتے ہی قدم دروازے کی طرف بڑھا دیے۔
"جی بی بی جی چپل تو ہیں یہاں۔" دروازہ کھول کر اس نے ایک نظر اندر جھانکا اور جیسے ہی پلٹ کر رومیلہ کو دیکھا چونک اٹھی۔
رومیلہ اپنی چادر اتار کر بستر پر ڈال چکی تھی اور اب جھک کر پاؤں کو پنسل ہیل والی سینڈل سے آزاد کر رہی تھی۔
"آپ دلہن ہیں؟" اس نے حیرانی سے پوچھا حالانکہ رومیلہ کا چہرہ دیکھنے سے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کوئی دلہن ہے مگر وہ پندرہ سولہ سال کی گاؤں سے آئی لڑکی تھی وہ رومیلہ کے میک اپ کو دیکھ کر یہی سمجھی تھی کہ شہر میں شاید لڑکیاں ایسے ہی تیار ہوتی ہوں گی۔

مگر رومیلہ کا بھاری کامدار لہنگا اور سر پر پنز لگا کر سیٹ کیا گیا دوپٹہ دیکھ کر اسے اندازہ ہوا کہ یہ سج دھج ایسے ہی نہیں ہے یہ تو زندگی کے سب سے خاص دن کی خاص تیاری ہے۔
رومیلہ کے ہاتھ اسٹیپ کھولتے ہوئے ایک دم تھم گئے۔
"دلہن؟ کیا وہ واقعی دلہن تھی دلہن ایسی ہوتی ہے جسے گاڑی میں ہی چھوڑ دیا جائے یا ملازمہ کے ساتھ کمرے میں بھجوا دیا جائے جس سے کھانے کو بھی نہ پوچھا جائے۔ اور جس کے بارے میں علم ہو کہ اس کے پاس کپڑے تبدیل کرنے کے لیے ایک جوڑا تک نہیں ہے پھر بھی اسے ایک خالی کمرے میں بھیج کر خود کمرہ بند کر کے سو جایا جائے۔"
"آپ دلہن ہیں تو یہاں کیا کر رہی ہیں آپ اپنی سسرال میں کیوں نہیں گئیں۔" اس کے لہجے میں اشتیاق اور آنکھوں میں تجسس بھرا تھا۔
رومیلہ کی سمجھ میں نہ آیا وہ اسے کیا جواب دے تو وہ ایک بار پھر خود ہی پوچھنے لگی۔
"آپ بڑی بی بی (شگفتہ غفار) کی کون ہیں؟" رومیلہ کا دل چاہا کہہ دے میں ان کی کوئی نہیں ہوں مگر وہ لب بھینچ کر رہ گئی آخر بہت سوچ کر اس نے کہا۔
"تم اگر میرے لیے کوئی کپڑے نہیں لا سکتیں تو مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ میں بہت تھک گئی ہوں مجھے نیند آرہی ہے۔"
"مگر آپ ان کپڑوں میں سوئیں گی کیسے۔ آں۔۔۔۔ میں آپ کو اپنا جوڑا لا دوں۔" رومیلہ نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔
وہ اور ایک ماسی کا جوڑا پہنے گی کیا اب اس کی ذات اتنے بے مایہ ہو گئی ہے کہ ایک جوڑے کے لیے اسے ماسی کا احسان لینا پڑے۔
"نہیں۔" وہ بے ساختہ بولی اپنے اندر سے اٹھتے سوالوں کو خاموش کرانے کے چکر میں وہ اس لڑکی سے بھی بڑی سختی سے بولی تو وہ ایک دم دل اچاٹ ہونے والے انداز میں کندھے اچکاتی کمرے سے نکل گئی۔
"سنو۔" رومیلہ کو اچانک احساس ہوا تھا کہ اسے اس لڑکی سے اس لہجے میں بات نہیں کرنی چاہیے تھی اول تو اس کا مزاج ایسا نہیں تھا دوسرے یہ کہ اس اجنبی ماحول میں جہاں سب کا رویہ بھی ناقابلِ فہم اور تکلیف دہ تھا وہاں کم از کم ایک فرد تو ایسا ہونا چاہیے جس سے بات چیت کی جا سکے۔
"اگر تمہیں مشکل نہ ہو تو اپنا کوئی جوڑا لا دو ویسے مجھے نہیں لگتا کہ تمہارے کپڑے مجھے آئیں گے۔" رومیلہ کا ارادہ اس کے کپڑے پہننے کا نہیں تھا وہ تو یہ سوچ کر منگوا رہی تھی کہ اس طرح اس کے رویے کی تلافی ہو جائے گی جبھی اس نے پہلے ہی کہہ دیا کہ اس کے کپڑے رومیلہ کو آئیں گے بھی نہیں۔
حالانکہ جس طرح کی لمبی چوڑی قمیص اس نے پہن رکھی تھی اسے زیب تن کرنا رومیلہ جیسی نازک سی لڑکی کے لیے بھلا کیا مشکل تھا۔
اس کی بات پر وہ لڑکی جیسے کھل اٹھی تبھی بڑے جوش سے بولی۔
"ارے میں تو بھول ہی گئی آپ نے پانی بھی تو مانگا تھا۔" وہ یہ کہہ کر جھپاک سے غائب ہو گئی اور رومیلہ خالی الذہن بیٹھی دروازے کو دیکھتی رہی۔

☆ ☆ ☆

الیان کی اس وقت تو ابرار سے بات نہ ہو سکی مگر کوئی ایک گھنٹے کے بعد ابرار کا فون خود ہی آگیا اس نے زیادہ

بات نہیں کی بس اتنی اطلاع دے کر فون بند کر دیا کہ بریرہ کل صبح تک گھر پہنچ جائے گی۔

اصل میں وہ الیان سے زیادہ بات کرنے سے کترا رہا تھا بھلے ہی الیان اسے پہچان گیا تھا مگر اس کی کوشش ابھی بھی یہی تھی کہ کسی طرح وہ الیان کو یہ یقین دلا دے کہ ان سب کے پیچھے اس کا ہاتھ نہیں ہے یا کم از کم اس کا شک کسی ثبوت کو حاصل کر کے یقین ہی میں نہ بدل جائے۔

اسی لیے اس نے الیان کا فون بھی اٹینڈ نہیں کیا کیا خبر الیان اس کی کال ٹیپ کر رہا ہو بے شک اس کی بہن ابرار کے پاس تھی لیکن بعض اوقات انسان غصے میں بھی کوئی قدم اٹھا لیتا ہے خاص طور پر اس وقت ایسے جذباتی اقدام کے امکان اور بڑھ جاتے ہیں جب انسان جب یہ جانتا ہو کہ اسے تکلیف پہنچانے والا اس کا دشمن کون ہے۔

اس لیے اب بھی ابرار کی کوشش یہی تھی کہ وہ شک و یقین کے بیچ جھولتا رہے اور کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکے بلکہ وہ تو کسی کو اس معاملے کی ہوا تک لگنے نہیں دینا چاہتا تھا اسی لیے خود بات کرنے پر مجبور تھا ورنہ اس آدمی سے ہی فون کروا لیتا جس کی مدد سے اس نے بریرہ کو اغوا کیا تھا مگر وہ بھی سوائے بریرہ کو اغوا کرنے کی جگہ کے اور کچھ اس کے متعلق نہیں جانتا تھا۔

جبکہ الیان سے بات کرنے کی صورت میں ابرار کو اسے بریرہ کو چھوڑنے وغیرہ کا ٹائم تو بتانا ہی پڑتا اور وہ اپنے جرم کے راز میں کسی کو بھی شامل نہیں کرنا چاہتا تھا کہ کل کو وہی اسے بلیک میل کرنے پر اتر آئے۔

اس نے دس سیکنڈ کی کال میں الیان سے بس اتنا ہی کہا تھا۔

"تم نے میری بات مان لی بہت اچھا کیا۔ بریرہ کل صبح تمہارے گھر پہنچ جائے گی کسی قسم کی ہوشیاری مت کرنا۔"

ابرار نے الیان کو بولنے کا موقع دیے بغیر لائن کاٹ دی۔

الیان صرف پیچ و تاب کھا کر رہ گیا اس نے محض یہ سوچ کر خود کو تسلی دے دی تھی کہ "ایک بار بریرہ کو آنے دو پھر دیکھوں گا۔"

وہ پوری رات اس کی جاگتے ہوئے گزری تھی ایک دو بار وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آیا تو ریاض غفار کے کمرے کی لائٹ، دروازے کے نیچے کی جھری سے جلتی ہوئی صاف نظر آ رہی تھی الیان اسے دیکھ کر الٹے قدموں واپس لوٹ جاتا، مبادا شگفتہ غفار اس کے قدموں کی چاپ سن کر کمرے سے باہر آ گئیں تو پھر ایک لا حاصل بحث ان کے بیچ چھڑ جائے گی۔

اسی ادھیڑ بن میں بالکل صبح کے قریب کہیں جا کر اس کی آنکھ لگی اور اندرونی بے کلی کے باعث فوراً ہی آدھے گھنٹے میں کھل بھی گئی۔

وہ گھڑی کو ساڑھے چھ بجاتا دیکھ کر اٹھ کر باہر آ گیا رات کو جو کپڑے پہن کر وہ گیا تھا ابھی تک وہی زیب تن کیے ہوئے تھا بس کوٹ اتار کر کمپیوٹر چیئر کے اوپر ڈال چکا تھا اس کے شکن آلود کپڑے اس کے رت جگے کو کھل کر بیان کر رہے تھے۔

وہ کمرے سے نکلا تو ریاض غفار کو ان کے کمرے کے سامنے کھڑا دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"کیا ہوا ڈیڈی خیریت؟" اپنا سوال اسے خود بھی عجیب لگا بھلا خیریت کہاں تھی ان کے گھر میں جو وہ اس طرح پوچھ رہا تھا۔

"وہ..... تمہارے ماموں کا فون آ رہا تھا۔ ابھی ابھی شگفتہ کی آنکھ لگی ہے تو میں کمرے سے باہر آ گیا کہ کہیں ....." انہوں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ماموں کا فون؟ اتنی صبح صبح۔" الیان نے تعجب سے کہا۔

"ہاں حیرت تو مجھے بھی ہے۔ کیا کروں؟ ان کے فون کا انتظار کروں یا خود ملا لوں۔ میرے باہر آنے تک لائن کٹ گئی۔" وہ ایسے بولے جیسے خود سے فیصلہ نہ کر پا رہے ہوں۔

"نہیں آپ مت ملائیں کوئی ضروری کام ہو گا تو وہ خود کر لیں گے کیا پتا غلطی سے مل گیا ہو ورنہ اتنی صبح صبح وہ کیوں فون کریں گے۔"

"ویسے اٹھتے تو وہ صبح ہی ہیں بلکہ مارننگ واک کے لیے فجر کے فوراً بعد باہر ہی نکل جاتے ہیں۔ خیر تم کہاں جا رہے تھے۔"

"مجھے کہاں جانا ہے ابرار نے کہا تھا بریرہ کو صبح بھیج دوں گا تو بس اسی امید پر گیٹ تک جا رہا تھا۔" الیان کا لہجہ شکستہ خوردہ تھا اس سے پہلے کہ ریاض غفار کچھ کہتے ان کا موبائل بج اٹھا۔

"تمہارے ماموں کی ہی کال آ رہی ہے اللہ خیر کرے۔" ریاض غفار نے خود کلامی کے انداز میں بولتے ہوئے موبائل کان سے لگا لیا۔

جس قسم کے حالات سے وہ گزر رہے تھے اس میں کوئی اچھی بات ذہن میں آنا مشکل ہی تھا الیان بھی بے اختیار ان کے نزدیک آ گیا جیسے ان کی گفتگو سننا چاہ رہا ہو وہ رسمی سلام دعا کے بعد کہنے لگے۔

"خیریت تو ہے نا آپ نے اس وقت فون کیا ہے؟"

"ہاں..... ریاض بھائی۔ آپ لوگ کل رات کہیں گئے تھے کیا۔" ماموں جان کا لہجہ عجیب سا تھا جیسے وہ کچھ سوچ رہے ہوں۔

"آں..... کیا مطلب۔" ریاض غفار نے بوکھلا کر الیان کی جانب دیکھا۔

الیان ان کے اتنے نزدیک کھڑا تھا کہ اسے بھی ماموں جان کا سوال سنائی دے گیا تھا وہ خود بھی دزدیدہ نظروں سے ریاض غفار کو دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو۔

"ماموں جان یہ سوال ایسے ہی نہیں پوچھ رہے ضرور انہیں کوئی سن گن مل گئی ہے۔"

کل رات شادی میں کچھ لوگ ایسے بھی موجود تھے جنہیں ریاض غفار ذاتی طور پر جانتے تھے ان لوگوں نے تو موبائل نکال کر فوراً" تازہ ترین سے اپنے جاننے والوں کو آگاہ کرنے کی کوشش کی ہو گی ہو سکتا ہے اسی کوشش میں یہ خبر ماموں جان کے کانوں تک پہنچ گئی ہو۔

یہی سوچتے ہوئے ریاض غفار کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا جواب دیں اس لیے انہوں نے خود ہی سوال کر دیا۔

"بھئی میرا مطلب ہے کیا آپ لوگ کل کسی تقریب وغیرہ میں گئے تھے۔" ماموں جان کا لہجہ ناقابلِ فہم تھا جانے وہ طنز کر رہے تھے یا واقعی پوچھ رہے تھے۔

"آں..... آپ..... آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"ارے بھئی آپ اتنا گھبرا کیوں رہے ہیں دراصل آج کے اخبار نے ایک عجیب و غریب افواہ اڑا دی ہے الیان کے متعلق۔

بے غیرتوں نے لکھا ہے کہ اس کی شادی کل رات پیلس ہوٹل میں انجام پا گئی۔" ریاض غفار کے تو ہاتھوں کے توتے اڑ گئے وہ فوراً" ہکلاتے ہوئے بولے۔

"ک..... کیا..... یہ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" الیان نے بروقت ہاتھ اٹھا کر انہیں مزید کچھ کہنے سے روک دیا تو وہ کچھ جھنجھلائے ہوئے انداز میں اسے دیکھنے لگے جو آنکھ سے انہیں سب بتا دیں کا اشارہ کر رہا تھا ریاض غفار بے یقینی سے الیان کو دیکھنے لگے جبکہ ماموں جان دوسری طرف سے کہہ رہے تھے۔

"ہاں میں حسبِ عادت مارننگ واک کے لیے نکلا تھا مگر ریسپشن پر رکھے اخبار کو دیکھ کر ساری واک وغیرہ

بھول گیا۔ میری خود سمجھ میں نہیں آرہا الیان کو اس اسکینڈل میں انوالو کر کے پریس کو کیا مل جائے گا اسی لیے تو میں پوچھ رہا ہوں کیا کل آپ لوگ کہیں گئے تھے۔"

"نہ ــــ نہیں ہم تو کہیں نہیں گئے۔" ریاض غفار کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی وہ کہنے کی جو کہنے کا اشارہ الیان مستقل انہیں کر رہا تھا۔

ان کے اس جواب پر تو الیان نے جیسے اپنا سر پیٹ لیا۔ جب ایک بات سب کو بتانی ہی ہے تو پھر اس وقت ٹال کر وہ آئندہ کے لیے جھوٹے کیوں بن رہے ہیں۔

ریاض غفار اس سے متفق تو تھے مگر وہ اس فعل پر اتنے شرمندہ تھے کہ چاہتے ہوئے بھی اس کا اعتراف نہیں کر پا رہے تھے۔

"اوہ اچھا یعنی انہوں نے تصویر کسی اور وقت کی چھاپ دی ہے۔" ماموں جان ایسے بولے جیسے ہاتھ میں پکڑے اخبار میں چھپی تصویر کو غور سے دیکھ رہے ہوں۔

"ت ــــ تصویر۔" ریاض غفار چونکے۔

"الیان کی ایک لڑکی کے ساتھ تصویر چھپی ہوئی ہے دونوں دولہا دلہن کی طرح اسٹیج پر ساتھ بیٹھے ہیں ویسے تو آج کل ٹرک فوٹوگرافی کے ذریعے ایسی تصویر بنا لینا کچھ مشکل نہیں۔ مگر میرے خیال سے یہ تصویر اصلی ہے الیان کسی شادی میں گیا ہے اور انہوں نے دلہن کے ساتھ اس کی تصویر ایسے لگا دی جیسے وہی دولہا ہو۔ اصل میں ہمارا الیان اتنی کم عمری میں اتنی کامیابیاں حاصل کر چکا ہے کہ اس سے حسد کرنے والے بہت پیدا ہو گئے ہیں۔ لیکن ایسی خبریں لگا کر وہ الیان کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتے بس اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑ لیتے ہیں۔" ماموں جان اپنی ہی دھن میں بولے جا رہے تھے۔

دوسری طرف الیان، ریاض غفار کو اشارہ کرتے کرتے زچ ہو گیا مگر ریاض غفار چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کہہ پا رہے تھے وہ صرف بے بسی سے الیان کو دیکھتے ہوئے ماموں جان کو نان اسٹاپ بولتا سن رہے تھے آخر الیان سے برداشت نہیں ہوا تو اس نے موبائل ریاض غفار کے ہاتھ سے چھین لیا۔

"ہیلو السلام علیکم ماموں جان۔" الیان کی آواز سنتے ہی ماموں جان سنجیدہ ٹون چھوڑ کر ایک دم شوخی اور زندہ دلی سے بولے۔

"وعلیکم السلام، بھئی تم تو بڑے مشہور ہو گئے ہو فلمی ہیروز کی طرح تمہارے بھی اسکینڈل چھپنے لگے ہیں۔ کمال ہے بھئی ہمیں نہیں پتا تھا کہ بزنس میں بھی اتنی شہرت ہوتی ہے۔"

"ماموں جان ــــ وہ کوئی اسکینڈل نہیں سچ ہے۔ کل رات واقعی میری شادی ہو گئی ہے۔" الیان صرف ایک لمحے کے لیے اٹکا تھا اس کے بعد بغیر رکے اتنی روانی سے بولا کہ جیسے ابھی نہیں بول سکا تو کبھی نہیں کہہ سکے گا۔

"ال ..... الیان ..... یہ کیا مذاق ہے بیٹے۔" ماموں جان ٹھٹک گئے۔

"یہ مذاق نہیں ہے ماموں جان حقیقت ہے۔ میں نے شادی کر لی ہے۔" الیان کہہ کر خاموش ہو گیا وہ سوچ رہا تھا کہ اپنی اس اچانک شادی کا کیا جواز پیش کرے یقیناً" ماموں جان اب اس سے اس افراتفری کی وجہ پوچھنے والے ہوں گے۔

مگر دوسری طرف تو بالکل خاموشی چھا گئی تھی وہ تو جیسے ہکا بکا رہ گئے تھے تبھی ان کے احساسات محسوس کرتے ہوئے الیان بمشکل بولا۔

"ماموں جان۔ اصل میں ــــ میں بہت شرمندہ ہوں جو ہوا وہ سب اتنا اچانک ہوا کہ ہم کسی کو اطلاع نہ دے

بس یوں سمجھ لیں کہ حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ مجھے یہ شادی کرنی پڑی۔" الیان کو جب کوئی جواز مناسب نہ لگا تو وہ بس یہی کہہ کر رہ گیا۔

اصل میں ماموں جان بھی تو بالکل خاموش ہو کر رہ گئے تھے اگر وہ سوال و جواب اور لعن طعن پر اتر آتے تو شاید الیان کے لیے صورت حال اتنی مشکل نہ ہوتی۔

وہ ان کے بگڑنے پر ان سے بحث کر کے فون بند کر سکتا تھا مگر ان کی چپ اس کے اصول پسند مزاج پر کوڑے برسا رہی تھی۔

اسے لگ رہا تھا جیسے اس شخص سے کوئی بھی جھوٹ بولنا یا خود کو زبردستی حق پر ثابت کرنے کی کوششیں کرنا ایک فضول عمل ہونے کے ساتھ ساتھ زیادتی بھی ہے۔

جب آپ ایک شخص کا مان توڑ چکے ہوں پھر اسے صدمے میں گھرا دیکھ کر اسے الٹی سیدھی تاویلیں پیش کرنے لگیں یہ الیان تو کیا کسی بھی باضمیر شخص کے لیے ناقابلِ عمل تھا۔

تبھی الیان نے محض اتنا کہہ کر فون بند کر دیا۔

"مجھے معلوم ہے اتنے قریبی رشتے میں اتنی اہم خبر آپ کو اخبار سے پتا چلی ہے یہ واقعی آپ کے لیے دکھ کی بات ہے مگر یقین کریں حالات ایسے نہ ہوتے تو میں یہ دکھ آپ کے حصے میں کبھی نہ آنے دیتا۔" ریاض غفار بت بنے الیان کے شرمندہ انداز کو دیکھ رہے تھے اس کے فون بند کرنے پر وہ ایک دم طیش میں آتے ہوئے بولے۔

"مجھے فوراً" وہ اخبار چاہیے ذرا پتا تو چلے کس رپورٹر نے وہ خبر لگائی ہے۔"

"اس سے کیا ہو گا؟" الیان پژمردہ لہجے میں بولا۔

"اس سے یہ ہو گا کہ میں اس سے بات کروں گا کہ"

"کہ اس نے سچ کیوں لکھ دیا۔" الیان نے ان کی بات کاٹ دی اور انہیں بولنے کا موقع دیے بغیر کہنے لگا۔

"وہاں اتنے لوگ موجود تھے کہ اگر یہ خبر اخبار میں نہیں بھی چھپتی تب بھی ہمارے سرکل میں تیزی سے پھیل جاتی۔

ابھی تو صبح ہوئی ہے لوگ عموماً" اتنی جلدی اٹھنے کے عادی نہیں ہوتے مگر آٹھ بجے کے بعد آپ اور ممی اپنا موبائل بند کر دیں تو بہتر ہے ورنہ خوامخواہ آپ دونوں کا بی پی ہائی ہوتا رہے گا۔"

"مجھے بھی پتا ہے کہ یہ بات جنگل کی آگ کی طرح شہر میں پھیل جائے گی مگر اخبار میں چھپنے سے تو ایک ہی دن میں سب کو پتا چل گیا نا ورنہ پہلے ہم بریرہ کے معاملے سے نبٹ جاتے پھر لوگوں کو خبر ہوتی تو ــــ"

"فار گاڈ سیک ڈیڈی اپنی تصوراتی دنیا سے باہر آجائیں۔ آپ اس خبر کو نہیں چھپا سکتے بلکہ آپ کو خود اعلان کرنا ہے۔ بریرہ کی شادی والے دن میرا ولیمہ ہونا ہے اچھا ہی ہے جو سب کو پہلے ہی خبر ہو جائے۔ ویسے بھی مجھے یقین ہے یہ خبر ابرار نے ہی چھپوائی ہو گی جبھی تصویر بھی چھپی ہے۔" الیان دانت پیستے ہوئے بولا تو ریاض غفار چونک اٹھے۔

واقعی الیان ٹھیک کہہ رہا تھا ابرار اس شادی کا اعلان کرنے کے لیے ایسا کر سکتا تھا۔

ایک بار پھر ان کے اندر غصے کی شدید لہر اٹھی تو وہ بغیر کچھ کہے کمرے کی طرف پلٹ گئے وہ الیان کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے مگر شگفتہ غفار کو بھی اخبار میں چھپی خبر سے آگاہ کرنا چاہتے تھے کیونکہ سب سے زیادہ فون تو ان ہی کے پاس آنے والے تھے جس میں ایسی عورتوں کی کال بھی موجود تھی جو اپنی بیٹیوں کے لیے آس لگائے بیٹھی تھیں۔

وہ تو کسی آسیب کی طرح شگفتہ غفار سے چمٹ جائیں گی اور بال کی کھال اتارنا شروع کر دیں گی۔

دوسری طرف الیان انہیں پاؤں پٹختا دیکھ کر اپنا بھی ضبط کھونے لگا وہ بغیر کچھ سوچے سمجھے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

اس کا ارادہ ابھی اور اسی وقت ابرار کے گھر جانے کا تھا جب اس نے اپنی شرط پوری کردی تھی تو ابرار اپنے وعدے سے کیوں نظریں چرا رہا تھا۔

کیا سوچ کر اس نے الیان کی بہن کو اپنے پاس رکھا ہوا ہے کہیں اس کی نیت میں فتور تو نہیں آگیا یا پہلے سے ہی وہ یہ ٹھانے بیٹھا تھا کہ بریرہ کو تب تک نہیں چھوڑے گا جب تک کہ اس کا دل نہ بھر جائے۔

ایک پل میں الیان کے دل میں ان شیطانی وسوسوں نے سر اٹھایا تو دوسرے ہی پل وہ ابرار کے گھر جانے کے لیے تیزی سے سیڑھیاں اترتا باہر کی جانب جانے لگا مگر عین سیڑھیوں کے پاس بنے گیسٹ روم کے دروازے سے نکلتے وجود سے ٹکرا گیا۔

ہاتھ میں چائے کی پیالی اور طشتری پکڑے وہ لڑکی اس ٹکراؤ پر اپنی گرفت برقرار نہ رکھ سکی اور چائے سے بھری پیالی جب زمین پر گر کر چکنا چور ہوئی تو اس کی چھینٹیں ان دونوں کے ہی کپڑوں کو داغ دار کر گئیں۔

"دکھائی نہیں دیتا کیا۔" الیان تو پہلے ہی غصے سے بھرا ہوا تھا اپنے کپڑوں کو چائے سے خراب ہوتا دیکھ کر تڑخ کر بولا اس نے اس بات پر غور ہی نہیں کیا کہ چائے بالکل ٹھنڈی تھی۔

البتہ سامنے کھڑی عجیب ملگجے سے کپڑوں میں ملبوس وہ لڑکی بے ساختہ کہہ گئی۔

"میں تو ابھی ابھی کمرے سے نکلی تھی چل تو آپ رہے ہیں۔" الیان اس کی بات پر بھڑک اٹھا۔

"بکواس بند کرو۔ چلنے تک کی تمیز نہیں تمہیں کام کیا خاک آتا ہوگا۔ یہ سرداراں بھی جسے چاہتی ہے اپنی جگہ کام کے لیے بھیج دیتی ہے کب آئے گی وہ واپس۔" الیان کے پوچھنے پر وہ لڑکی حیرت زدہ سی اسے دیکھنے لگی۔

"میں نے کچھ پوچھا ہے سرداراں کب کام پر واپس آئے گی۔" الیان کے چبا کر پوچھنے پر وہ اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

"مجھے نہیں معلوم۔"

"کیوں۔ کیا تم اس کی جگہ غیر محدود مدت کے لیے کام کرنے پر راضی ہوئی ہو۔" الیان نے طنزیہ کہا تھا اسے غصہ اس بات پر آرہا تھا کہ وہ سیدھا سیدھا۔ "صاحب معاف کرو۔" کہہ کر آگے کیوں نہیں بڑھ گئی وہ اس کے سامنے جمی سر اٹھائے اس کی طرف کیوں دیکھ رہی ہے اسے تندہی سے زمین پر پھیلتی کرچیوں کو سمیٹنا چاہیے تھا پونچھے کا کپڑا لا کر جلدی سے چائے کا داغ صاف کرنا چاہیے تھا۔

اس طرح بحث پر آمادہ وہ کوئی کام چور اور ہڈ حرام لگ رہی تھی۔

"میں سرداراں کی جگہ کام پر نہیں آئی ہوں۔ میرا نام رومیلہ ہے۔" رومیلہ کا لہجہ اور اس کے تاثرات دونوں ایک دم سرد تھے۔ ایک پل کے لیے الیان اپنی جگہ سن ہو گیا۔

صبح صبح چائے کی پیالی لے جاتی ان معمولی سے کپڑوں میں ملبوس وہ رومیلہ بھی ہو سکتی ہے یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا مگر سچائی پتا چلنے پر اب اس نے اس کے حلیے کی بجائے اس کی شخصیت پر غور کیا جس میں صف اول اس کا چہرہ تھا۔

نازک نازک نین نقش کے ساتھ وہ بڑی بڑی آنکھوں والی کومل سی لڑکی بغیر کسی میک اپ کے بالکل سادہ سے چہرے کے ساتھ گلابی گلابی سی لگ رہی تھی کیونکہ اس کی آنکھیں ہلکی ہلکی سرخ ہو رہی تھیں جانے وہ رات بھر جاگتی رہی تھی یا رونے کی وجہ سے ایسا ہوا تھا یا شاید دونوں ہی باتیں تھیں اس کی گیلی پلکیں اس کے رونے کی صاف چغلی کھا رہی تھیں۔

حالانکہ رومیلہ کئی بار اپنا چہرہ دھونے کے بعد کمرے سے نکلی تھی۔

وہ لڑکی جو جوڑا رومیلہ کو رات میں دے گئی تھی رومیلہ کا اسے پہننے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اس نے تقریباً ساری رات اسی بھاری جوڑے میں گزار دی حالانکہ وہ لڑکی بڑا صاف ستھرا جوڑا دے کر گئی تھی مگر رومیلہ کا ذہن اس بات کو قبول نہیں کر رہا تھا کہ اسے ایک کام والی کی اترن لینی پڑے گی۔

وہ لڑکی جوڑے کے ساتھ رومیلہ کے لیے چائے اور بسکٹ بھی لے آئی تھی اس کا کہنا تھا۔

"دلہن بن کر کون سا کھانا کھایا جاتا ہے تھوڑے سے بسکٹ تو لے لیں۔" اصل میں کھانے کے لیے رومیلہ نے دوٹوک انکار کردیا تھا لہٰذا وہ بسکٹ اور چائے پانی کے ساتھ پوچھے بغیر لے آئی۔

یہ بات اور تھی کہ وہ چائے بھی رکھے رکھے پانی ہو گئی تھی ساری رات آنکھوں میں کاٹتے ہوئے وہ یہی سوچ رہی تھی کہ کوئی تو اس کے پاس آتا اس کا حال احوال پوچھنے۔

آخر اس جمود کو تھوڑی دیر پہلے آئے ابرار کے فون نے توڑا اتنی صبح صبح جسے عرف عام میں رات ہی کہا جاتا ہے ابرار کا نمبر اپنے موبائل پر دیکھ کر وہ قدرے حیران رہ گئی اور کال ریسیو کرنے پر تو جیسے حیرت دوچند ہو گئی کیونکہ وہ صاف صاف ان سب کے رویوں کے متعلق اس کی رائے لے رہا تھا۔

حالانکہ اس کے سوال ایسے کوئی انوکھے نہیں تھے جن حالات میں رومیلہ کی شادی ہوئی تھی اور حالات ایسے نہ بھی ہوتے تب بھی بیٹی بیاہتے وقت لڑکی کے گھر والوں کے وسوسے کم و بیش اسی قسم کے ہوتے ہیں۔

مگر ابرار نے جس وقت اسے فون کرکے پوچھا تھا وہ رومیلہ کے لیے زیادہ حیران کن تھا اب اسے تو خبر نہیں تھی نا کہ یہ سب ابرار نے کس طرح کیا ہے۔

خود ابرار بھی ساری رات سونے جاگنے کی کیفیت سے گزرتا رہا تھا اپنے پلان کے مطابق اس نے اس شادی کا جلد سے جلد اعلان کردینے کے لیے بمعہ تصویر اس کی خبر بھی اخبار میں دے دی تھی یہ سارے انتظامات وہ رات سے ہی کیے بیٹھا تھا مگر اب اپنے موبائل پر الیان کی بار بار کال آتی دیکھ کر اسے یہی مناسب لگا کہ وہ ایک بار رومیلہ سے بات کرکے صورت حال کا جائزہ لے لے اس نے بہت کھل کر سب کی بابت پوچھا تھا مگر رومیلہ ایک بھی جواب پوری سچائی سے نہ دے سکی ہر جواب میں اس نے جھوٹ کی آمیزش کی تھی یا مکمل جھوٹ بول دیا تھا۔

انہوں نے سوال نامہ ختم ہونے پر فون بند کردیا اور رومیلہ کے دل میں اٹھتے سوال ادھورے ہی رہ گئے تب اس نے نمل کا فون ملا لیا۔

صبح صبح اس کی کال دیکھ کر نمل بھی آنکھیں ملتی اٹھ بیٹھی خود اس کے اندر سوالوں کا ڈھیر جمع تھا مگر رومیلہ کو اس وقت وہ فون نہیں کر سکتی تھی وہ تو کل رات سے اس سے بات کرنے کے لیے مناسب وقت کا انتظار کر رہی تھی لیکن جو باتیں اس نے رومیلہ کو بتائیں انہیں سننے کے بعد رومیلہ مزید الجھ گئی۔

جو جوڑا وہ یہ سوچ کر نہیں پہن رہی تھی کہ ابھی اس کے میکے سے سب اسے لینے آئیں گے تو وہ نمل یا سنبل سے کچھ منگوا لے گی لیکن جب ساری امیدوں پر پانی پھر گیا تو وہ اسے ہی زیب تن کرکے ایسے کمرے سے نکلی جیسے چائے کی پیالی کچن میں رکھنے جا رہی ہو کیونکہ ایک انجانے گھر میں جن حالات میں وہ لائی گئی تھی اسے خود سے کمرے سے نکلنا بڑا عجیب لگ رہا تھا چنانچہ اسے ایک بہانے کی اشد ضرورت تھی۔

لیکن اسے کیا پتا تھا کہ وہی پیالی لے کر وہ الیان سے ٹکرا جائے گی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

✡ ✡

شعاع محمود

کرن کرن خوشبو

نبی امت کا خیر خواہ ہوتا ہے

حضرت ابو ہریرہؓ نقل کرتے ہیں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تمہارے ساتھ محبت اور خیر خواہی میں کہ تم بھی آخرت کے عذاب سے بچ کر ہمیشہ کی نعمتیں حاصل کرلو۔

میری مثال اس شخص کی سی ہے' جس نے آگ روشن کی' جب اس نے ارد گرد کو خوب روشن کردیا تو پروانے اور کیڑے جو آگ میں گرا کرتے ہیں گرنے لگے وہ ہے کہ انہیں روک رہا ہے اور یہ ہیں کہ عاجز کرکے آگ میں گھسے جارہے ہیں' اسی طرح میں بھی ہوں کہ تمہاری کمر پکڑ پکڑ (یعنی تمہاری منت سماجت کرکے) تمہیں دوزخ سے بچا رہا ہوں اور تم ہو کہ اس میں گھسے جاتے ہو' صحیح مسلم کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ وہ میری اور تمہاری مثال ہے۔ میں تمہاری کمر پکڑے ہوئے (کہہ رہا) ہوں' دوزخ سے بچو' دوزخ سے بچو' تم مجھے عاجز کرکے اس میں گھسے جاتے ہو۔"

(بخاری و مسلم)

ارم آفتاب۔۔۔ کراچی

لاجواب

حضرت لقمانؑ نے باوجود عمر درازی کے کوئی مکان نہیں بنایا اور ایک جھونپڑی میں ہی پوری زندگی گزار دی۔ ملک الموت نے پوچھا۔ "آپ نے اتنی لمبی عمر پائی' اس کے باوجود کوئی مکان نہیں بنایا' اس کی کیا وجہ تھی؟"

آپؑ نے فرمایا۔ "جس کی تاک میں آپ رہیں' اس کو مکان بنانے کی کب سوجھتی ہے؟"

روبینہ ناز۔۔۔ کراچی

باتوں سے خوشبو آئے

☆ صادق شخص کی علامت یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ ملا جلا رہے اور دل میں اکیلا ہو' صرف اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہو۔

(حضرت ابوبکر صدیقؓ)

☆ حق کا پرستار کبھی ذلیل نہیں ہونا چاہیے۔ سارا زمانہ اس کے خلاف ہوجائے۔

(حضرت عائشہ صدیقہؓ)

☆ خدا کا راستہ یہ ہے کہ جاہلوں سے الگ تھلگ رہو' عالموں کی صحبت اختیار کرو' علم پر عمل کرو اور ذکر میں مشغول رہو۔

(شیخ ابو یعقوب بن اسحاق)

☆ کچھ باتیں اور منظر یادوں کے طوفان میں ان تنکوں جیسے ہوتے ہیں جن کے سہارے دور تک اور دیر تک بہا جاسکتا ہے۔

(اختر عباس)

☆ وقت ضائع کرتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ وقت بھی آپ کو ضائع کررہا ہے۔

(ارسطو)

سدرہ وزیر۔۔۔ خوشاب پیل

حق دار

ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا۔

"میں صدقہ خیرات کرنا چاہتا ہوں' لیکن مجھے اندازہ نہیں کہ کون حق دار ہے اور کون نہیں۔"

"تم اس کو دے دو جو حق دار ہے۔" بزرگ نے

کہا۔

"اور اس کو بھی دے دو جو حق دار نہیں' اللہ تجھے وہ دے گا جس کا تو حق دار ہے اور وہ بھی دے گا جس کا تو حق دار نہیں ہے۔"

فوزیہ ثمر بٹ۔۔۔ گجرات

خطرناک دھمکی

ایک عورت کافی دنوں سے اپنی ماں کے گھر آئی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی ایک سہیلی کو فون کیا۔ شوہر جی کے مزاج گرامی یہ بات ہونے لگی تو اس نے بتایا۔

"آج کل میں نے اپنے شوہر کے غصے کو کنٹرول کیا ہوا ہے۔"

سہیلی حیرت سے بولی۔ "وہ کیسے؟"

"میں نے انہیں دھمکی دی ہے کہ اگر آپ نے زیادہ غصہ کیا تو میں فوراً" گھر واپس آجاؤں گی۔"

عورت نے چہکتے ہوئے جواب دیا۔

مہوش اختر۔۔۔ نارتھ کراچی

رحم دلی۔۔۔؟

ایک دفعہ تاتاریوں کے سردار چنگیز خان سے کسی نے پوچھا۔

"اے خان تاتار تونے کبھی کسی پر رحم کیا ہے؟"

"ہاں!" چنگیز خان نے جواباً" کہا۔

"ایک دن میں گھوڑے پر سوار نیزہ اٹھائے ایک ندی کے قریب سے گزر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک عورت ندی کے کنارے کھڑی روتے ہوئے مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ قریب ہی اس کا ننھا بچہ ندی میں ڈبکیاں کھا رہا تھا۔ مجھے عورت پر ترس آگیا۔ بچہ کنارے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں گھوڑے سے اتر کر بچے کے قریب پہنچا' پھر میں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر نیزہ بچے کے پیٹ میں گھونپ دیا اور اسے نیزے کی نوک پر اٹھا کر اسے اس کی ماں کے سپرد کردیا۔"

سیدہ عابدہ حسین شاہ۔۔۔ فتح جنگ

کچھ لفظ چنے ہیں

☆ کوئی آپ کی بات سننا بھی گوارا نہ کرے' اس سے بڑی آپ کی توہین اور کیا ہوگی۔

☆ بات الفاظ کی نہیں' بات لہجے کی ہوتی ہے۔

☆ انسان کی اصلیت طیش کی حالت میں سامنے آتی ہے۔

☆ زندگی میں تجربات کیجیے' انسان تجربے ہی سے سیکھتا ہے۔

☆ دور سے آنے والی آواز بھی اندھیرے میں روشنی کا کام دیتی ہے۔

☆ زندگی میں سوال زیادہ اور جواب کم ہیں۔

☆ لفظ کا بے سبب استعمال گناہ ہے۔

☆ دولت کے بھوکے کو کبھی راحت و سکون نہیں ملتا۔

☆ اپنی مرضی اور اللہ کی مرضی میں فرق کا نام غم ہے۔

☆ ہٹ دھرمی پھیکے مشروب کی طرح ہے' یہ نہ آپ کو کچھ دے گی اور نہ دوسروں کو' کسی کو قائل کرنے کے لیے دلائل استعمال کریں' یہ زیادہ موثر طریقہ ہے۔

☆ ذہن میں اچھے خیالات کو جگہ دیجیے' آپ خیر خواہ دوستوں میں رہیں گے۔

☆ اپنے ارد گرد کے برے ماحول پر چیخنے چلانے سے آپ کو کچھ نہیں ملے گا' دھیمے لہجے میں دوستوں کے درمیان اس کے تدارک کے لیے بولیں گے تو اثر بھی ہوگا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس خراب ماحول سے خود کو بچائیں۔ آپ ایک خاندان بچالیں گے۔

سیدہ نسبت زہرا۔۔۔ کھروڑپکا

باتیں واصف علی واصف کی

☆ ایک انسان کو زندگی میں بااعتماد ہونے کے لیے یہ

حقیقت ہی کافی ہے کہ اس سے پہلے نہ تو کوئی اس جیسا انسان دنیا میں آیا' نہ اس کے بعد ہی کوئی اس جیسا آئے گا۔ یہ عظیم انفرادیت ہی بہت بڑا نصیب ہے۔

☆ سب سے پیارا انسان وہ ہوتا ہے' جس کو پہلی ہی بار دیکھنے سے دل یہ کہے۔ "میں نے اسے پہلی بار سے پہلے بھی دیکھا ہوا ہے۔"

☆ آسمانوں پر نگاہ ضرور رکھو لیکن یہ نہ بھولو کہ پاؤں زمین پر ہی رکھے جاتے ہیں۔

☆ دو انسانوں کے مابین ایسے الفاظ جو سننے والا سمجھے کہ سچ ہے اور کہنے والا جانتا ہو کہ جھوٹ ہے' خوشامد کہلاتے ہیں۔

☆ انسان جتنی محنت خامی چھپانے میں صرف کرتا ہے' اتنی محنت اور کرے تو خامی دور کی جا سکتی ہے۔

ثریا شاہ۔۔۔ کھروڑ پکا

عالم محبت میں

عالم محبت میں
اس کمال وحشت میں
بے سبب رفاقت کا
دکھ اٹھانا پڑتا ہے
تتلیاں پکڑنے کو
دور جانا پڑتا ہے

(نوشی گیلانی)

مینا بشیر۔۔۔ گجرات

ذرا سا رہتا ہے

سہما سہما ذرا سا رہتا ہے
جانے کیوں جی بھرا سا رہتا ہے
کائی سی جم گئی ہے آنکھوں پر
سارا منظر ہرا سا رہتا ہے
ایک پل دیکھ لوں تو اٹھتا ہوں
جل گیا گھر ذرا سا رہتا ہے

(گلزار)

رانی۔۔۔ کراچی

حاصل زندگی

☆ صرف بددعائیں ہی خوشیوں کے راستے بند نہیں کرتیں' بارہا صبر بھی سکھ کی راہ کی دھول بن جایا کرتا ہے۔

☆ انسان جب مایوسی کی انتہا پر پہنچتا ہے تو پھر معجزوں کو آواز دیتا ہے۔

☆ زندگی میں کوئی کل نہیں ہوتا' نہ آنے والا' نہ گزر جانے والا' زندگی میں صرف آج ہی ہوتا ہے۔

☆ ہر آنکھ دیکھتی ضرور ہے' مگر محسوس کرنے والی آنکھ بہت کم ہوتی ہے۔

☆ غلطی قابل معافی ہو سکتی ہے' لیکن اگر اس غلطی پر اکڑا اور اترایا جائے تو اسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔

☆ مزا تو تب ہے جب شام ڈھل رہی ہو اور آپ کے اندر سورج طلوع ہو رہا ہو۔

☆ جو محبت روزانہ نہیں امنڈتی وہ روزانہ مرتی ہے۔

☆ نیند عارضی موت ہے اور موت مستقل نیند۔

☆ آپ کا پل پل بدلتا رویہ آپ سے وابستہ لوگوں کو پل پل کی اذیت میں مبتلا رکھتا ہے۔

☆ موم کو پتھر بننے میں کتنی دیر لگتی ہے' صرف ایک لمحہ' نفرت کا صرف ایک لمحہ۔

نوشین اقبال نوشی۔۔۔ گاؤں بدر مرجان

سمجھ لیں

☆ رشتے خون کے نہیں ہوتے' رشتے احساس کے ہوتے ہیں' اگر احساس ہو تو اجنبی بھی اپنے' اور اگر احساس نہ ہو تو اپنے بھی اجنبی۔

☆ دوستی کرنا اتنا آسان ہے جیسے مٹی سے مٹی پر مٹی لکھنا' لیکن دوستی نبھانا اتنا مشکل ہے' جیسے پانی سے پانی پر پانی لکھنا۔

☆ جب انسان مسلسل جھوٹ بولتا ہے' اور اس فن میں پکا ہو جاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کا تخلص جھوٹا لکھ دیتا ہے۔ پھر اسی نام سے اس کا نامۂ اعمال لکھا جاتا ہے۔

☆ جس سے نفرت ہو اس کی خوبیاں نظر نہیں آتیں جس سے پیار ہو اس کی خامیاں نظر نہیں آتیں۔

☆ بیماری میں گناہ اس طرح جھڑتے ہیں' جیسے پت جھڑ کے موسم میں پتے جھڑتے ہیں۔

☆ برے شخص سے دوستی کبھی نہیں کرنی چاہیے' کیونکہ کوئلہ اگر جلتا ہوا ہو تو ہاتھ کو جلا دیتا ہے' اور اگر ٹھنڈا ہو تو ہاتھ کو کالا کر دیتا ہے۔

☆ اپنے ارمانوں کے پاؤں اتنے مت پھیلاؤ کہ اس سے آپ کی چادر کی لمبائی کم لگنے لگے۔

فوزیہ ثمرہ بٹ۔۔۔ گجرات

جنت میں مقام

ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا۔
"مرتے وقت مجھے کلمہ نصیب ہوگا؟"
"صبح جب آنکھ کھلے اور اللہ کی یاد آ جائے تو سمجھ لو کہ ایمان سلامت ہے' ورنہ درود پاک کی کثرت رکھو۔ موت سے پہلے جنت میں اپنا مقام دیکھ لو گے۔" جواب ملا۔

ہانیہ عمران۔۔۔ گجرات

بہانہ

جنرل منیجر نے ایک روز اپنے ملازم کو بلایا اور سخت لہجے میں کہا۔
"میں نے پچھلے دو سال میں یہ بات خاص طور پر نوٹ کی ہے کہ جب اپنی خالہ کی بیماری کا کہہ کر دفتر سے چھٹی لے کر جاتے ہو' اس روز ضرور کوئی کرکٹ میچ ہوتا ہے۔" ملازم سر کھجلاتے ہوئے بولا۔
"سر جی! آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ میری خالہ بیماری کا بہانہ کرتی ہیں۔"

فوزیہ ثمرہ بٹ۔ گجرات

آعندلیب

دفتر میں عمران نے جاذب سے کہا۔
"یار یہ جو دفتر میں نئی لڑکی طیبہ آئی ہے' یہ بالکل احمق اور فضول لڑکی معلوم ہوتی ہے۔"
"ہاں یار تم صحیح کہہ رہے ہو۔" جاذب نے اس کی تائید میں سر ہلایا۔
"اس نے میری طرف بھی توجہ نہیں دی۔"

اسماء۔۔۔ لاہور

خاص عنایتیں

اللہ نے اپنے بندوں پر تین خاص عنایات کیں۔

☆ گندم اور اناج میں کیڑے پیدا کر دیے' ورنہ لوگ اسے سونے' چاندی کی طرح ذخیرہ کر لیتے اور لوگ بھوکے مر جاتے۔

☆ موت کے بعد مردے کے جسم میں بدبو پیدا کر دی' ورنہ کوئی اپنے پیاروں کو دفن نہ کرتا۔

☆ مصیبت کے بعد اہل خانہ کو صبر و سکون دیا' ورنہ ان کی زندگی بھی خوش گوار نہ ہوتی۔

تو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

ڈاکٹر حمیدہ شیخ۔۔۔ باغبان

باتوں سے خوشبو آئے

☆ دکھ انسان کے مرنے کا نہیں ہوتا' بلکہ اپنائیت' محبت اور خلوص کے رشتوں کے ٹوٹ جانے کا ہوتا ہے۔

☆ کوئی گناہ لذت کے لیے مت کرنا' کیونکہ لذت ختم ہو جائے گی' گناہ باقی رہ جائے گا اور کوئی نیکی تکلیف کی وجہ سے مت چھوڑنا کیونکہ تکلیف ختم ہو جائے گی' نیکی باقی رہ جائے گی۔

☆ دوستی' بھروسا' دل' رشتہ' وعدہ' پیار' کبھی مت توڑنا' کیونکہ جب یہ ٹوٹ جاتے ہیں تو آواز نہیں آتی' لیکن درد بہت ہوتا ہے۔

☆ شرم کی کشش حسن سے زیادہ ہوتی ہے۔

☆ اپنے خیالات کو اپنا جیل خانہ نہ بناؤ۔

☆ تاریخ کو یاد رکھنے کی بجائے' تاریخ بنانے کی فکر کرنا چاہیے۔

بشریٰ محمود

یادوں کے دریچے سے

رابعہ رشید، کی ڈائری میں تحریر
فیض احمد فیض کی نظم

درد آئے گا دبے پاؤں،

اور کچھ دیر میں، جب پھر مرے تنہا دل کو
فکر آ لے گی کہ تنہائی کا کیا چارہ کرے
درد آئے گا دبے پاؤں لیے سرخ چراغ
وہ جو اک درد دھڑکتا ہے کہیں دل سے پرے
شعلہ درد جو پہلو میں لپک اٹھے گا
دل کی دیوار پہ ہر نقش دمک اٹھے گا
حلقہ زلف کہیں، گوشہ رخسار کہیں
ہجر کا دشت کہیں، گلشن دیدار کہیں
لطف کی بات کہیں، پیار کا اقرار کہیں
دل سے پھر ہو گی مری بات کہ اے دل، اے دل
یہ جو محبوب بنا ہے تری تنہائی کا
یہ تو مہماں ہے گھڑی بھر کا، چلا جائے گا
اس سے کب تیری مصیبت کا مداوا ہو گا
دشمن جاں ہیں سبھی، سارے کے سارے قاتل
یہ کڑی رات بھی، یہ سائے بھی، تنہائی بھی
درد اور جنگ میں کچھ میل نہیں ہے اے دل
لاؤ، سلگاؤ کوئی جوش غضب کا انگار
طیش کی آتش جرار کہاں ہے لاؤ
وہ دہکتا ہوا گلزار کہاں ہے لاؤ
جس میں گرمی بھی ہے، حرکت بھی، توانائی بھی
ہو نہ ہو اپنے قبیلے کا بھی کوئی لشکر
منتظر ہو گا اندھیرے کی فصیلوں کے ادھر
ان کو شعلوں کے رجز اپنا پتا تو دیں گے
خیر، ہم تک وہ نہ پہنچیں بھی، صدا تو دیں گے
دور کتنی ہے ابھی صبح، بتا تو دیں گے
درد آئے گا دبے پاؤں . . .

حمیرہ مہتاب، کی ڈائری میں تحریر
گلزار کی غزل

خوشبو جیسے لوگ ملے افسانے میں
ایک پرانا خط کھولا انجانے میں

شام کے سائے بالشتوں سے ناپے ہیں
چاند نے کتنی دیر لگا دی آنے میں

رات گزرتے شاید تھوڑا وقت لگے
دھوپ انڈیلو تھوڑی سی پیمانے میں

جانے کس کا ذکر ہے اس افسانے میں
درد مزے لیتا ہے جو دہرانے میں

دل پر دستک دینے کون آ نکلا ہے
کس کی آہٹ سنتا ہوں ویرانے میں

ہم اس موڑ سے اٹھ کر اگلے موڑ چلے
ان کو شاید عمر لگے گی آنے میں

ارم آفتاب، کی ڈائری میں
زہرا نگاہ کی نظم

سنا ہے جنگلوں کا بھی کوئی دستور ہوتا ہے
سنا ہے، شیر کا جب پیٹ بھر جائے
تو وہ حملہ نہیں کرتا
سنا ہے، جب کسی ندی کے پانی میں
بئے کے گھونسلے کا گندمی سایہ لرزتا ہے
تو ندی کی روپہلی مچھلیاں اس کو
پڑوسی مان لیتی ہیں
ہوا کے تیز جھونکے جب درختوں کو ہلاتے ہیں
تو مینا اپنے گھر کو بھول کر
کوے کے انڈوں کو پروں میں تھام لیتی ہے
سنا ہے، گھونسلے سے جب کوئی بچہ گرے تو
سارا جنگل جاگ جاتا ہے
ندی میں باڑ آ جائے
کوئی پل ٹوٹ جائے

تو کسی لکڑی کے تختے پر
گلہری، سانپ، چیتا اور بکری
ساتھ ہوتے ہیں
سنا ہے، جنگلوں کا بھی کوئی دستور ہوتا ہے
خداوندا! جلیل و معتبر، دانا و بینا، منصف و اکبر
ہمارے شہر میں اب
جنگلوں کا ہی کوئی دستور نافذ کر

فوزیہ ثمر بٹ، کی ڈائری میں تحریر
زاہد فخری کی غزل

اسے اپنی فردا کی فکر تھی، وہ جو میرا واقف حال تھا
وہ جو اس کی صبح عروج تھی وہ میرا وقت زوال تھا

میرا درد کیسے وہ جانتا، میری بات کیسے وہ مانتا
وہ تو خود فنا کے سفر میں تھا، اسے روکنا بھی محال تھا

کہاں جاؤ گے مجھے چھوڑ کر میں یہ پوچھ پوچھ کے تھک گیا
وہ جواب مجھ کو نہ دے سکا وہ تو خود سراپا سوال تھا

وہ ملا تو صدیوں کے بعد بھی مرے لب پہ کوئی گلہ نہ تھا
اسے میری چپ نے رلا دیا جسے گفتگو میں کمال تھا

نوشین اقبال نوشی، کی ڈائری میں تحریر
اعتبار ساجد کی غزل

تمہیں جب کبھی ملیں فرصتیں، میرے دل سے بوجھ اتار دو
میں بہت دنوں سے اداس ہوں مجھے کوئی شام ادھار دو

مجھے اپنے روپ کی دھوپ دو کہ چمک سکیں مرے خال و خد
مجھے اپنے رنگ میں رنگ دو، مرے سارے زنگ اتار دو

کسی اور کو میرے حال سے نہ غرض ہے نہ کوئی واسطہ
میں بکھر گیا ہوں سمیٹ لو، میں بگڑ گیا ہوں سنوار دو

میری وحشتوں کو بڑھا دیا ہے جدائیوں کے عذاب نے
میرے دل پہ ہاتھ رکھو ذرا، میری دھڑکنوں کو قرار دو

تمہیں صبح کیسی لگی، کہو، میری خواہشوں کے دیار کی
جو بھلی لگی تو یہیں رہو، اسے چاہتوں سے نکھار دو

وہاں گھر میں کون ہے منتظر کہ ہو فکر دیر سویر کی
بڑی مختصر سی یہ رات ہے اسی چاندنی میں گزار دو

کوئی بات کرنی ہے چاند سے کسی شاخسار کی اوٹ سے
مجھے راستے میں یہیں کہیں کسی کنج گل میں اتار دو

نمرہ، اقرأ، کی ڈائری میں تحریر
منور جمیل کی غزل

ہر ذرہ امید سے خوشبو نکل آئے
تنہائی کے صحرا میں اگر تو نکل آئے

کیسا لگے اس بار اگر موسم گل میں
تتلی کا بدن اوڑھ کے جگنو نکل آئے

پھر دل تیری یادوں کی منڈیروں پہ گزارا
پھر شام ہوئی آنکھ سے آنسو نکل آئے

بے چین کیے رہتا ہے دھڑکا یہی جی کو
تجھ میں نہ زمانے کی کوئی خو نکل آئے

پھر دل نے کیا ترک تعلق کا ارادہ
پھر تجھ سے ملاقات کے پہلو نکل آئے

انیشین شاہد، کی ڈائری میں تحریر
نوشی گیلانی کی نظم

نادیدہ رفاقت،

کچھ بھی تو نہیں ویسا
جیسا تجھے سوچا تھا
جتنا تجھے چاہا تھا
کچھ حرف دعاؤں کے، کچھ پھول دعاؤں کے
مہکیں گے میری خاطر
کچھ بھی تو نہیں ویسا
جیسا تجھے سوچا تھا
محسوس یہ ہوتا ہے دکھ جھیلے تھے جواب تک
بے نام مسافت میں
لکھنے کی محبت میں، پڑھنے کی ضرورت میں
بے سود ریاضت تھی، بے فیض عبادت تھی
جو خواب بھی دیکھے تھے
ان جاگتی آنکھوں نے
سب خام خیالی تھی
پھر بھی تجھے پانے کی دل کے کسی گوشے میں
خواہش تو بچائی تھی
لیکن تجھے پا کر بھی اور خود کو گنوا کر بھی
اس حبس کے موسم کی کھڑکی سے ہوا آئی
نہ پھول سے خوشبو کی کوئی بھی صدا آئی
اب نیند ہے آنکھوں میں
نہ دل میں وہ پہلی سی تازہ سخن آرائی
نہ لفظ میرے نکلے نہ حرف و معانی کی
دانش میرے کام آئی
نادیدہ رفاقت میں جتنی بھی اذیت تھی
سب میرے ہی نام آئی
کچھ بھی تو نہیں ویسا

جیسا تجھے سوچا تھا
جتنا تجھے چاہا تھا
کچھ بھی تو نہیں ویسا

عنبر وسیم، کی ڈائری میں تحریر
محسن نقوی کی غزل

جنس دنیا سے گزر جاتے ہیں
ایسا کرتے ہیں مر جاتے ہیں

دل جو ٹوٹے تو سر محفل بھی
یال بے وجہ بکھر جاتے ہیں

اب نہ دیکھو میری ہنستی آنکھیں
چڑھتے دریا تو اتر جاتے ہیں

دھوپ کا روپ رچانے والے
شام کو اور نکھر جاتے ہیں

اب نہ مڑ مڑ کے پکارو ان کو
لوگ رستے میں ٹھہر جاتے ہیں

تم کہاں جاؤ گے سوچو محسن
لوگ تھک ہار کے گھر جاتے ہیں

شگفتہ سلمان

مجھے یہ شعر پسند ہے

مہوش فاروق ______ کراچی
محبت کا عجیب کاروبار ہم نے کیا
وہ بے وفا ہی مگر پیار ہم نے کیا
اگر وہ چھوڑ گیا تو مت کہو برا اس کو
قصور اس کا نہیں اعتبار ہم نے کیا

عفت جبیں ______ فیصل آباد
تو کبھی نہ مل سکا ہمیں، عمر بھی رائیگاں گئی
تجھ سے تو خیر عشق تھا، خود سے بڑے گلے رہے

صدف سلیمان ______ شورکوٹ
میں نے مانا کہ نہیں کوئی بھی خوبی اس میں
پھر وہ ایک شخص ہزاروں میں نمایاں کیوں ہے

حمنہ حبیب ______ عبدالحکیم
سانس اٹکی ہوئی سی لگتی ہے
تم کہیں پاس تو نہیں میرے

سمیرا احسان ______ عبدالحکیم
اک محبت کا مشغلہ لے کر
زندگی خوب تباہ کی ہم نے

اینقا انا ______ چکوال
اس اک چراغ کی لو چبھ رہی ہے آنکھوں میں
تمام شہر ہو روشن تو اپنا گھر دیکھوں
جدا سہی مری منزل، بچھڑ نہیں سکتا
میں کس طرح تجھے اوروں کا ہم سفر دیکھوں

صدف عبداللہ ______ لاہور
مرے جنوں کا فسوں ہے جو رو پڑا ہے وہ
کہ میرے غم نے اسے آج جان سے کھینچ لیا
اسے بھی زعم تھا انکار پر مگر میں نے
وہ ایک لفظ محبت زباں سے کھینچ لیا

امامہ حبیب ______ عبدالحکیم
ملنے آئے ہو چھوڑنے کے لیے
اس تکلف کی کیا ضرورت تھی

عظمیٰ ______ کراچی
پھر اس کی ہر ادا سے چھلکنے لگا خلوص
جب مجھ کو اعتبار کی عادت نہیں رہی

اقرا شفقت وفا ______ لاہور
مدت سے کوئی آیا نہ گیا سنسان پڑی ہے گھر کی فضا
ناصران خالی کمروں میں شمع جلاؤں کس کے لیے

امبر آصف ______ کراچی
اللہ اگر توفیق نہ دے تو انسان کے بس کا کام نہیں
فیضان محبت عام سہی، عرفان محبت عام نہیں

مہک سہیل ______ لاہور
عجیب عالم حیرت ہے کارگاہ حیات
کسی کو دیکھنا چاہا کوئی نظر آیا

عمارہ ______ کوئٹہ
بے سماعت کر دیا ہے خود کلامی نے مجھے
تو بتا کیا اب بھی سناٹا ہے سارے شہر میں

صائمہ ______ پشاور
اگرچہ ہم ابھی بینائی کو نہیں سمجھے
بنا لیا ہے مگر آئینہ نہ جانے کیوں

صبا ______ کراچی
دھڑکن کی ڈگڈگی پہ کب سے ہے محو رقص
دل تھک کے گر ہی جائے، تماشا تو ختم ہو

تانی چوہدری ______ آکسفورڈ یو کے
عجیب لگتی ہے شام کبھی کبھی
زندگی لگتی ہے بے جان کبھی کبھی
سمجھ میں آئے تو ہمیں بھی بتانا
کہ کیوں کرتی ہیں یادیں پریشان کبھی کبھی

ناصرہ تبسم ________ کاموں کی

میں تھا میرے خواب کے اندر تم تھے اور تنہائی تھی
اس کے آگے افواہیں تھیں، یادوں کی پھیلائی ہوئی

فاطمہ ________ رحیم یار خان

وفا سرشت ہوں دُوری میں بھی محبت ہے
اکیلے رہنے میں لیکن بڑی اذیت ہے
جہاں پہ عشق کی سرحد جنوں سے ملتی ہے
وہاں پہ آکے ملے وہ اگر محبت ہے

لبنیٰ آرزو ________ میاں چنوں

جسے اپنے بجھنے کی فکر تھی خامشی سے چمک اُٹھی
جسے شمع ہونے پہ ناز تھا مری گفتگو سے پگھل گئی

ثناء ________ کراچی

کاش کوئی تو اختیار میرے پاس ہوتا
اُسے پانے کا یا چپکے سے مر جانے کا

صدف سلیمان ________ شورکوٹ

شکوے شکایتوں کی نہیں، اپنے اپنے ظرف کی بات ہے
تیرے وہم و گمان میں بھی ہم نہیں، مجھے لفظ لفظ تو یاد ہے

آمنہ رومان ________ عبدالحکیم

مکمل دو ہی دانوں پر یہ تسبیح محبت ہے
جو آئے تیسرا دانہ یہ ڈوری ٹوٹ جاتی ہے
مقرر وقت ہوتا ہے محبت کی نمازوں کا
ادا جن کی نکل جائے قضا بھی چھوٹ جاتی ہے

سمیعہ حبیب ________ عبدالحکیم

تو بدگمان ہے میری وفا سے تو صرف اک بار آزمالے
جو ہار جاؤ تو لوٹ جانا، جو جیت جاؤ تو مان جانا

جاسمہ مریم نوید ________ کورنگی کراچی

اک جنون بے معنی، اک یقین لاحاصل
اور کیا ملا مجھ کو تیری آرزو کر کے

ریحانہ علی ________ کراچی

تجھے سوچوں تو پہلو سے سرک جاتا ہے دل میرا
میں دل پر ہاتھ رکھ کر دھڑکنیں ترتیب دیتا ہوں

فرزانہ ________ کراچی

سنو مسافر، اچھا چھوڑو، بات پرانی ہے
ہم تم کچھ دن ساتھ رہے تھے یاد دلانا ہے

آمنہ امتیاز ________ کراچی

اتنا جلدی سو جانا
گویا عشق سے خالی ہو

ارم ________ لاہور

حاصل زندگی حسرتوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے
یہ کیا نہیں، وہ ہوا نہیں، یہ ملا نہیں، وہ دیا نہیں

بشریٰ الطاف ________ گجرات

تمہارے ساتھ کئی رنگ بانٹتے ہیں مجھے
سو اک دن کے لیے کام سے اجازت لو

رفعت اشفاق ________ لاہور

ملا کرو ہمیں اکثر کہ جی نہیں لگتا
تمہارے رابطے سے زندگی وجود میں ہے

نازیہ ________ کوئٹہ

کچھ یوں ہوا کہ جب بھی ضرورت پڑی مجھے
وہ شخص اتفاق سے مجبور ہو گیا

سائرہ ________ اسلام آباد

بیٹھ کر آرام سے اے قاصد خوش رو بتا
پہلے اس نے کیا کہا، پھر کیا کہا، پھر کیا کہا

نزہت جاوید ________ کراچی

اک یہ خواہش کہ کوئی زخم نہ دیکھے دل کے
اک یہ حسرت کہ کوئی دیکھنے والا ہوتا

حمیرہ مہتاب ________ سعودی عرب

محبت بُری ہے، بُری ہے محبت
کیے جا رہے ہیں، کیے جا رہے ہیں

صائمہ نورین ________ شورکوٹ

وہ بھی ضد پہ اڑا رہا تنہا
میں بھی در پہ کھڑا رہا تنہا
دھول ہوتا تو چومتا پاؤں
سنگِ در تھا، پڑا رہا تنہا

زینب ________ کراچی

تمہارا ساتھ تسلسل سے چاہیے مجھ کو
تھکن زمانے کی لمحوں میں کب اترتی ہے

شکیلہ شہزادی ________ ملک وال

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

خوش فہم

ایک ڈائریکٹر بچت کرنے کا عادی تھا ہمیشہ سچویشن کے مطابق قدرتی لوکیشن تلاش کرتا اور بغیر سیٹ لگائے فلمبند کرلیتا۔ ایک سین تھا جس میں ہیرو نے ایک راہ گیر سے مار کھائی تھی۔ ڈائریکٹر پورے یونٹ کو بس اسٹینڈ پر لے گیا۔ اور ہیرو کو سمجھایا کہ ”وہ دیکھو ایک بدصورت لنگور نما شخص کے بازو میں حور نما لڑکی ہے تم جاکر اسے چھیڑو میں فلم تیار کرلیتا ہوں۔“ ہیرو سیٹی بجاتا ہوا اس شخص کے پاس پہنچا اور پوچھا۔

”کیا یہ اتنی بدصورت بیوی آپ کی ہے؟“ اور تھپڑ کھانے کی امید میں اپنا منہ کچھ آگے کردیا۔ وہ شخص کچھ نہ بولا اس پر ہیرو نے اپنا سوال دہرایا۔ اس پر وہ شخص اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوا اور بولا۔

”دیکھا۔۔۔ صرف میں ہی نہیں ساری دنیا تمہیں بدصورت کہتی ہے۔“

مریم۔۔۔ کراچی

پاگل

پاگل خانے میں ڈاکٹر نے ایک مریض سے کہا۔

”یہاں رہتے ہوئے تمہیں تین سال ہوگئے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اب تمہارا ذہنی مرض قریب قریب ختم ہوچکا ہے کہ تو میں افسروں سے تمہاری سفارش کروں کہ اب تمہیں ایک ماہ کے لیے بیوی کے پاس بھیج دیا جائے۔“

”ہرگز نہیں۔“ مریض نے گھور کر ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

”میں پاگل ضرور ہوں لیکن احمق نہیں ہوں کہ دوبارہ بیوی کے پاس چلا جاؤں۔“

رابعہ اعجاز۔۔۔ کراچی

ان میں ایک

لڑکی نے لڑکے کو فون کیا۔

”آج رات ہمارے ہاں مت آنا۔ ابو کو معلوم ہوگیا ہے کہ رات کو ہم نے ان کی کار استعمال کی تھی اور وہ غصے میں پاگل ہوئے جارہے ہیں۔“

”انہیں کیسے معلوم ہوا؟“

”ہم نے جن درجن بھر لوگوں کو ٹکر ماری تھی وہ ان میں سے ایک ہیں۔“

راحیلہ۔۔۔ ملتان

علاج

نوجوان مارتھا کے سر میں پہلی بار درد ہوا تو وہ ڈر گئی۔ سمجھی کہ موت کا وقت قریب آگیا ہے۔ بھاگی بھاگی پادری کے پاس پہنچی۔

”فادر۔“ اس نے کہا۔

”مرنے سے پہلے میں یہ اعتراف کرنے آئی ہوں کہ اب تک میری چودہ لڑکوں سے دوستی رہ چکی ہے۔“ پادری نے کہا۔

”گھر جاؤ اور چودہ لیموؤں کو نچوڑ کر شربت بناؤ اور پی جاؤ۔“

”کیا اس طرح میرے سب گناہ دھل جائیں گے؟“

”نہیں۔۔۔ ان سے تمہارے سر کا درد ختم ہوجائے گا۔“

قرۃ العین۔۔۔ سیالکوٹ

اس طرح تو

میاں بیوی اپنی کار میں بیٹھے کہیں جا رہے تھے۔ گرمی کا موسم تھا اور کار کے تمام شیشے بند تھے مارے گرمی کے شوہر کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ ہمت کر کے وہ بیوی سے بولا۔

"ہنی! ذرا شیشے کھول دو۔ میرا تو گرمی کے مارے سر چکرا رہا ہے۔" بیوی تنک کر بولی۔

"پاگل ہوئے ہو۔ اس طرح تو دوسری گاڑیوں والے فوراً سمجھ جائیں گے کہ ہماری کار ایئر کنڈیشنڈ نہیں ہے۔"

شبنم۔۔۔ پنجاب

احمق مخلوق

دو انگریز ٹہلتے ٹہلتے دریائے ٹیمز کے پل پر جا نکلے۔ وہاں انہوں نے ایک خوب صورت لڑکی کو آنسو بہاتے اور بڑبڑاتے ہوئے دیکھا۔

"میرا جینا بے کار ہے۔ میرا محبوب رابرٹ ہر بدھ کو اس جگہ آکر مجھ سے ملتا ہے لیکن آج وہ ابھی تک نہیں آیا۔ وہ اب مجھ سے اکتا چکا ہے بے زار ہو چکا ہے۔ اسے مجھ سے ذرا سی بھی محبت باقی نہیں رہی ضرور وہ اس وقت روزی کے پاس بیٹھا ہو گا۔ میرے لیے تو اب مرجانا ہی بہتر ہے۔" یہ کہہ کر اس نے دریائے ٹیمز میں چھلانگ لگا دی۔ اس حادثہ پر افسوس کرتے ہوئے ایک انگریز نے کہا۔

"یہ ہے عورت کی اوقات۔" دوسرا بولا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ ویسے جم! کیا بہتر نہ ہوتا کہ ہم اس احمق لڑکی کو بتا دیتے کہ آج بدھ نہیں منگل ہے۔"

بشریٰ الطاف۔۔۔ لالہ موسیٰ

تخمینہ

ایک عورت نے کسی نوجوان سے پوچھا۔

"تمہارے اندازے کے مطابق میری عمر کیا ہو گی؟" نوجوان نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"بالوں سے آپ پندرہ برس کی دوشیزہ لگتی ہیں۔ آپ کے گال سولہ برس کی لڑکیوں جیسے ہیں۔"

"اور۔۔۔ اور۔۔۔؟" عورت نے اپنی خوشی چھپاتے ہوئے اشتیاق سے پوچھا۔

"اور جسمانی طور پر آپ سترہ برس کی لڑکی سے زیادہ نہیں لگتیں۔" نوجوان بولا۔

"یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو۔ مگر تمہارے خیال میں میری صحیح عمر کیا ہے؟"

"آپ دراصل تین ٹین ایجرز کا مجموعہ ہیں یعنی آپ کی عمر پندرہ' سولہ اور سترہ کا مجموعہ ہے۔"

سائعہ۔۔۔ کراچی

بے اعتبار

ایک سہیلی دوسری کو بتا رہی تھی۔

"مردوں پر کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے آج سے میں نے قسم کھائی ہے کہ طارق کا منہ بھی نہ دیکھوں گی اور مردوں پر بھی اعتبار نہیں کروں گی۔"

"آخر ہوا کیا؟" سہیلی نے کریدا۔

"کیا طارق کو کسی دوسری لڑکی کے ساتھ دیکھ لیا ہے؟"

"نہیں بلکہ طارق نے مجھے ایک دوسرے لڑکے کے ساتھ دیکھ لیا ہے۔ جبکہ وہ مجھے کل بتا کر گیا تھا کہ وہ کراچی جا رہا ہے۔"

غزل ثوبان۔۔۔ گلشن اقبال

بے وفا

ایک عورت اپنے شوہر سے طلاق لینے کے لیے عدالت میں دلائل دے رہی تھی۔

"میرے شوہر کا کردار بہت خراب ہے وہ بے وفا اور دھوکہ باز ہے کل ہی کی بات ہے میں نے اسے ایک عورت کے ساتھ ایک سینما ہال میں داخل ہوتے دیکھا۔ حالانکہ اس وقت اسے اپنے دفتر میں ہونا چاہیے تھا۔"

جج نے جرح کی۔

"لیکن آپ نے اسے رنگے ہاتھوں کیوں نہ پکڑا۔"

"اس وقت میں اپنے دوست کے ساتھ فلم دیکھ رہی تھی۔"

آمنہ اقبال۔۔۔ کراچی

افسوس

ایک صاحب نے اپنے امریکی دوست سے کہا۔

"میں نے اپنے لڑکے کو تمہارے ملک کی یونیورسٹی میں اس لیے بھیجا تھا کہ وہ تعلیم حاصل کرے گا لیکن وہ اپنی کلاس فیلو لڑکیوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا ہے۔"

دوست بولا۔

"آج کل اکثر طالب علم یہی کرتے ہیں۔" اس پر انہوں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بولے۔

"اس سے تو بہتر یہ ہوتا کہ میں بیٹے کو گھر پر رکھتا اور خود تمہاری یونیورسٹی میں داخلہ لے لیتا۔"

ام ہانی۔۔۔ سندھ

غور

ایک یہودی دعا مانگ رہا تھا۔

"اے خداوندا! اگر مجھے سو روپے مل جائیں تو میرا کام بن جائے۔" اتنے میں ایک اور یہودی آنکلا اور بولا۔

"اے خداوندا! اگر پانچ روپے مل جائیں تو میرا کام بن جائے۔" پہلے یہودی کو بہت غصہ آیا اس نے جیب سے پانچ روپے نکال کر دوسرے یہودی کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ رہے تمہارے پانچ روپے اب خداوند کو میرے مسئلے پر غور کرنے دو۔"

قمر۔۔۔ سیالکوٹ

شوق

اسکول کی بہترین استانی نے اپنی کلاس کو بتایا۔

"لڑکیو! جب میں نوعمر تھی تو اس وقت سوچا کرتی تھی کہ بہترین گانے والی بنوں گی۔ چنانچہ میں اپنا زیادہ وقت پیانو کے پاس گزارتی اور رات دن گاتی رہتی۔ لیکن میرے والدین نے پیانو چھین کر چھپا لیا اور میرے ہاتھ میں کتابیں تھما دیں نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے گانے کا ریاض ختم کرنا پڑا اور ساری توجہ تعلیم پر صرف کرنا پڑی۔ آپ دیکھ رہی ہیں کہ آج میں کیا ہوں۔؟"

لڑکیوں نے ہم آواز ہو کر کہا۔ "ہمارے اسکول کی سب سے بہترین استانی۔"

"نہیں۔" استانی نے جواب دیا۔ "شہر کی سب سے بے سری گانے والی۔"

سندس۔۔۔ گجرات

فضول خرچ

ایک اسکاچ نے اپنے بیٹے کا کان کھینچتے ہوئے اسے ڈانٹا۔ "تمہیں شرم نہیں آتی؟"

"مگر کیوں۔ میں نے ایسی کون سی حرکت کی ہے؟"

"کل رات میں نے تمہیں ایک لڑکی کے ساتھ ہوٹل میں دیکھا تھا۔ ٹھیک ہے میں نے تمہیں آزادی دی ہے لیکن میں تمہیں اتنی بے دردی سے پیسے لٹاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ اچھا بتاؤ رات تم نے کتنی رقم خرچ کی تھی؟"

"صرف ایک ڈالر۔" لڑکے نے جواب دیا۔

"تمہیں یقین ہے کہ اس سے زیادہ پیسے خرچ نہیں ہوئے؟"

"بالکل ڈیڈی! اس لیے کہ اس لڑکی کے پاس اس سے زیادہ رقم تھی ہی نہیں۔"

حنا۔۔۔ ساہیوال

حیرت

ایک نوجوان سے اس کے دوست نے پوچھا۔

"جس بد صورت لڑکی سے تم محض دل لگی کر رہے تھے۔ جب اس کے باپ کے سامنے تم نے شادی کی تجویز رکھی تو اسے حیرت تو ہوئی ہو گی۔" نوجوان نے جواب دیا۔

"حیرت۔! ابھی اس کی یہ حالت ہوئی کہ بندوق اس کے ہاتھ سے نیچے گر گئی۔"

ماہ وش۔۔۔ میرپور خاص

افسوس

"تین دن کی مسلسل غیر حاضری کی وجہ سے منیجر نے مجھے آج ملازمت سے برخاست کردیا ہے۔" ایک دوست نے افسردہ لہجے میں بتایا۔

"تم تو بڑے احمق ہو۔ کہہ دیتے میرے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔"

"کیسے کہہ دیتا۔ منیجر ہی تو میرے والد ہیں۔"

اقرا ۔۔۔ کراچی

رحم

ایک جابر قسم کا افسر جونیئر کلرک کی پوسٹ کے لیے ایک امیدوار کا انٹرویو لے رہا تھا۔ باتوں باتوں میں امیدوار بولا۔

"میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ کی بائیں آنکھ پتھر کی ہے۔"

"ہاں لیکن تمہیں کیسے پتا چلا۔" افسر حیران ہو کر بولا۔

"کیونکہ اسی میں مجھے رحم کی جھلک نظر آئی ہے۔"

فوزیہ ثمرین بٹ ۔۔۔ گجرات

ہوش میں

ایک صاحب ڈرائیونگ کا ٹیسٹ دینے گئے۔ واپسی پر کسی نے پوچھا۔

"ٹیسٹ کیسا رہا۔ کیا آپ کامیاب ہوگئے؟" انہوں نے کہا۔

"معلوم نہیں! جب میں نے ہسپتال چھوڑا تو اس وقت تک امتحان لینے والے آفیسر ہوش میں نہیں آئے تھے۔"

تانی چوہدری ۔۔۔ آکسفورڈ یو کے

مجبوری

ایک پلازہ کے ایک فلیٹ میں آتشزدگی کی اطلاع پر فائر بریگیڈ کا عملہ پہنچا۔ عمارت میں بجلی بند ہو چکی تھی۔ تاریک راہ داری میں ایک سینئر فائرمین نے زیر تربیت فائرمین کو ہدایت کی۔

"دیوار کو ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھتے رہو اور جہاں دروازہ ملے اسے کھول کر مجھے اطلاع دو۔" فائرمین نے کچھ دیر بعد اندھیرے میں چیخ کر اطلاع دی۔

"دروازہ مل گیا ہے اور میں نے اسے کھول لیا ہے۔" سینئر فائرمین نے جلدی جلدی موٹا پائپ کھینچ کر اس تک پہنچایا اور ہدایت کی۔

"پانی ڈالو۔"

"یہاں پانی نہیں ڈالا جاسکتا۔" زیر تربیت فائرمین کی آواز ابھری۔

"کیوں؟" سینئر فائرمین نے جھنجلا کر پوچھا۔

"یہ فریج کا دروازہ ہے۔" قدرے مایوسی سے جواب ملا۔

غزنی اکرم ۔۔۔ بہار کالونی لیاری

بیس روزہ

ڈسرائیلی انگلستان کے مشہور وزیراعظموں میں گزرا ہے۔ اس نے ایک دن پارلیمنٹ میں نہایت مدلل اور پر اثر تقریر کی۔ لوگوں پر اس کا اثر اس لیے بھی ہوا کہ وہ بغیر کسی تیاری کے فی البدیہہ تقریر کر رہا تھا۔

پارلیمنٹ کا اجلاس ختم ہونے کے بعد ایک خاتون ڈسرائیلی کے پاس گئی اور کہا۔

"بغیر کسی تیاری کے ایسی اچھی فی البدیہہ تقریر کر لینے پر میں آپ کو مبارک باد دیتی ہوں۔"

ڈسرائیلی نے کہا۔

"خاتون! جس تقریر کو آپ فی البدیہہ سمجھ رہی ہو' وہ بیس روز سے میرے دماغ پر سوار تھی۔"

سیدہ نسبت زہرا ۔۔۔ کہوڑ پکا

کرن کا دسترخوان

خالدہ جیلانی

بنگالی دال

اجزا:

چنے کی دال	ایک کپ
پانی	ڈھائی کپ
ہلدی پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
شکر	دو چائے کے چمچے
تیل	تین کھانے کے چمچے
پنچ پورن مسالا	دو کھانے کے چمچے
ہری مرچیں (لمبی والی)	چار عدد (کوٹ لیں)
تیزپات	دو عدد
امچور پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
کشمش	دو چائے کے چمچے

ترکیب:

دال کو صاف کر کے پانی میں اتنی دیر تک ہلکی آنچ پر پکائیں کہ یہ پک کر نرم ہو جائے۔ ہلدی پاؤڈر' نمک اور شکر ڈال کر مکس کریں۔ ایک چھوٹے فرائنگ پین میں تیل گرم کر کے اس میں پنچ پورن مسالا ڈال کر کڑکڑائیں اس کے بعد اس میں مرچیں' تیزپات' امچور پاؤڈر اور کشمش ڈالیں اور ہلکی آنچ کر کے ایک منٹ تک پکائیں اس کے بعد بگھار لگادیں۔ مزے دار بنگالی دال تیار ہے۔ نان یا پوری کے ساتھ سرو کریں۔

پنچ پورن مسالے کے لیے:

اشیا:

سفید زیرہ	دو چائے کے چمچے
سونف	دو چائے کے چمچے
میتھی	دو چائے کے چمچے
رائی	دو چائے کے چمچے

کلونجی — دو چائے کے چمچے

ترکیب :

پنچ پورن مسالا تیار کرنے کے لیے سفید زیرہ، سونف، میتھی، رائی اور کلونجی کی متوازی مقدار کو مکس کر کے ایک جار میں رکھ سکتے ہیں اور اگر آپ پنچ پورن پاؤڈر تیار کرنا چاہتی ہیں تو انہیں پیس کر پاؤڈر حالت میں بھی رکھا جا سکتا ہے۔

کھٹی دال

اجزا :

چنے کی دال	آدھا کپ
مسور کی دال	آدھا کپ
پیاز (باریک کاٹ لیں)	ایک عدد
ٹماٹر (باریک کاٹ لیں)	ایک عدد
لال مرچ پاؤڈر	دو چائے کے چمچے
ہلدی پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
دھنیا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
زیرہ (پسا ہوا)	ایک چائے کا چمچہ
املی کا پانی	آدھا کپ
لہسن (پسا ہوا)	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ

بگھار کے لیے :

رائی	ایک چائے کا چمچہ
ثابت زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
ثابت لال مرچیں	آٹھ عدد
لہسن کے جوئے (باریک کاٹ لیں)	چار عدد
گھی	ایک کپ
کلونجی	آدھا چائے کا چمچہ
کڑی پتا	چند پتے

ترکیب :

پتیلی میں چنے کی دال، مسور کی دال، پیاز، ٹماٹر، لال مرچ پاؤڈر، ہلدی پاؤڈر، دھنیا پاؤڈر، زیرہ، لہسن اور نمک ڈال کر گلا لیں۔ جب دال گل جائے تو اسے اچھی طرح میش کر لیں۔ حسب پسند گاڑھا کر لیں اور املی کا پانی شامل کر کے جوش آنے پر اتار لیں۔

فرائنگ پین میں گھی گرم کر کے اس میں رائی، ثابت زیرہ، ثابت لال مرچیں، لہسن کے جوئے، کلونجی اور کڑھی پتے ڈال دیں۔ براؤن ہو جائے تو دال میں بگھار لگا دیں۔ لذیذ دال، چاول کے ساتھ سرو کریں۔

پنیر والی دال

اجزا :

مسور کی دال	ایک کپ
پیاز (چوپ کر لیں)	ایک عدد
ہلدی پاؤڈر	چوتھائی چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	دو کھانے کے چمچے
ہری مرچیں	چار عدد

(تین مرچوں کو چاک کر لیں ایک مرچ کو باریک چوپ کر لیں)

لیموں کا رس	ایک کھانے کا چمچہ
لیموں کی چھال	ایک چائے کا چمچہ
کیفر لائم کے پتے	دو عدد
پنیر (کش کر لیں)	تین کھانے کے چمچے
براؤن پیاز (چورا کر لیں)	تین کھانے کے چمچے

ترکیب :

دال کو اچھی طرح صاف کرنے کے بعد دھو کر ایک سوس پین میں ڈال کر چار کپ پانی، پیاز اور ہلدی پاؤڈر کے ساتھ ابالیں۔ ابال آجائے تو دال کے اوپر آنے والا جھاگ اتار لیں۔ ڈھکن ڈھک کر آنچ دھیمی کر کے دال کے گلنے تک پکائیں۔ جب دال گل جائے تو نمک شامل کر کے چمچہ چلا کر دال کو ہلکا سا میش کر لیں۔

ایک چھوٹے فرائنگ پین میں تیل گرم کر کے اس میں چاک کی ہوئی ہری مرچیں ڈال کر چار سیکنڈ پکانے کے بعد دال والے سوس پین میں ڈال کر سوس پین کا ڈھکن مضبوطی سے بند کر دیں تاکہ بگھار کی خوشبو دال میں شامل ہو جائے۔

سرو کرنے سے قبل دال کو ہلکی آنچ پر گرم کریں۔ لیموں کا رس اور لیموں کی چھال ایک بڑے سرونگ باؤل میں ڈال کر اس کے اوپر کیفر لائم کے پتے توڑ کر ڈال دیں۔ اب پنیر، چوپ کی ہوئی ہری مرچ اور پیاز کا چورا بھی ڈال دیں۔ دال جیسے ہی گرم ہو جائے دال کو اسی سرونگ ڈش میں ڈال کر ہلکے ہاتھ سے مکس کر کے فوراً ہی سرو کریں۔

گجراتی دال

اجزا :

مونگ کی دال	ڈیڑھ کپ
دھنیا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
زیرہ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
ہری مرچیں (پیس لیں)	دو عدد
پانی	پانچ کپ
گڑ	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	دو کھانے کے چمچے
خشک سرخ مرچ	ایک عدد
رائی دانہ	ایک چائے کا چمچہ
ہینگ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا (باریک چوپ کیا ہوا)	چوتھائی کپ

ترکیب :

دال کو صاف کر کے اچھی طرح دھو کر پتیلی میں ڈال کر دال کے ساتھ پانی، ہری مرچوں کا پیسٹ، ہلدی پاؤڈر، زیرہ پاؤڈر اور دھنیا پاؤڈر ڈال کر پہلے تیز آنچ پر ابالیں۔ ابال آجائے تو آنچ درمیانی کر دیں۔ بغیر ڈھکے دال کو گلنے تک پکائیں۔ وقفے وقفے سے چمچہ چلاتی رہیں۔ اب ایک ڈوئی سے دال کو اچھی طرح میش کر لیں۔ دال ذرا پتلی ہونی چاہیے۔ اگر ضرورت ہو تو پانی شامل کر لیں۔ اب دال میں گڑ اور نمک ملا کر اتنا مکس کریں کہ گڑ حل ہو جائے۔ آنچ کم کر کے بالکل دھیمی کر دیں۔ ایک چھوٹے فرائنگ پین میں تیل گرم کریں۔ جب تیل خوب اچھی طرح گرم ہو جائے تو اس میں رائی ڈال کر تین سیکنڈ تک کڑکڑائیں۔ اس کے بعد خشک سرخ مرچ ڈال کر اتنی دیر تلیں کہ مرچ تقریباً "سیاہ ہو جائے اب ہینگ پاؤڈر ڈال کر فوراً" ہی بگھار دال کے اوپر ڈال کر مکس کریں۔ سرونگ ڈش میں دال نکال کر اوپر ہرا دھنیا چھڑک کر سرو کریں۔

قلفی کریزی

اجزا :

دودھ	ایک لیٹر
کھیر مکس	ایک پیکٹ
کنڈنس ملک	آدھا ٹن
کھویا	ایک کپ
پستے، بادام	آدھا کپ
الائچی	تین سے چار عدد
کرنچ	چوتھائی کپ

کرنچ تیار کرنے کے لیے :

چینی	چوتھائی کپ
بادام	چوتھائی کپ

کرنچ تیار کرنے کا طریقہ :

چینی کو پین میں ڈال کر پکنے رکھیں جب اس کا رنگ تبدیل ہونے لگے اور براؤن ہو جائے تو بادام شامل کریں۔ چکنی پلیٹ پر الٹ دیں سخت ہونے پر کوٹ لیں۔

ترکیب :

سوس پین میں دودھ، کنڈنس ملک، کھیر مکس کو پکنے رکھیں الائچی ڈال دیں۔ گاڑھا ہونے پر کھویا آدھا کپ شامل کریں پستے بادام بھی ڈال دیں۔ چولہے سے اتار کر ٹھنڈا کرنے کے بعد آدھا کپ کھویا ڈال کر مکس کریں اور کرنچ بھی شامل کر دیں۔ سانچوں میں بھر کر ایئر ٹائٹ کریں اور فریزر میں جمنے کے لیے رکھ دیں جمنے کے بعد ٹھنڈا ٹھنڈا سرو کریں۔

☆ ☆

حسن و صحت

ادارہ

رات دیر تک جاگنے اور پارٹی وغیرہ میں شرکت کرنے سے آپ کی جلد متاثر ہوتی ہے۔ سیاہ حلقے آنکھوں کے گرد پڑ سکتے ہیں اور جلد کی رنگت ایسی ہوتی ہے کہ آپ کا چہرہ پھیکا پھیکا نظر آئے۔

چاہے آپ کتنی ہی تھکی ہوئی کیوں نہ ہوں' میک اپ اتارے بغیر بستر پر نہ جائیں۔ اگر میک اپ سمیت آپ سو جائیں گی تو صبح کے وقت یہ میک اپ آپ کے لیے بوجھ ہو گا۔ دوسرے یہ کہ آپ کی جلد کو متاثر کرے گا اور داغ دھبوں کی افزائش کا موجب بنے گا۔ اپنی انگلیوں کی مدد سے میک اپ کو چھڑائیں پھر ٹشو پیپر سے پونچھ لیں یا دھو ڈالیں۔ بالکل آخر میں ٹونر کا استعمال کریں تاکہ بچا کھچا میک اپ بھی اتر جائے۔

ایسا کرنے کے بعد اگر آپ کے پاس وقت ہو تو پانچ منٹ کریم کا استعمال کر لیں۔ کریم بہت تھوڑی لیں اور آہستہ آہستہ چہرے پر ملیں۔ آنکھوں کے ارد گرد نہ لگائیں۔ کریم نیچے سے اوپر کی طرف ملیں۔ جب جذب ہو جائے تو چھوڑ دیں۔

آنکھوں کے گرد Eye Gel لگائیں کیونکہ کریم میں کچھ ایسے اجزا ہوتے ہیں۔ جن کے استعمال کے بعد آنکھیں پھولی نظر آتی ہیں اس لیے آئی جیل کا استعمال ٹھیک رہے گا۔

رات کے وقت جڑی بوٹیوں سے تیار شدہ چائے یا پھر دودھ پئیں۔ چائے اور کافی سے بچیں۔ ان میں موجود اجزا آپ کو سلانے کی بجائے جگائیں گے جو کہ ظاہر ہے نقصان دہ ہے۔

اگر دن کے معمولات میں آپ کا ذہن اب بھی الجھا ہوا ہے تو کوئی ہلکا پھلکا ناول پڑھنا شروع کر دیں۔ اس سے آپ کا ذہن بٹ جائے گا اور آپ کو نیند آجائے گی۔

خالی پیٹ نہ سوئیں۔ اس طرح آپ کے جسم میں موجود شوگر کی سطح کم ہو جائے گی اور آپ بے سکونی محسوس کریں گی۔ اگر آپ کو کھانا کھائے زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے تو کوئی مشروب (پھل کا رس یا دودھ) یا پھر زود ہضم اشیاء کھالیں مثلاً "بسکٹ وغیرہ۔

اگر سونے سے قبل غسل کر لیں تو اس سے نا صرف آپ کو گہری نیند آئے گی بلکہ اس کے بہتر اثرات آپ کی صحت پر بھی نمودار ہوں گے۔

سانسوں کی مشق کر کے آپ جلد نیند کی آغوش میں پہنچ سکتی ہیں۔ خوب لمبی سانس لیں اور پھر آہستہ آہستہ خارج کر دیں اور تصور کریں کہ آپ جو سانس خارج کر رہی ہیں اس کے ساتھ دن بھر کی تھکن اور الجھن بھی آپ کے اندر سے باہر نکل رہی ہے۔ یہ عمل اس وقت تک دہرائیں جب تک آپ پر سکون نہ ہو جائیں۔

ذہنی دباؤ اور ڈپریشن بھی اس کی بڑی وجہ ہو سکتے ہیں اس کے علاوہ یہ اس بات کی علامت بھی ہو سکتی ہے کہ آپ نے ضرورت سے زیادہ نیند لی ہے۔

نائٹ کریم اور عام کریم میں فرق

نائٹ کریم بھی عام کریم سے ملتی جلتی ہے اور اجزا بھی تقریباً" وہی ہوتے ہیں اور اجزا کی انتہائی بہترین قسم نائٹ کریم میں استعمال کی جاتی ہے۔ ان میں ایک دو اجزا کا اضافہ بھی ہوتا ہے جیسے کولیجن ———— اور الاسٹین ———— یہ دونوں اجزا قدرتی طور پر انسانی جلد میں موجود ہوتے ہیں مگر زیادہ دیر تک جاگنے سے ان کے اثرات زائل ہو جاتے ہیں۔ نائٹ کریم اس کمی کو پورا کرتی ہے۔ اس میں وٹامن A بھی ہوتا ہے۔ جو خلیوں کو نئی زندگی عطا کرتا ہے اور وٹامن E کی موجودگی کی وجہ سے سورج کے منفی اثرات اور بڑھتی ہوئی عمر کے اثرات پر قابو پانے میں مدد ملتی ہے۔ ایک واضح فرق یہ ہے کہ نائٹ کریم میں مونسچرائزر رات کی روشنی کے مطابق شامل کیا جاتا ہے۔

عام حالات میں چھ گھنٹے کی نیند ضروری ہے

آپ صبح جب بستر چھوڑتی ہیں خود کو اتنا ہی تھکا ہوا محسوس کرتی ہیں۔ آپ دن بھر اپنی جمائیوں کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے دن گزارتی ہیں اور شام ہونے تک آپ اس قدر تھک جاتی ہیں کہ جلد بستر پر چلی جاتی ہیں لیکن اگلی صبح جب الارم بجتا ہے تو آپ کا دل چاہتا ہے کہ دوبارہ گہری نیند سو جائیں۔ اگر واقعی ایسا ہے تو آپ تنہا اس کیفیت میں مبتلا نہیں ہیں بلکہ آج کل بہت سے افراد اس قسم کے مسائل سے دوچار ہیں۔

بے خوابی آپ کے پوشیدہ مسائل اور اندرونی پریشانیوں کا ایک اظہار بھی ہو سکتی ہے۔ اس لیے اگر آپ کی اکثر راتیں بے چینی کے عالم میں گزرتی ہیں تو اس کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ اس کے علاوہ اعصاب کو ڈھیلا چھوڑنے کی کوشش بھی مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔

قیلولہ کا وقت

دوپہر کے کھانے کے بعد آپ پر غنودگی کا جو حملہ ہوتا ہے وہ قدرتی عمل کا ایک حصہ اور اس وقت جسمانی نظام سست پڑ جاتا ہے۔ ایسا ہی صبح کے اوقات میں ایک مرتبہ ہوتا ہے جس کا نوٹس عام طور پر آپ نہیں لیتیں۔ اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے آپ ہلکی پھلکی ورزش کر سکتی ہیں' اپنا دھیان کسی ایسے کام کی طرف لگا سکتی ہیں جس میں آپ کی پوری توجہ درکار ہو' یا پھر چائے یا کافی کی ایک پیالی آپ کو توانائی کے حصول میں مددگار ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس آپ یہ بھی کر سکتی ہیں کہ پندرہ بیس منٹ کا قیلولہ کر لیں اس سے زیادہ دوپہر کا آرام آپ میں سستی لائے گا۔

خراٹے کوئی مذاق نہیں

گو کہ کسی کو خراٹے لیتے سن کر بعض اوقات مزاح کا تاثر ابھرتا ہے لیکن یہ متعلقہ شخص کے لیے ہرگز کوئی مزاح یا تفریح کا معاملہ نہیں ہے۔ اس کا اندازہ وہ لوگ باآسانی کر سکتے ہیں جنہیں ایسے کسی شخص کے ساتھ سونا پڑتا ہے۔ جو سوتے میں خراٹے اس وقت لیتا ہے جب سوتے میں سانس کے ساتھ اس کی زبان اور نچلا جبڑا پیچھے کی جانب حرکت کرتا ہے اور اس طرح اس کے سانس کی نالی کا راستہ رکتا ہے۔ لیکن خراٹوں کی شدت اس بات کی علامت بھی ہو سکتی ہے کہ متعلقہ شخص نے اپنے گلے کے پچھلی طرف کے پٹھوں کو ضرورت سے زیادہ آرام دیا ہے۔ اس تکلیف سے متاثرہ اشخاص بعض اوقات تقریباً" ایک منٹ

تک سانس نہیں لے پاتے جس کے باعث ان کی آنکھ مختصر مدت کے لیے کھل جاتی ہے اور اس عمل کے تسلسل کے باعث وہ مکمل اور بھرپور نیند نہیں لے پاتے اور دن بھر اپنے آپ کو تھکا ہوا محسوس کرتے ہیں۔

ایسے اشخاص جو خراٹے لیتے ہیں ان کے لیے تجویز ہے کہ اگر ان کا وزن زیادہ ہے تو اس کو گھٹانے کی کوشش کریں، کیونکہ وزن کی زیادتی خراٹوں کے امکان کو تین گنا بڑھا دیتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ چیز ان لوگوں میں زیادہ عام ہے جو اپنی کمر کے پیچھے کوئی کشن یا تکیہ اس طرح رکھ دیں کہ وہ چت نہ لیٹ سکیں، یا پھر ٹینس کی ایک گیند ان کی قمیص کے پچھلی جانب سلائی سے جوڑ دیں تاکہ وہ کروٹ لینے پر مجبور ہو سکیں۔ اگر اس سے فائدہ نہ ہو تو پھر اپنے ڈاکٹر سے رجوع کریں۔ خراٹوں کی شدت کو کم کرنے کے لیے دوائیں موجود ہیں اور آخری حربہ کے طور پر سرجری اس میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔

کیا خواب آور دوائیں بے خوابی کا حل ہیں؟

خواب آور دواؤں کا استعمال کسی شدید صورت میں کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ ان پر انحصار کی عادت بہت آسانی سے پڑ سکتی ہے۔ زیادہ تر معالج اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ آپ رات کی مکمل اور بھرپور نیند کے لیے دوسرے ذرائع تلاش کریں۔ کچھ تجاویز مندرجہ ذیل ہیں۔

☆ دن کے اوقات میں نیند نہ لیں، اس سے رات کو آپ بے خوابی میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔

☆ اپنی اندرونی گھڑی کو اس طرح عادت ڈالیں کہ آپ روزانہ صبح کو ایک ہی وقت پر سو کر اٹھیں۔

☆ سونے سے قبل نیم گرم پانی کا غسل لیں اور اس میں لیونڈر یا چنبیلی کے تیل کے چند قطرے ڈالیں۔

☆ نیند لانے کی شعوری کوشش شدت سے نہ کریں، بلکہ کوئی پسندیدہ بات ذہن میں دہرائیں یا کوئی دل لبھانے والا واقعہ یاد کریں۔ شام کو ہلکی ورزش کو معمول بنا لیں تاکہ آپ کو سکون محسوس ہو۔

☆ دودھ کا ایک نیم گرم گلاس نیند لانے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے جبکہ کافی چائے اور سگریٹ سے پرہیز ضروری ہے۔

☆ اپنے بیڈ روم کو صرف سونے کے لیے استعمال کریں تاکہ وہاں جا کر آپ کو نیند کا احساس ہو۔

☆ بستر پر لیٹنے کے دس منٹ بعد تک نیند نہ آنے کی صورت میں بستر چھوڑ کر اٹھ جائیں اور دوبارہ اسی وقت بستر پر جائیں جب آپ کو واقعی نیند کی ضرورت محسوس ہو رہی ہو۔

بے خوابی کا باعث تھکن کی شکایت

ہم میں سے کئی افراد اکثر اس وقت اپنے آپ کو تھکا ہوا محسوس کرتے ہیں یا اپنے ساتھیوں سے بات بات پر الجھ پڑتے ہیں یا پھر اپنا کام صحیح طور پر انجام نہیں دیتے، جب ہم گزشتہ رات کو صحیح طور سے سو نہیں سکے ہوتے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق نیند صحیح نہ آنے کی ایک بڑی وجہ ذہنی فکر و پریشانی ہے۔ ایسے افراد چاہے کام کر رہے ہوں یا نہیں، ان کی اس خوابیدہ کیفیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ سروے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ذاتی زندگی، خاندان، گھر بار یا پھر اپنے کام سے متعلق فکرات و پریشانیاں نیند نہ آنے کی آدھی سے زیادہ مشکلات کا باعث ہیں۔

خواتین زیادہ تر ذاتی زندگی، جبکہ مرد عام طور سے اپنے کام سے متعلق فکرات میں گھرے ہوتے ہیں۔ ایک رات نہ کافی نیند سے جو مسائل جنم لیتے ہیں ان میں توجہ کے ارتکاز کی کمی، ذہنی دباؤ کا احساس یا آس پاس کے لوگوں اور ساتھیوں کے ساتھ بلاوجہ بحث و مباحثہ شامل ہیں۔ اس لیے اپنے ذہن کو یکسو رکھیں اور مسائل پر پریشان ہونے کے بجائے ان کے حل کی تدابیر تلاش کریں۔ اور فارغ وقت کسی اچھی سی کتاب کے مطالعہ میں صرف کریں۔ اچھے نتائج مرتب ہوں گے۔

☆ ☆

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ ۱۹۷۸ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں ۱۹۸۱ء کے شمارے کے سوال و جواب شائع کیے جا رہے ہیں۔

ذوالقرنین

عید ادبیا

نسرین کنول ..... کراچی

س خانہ شماری سے علم ہوا کہ بے روزگاروں کی لسٹ سے ایک نام کم ہو گیا ہے۔ جب تحقیق کی تو پتا چلا کہ وہ بے روزگار آج کل کرن میں نہلے پہ دہلا مارتا ہے؟

ج شکر ہے خدا کا روزگار تو ہے۔

عاصمہ نازلی ..... راولپنڈی

س [illegible]

ج [illegible]

نورین عزیز ..... شکارپور

س پھول ہوتے تو تیرے در پہ سجا بھی دیتے
زخم لے کے تیری دہلیز پہ جاؤں کیسے؟

ج چلو آ جاؤ، ہم فرسٹ ایڈ بکس منگوا لیتے ہیں۔ آخر انسانیت بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔

آنسہ تاج ..... کوئٹہ

س بھیا! یہ مرد حضرات لڑکیوں کو صحیح طریقہ سے نہیں دیکھ سکتے تھیا ضروری ہے کہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھیں؟

ج نہیں کوئی خاص ضروری نہیں، بس ویسے دیکھیں جیسے لڑکیاں انہیں دیکھتی ہیں۔

صبا جمیل احمد ..... کراچی

س اب تو عینک کی سخت حاجت ہے۔ کوئی صورت نظر نہیں آتی ہے؟

ج ایسا کرو، جس چیز کی حاجت ہے اس سے دور رہو اچھا ہے کہ صورت نظر نہیں آئے گی۔

رضیہ سلطانہ بلوچ ..... حیدرآباد

س بیوی تو میکے جانے کی دھمکی دیتی ہے لیکن شوہر؟

ج رات گئے گھر سے باہر جانے کی۔

صبیحہ ارشاد قریشی ..... کراچی

س جو شخص ٹھوکر کھا کر بھی نہ سنبھلے، اسے کیا سمجھنا چاہیے؟

ج ٹھوکر کھانے کا عادی۔

س دوست کب دھوکا دیتا ہے؟

ج یہ پوچھیں کب نہیں دیتا۔

تحسین زیدی ..... کراچی

س لوگ چاند پر جاتے ہیں' سورج پر کیوں نہیں جاتے؟
ج ایئر کنڈیشنر پلانٹ خراب پڑا ہے وہاں کا ایک عرصے سے۔
س مرد ظالم' عورت مظلوم اور بچے؟
ج کہتے ہیں ان سے شیطان بھی پناہ مانگتا ہے۔

عینی طفیل..... کراچی

س اگر یہ صحیح ہے کہ صحبت کا اثر ہوتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ کانٹوں پر پھول کی صحبت کا اثر نہیں ہوتا؟
ج دونوں میں ضد چل رہی ہے۔ دلائل اگرچہ زور دار ہیں لیکن نہ پھول کانٹوں کا اثر لینے پر رضامند ہیں اور نہ ہی کانٹے۔

منصوری..... کمرشل سینٹر

س آپ اتنے خوب صورت کیسے ہو گئے۔ کہیں یہ سب فیئر اینڈ لولی کا کمال تو نہیں ذوالقرنین جی؟
ج فیئر اینڈ لولی کا اشتہار دیکھ کر تو کسی سیاہ ترین جلد کے مالک کا بھی دل ایسی کریم استعمال کرنے کو نہیں چاہے گا بی بی۔

عالیہ حرا..... ڈالمیہ کراچی

س تمہیں لکھنا تو آتا نہیں پھر تمہارے ہی لوگ تمہیں نئی نسل کا نمائندہ قلمکار کیوں کہتے ہیں جبکہ میری نظر میں تم میں کوئی ایسی بات نہیں؟
ج مجھ میں کوئی ایسی بات نہیں' میری تحریر میں شاید ضرور ہے۔

رضیہ حمید..... شکارپور

س آسمان پر چمکتی کہکشاں اور دلہن کی جھلملاتی مانگ میں سے آپ کو کون سی چیز پسند ہے؟
ج دونوں بہت دور ہیں مجھ سے۔

ثمینہ کوثر..... ملتان

س نین بھیا! آپ کے ہر ناول کا ہیرو سگریٹ یا سگار ہی کیوں پیتا ہے۔ کچھ اور کیوں نہیں؟
ج پاکستان میں ان دو چیزوں کے ساتھ صرف چائے پینے کی اجازت ہے۔

فرح دیبا..... کراچی

س کہیں الو بولتے تو جگہ ویران ہو جاتی ہے۔ اگر ذوالقرنین بولے تو جگہ کا کیا حال ہوتا ہے؟
ج احباب کو گمان ہوتا ہے کہ جشن بہاراں کا سماں ہے۔

شہناز اختر..... ڈلوال

س آہستہ سے بتا دیں۔ جو ناول آپ کے نام سے آ رہا ہے وہ آپ کس سے لکھوا رہے ہیں؟
ج ایک ہے مگر نام ہم تمہیں کیوں بتائیں اس کا۔

شبانہ عینی..... کراچی

س ذوقی بھیا! اتنے اہتمام سے تیار ہو کر کیوں بیٹھے ہو کیا بھابھی کا انتظار ہے؟
ج بات یہ نہیں بلکہ معاملہ یوں ہے کہ تمہاری بھابھی کو ہمارا انتظار ہے۔

شیریں رحمن..... کوئٹہ

س قابلِ رشک موت تو شہادت ہے۔ یہ بتائیے کہ قابلِ رشک زندگی کیا ہے؟
ج جو جہاد کرتے گزرے۔ اپنے نفس کے خلاف۔

کوثر ارشاد..... ملتان

س ذوالقرنین بھیا! اگر آئینہ صورت کے بجائے سیرت دکھاتا تو پھر؟
ج پھر شاید اعمال کی درستگی پر ہم زیادہ توجہ دیتے۔
س اگر آپ کا بچپن دوبارہ لوٹ آئے گا پھر آپ کیا کریں گے؟
ج اس عمر تک پہنچنے کی جستجو۔

☼ ☼

مدیرہ

نامے میرے نام

انیقہ انا..... چکوال

مارچ کا شمارہ اس بار بہت تاخیر سے سترہ مارچ کو ہاتھ میں آیا۔ روایتی سا انداز لیے سرورق دل کو بھا گیا۔ کرن کتاب بھی بیکنگ کے موضوع پر ہونے کے باعث پسند آئی۔ سلسلہ وار ناولز میں ایک تھا ہی نہیں' دوسری کہانی اس بار دلچسپ موڑ پر آ کر رک گئی۔ خرم نے زوبیہ کے ساتھ قطعاً" اچھا نہیں کیا۔ یہ تو وہی بات ہوئی "کسی کی دل لگی کسی کی دل کی لگی بن گئی" ابرار صاحب کے کیے کا بھگتان' رومیلہ کو بھگتنا پڑے گا۔ فوزیہ جی اب جلد از جلد نمل اور خرم کی شادی کروا کر شائستہ کا مسئلہ حل کریں' تاکہ دل کو قرار آئے۔

نایاب جیلانی کے ناول سے ہمیں سوائے از حد طوالت کے کوئی گلہ نہیں۔ منیب عالم کے اس بار کے مکالمے نے تجسس کی ساری گتھیاں سلجھا دیں۔ سچ ہے کہ وہ جس راہ کا مسافر بن چکا ہے' اس راہ پر چلنے والے کبھی ناامید نہیں ہوتے۔ ہنی اور زوبارہ (ایک کردار دو نام) آخر میری [illegible] ثابت ہوئی۔ فلک ناز نے [illegible] تو خوب چلی [illegible] تقدیر لکھی [illegible] نہیں [illegible] امید ہے کہ فلک ناز' ماہیر عالم [illegible] کی [illegible] ہو گا۔ تقدیر' تدبیر پر حاوی ہوتی ہے [illegible] ناول کو پیش نظر رکھوں تو "ماہیر ہے قسمت کا دھنی" خیر یہ بتائیے کہ اگلے مہینے اتنی وسیع بساط پر چلتے یہ تمام مہرے سمٹ کر اپنے انجام کو پہنچ جائیں گے کیا؟

مقید خاک تاحال (سوائے پہلی قسط کے) نہیں پڑھا۔ اگلے ماہ ان شاء اللہ مکمل تبصرہ کروں گی۔

"فرحانہ ناز ملک" عرصہ طویل کے بعد آئیں اور گویا چھا گئیں۔ اب جہاں "عمر جہانگیر" ہو وہاں انیقہ کا دل تو آئے گا ہی نا! ہلکی پھلکی' شگفتہ سی تحریر' جان دار مکالموں' شان دار کرداروں کی بدولت جی کو خوش کر گئی۔ اتنا کہ دوبارہ پڑھنے کو جی چاہا۔ ویسے اس بار کرن کی سب ہی تحاریر میرا بار بار پڑھنے کو جی چاہ رہا ہے۔ فرحانہ ناز کو میری طرف سے اتنا خوب صورت ناول لکھنے پر ڈھیروں مبارک باد دیجیے گا۔

"مہوش افتخار" نے بھی خوب لکھا' اونچی اونچی حویلیوں میں رہنے والے خوب پڑھے لکھے لوگوں کی سوچ' ان کے دل' ان حویلیوں کی طرح پتھر ہی ہوتے ہیں۔ نجیب جلال نے جو کچھ کیا' اس کا کیا داؤد اور آبگینے کو بھگتنا پڑا۔ ذکاء نے اپنے غصے اور جذبات میں مطلق العنان بن کر فیصلہ تو سنایا پر نقصان تو آبگینے کا ہوا۔ گل مینا کے زخموں کا مداوا تو ہو ہی گیا۔ بہرحال کہانی مجھے بہت پسند آئی' ایک تو اس لیے کہ موضوع اچھا تھا' دوسرے مجھے پٹھان بہت اچھے لگتے ہیں۔

"نفیسہ سعید" کا ناولٹ بھی بہت پسند آیا۔ داؤد کا صبر اور حوصلہ' فاریشہ کو اس کا مقدر بنا گیا۔ وہیں زریاب نے بھی من پسند ساتھی کے انتخاب میں برداشت سے کام لے کر منزل پالی۔

افسانوں میں اس ماہ کا بہترین افسانہ "ذہین" تھا۔ بے حد خوب صورت' دیگر افسانے بھی خوب رہے۔

"سروے" میں سب ہی کے جوابات نے خوب متاثر کیا۔ دیگر مستقل سلسلے بھی لاجواب رہے۔ ذوالقرنین بھائی کی غزل اور نظم بہت بھائی۔ الغرض اس ماہ سارا کا سارا کرن ہی لاجواب رہا۔ اتنا شان دار سالگرہ نمبر نکالنے پر ایک بار پھر ڈھیروں مبارک باد۔

فوزیہ ثمر بٹ..... گجرات

سالگرہ نمبر تیرہ تاریخ کو موصول ہوا۔ ٹائٹل نہایت ہی خوب صورت تھا۔ ماڈل کا میک اپ' جیولری' خاص کر مہندی لاجواب تھی۔ "دست کوزہ گر" اور "عشق ہوتا نہیں" ناول کا اسکیچ پسند آیا۔

ہمیشہ کی طرح حمد و نعت کو نہایت عقیدت سے پڑھا۔ اداریہ کی باتوں پہ غور و فکر کیا۔ اس بار انٹرویوز تمام کے تمام اچھے لگے۔ "دو کا پہاڑہ" میں "ترنا بچہ" سے ملاقات اچھی رہی۔

"قارئین کی عدالت میں ثمینہ پیرزادہ" کے جوابات بھی اچھے تھے۔ "سوہائی ابرو" کافی بولڈ لگی۔ خیر ایک حد

تک لڑکیوں کو بولڈ ہونا بھی چاہیے۔

"مجھ سے ملیے" سعدیہ عزیز آفریدی" سے ملاقات کروا کے آپ نے میرا دل خوش کردیا۔ بڑی حسرت تھی کہ سراپا محبت خاتون کیسی ہوں گی' اب کیا کہوں' سر سے پاؤں تک محبت ہی محبت ہیں۔

رسالے کی جان ناول "ادرے پیا" کے متعلق بات ہوجائے۔ ایک ہی قسط میں تمام کہانی کو کلوزاپ کردیا۔ زوباریہ پر بے تحاشا ترس آیا۔ اس وقت آنکھیں اشک بار ہوگئیں' جب وہ اپنے رب سے سوال کرتی ہیں کہ "میں اتنی بری ہوں' کائنات کی ناپسندیدہ بنی ہوں' جو تو میری نو سال کی دعاؤں کو قبولیت کا درجہ عطا نہیں فرما رہا۔"

ایک پل کو دل نے دہائی بھی دی کہ ماہیر کو' زوباریہ کا ہی ہونا چاہیے۔ مگر پھر حریم اور ماہیر دونوں کا خیال آیا کہ ان دونوں کا کیا قصور دو محبت بھرے دل کیوں ٹوٹے' جبکہ زوباریہ کی' ماہیر نے کبھی حوصلہ افزائی بھی نہیں کی۔ کیا زوباریہ تمام عمر انجان رہی ہے کہ ماہیر' حریم سے محبت کرتا ہے۔ میرے خیال میں جب زوباریہ کو اس حقیقت کا پتا چلے گا کہ ماہیر اور حریم دونوں ایک دوسرے کی محبت ہیں۔ تو زوباریہ خود ہی پیچھے ہٹ جائے گی۔ اور اپنی ماں کے قہر سے بھی زوباریہ ہی بچائے گی ماہیر کو۔ شدت سے انتظار رہے گا' اب نایاب جی کیا اینڈ کرتی ہیں۔ "معتبد خاک" کا بے چینی سے انتظار رہے گا' دیکھتے ہیں آخری قسط میں کیا برآمد ہوتا ہے۔

"میرے بے خبر" اچھا ناول تھا۔ زکاء نے جب اپنی بہن کو انصاف دلایا تو آبگینے کے لیے بھی کچھ کرتا نا' پتا نہیں یہ اونچے شملے والے مرد' عورت کو پاؤں کی جوتی کیوں سمجھتے ہیں۔ جس کا جب دل چاہا پاؤں میں پہن لی' جب چاہا اتار دیا۔

"تم سنگ نیناں" بھی اچھی کہانی تھی' اس کا مرکزی کردار عمر جہانگیر بے چارہ پوری کہانی میں حوریہ کی بدتمیزیاں ہی برداشت کرتا رہا بے چارا اک تک چڑھی سے محبت جو کر بیٹھا تھا۔

افسانوں میں "ذہین" اچھا تھا' صباحت جی نے اچھی ٹپ دی ہیں بیویوں کو۔ گمراہ شوہروں کو راہ راست پر ایسے بھی لایا جاتا ہے۔

"من کی چھاؤں" پسند آیا گھر کی چار دیواری کی خواہش ہر عورت کو ہوتی ہے' صدف آصف" انگنا پھول کھلے" کافی سبق آموز کہانی تھی۔

"عشق ہوتا نہیں" نفیسہ سعید بار بار کی پڑھی ہوئی تحریر تھی۔ مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح اچھے دن رہے' اجازت چاہتی ہوں' اس دعا کے ساتھ کرن خوب ترقی کرے۔ (آمین)

نمو انوار۔۔۔ راولپنڈی

اس مرتبہ کرن قدرے تاخیر سے ملا اور جیسے ہی ہاتھ میں آیا سب سے پہلے نامے میرے نام کھولا' اپنا نام دیکھ کر بہت خوشی ہوئی' پہلی دفعہ شرکت کی اور پہلی دفعہ ہی میرا خط اور سروے کے جوابات شامل ہوگئے اور بابدولت نے حقیقتاً" اچھل اچھل کر پورا گھر سر پر اٹھالیا۔ اس ماہ میں اپنا ایک افسانہ ارسال کررہی ہوں۔

اب آتے ہیں کرن کی جانب' کرن ملا تو کافی لیٹ لیکن پھر بھی تھوڑا بہت پڑھ ہی لیا۔ "مسوہائی" سے ملاقات اچھی لگی۔ "دو کا پہاڑہ" میں "نرا بچہ" کے بارے میں پڑھ کر اچھا لگا۔ مکمل ناول فی الحال ایک ہی پڑھا ہے۔ فرحانہ ناز ملک نے کافی اچھا لکھا۔ زریاب کی قربانی بہت اچھی لگی۔ افسانے ابھی دو ہی پڑھے ہیں' دونوں اپنی اپنی جگہ بہت اچھے اور سبق آموز تھے۔

آخر میں آپ کا بہت زیادہ شکریہ ادا کرنا چاہوں گی' اور کرن کے اسٹاف' مصنفین اور قارئین کے لیے ڈھیر ساری دعائیں' اب اجازت دیجیے' اللہ حافظ وناصر۔

شکیلہ شیرازی۔۔۔ ملکوال

میرا کسی بھی ماہنامے میں پہلا خط ہے۔ میں کرن کی خاموش قاری ہوں' میں کرن کو گزشتہ چار سال سے پڑھ رہی ہوں۔ مجھے آج بھی یاد ہے جب میں نے میٹرک کلیئر کیا تھا اور آگے پڑھنا چاہتی تھی' مگر میرے بھائی نے مجھے پڑھنے کی اجازت نہ دی' تب میں بہت پریشان رہا کرتی تھی۔ اک دن اچانک میرے خالہ اور خالو آئے اور مجھے اداس دیکھ کے کہنے لگے' ہماری مینا آج بڑی چپ چپ ہے اور گھر سونا سونا ہے' پھر ای نے بتایا کہ پڑھنا چاہتی ہے۔ مگر اس کا بھائی اجازت نہیں دیتا' تب تو وہ خاموش ہوگئے' جب اگلے دن آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک بڑا سا شاپنگ بیگ تھا' انہوں نے میرے سامنے لاکے رکھا' میں حیران تھی کہ یہ کیا ماجرہ ہے' جب کھول کے دیکھا تو' تو میری باچھیں کھل گئیں' جی ہاں! اس میں ہر طرف کرن مسکرا رہا تھا۔

جب میں نے اسے پڑھنا شروع کیا تو میری اداسی آہستہ آہستہ ختم ہوگئی' کرن سے میری توجہ پیار' پھر محبت' پھر عشق اور یہ اب جنون میں بدل گئی۔ کرن نے مجھے شعور سے آگاہی عطا کی ہے۔ ماں کی نرم گرم گود کے بعد کرن نے رہنمائی دی۔ کرن کی ساری رائٹرز خوب لکھتی ہیں۔ نبیلہ عزیز' نایاب جیلانی اور مریم عزیز میری فیورٹ رائٹرز ہیں۔ لگتا ہے خط کچھ زیادہ ہی لمبا ہوگیا ہے' چار سال بعد خط لکھنے کی ہمت کی ہے' پلیز مجھے اپنے رسالے میں جگہ ضرور دیجیے' کیونکہ یہ میری اولین خواہش ہے' اگر یہ خط شائع ہوگیا تو آئندہ تبصرہ کروں گی' اب اجازت چاہتی ہوں۔

حرمت روا کرم۔۔۔ ڈلوال

طویل غیر حاضری کے بعد حاضر خدمت ہیں۔ مارچ کا شمارہ پندرہ مارچ کو ملا۔ سرورق بہت پسند آیا۔ حمد ونعت سے مستفید ہونے کے بعد "ادرے پیا" پڑھا۔ بہت اچھا لکھ رہی ہیں نایاب جیلانی۔ مگر براہ مہربانی ایک درخواست ہے کہ ماہیر اور حریم کے ساتھ کچھ برا مت کیجیے گا۔ فیفا کے ساتھ ہونے والی بے انصافی پہ بہت دل دکھا۔ آخری قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ اس دفعہ "دردل" کو نہ دیکھ کر دل خاصا برا ہوا۔ پلیز نبیلہ جی ایسا نہ کیا کریں' پورے مہینے ناول کا انتظار رہتا ہے۔ "نفیسہ سعید" کا ناولٹ بھی بہترین تھا۔ جبکہ ضوباریہ کا مکمل ناول ابھی پڑھنا شروع نہیں کیا' سو تبصرہ بعد میں۔ افسانے سارے ہی اچھے تھے۔ "سائرہ اسد" کا افسانہ بہت پسند آیا۔ انٹرویوز سارے ہی بہترین تھے۔ "دو کا پہاڑہ" میں "نرا بچہ" سے ملاقات اچھی رہی' مستقل سلسلے بھی بہترین تھے۔

شہرین اعوان۔۔۔ ملکوال

میں گزشتہ تین برس سے کرن شمارے کی خاموش قاری ہوں' اکثر دل چاہا کہ قلم اٹھاؤں اور اپنے جذبات سے آپ کو آشنا کراؤں' لیکن گردش دوراں اس قدر تیز رفتار ہے کہ یہ ارادہ کرتے کرتے بھی تقریباً" ایک سال ہونے کو آیا ہے۔ آخر آج کاغذ قلم لے کر ہم آپ کے سامنے آہی گئے' کرن بلاشبہ خواتین کے لیے بہترین شمارہ ہے۔

نایاب جیلانی کی تحریر زبردست ہے' لیکن اب مصنفہ سے درخواست ہے کہ اس کہانی کا جلدی سے اختتام کریں' ہم بے چینی سے منتظر ہیں۔

تعریفیں تو ہوتی رہتی ہیں' ہم آپ کی توجہ ایک اہم نکتہ کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ شمارے میں شائع ہونے والی بعض ایسی تحریریں ہیں' جو حالات وواقعات اور ناموں کے فرق کے ساتھ بار بار دہرائی جارہی ہیں۔ اس کے علاوہ ڈائجسٹ کی مصنفین سے گزارش ہے کہ ایک خاص روش سے ہٹ کر موجودہ حالات وواقعات پر روشنی ڈالتی ہوئی تحریریں سامنے لائیں۔

اب آپ سے اس امید اور درخواست کے ساتھ اجازت چاہتی ہوں کہ میرے خط اور پیغام کو قابل توجہ سمجھا جائے گا۔

شگفتہ ناز۔۔۔ گوجرانوالہ

ماہنامہ کرن ہم ساتویں کلاس سے پڑھ رہے ہیں اور ڈائجسٹ بھی پڑھتے تھے۔ مگر کرن نے اپنی جگہ دل میں ایسی بنائی کہ باقی سب کو خیرباد کہنا پڑا۔ ساتویں کلاس سے چھپ چھپ کے کرن پڑھتے رہے۔ اب ہم نے ماسٹر اردو مکمل کرلیا ہے۔ ہر دفعہ ڈائجسٹ پڑھنے کے بعد کاغذ اور قلم لے کر بیٹھ جاتے ہیں کہ کرن کے لیے کچھ لکھ کر بھیجیں لیکن پھر اس خوف سے پوسٹ نہ کرسکے کہ کہیں ہمارا خط ردی کی ٹوکری کی زینت نہ بن جائے' لیکن اس دفعہ اللہ کا نام لے کر خط بھیج رہے ہیں' اس امید کے ساتھ ضرور کرن کی زینت بنے گا۔

"کرن" کی کہانیاں اور ان کی مناسبت سے جو تصاویر شائع کی جاتی ہیں' وہ کہانی پڑھنے کے بعد بالکل اس کہانی کا عکس لگتی ہیں۔ کرن کی تصاویر اور کہانیاں ایسی دل موہ لینے والی ہوتی ہیں کہ ان کے آگے ہمیں باقیوں کو خیرباد کہنا پڑتا ہے۔ اس دفعہ اتنا ہی' اگر نظر عنایت ہوگی تو آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گے۔ اللہ ہم سب کا نگہبان ہو۔ (آمین)

انیلا گل توشین گل۔۔۔ ایبٹ آباد

خوب صورت رنگوں سے سجا کرن کا سالگرہ نمبر پندرہ مارچ کو مل گیا۔ سب سے پہلے "دست کوزہ گر" پڑھا۔ خرم کا شرط جیتنا اور پھر نمل کا ردعمل مزا دے گیا۔ خرم کے اور باقی سب کے تاثرات پڑھ کے بے ساختہ ہنسی آئی۔ رومیلہ اور عالیان کا ساتھ ہمیشہ کا ہونا چاہیے۔ اس کے بعد نایاب جی کے پاس گئے۔ ماہیر عالم اور حریم کو جدا نہیں ہونا چاہیے۔ فیفا اور شاہ نواز ساتھ ساتھ بہت اچھے لگتے

ہیں۔ ناول ہمیشہ یاد رہے گا۔ اس کے بعد "فرحانہ ناز ملک" کے پاس پہنچے۔ ناول بہت اچھا لگا۔ "مہوش افتخار" کا ناول بھی بہت اچھا لگا۔ اور ذکاء کا بدلنا بھی۔ ناولٹ اور افسانے سب بہت اچھے تھے۔ نام میرے نام میں "اور رے پیا" کے بارے میں سب کی قیافہ شناسی دل دھڑکا گئی۔ حریم اور ماہیر کو جدا نہیں ہونا چاہیے۔ انیقہ انا کی موجودگی اچھی لگی۔ ربیعہ کنول رانا کا طویل خط بہت دلچسپ تھا۔ فوزیہ ثمر بٹ آپ واقعی بہت اچھا لکھتی ہیں۔ سعدیہ آپ کہاں گم ہو گئی ہیں۔ جلدی سے مکمل ناول کے ساتھ حاضر ہوں۔ ہم شدت سے آپ کے مکمل ناول کا انتظار کر رہے ہیں۔ "ثمن اور نادیہ جہانگیر آپ بھی جلدی سے مکمل ناولز کے ساتھ آئیں۔ ہم آپ کو بھی یاد کر رہے ہیں' باقی سالگرہ نمبر بیسٹ تھا۔

عفت جبیں..... فیصل آباد

ایک طویل عرصے بعد آپ کی محفل میں قدم رکھا ہے۔ امید ہے' جگہ ضرور ملے گی۔ ہر مہینے رسالہ پڑھنے کے بعد سوچا کہ اب تبصرہ ضرور بھیجوں گی' لیکن عمل نہ کر سکی' وجہ وقت کی کمی' خیر..... اب بھی خط لکھنے کی وجہ نایاب جیلانی اور نبیلہ عزیز ہیں۔

نایاب آپ لکھیں اور ہمیں پسند نہ آئے۔ یہ نہیں ہو سکتا' اور نبیلہ جی آپ کی بھی کیا بات ہے' ہر ناول زبردست ہوتا ہے۔ "اور رے پیا" اس پر بھی تبصرہ ادھار رہا۔ کیونکہ یہ میں نے ابھی پڑھا بھی نہیں' اگلی بار بھرپور تبصرے کے ساتھ شرکت کروں گی' دعا ہے کہ کرن ہمیشہ یوں ہی اپنی کرنیں بکھیرتا رہے۔ (آمین)

سائرہ پروا علی..... مرغائی راجن پور

ٹائٹل گرل میرے فیورٹ کلر میں بہت غضب ڈھا رہی تھی۔

"سوہائی ابرو" سے ملاقات سو سو رہی۔ یہ نام پہلی بار سنا ہے' اس لیے کچھ عجیب سا لگا۔ "وہ تم کو کیسی لگتی ہے۔" ذوالقرنین کی یہ نظم مجھے بہت بہت پسند ہے۔ "زمانچہ" کا تعارف پڑھ کر یہ کہہ سکتی ہوں کہ وہ بہت خود پسند ہیں۔ "قارئین کی عدالت" میں "ثمینہ پیرزادہ" کے جوابات بہت اچھے لگے۔

کہانیوں کی فہرست پر نظر دوڑائی تو سلسلے وار ایک ناول دیکھ کر دل تھام کر رہ گئے۔ نبیلہ آپی' یہ آپ نے کیا کیا' "در دل" کو نہ پاکر دل بہت رویا۔ ایک ماہ کیا کم ہوتا ہے' انتظار کے لیے۔

"مقید خاک" کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے' جیسے ہم جاسوسی ناول پڑھ رہے ہیں۔ فوزیہ یاسمین کا ناول ایک جگہ پر آکر رک گیا ہے۔ ایک ماہ کے جان لیوا انتظار کے بعد بس چار' پانچ صفحات پڑھنے کو ملیں تو بہت غصہ آتا ہے۔ وہی خرم اور نمل کی سرد جنگ' زوبیہ کا خواب میں ڈرنا اور رومیلہ کی شادی والا معاملہ' فوزیہ آپی! ناول میں کچھ تیزی لائیں۔ اب خرم اور نمل کی شادی بھی کرہی دیں۔ اتنا انتظار مت کروایا کریں' ورنہ ناول میں دلچسپی برقرار نہیں رہتی۔ جھمیلی لین لنک" بہت انٹرسٹنگ اسٹوری تھی۔ "ذہین" چھوٹا سا' مگر ایک سبق آموز افسانہ ہے مردوں کے لیے' ویل ڈن! صباحت یاسمین "اور رے پیا" کی اس ماہ کی قسط میں کافی رازوں سے پردہ اٹھایا۔ زوباریہ درانی کی محبت کی انتہا دیکھ کر حیران رہ گئے۔ مگر نہیں..... یہ محبت نہیں' یہ تو عشق ہے اور اس عشق کی آگ کے آگے لگتا ہے ماہیر عالم بھی سر تسلیم خم کردے گا۔ ماضی میں ماہیر اور زوباریہ کی باتیں بہت اچھی لگیں۔ اس بار زرجان عباس اور اس کی خاموشی کا ذکر نہیں تھا۔ سارا ناول زبردست تھا' مگر آخری صفحہ پڑھ کر چکرا کر رہ گئے۔ محترمہ فلک ناز اتنا کر سکتی ہیں اندازہ نہیں تھا۔ "من کی چھاؤں" میں شازیہ کو سکندر جیسا مخلص ہم سفر ملا۔ پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ آپ سے ریکوئسٹ ہے "مجھ سے ملنے" میں نادیہ جہانگیر' راحت جبیں اور فرحت اشتیاق کا تعارف ضرور شائع کریں۔

شاہین محمد شوقین..... میرپور خاص

کرن تیرہ کو ملا' ٹائٹل بہت پسند آیا' دلہن بہت ہی پیاری لگ رہی تھی۔ حمد و نعت سے مستفید ہونے کے بعد مستقل سلسلوں کی طرف دوڑ لگائی۔ نبیلہ عزیز کا "در دل" نہ پاکر دل اداس ہو گیا۔ اب پورا ایک مہینہ انتظار کرنا پڑے گا۔ نایاب جی کا "اور رے پیا" بہت اچھا جارہا ہے۔ "مجھ سے ملئے" میں پلیز' پلیز نازیہ کنول نازی کو بھی لائیے اور "قارئین کی عدالت میں "ہمایوں سعید" کو بھی ضرور لائیں' باقی سارے سلسلے اچھے تھے' اب اجازت دیں۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گی' کرن کے لیے ڈھیر سارا پیار۔

☆ ☆